سلسلہ آصفیہ نمبر (۲)

مراثی انیس

جلد اوّل

یعنی

جناب میر ببر علی صاحب انیس لکھنوی مرحوم و مغفور کے زمانہ پیری کا کلام

مُرتّبہ

مولانا سید علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم لکھنوی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ وظیفہ خوار
و پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن

مع مقدمہ

مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

سنہ ۱۹۳۵ء

بار دوم ۵۰۰ جلد

میر ببر علی انیس لکھنوی
ولادت سنہ ۱۸۰۲ع ❁ وفات سنہ ۱۸۷۴ع

فہرست مراثی

جلد اوّل

طبع ثانی کے متعلق التماس

آج سے چونسٹھ سال قبل میر انیس کا کلام مجالس عزا کے ساتھ مخصوص تھا لیکن خدا خوش رکھے ڈاکٹر سر سید راس مسعود المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر کو کہ ان کی اس دلچسپی کی بدولت جو وہ اردو ادب کی ترقی سے رکھتے ہیں اس کی خوبیاں مجالس عزا سے نکل کر بزم ہائے ادب اردو میں خراجِ تحسین حاصل کرنے لگیں یا یوں کہیے کہ اس کے اوراق مرثیہ خوانوں کے بستوں سے نکل کر خوشنما مجلدات کی صورت میں تعلیم یافتہ طبقہ کی میزوں اور کتاب خانوں کی الماریوں کی زینت بن گئے۔

سب سے پہلے اس قادر الکلام فردوسی ہند کے مراثی کے مجموعہ کی پہلی جلد ادب اردو کے سب سے بڑے محسن و مربی اعلیٰحضرت نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر بالقابہ فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہٗ کی سرپرستی میں نئی سج دھج کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں شایع ہوئی جو نظامی پریس بدایوں کے "سلسلۂ آصفیہ" کی دوسری کڑی تھی۔

خدا مغفرت کرے مولانا سید علی حیدر طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر کی جنھوں نے باوجود پیرانہ سالی اور مشاغل سرکاری کے اس مجموعہ کی ترتیب و تصحیح کی زحمت اٹھائی لیکن مولانائے موصوف باوجود میرے اصرار کے اس وقت اس کا مقدمہ لکھنے کے لیے وقت نکال سکے جس کا اظہار میں نے افسوس کے ساتھ اپنے مقدمہ میں کر دیا ہے بہ مجبوری مجھ ہی کو مقدمہ لکھنا

پڑا جس میں اپنی بساط کے موافق میر صاحب کے کلام پر تبصرہ کیا اور اُن کے سوانح حیات پر روشنی ڈالی لیکن اُن کی وفات کی تاریخ وسال کا حوالہ نظرانداز ہو گیا اُسی زمانے میں سب سے پہلے میری اس فروگزاشت پر علامہ حاجی عبداللہ یوسف علی مدظلہ نے مجھے ٹوکا تھا اُسی وقت سے ارادہ تھا کہ طبع ثانی میں اس کمی کو پورا کیا جائے خدا کا شکر ہی کہ آج چودہ برس کے بعد یہ آرزو پوری ہوئی ہی اس کے علاوہ نکتہ چیں دوستوں نے اس اعتراف کے ساتھ کہ کتاب کی ظاہری شان دوسرے مطابع کی جلدوں سے بدرجہا بہتر ہی کتابت کی بعض غلطیوں کی طرف انگشت نمائی کی تھی۔

میں نے اس نسخہ کو جو آج دوسری مرتبہ چھپکر محترم ناظرین کے ہاتھوں تک پہونچتا ہی اغلاط سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی ہی اور سچ تو یہ ہی کہ ایسی ایسی غلطیوں کی درستی کی نوبت آئی ہی جس سے طبع اوّل میں بعض مقامات پر نہایت بدنمائی پیدا ہو گئی تھی خدا سے دُعا ہی کہ میری یہ سعی ادب اُردو کی دُنیا میں مشکور ہو۔

میر صاحب کے کلام پر تبصرہ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہی اور مجھ ہیچ میرز کی قابلیت سے بالاتر، میں جو کچھ لکھ سکتا تھا وہ میرے مقدمہ میں موجود ہی اس لیئے اس وقت میں خود میر صاحب ہی کے اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں ؎

کسی نے تری طرح سے اے انیس عروس سخن کو سنوارا نہیں

میر صاحب کے کلام کو پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے تو یہ امر خود بخود واضح ہو جائے گا کہ میر صاحب نے جو کچھ اس شعر میں کہا ہی وہ نہ تعلّی ہی نہ خودستائی بلکہ واقعہ ہی اور بالکل حقیقت حقیقت کیوں ہی؟ اس کا جواب بھی میر صاحب کا یہ مصرعہ دے گا۔

"پڑا جو عکس تو ذرّہ بھی آفتاب ہوا"

خاکسار
نظامی بدایونی

بدایوں ۳ محرم الحرام ۱۳۵۴ھ
مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۳۵ء عیسوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

اساتذۂ اُردو میں میر ببر علی صاحب انیس کے کلام کا پڑھنا سمجھنا پرکھنا اُس سے زبان وطرز بیان کا سیکھنا اُن کا تتبع کرنا اُن کے نقش قدم پر چلنا ہر شاعر و ادیب جو واقعہ نگار ہو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے فارسی ترکیبوں میں اُن کے تصرفات ایک اُستاد زمانہ ہونے کی حیثیت سے اُردو میں قابل استناد ہیں اسی اہمیت کو مدنظر رکھ کر جناب سید راس مسعود صاحب بی۔ اے (آکسن) ناظم تعلیمات دولت آصفیہ نے اپنی اسکیم کی دوسری قسط کے طور پر اس کے شایع کرنے کی ضرورت محسوس ہائی اور اعلیحضرت قدر قدرت ہزاکزالٹڈ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفرالممالک نظام الملک محی الملۃ والدین نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نظام الدولہ فتح جنگ بالقابہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ سے جو مستند شعرائے اُردو کے کلام کی اشاعت کے لیے سید صاحب موصوف کی درخواست پر مرحمت ہوا تھا مراثی انیس کی پہلی جلد شایع ہونے کی نوبت آئی۔ اس جلد میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور اس میں بعض وہ مراثی ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئے درحقیقت یہ جلد میر صاحب کے اُس کلام کا مجموعہ ہے جس کی نسبت اُنھوں نے خود فرمایا ہے ؎

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی

ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ نے اس جلد کی ترتیب تصحیح کی خدمت کو انجام دے کر ملک پر بالعموم اور اُردو داں پبلک پر بالخصوص احسان فرمایا ہے آغا سید حسن صاحب بی۔ اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ (حیدرآباد) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میر صاحب کا اصلی فوٹو عنایت

فرمایا جس کے بغیر یقیناً یہ مجموعہ نامکمل رہتا۔

اُمید تھی کہ اس جلد کے قابل مرتب مولانا طبا طبائی صاحب اس کا مقدمہ لکھ کر اپنے کامل الفن ہونے کی حیثیت سے فن مرثیہ گوئی اور شاعری کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیں گے جس سے ناظرین کو میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قایم کرنے میں مدد ملے گی لیکن ہماری بدقسمتی سے مولانائے موصوف اپنی پیرانہ سالی اور مصروفیت کی وجہ سے ہماری اس خواہش کو پورا نہ کر سکے انھوں نے اپنے ایک نوازشنامہ کے چند فقروں میں اس جلد کی خصوصیات کا جو ذکر فرمایا ہے اس موقع پر اُس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس جلد میں میر صاحب مرحوم و مغفور کے یا تو وہ مرثیے ہیں جن میں مصنف نے خود صراحتاً یا اشارۃً یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ یہ ان کی آخر عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب اتو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے بستے میں تھے۔ جس دن جناب مرحوم نے منبر و مجلس کو الوداع کہی تینوں صاحبزادے سامنے حاضر تھے۔ چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیس کو اشارے سے پاس بلایا بستہ اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا سلیس مرحوم مٹیا برج و حیدرآباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا کیے یہ مرثیے منشی نولکشور کو نہ ہاتھ آ سکے کہ ان کی مرتب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے اس کے علاوہ دو ایک تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کی نہایت مشق کا کلام ہے۔ لوگوں کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بستے سے جُدا کرنے پڑے"

مولانا طباطبائی کی طرف سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے متعلق جب مایوسی ہو گئی تو میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی وہ یہ ہے:۔

تمہید

دُنیا میں جس قدر روشن دماغ اور مہذب قومیں ہیں وہ قدرتی طور پر شاعری کی دلدادہ ہیں کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے اس میں کچھ نہ کچھ ایسی روایات ضرور ملیں گی جن کو نظم کا لباس پہنا کر مشاہیر کے شجاعانہ مذہبی اور اخلاقی کارناموں کو پیش کیا گیا ہی اسی وجہ سے جملہ اصنافِ سخن میں رزمیہ شاعری کو فوقیت حاصل ہی اور وہ آئندہ نسلوں میں جرأت دلیری اور قومی غیرت کے جذبات پیدا کرنے کو صدیوں تک زندہ رہے گی۔ یونانی زبان میں ہومر نے الیڈ[1] کے صفحات پر رزم و بزم کی معرکہ آرائیاں پیش کی ہیں۔ لاطینی میں ورجل نے اینڈ[2] کے اوراق میں انیس[3] کے واقعاتِ زندگی کا نقشہ کھینچا۔ سنسکرت میں مہابھارت کے واقعات آج تک انسانی دل و دماغ پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں۔ انگریزی میں پیراڈائیز لاسٹ[4] میں ملٹن کے بیانات مہذب سوسائٹیوں کے دل پر یہ نقش بٹھا رہے ہیں کہ جنگ تہذیب و تمدن کے رُخ سے نقاب اُٹھا کر انسانوں کو علوم و فنون کا مالک بنا دیتی ہی عربی میں سبعہ معلقہ کے بعض قصائد ایسے ہیں جو دلوں پر برچھی اور بھالے کا کام کر جاتے ہیں۔ فارسی زبان میں شاہنامہ فردوسی کی رزمیہ داستانیں مشہور و معروف ہیں مگر اُردو میں رزمیہ شاعری کا چرچا اس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ ہندوستان میں ایک ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جس نے اُردو کی رزمیہ شاعری کا نہ صرف پارسی سے رتبہ بڑھا دیا بلکہ یونانی۔ لاطینی اور انگریزی شاعری سے بھی ارفع کر دیا۔ وہ کون تھا **انیس** اُس نے اپنے قلم کے سمند کو اس شان سے میدان میں دوڑایا کہ ہومر، ورجل اور کالیداس کی روحیں ٹاپوں سے اُڑنے والے غبار کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے لگیں۔ بالمکی اور بیاس اس کی علم برداری پر آفریں کہہ اُٹھے۔ اہلِ عرب کی رجز خوانی اور شجاعانِ عرب کے نعرے اس کے شکوہ و تجمل سے خجل ہو گئے اور اُس نے اپنی تیغ زبان کے جوہر سے فردوسی کی فصاحت پر پانی پھیر دیا۔ انیس نے اپنی شاعری کے جس جانگداز واقعہ کو انتخاب کیا وہ نہ صرف تاریخ کا ایک اہم جزو ہی بلکہ اس کو تہذیب و تمدن مذہب و اخلاق سے خاص تعلق ہی اور ان کی ممدوح وہ مقدس ذات تھی جو ان کی مدح سے مستغنی تھی اس لیے اس کی مدح خود مداح کے لیے باعثِ مباہات ہی برخلاف اس کے فردوسی نے اپنی قوت مبالغہ

اور چرب زبانی کے زور سے اپنے ہیرو کی شجاعانہ داستانوں میں جان ڈال کر اس پر احسان کیا ہے

جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

منش کردہ ام رستم داستاں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

خلاصہ یہ کہ میر انیس نے جن واقعات کو نظم کیا ہے ان سے انسانی طبایع ہمیشہ متاثر ہوتی رہینگی اور ایک عظیم الشان مذہبی قربانی کے حالات عالم اسلام کے ستونوں کو جنبش میں لاتے رہینگے۔

میر صاحب کے اسلاف میر انیس کے اسلاف ہرات کے سادات سے تھے پرانی دلی میں آکر آباد ہوئے۔ میر ضاحک میر حسن میر خلیق کے نام ادبی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ میر انیس کے دادا میر حسن عالم جوانی میں اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ دلی سے فیض آباد (اودھ) چلے آئے تھے اور سرفراز جنگ کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھے وہاں سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ آپ کی مثنوی "بے نظیر بدر منیر" اردو لٹریچر میں لاجواب چیز ہے جس میں زبان کی سلاست محاورات کی خوش اسلوبی کے سوا جواہر نگار خامہ سے قدرت کے مرقعے کھینچے گئے ہیں۔

ولادت میر انیس میر خلیق کے گھر ۱۲۲۰ھ کے قریب فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بعض سوانح نگاروں نے ان کی جائے پیدائش دہلی کو لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا دلی میں تو کبھی ان کا جانا بھی ثابت نہیں۔

تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم فیض آباد میں حاصل کی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں میر صاحب اور ان کے بھائی میر مونس لکھنؤ تشریف لائے۔ میر خلیق اور اُن کے منجھلے بیٹے میر انس عرصہ تک فیض آباد میں مقیم رہے میر صاحب کے دیکھنے کو خلیق اور انس دونوں اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہے مدت کے بعد لکھنؤ کی کشش میر انس کو بھی فیض آباد سے کھینچ لائی میر خلیق اب بھی فیض آباد ہی میں اپنے بزرگوں کے مکان میں مقیم رہے لیکن خاک اُن کی بھی لکھنؤ ہی کی تھی ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ میر انیس کی مشق سخن اس قدر

ترقی پر تھی اپنے مرحوم باپ کی قبر پر مجلسیں کرتے تھے اور ہر مجلس میں نیا مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ مفتی محمد عباس صاحب مرحوم خود فرمایا کرتے تھے کہ صدرامیر صاحب نے اُن سے پڑھا تھا۔

علمی معلومات میر صاحب کو ادبی و علمی مسایل کی تحقیق اور تدقیق کا بہت شوق تھا۔ چالیس سال کی عمر تک اُنھوں نے طالب علمانہ زندگی بسر کی وہ عالم نہ تھے لیکن تمام تذکرہ نویس اس بات کے متعرف ہیں کہ علمی معلومات اعلیٰ درجہ کی تھی۔ جس طرح میر صاحب کا گھر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ایک علمی درسگاہ کا رتبہ رکھتا تھا اسی طرح علماو فضلا کی سوسائٹی نے ہر علم و فن کے رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔ تلوار کی تعریف میں آپ کا ایک مصرع ہے "ہر جزو تن کو لایتجزیٰ بنا دیا" ذوق مرحوم فرماتے ہیں ع جوہر فرد تھے بالفرض تو کیا بے قسمت" یہ دونوں مصرعے اپنے اپنے مصنفوں کے مبلغ علم کو ظاہر کر رہے ہیں۔ ازرق کے قتل پر میر صاحب فرماتے ہیں ع "لو کو فیو! گرا دیا حرفِ ثقیل کو" یہ مصرعہ خبر دیتا ہے کہ کوفییّن و بصریین میں تحقیق زبان و نحو عربی میں جو جو مباحثے ہوئے ہیں وہ سب مصنف کے پیش نظر تھے

باپ بیٹے کی اصلاح کا مقابلہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خلیق اپنے دونوں بیٹوں انیس اور مونس سے ملنے کے لیے فیض آباد سے لکھنؤ آئے ان کے منجھلے بیٹے مہر علی انس ان کے ہمراہ تھے میر خلیق نے میر انیس سے کہا مہر علی اُنس نے جو مرثیہ اس سال کہا ہے ذرا اسے سنو اس مرثیہ پر میر خلیق کی اصلاح تھی اور وہ بیٹے سے اس اصلاح کی داد کے طالب تھے چنانچہ انیس نے مرثیہ سن کر بہت داد دی ہی کے ساتھ کہا کہ باوا جان میر نواب (مونس) نے جو مرثیہ اسی سال کہا ہے ذرا اسے بھی سنیئے مونس نے مرثیہ سنایا یہ کچھ چیز ہی اور تھا اس پر انیس کی اصلاح تھی اس مرثیہ کو سنانے کی غرض بھی یہی تھی کہ میر خلیق بیٹے کی اصلاح کی داد دیں خلیق چھوٹے بیٹے کے مرثیہ اور بڑے بیٹے کی اصلاح سے بہت خوش ہوئے

چھوٹے بھائی کے ساتھ محبت میر صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی مونس سے جو بچپن سے میر صاحب کے ساتھ لکھنؤ میں رہے تھے کمال درجہ کی محبت تھی باوجود صاحب اولاد ہو جانے کے کبھی شفقت مربیانہ میں فرق نہ آیا میر صاحب کے صاحبزادے میر خورشید علی نفیس ہمیشہ رشک کرتے تھے اور کہا کرتے تھے ہمارا مرثیہ باوا جان کی اصلاح سے مہینوں محروم رہتا ہے اور

اور چھوٹے چچا کے مرثیہ پر فوراً اصلاح ہو جاتی ہے۔

خودداری

میر صاحب اس قدر خوددار اور نازک دماغ تھے کہ کوئی شخص آپ سے ملنے کے لئے اُس وقت تک نہ جا سکتا تھا جب تک پہلے سے اس کی ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے۔ روزمرہ کے آنے جانے والے بھی اطلاع کے بعد شرف ملاقات حاصل کرتے تھے۔

خودداری کی ایک مثال

حکیم مہدی سے لوگوں نے ذکر کیا کہ انتزاع سلطنت کے بعد سے میر انیس نے مجلسوں میں پڑھنا ترک کر دیا ہے اکثر لوگوں نے بہت کچھ الحاح و اصرار و اظہار شوق کیا مگر بے سود ہوا اور سب کا اشتیاق برسوں سے تقاضا کر رہا ہے کہ پھر میر صاحب کو منبر پر دیکھیں حکیم مہدی نے کہا "دیکھو میں پڑھواتا ہوں انیس کو" رقعے چھپوا کر اُنھوں نے تقسیم بھی کر دیئے کہ فلاں تاریخ مجلس ہے میر صاحب پڑھیں گے میر انیس سے لوگوں نے پوچھا کہ حکیم مہدی کے یہاں آپ پڑھیں گے میر صاحب نے کہا میں تو نہیں پڑھوں گا حکیم مہدی کو یہ خبر پہونچی اُس نے اس برتے پر میر انیس کو پڑھوانے کا دعوےٰ کیا تھا کہ نجف کے ذاکروں میں مبارک محل میر انیس کو بھی وثیقہ مقرر کر گئی تھیں وہ وثیقہ آج تک جاری تھا مگر میر صاحب خود پڑھنے کو نجف کی مجلس میں نہ جاتے تھے۔

میر نفیس مرحوم کو حکم تھا کہ میرے بدلے تم جا کر پڑھ آیا کرو اس وثیقہ کی تولیت حکیم مہدی کو بھی اُس نے نواب غضنفر الدولہ کی وساطت سے میر صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ میری مجلس میں آپ نہ پڑھیں گے تو مبارک محل کے وظیفہ سے ہاتھ دھو رکھیے غضنفر الدولہ بہادر میر صاحب کے اخلاص مند دوستوں میں تھے اُنھوں نے بہت چاہا کہ میر صاحب کو مجلس پڑھنے پر راضی کر لیں جب دیکھا کہ انھیں بھی اس بات میں کد ہے کہ حکیم مہدی کے یہاں ہرگز نہ پڑھیں گے تو کہدیا کہ نجف سے جو وظیفہ آپ کو ملتا ہے وہ ظالم موقوف کر دے گا میر صاحب کے پاؤں میں زردوزی اوگی تھی کہنے لگے میں جانوں گا میری اوگی کے ستارے جھڑ گئے آخر نہ پڑھنا تھا نہ پڑھے وظیفہ کے موقوف ہو جانے کی کچھ پروا نہ کی زوال سلطنت اودھ کا قلق میر صاحب کو برسوں رہا پڑھنا

بلکہ مجلسوں میں جانا تو یک قلم موقوف کر دیا تھا کہتے بھی کم تھے یہ زمانہ مونس کی اصلاح میں بہت صرف ہوتا تھا ایک دفعہ نواب فدا علی خاں کے اصرار پر پڑھنے کا وعدہ کرلیا یہ خبر مشہور ہوگئی لکھنؤ کے چاروں طرف ریل نکل چکی تھی دور دور سے لوگ اشتیاق میں آتے تھے اہل مجلس منتظر تھے کہ انیس آئے سپنیں میں سے میر خورشید علی نفیس اُترے اُنھوں نے منبر پر جاکر پہلے یہ عذر کیا کہ سب حضرات جناب قبلہ وکعبہ کے اشتیاق میں جمع ہوئے ہیں میرے پڑھنے کا کوئی محل نہ تھا لیکن میں معذور ہوں ارشاد ہوا کہ میں اس وقت نہیں جاسکتا تو جاکر پڑھ دے۔ امتثال حکم کرتا ہوں۔ مرثیہ انیس کا بنایا ہوا اور اُن کی نظر میں کھبا ہوا بھی تھا جانتے تھے انیس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ مرثیہ نفیس کی زبان سے بھی بے رنگ دکھائے نہیں رہے گا یہی ہوا ہر شخص مجلس سے یہی کہتا اُٹھا کہ میر خورشید علی کبھی ایسا نہیں پڑھے جیسا آج پڑھے اس کے چند مہینے بعد حیدر خاں کے یہاں میر خورشید علی پڑھنے والے تھے حیدر خاں نے آکر قدموں پر ٹوپی رکھدی اور کہنے لگا آج میری مجلس میں شریک ہوکر مجلس کی رونق اور میری عزت بڑھایئے میر خورشید علی صاحب کو آپ نے کبھی مجلس پڑھتے نہیں سُنا سُنیئے گا تو نہایت خوشی ہوگی۔ میر صاحب حیدر خاں کی مجلس میں چلے آئے دیکھتے کیا ہیں کہ لکھنؤ کے تمام ماہرین فن اور نقادان سخن کا مجمع ہے ان لوگوں میں ناسخ والوں میں سے بڑے خوش فکر مرثیہ گو سید صاحب تعشق بھی موجود تھے ان قدرشناسوں نے کچھ ایسا اصرار اور اشتیاق کا اظہار کیا کہ میر صاحب منبر پر چلے گئے ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں پہلی مرتبہ میر صاحب نے یہی مجلس پڑھی مگر آدھا مرثیہ پڑھا ہوگا کہ نواب فدا علی خاں پر نظر پڑ گئی کہ وہ بھی مجلس میں موجود ہیں آنکھ ملتے ہی میر صاحب پر حجاب طاری ہوا مرثیہ بند کرکے اہل مجلس سے خطاب کیا کہ باقی مرثیہ نواب فدا علی خاں صاحب کی آئندہ مجلس میں پڑھونگا پھر نواب فدا علی خاں کے یہاں بھی پڑھے نواب ابو صاحب کی مجلسیں بھی پڑھے یہ میر صاحب کا آخر عمر کا پڑھنا تھا۔

طبعی خصوصیات | شہسواری۔ سیف زنی۔ پٹا۔ بانک۔ بنوٹ کے فنون سے بخوبی ماہر تھے

ورزش کا شوق آخر وقت تک قایم رہا۔ چند ڈونٹر اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر ہلا لینا کبھی ناغہ نہ ہوا۔ میر صاحب کی طبیعت حسن پرستی سے خالی نہ تھی اور وہ حسن پرستی انسانی خوبصورتی تک محدود نہ تھی بلکہ اُن کی نگاہ تمام موجودات عالم میں سے اپنے دل بہلاؤ کا ذریعہ پیدا کر لیتی تھی خوبصورت اور خوشنما پھولوں کو دیکھ کر اُن کا ذوق وجدانی ترقی کر جاتا تھا جمادات نباتات وحیوانات کے مشاہدہ میں ان کی نظر قدرتی خوبیوں کو پا جاتی تھی۔

حلیہ اور وضع میر صاحب کا قد لانبا تھا سر کے بال باریک اور ملایم۔ چہرہ خوبصورت کتابی رنگ کھلا ہوا گندمی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ مونچھیں بڑی اور افگندہ مو داڑھی صاف۔ گردن صراحی دار سینہ کشادہ۔ چال نہایت مستقلیق۔ اپنی وضع کے نہایت پابند تھے جو وضع اُنھوں نے شروع سے اختیار کی تھی وہی آخر دم تک قایم رہی۔ سر پر بیضاوی پنج گوشہ ٹوپی رکھتے تھے اور اپنے سامنے آئینہ رکھ کر جب تک ٹوپی کو درست نہ کر لیتے اور وہ سر پر موزوں نہ معلوم ہوتی ہرگز چین نہ آتا بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ اس شغل میں صرف ہو جاتا ایک خاص وضع کا گھیردار کرتہ گول پردہ کا انگرکھہ زیب جسم فرماتے تھے۔ ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال ہوتا تھا پاؤں میں لکھنؤ کا زرد مخملی اور اکثر زردوزی جوتہ۔

معاصرین جس زمانہ میں میر انیس لکھنؤ تشریف لے گئے شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سرائی اور میر ضمیر و خلیق کی مرثیہ گوئی کے ڈنکے بج رہے تھے میر خلیق نے اپنے پیارے بیٹے کو بھی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے آداب سکھائے اور خاص خاص مجالس میں ان کو اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ آخر وہ دن آیا کہ شائقین کے اصرار سے میر خلیق نے انیس کو منبر پر بٹھا دیا۔ میر صاحب جب پہلی مرتبہ منبر پر تشریف لے گئے تو اول تو چند لمحہ تک خاموش بیٹھے رہے پھر ایک رباعی پڑھی۔ پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے دلوں پر گہرا اثر ڈالا چاروں طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آپ نے ایک سلام پڑھا جس نے تمام

مجلس کو گرویدہ بنا لیا۔ پھر اس شان سے مرثیہ شروع کیا کہ آپ کی فصاحت اور بلاغت نے محفل کو گرما دیا رزم و بزم کی تصویروں پر ارباب سخن غش ہو گئے اور مرثیہ ختم ہونے کے بعد قدرشناس اپنی جگہ سے اُٹھ کر مصافحہ کرنے لگے اور ہاتھ چومنے لگے۔ خوش نصیب باپ کی زندگی ہی میں آپ کی مرثیہ گوئی کا شہرہ ہو گیا اس وقت جبکہ لکھنؤ میں میر صاحب کے کلام کا چرچا ہو رہا تھا تا سخن گروہ کے بعض شعرا کو ماہرین فن سمجھا جاتا تھا چنانچہ ان لوگوں نے جواب کہنے کی طرف توجہ کی۔ حرملہ کے تیر مارنے کا ذکر میر علی اوسط اشک نے اس طرح نظم کیا ؎

حلقِ اصغر بازوئے سرور دلِ زہرا چھدا　　　رن کہاں جنت کہاں اللہ رے پلہ تیر کا

عشق کہتے ہیں ؎

علم کا جب پھریرا دوش پر عباس کے کھولا　　　پکارے جعفرِ طیار شہپر ایسے ہوتے ہیں

علم کا لچکنا دیکھیے ؎

عالم عجب لچکنے میں ہے آب و تاب کا　　　پنجہ بجھا رہا ہے چراغ آفتاب کا

ان لوگوں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر میر انیس کا جواب نہ ہوا

انیس کی شاعری کا جو خاص میدان تھا اُس کی ہوا بھی کسی کو نہ لگی تھی حرِ شہید کا لشکرِ یزید سے علٰحدہ ہونا ایک تصویر ہے جو انیس نے کھینچ دی ہے ؎

کس لشکرِ بد خو سے بگڑ کر نکل آیا　　　ڈولا کھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا

تنتا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا

پھر حُر کی آمد لشکرِ یزید میں تصویر نہیں کرامات ہے ؎

زورِ بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے　　　دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے

برچھیوں اُڑتا تھا دبنے کے فرزانوں سے　　　آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

پسرانِ زینب کی تصویریں دیکھیے ؎

وہ نیمچے ہلال کے دم خم ہے جن کو فوق　　　جرات کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق

ہنس ہنس کے زخم کھائیں نہ بانوں کو اس کا ذوق — گیسو ہوں منہ پہ کانوں میں بُندے گلوں میں طوق

آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں — نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

دونوں بھائیوں کا ہجوم فوج میں ساتھ چھوٹ جانا اور پھر یکایک مل جانا میر صاحب کی سحر بیانی کا ایک کارنامہ ہی ملاحظہ ہو ؎

وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا — دم بھر میں پیادوں کو یہ پامال کر آیا

جب شیر سا پہونچا وہ اُدھر یہ ادھر آیا — جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

بچ بچ کے نکلتے تھے جو تیغوں کے تلے سے

اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

لشکرِ یزید میں کیسے کیسے سنگدل تھے سب جانتے ہوں گے مگر انیس نے اُن لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیا ؎

کہتا تھا کوئی تیر کو چلّہ میں جوڑ کے — گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے

سوئیں گے جب یہ ماں پہ جھولے کو چھوڑ کے — دونوں کے کڑے اُتاروں گا پہونچے مروڑ کے

شاہزادہ علی اکبر کی امام حسین سے رخصت ؎

تسلیم کرکے بولے علی اکبرِ غیور — لاکھوں برس جہاں میں سلامت رہیں حضور

فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دور — برچھی لگا کے دل پہ خوش آمد یہ کیا ضرور

پھوپھی کو بھتیجے سے شکایت ہے ؎

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی — بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی

بے ان کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی — روئیں بہن پہ ان کو رلاتی نہ تھی کبھی

میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے

جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خرد سال — پر ان کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال

راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال میں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہو میرا لال

وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں روتے تھے

پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

میرانیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر بھی حریف بن کر مرثیہ گوئی کے میدان میں نمودار ہوئے اور دونوں کی شہرت حضرت جان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے گوش گزار ہوئی۔ مفتاح الدولہ کے ذریعہ سے دونوں مرثیہ پڑھنے کے لیئے شاہی امام باڑہ میں بلائے گئے پہلے مرزا دبیر وقت پر پہنچے اور حضور میں باریاب ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے گھڑی گھڑی کی خبریں بھیجنے کا انتظام کر لیا تھا۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ مرزا صاحب پہونچ گئے تو اپنے جانے میں قصداً دیر لگانا شروع کر دی یہاں تک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آگیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے صرف آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ میر صاحب تیار تو تھے ہی پینس سامنے حاضر تھی اس میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ مجلس میں فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب سیدھے منبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدۂ مقررہ کے موافق منبر کے پاس بیٹھ گئے نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو اُن سے کہا آپ حضرت جانعالم سے عرض کر دیں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دُعا عرض کرتا ہے۔ مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر صاحب کو اپنی خودداری کا خیال کہاں تک تھا۔ بادشاہ کی طرف سے پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اُنھوں نے بادشاہ کی تعریف میں ایک رُباعی پڑھی جس پر چاروں طرف سے آفریں کی صدائیں گونج اٹھیں پھر میر صاحب کو پڑھنے کے لیئے ارشاد کیا گیا۔ اُنھوں نے جناب امیر علیہ السلام کی منقبت میں ایک رباعی پڑھی جس کو سُن کر سامعین پر وجد طاری ہو گیا اس کے بعد سلام شروع کیا جس کا مطلع یہ تھا ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر

مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سُلیماں ہو کر

لکھنؤ سے باہر کی مجلسیں

لکھنؤ کے علاوہ میر صاحب کو عظیم آباد الہ آباد و حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا جہاں کہیں بھی آپ نے مرثیہ پڑھا ماہران فن کے دلوں پر اپنی شاعری کا سکّہ بٹھا دیا حیدر آباد میں آج تک یہ روایت مشہور ہے کہ وہاں ایک صاحب نے میر صاحب کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ میر کی شاعری کا پایہ بھی آپ کے سامنے پست نظر آتا ہے فرمایا کہ میر غزل کے اُستاد تھے میں ایک مرثیہ گو مجھے اُن سے کیا نسبت اُنھوں نے کہا جناب عالی میرا قول بے دلیل نہیں مقابلہ کر لیجیے میر کا مطلع ہے ؎

اُس زلف پہ محو ہو گئے ہم　　یعنی سرِ شام سو گئے ہم

اور آپ (میر انیس) فرماتے ہیں ؎

ایک آہ میں سرد ہو گئے ہم　　ٹھنڈی جو ہوا تھی سو گئے ہم

اپنے اور میر تقی کے مطلع کو سُن کر میر صاحب کو جواب دیتے کچھ نہ بن پڑا مسکرانے لگے۔

میر صاحب کی مرثیہ گوئی کا طرۂ امتیاز اور اس کی مثالیں

میر صاحب کی شاعری پر تنقید کرنا صرف اس شخص کا کام ہے جو خود بھی اس فن کے نکات سے آگاہ ہو لیکن ہر شخص جو ذوق سلیم رکھتا ہے کہہ سکتا ہے کہ اُردو زبان میں اُنھوں نے اس فن کو ایسی ترقی دی کہ ان کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔

مرثیہ گوئی کا فن نیا فن نہیں ہے انسانی نسل کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کا بھی وجود پایا جاتا ہے۔ عربی تاریخوں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا تو حضرت آدم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اس وقت جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے اپنی موزونیت کے اعتبار سے وہ شعر کا درجہ رکھتے تھے۔ ایام جہالت کے اکثر مرثیے عربی کی ادبی کتابوں میں موجود ہیں فارسی میں بھی مرثیہ گوئی کا رواج قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے۔ مقبل مخلص محتشم وغیرہ شعرا نے فارسی زبان میں حسرت و یاس کے دردناک مناظر پیش کرنے میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی ہے اُردو شاعری میں بھی میر انیس کے زمانہ سے قبل مرثیہ گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت میر تقی

میر نے اپنے مشہور تذکرہ نکات الشعرا میں یک رنگ معاصر میاں آبرو کی تصنیف سے یہ اشعار درج کیے ہیں جو بطور مرثیہ کے لکھے گئے تھے:۔

زخمی برنگ گل ہیں شہیدانِ کربلا گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا

کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ دھو ہاتھ زندگی ستی میدانِ کربلا

اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا

اشعار مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اُردو میں جو مرثیے لکھے جاتے تھے بیس تیس بیت سے زیادہ نہ ہوتے تھے پھر ایک ایسا دَور شروع ہوا جس میں مراثی مسدس کے طرز پر لکھے جانے لگے اور میر ضمیر و میر خلیق کے زمانہ میں یہ ایک مستقل فن ہو گیا اور آخر میں میر انیس کی طبع رسا نے ترقی دے کر اس کو معراجِ کمال پر پہونچا دیا۔ اور مرثیہ گوئی کے میدان کو وسیع کر دیا۔ میر صاحب نے مناظر فطرت کے جس حصّے پر توجہ کی کمال کر دکھایا مثلاً صبح کا سین اُنھوں نے اس خوبی سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے صحیفۂ فطرت کو کس قدر گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کہتے ہیں ؎

وہ صبح اور وہ چھاؤں تاروں کی اور وہ نور دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور

پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

اسی مرثیہ کی بیت ہے ؎

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اس ٹیپ میں میر صاحب نے صبح کی جس کیفیت کو پیش کیا ہے اس کا پورا لطف وہی شخص کو آسکتا ہے جس کو علم الحیوانات تک دسترس حاصل ہے۔ آفتاب کی تمازت کا جو قدرتی اثر انسان حیوان

اور جمادات پر ہوتا ہے اس کا بیان جن الفاظ میں فرمایا ہے اس سے بہتر نقشہ کسی دوسرے شاعر کے قلم سے کھینچنا ناممکن ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہ دھوپ کی تیزی غضب اللہ لوؤں کا وہ چلنا　　　وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا　　　اور تن پہ حرارت سے وہ ہتھیاروں کا جلنا
جنگل کے پرندے بھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہِ مظلوم کھڑے ہیں

وہ دھوپ ہے جس میں کہ ہرن ہوتے ہیں کالے　　　اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے
گرمی سے دو دو دم میں منہ آب میں ڈالے　　　رہتے ہیں جو دھریں پاؤں تو پڑ جاتے ہیں چھالے
آہن کی سی شے موم صفت نرم ہوئی ہے
پتھر ہیں چٹختے یہ زمیں گرم ہوئی ہے

ایک موقع پر خوفناک جنگل کا سماں اس طرح بیان کیا ہے ؎

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں　　　تھرّائی تھیں بچّوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں　　　روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچّے

جس گھر میں اہل بیت اطہار کو یزید نے قید کیا تھا اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

شکلِ دلِ یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ　　　تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دودِ آہ　　　حجرے سے چشمِ تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشمِ غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر　　　ظاہر تھے جا بجا حشراتِ زمیں کے گھر

تھے وقفِ آشیانِ ابابیل سقف و در　　نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

سید الشہدا کی سیف زنی کی تعریف میں لکھا ہے ؎

سر گرنے لگے جسم سے چلنے لگی تلوار　　چار آئینے میں جا کے نکلنے لگی تلوار
افعی کی طرح زہر اگلنے لگی تلوار　　پی پی کے لہو رنگ بدلنے لگی تلوار
پانی نے اثر زہر ہلاہل کا دکھایا
ہر ضرب میں جلوہ حق و باطل کا دکھایا

حضور کا سراپاے مبارک لکھتے ہوئے کس قدر نفیس استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے فرماتے ہیں ؎

وہ ریش پاک اور وہ چہرے کی آب و تاب　　نکلا ہو چیر کر شب یلدا کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہو ریش کا خضاب　　رخصت ہو مل رہے ہیں گلے پیری و شباب
تا وقت عصر اور زمانِ حیات ہے
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے اور یزیدی فوج کے لوگوں کی کیفیت لکھتے ہیں جو کمال ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اس بند سے ہو سکتا ہے ؎

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل　　خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار واہلِ نار و دغا باز و پُر دغل　　شکلیں مہیب تیوری سے قد ابروؤں پہ بل
بدخواہ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

علی اکبر کو رن کی اجازت دینے کے موقع پر بی بی زینب کی زبان سے ماں کی فطرتی محبت کا موازنہ

پھوپی کی محبت سے کیا ہو وہ قابل ہزار ستایش ہی کہتے ہیں ؎

سچ ہو کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں　　ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی وہ پھر ہو ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں　　آنچ آنہا کی ہو وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خبر ہو
ماں ہو تو ماں ہو خلق میں پھر غیر غیر ہو

گھوڑے کی تعریف میر صاحب نے اکثر موقعوں پر لکھی ہو لیکن جس طرح ایشیائی شاعر قصیدوں میں اپنے ممدوح کے گھوڑے کی تعریف میں انتہائے مبالغہ سے کام لیکر اپنے کلام کو مبتذل بنا دیتے ہیں اس سے میر صاحب کا کلام مبرّا ہو اور ان کے یہاں بھی مبالغہ ہو لیکن لطف سے خالی نہیں اور اس کی صرف یہ وجہ ہو کہ اس میں بھی اکثر فطرتی مضامین میر صاحب کے قلم سے نکل گئے ہیں مثلاً کہتے ہیں :-

لکھتا ہو اد ہم قلم اب سرعتِ عقاب　　نعل اس کے ماہِ نو ہیں تو سم رشکِ آفتاب
پستی میں سیل ہو تو بلندی میں ہو سحاب　　سرعت میں برق گرم روانی میں عجزِ آب

اُڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ اوج ہو
ایک شور تھا قدم نہیں دریا کی موج ہو

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ ادھر آیا ادھر گیا　　چمکا بڑھا جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑ کے برچھیوں سے بے خطر گیا　　برہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سر وہی کا وار تھا

فطری مضامین میں اضطراب استقلال۔ فراق و وصال وفاداری بے ثباتیِ دنیا۔ انقلابِ عالم غرض کوئی مضمون ایسا نہیں ہو جس میں میر صاحب کے قلم نے شیکسپیر اور کالیداس سے زیادہ ڈرامانگاری کی قوت نہ دکھائی ہو اگر یہ قوت میر صاحب کے قلم میں نہ ہوتی تو میر صاحب کو اعلے درجہ کے رزمی شاعر (ایپک پوئٹ) کا مرتبہ حاصل نہ ہوتا میں اگر اس مختصر دیباچہ میں ہر مضمون کے

بندوں کو مثال میں پیش کروں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ اس لیئے میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ ناظرین جس وقت ان مراثی کو جو اس جلد اوّل کے ذریعہ سے ان کے سامنے پیش کیئے جاتے ہیں مطالعہ فرمائیں گے تو وہ خود انصاف سے کہدیں گے کہ میر صاحب بلاشبہ فطری شاعر تھے اور ان کی فطرت نگاری دلوں پر ایک خاص اثر ڈالتی ہے اور وہ شعر میں مناظر فطرت کی طرف ان کا میلان طبعی تھا۔ اور فطرت پسند اور فطرت شناس طبیعت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے جس چیز کی تصویر کھینچی ہے لاجواب ہے ان کا انداز بیان دلکش ہے جس واقعہ کو نظم کیا ہے اس کو ترتیب کے سلسلہ میں ایسا منسلک کیا ہے کہ سبحان اللہ ؎

نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں نہیں　　جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

ایک نئی طرز کی ایجاد سے اُردو شاعری کو فی الواقع آپنے چار چاند لگا دیئے جیسا خود فرما گئے ہیں ؎

سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر　　مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
میری قدر کر اے زمینِ سخن　　تجھے بات میں آسماں کر دیا

میر صاحب کے ان اشعار کو شاعرانہ تعلّی نہ سمجھنا چاہیئے اس میں بہت کچھ واقعیت موجود ہے اُن کے مراثی پر گہری نظر ڈالنے سے ان کے اس بیان کی کہ ؎

بزم کا رنگ جُدا رزم کا میداں ہے جُدا　　یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جُدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جُدا　　مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جُدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

پورے طور پر تصدیق ہوتی ہے اور بڑے سے بڑے نکتہ چیں کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان کے کلام میں جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔ اور ڈراما نگاری کے اعلےٰ اصول کی پابندی کے ساتھ اُنھوں نے اُردو زبان کو ایک خاص قسم کی جلا دینے میں کامیابی حاصل کی ہے دیگر شعرا کی نسبت اُنھوں نے اپنے کلام میں اُردو کے سب سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیئے ہیں

اور اگر اسی ایک بات کو معیارِ کمال قرار دیا جائے تو بھی بقول مولانا حالی میر انیس کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ مرزا دبیر جن کا ذکر اس مقدمہ میں ایک موقع پر آچکا ہے میر صاحب کے ہمعصر بلکہ مدمقابل مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں اور آج بھی ایک گروہ مرزا صاحب کے کلام کو میر صاحب کے کلام پر ترجیح دینے والا ملک میں موجود ہے۔ مولانا شبلی نے اس مضمون پر ایک مستقل کتاب موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر اُردو لٹریچر میں ایک مفید اضافہ کیا ہے۔ اس کے بعد دوسری کتاب المیزان لکھی گئی جس میں **موازنۂ انیس و دبیر** کے مصنف کی بعض رایوں پر جو اس نے میر صاحب کے کلام کے متعلق دی ہیں نکتہ چینی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد نے تذکرۂ آب حیات میں مرثیہ گوئی کے ان دونوں پہلوانوں کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے:۔

"میر انیس صفائی کلام لطف زبان۔ چاشنی محاورہ۔ خوبیِ بندش حسن اسلوب مناسبت مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے مگر مرزا دبیر بھی شوکت الفاظ مضامین کی آمد اس میں جا بجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنائے، دلگداز انداز کے جو مرثیے کی اصلی غرض ہے بادشاہ تھے۔"

لیکن ان سب رایوں کے دیکھنے کے بعد بھی ایک غیر جانبدار شخص جو نہ **انیسیوں** میں ہے نہ **دبیریوں** میں وہ صرف اُردو ادب کی گزشتہ موجودہ اور آئندہ حالت پر نگاہ رکھ کر مولانا حالی کی اس رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہے

"میر انیس اُردو شعرا میں سب سے زیادہ برتر تھے۔"

انتقال دنیائے مرثیہ گوئی کا یہ آفتاب عالم تاب ۷۱ سال درخشاں رہ کر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق دسمبر ۱۸۷۴ء بروز جمعہ اور بقول صاحب "یادگار انیس" ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ روز دوشنبہ تقریباً ۷۲ سال کی عمر میں غروب ہو گیا۔ قبر اپنے مملوکہ باغ واقع سبزمنڈی لکھنؤ میں موجود ہے مگر اچھی حالت میں نہیں ہے ۱۹۳۳ء میں مقبرہ تعمیر ہونے کی تحریک کی گئی تھی۔ کاش یہ تحریک جلد سے جلد عملی صورت اختیار کرے اور ثبوت قدرشناسی کی یادگار ثابت ہو۔

خاکسار **نظامی** بدایونی ۲۳ مئی ۱۹۳۱ء
نظر ثانی، اپریل ۱۹۳۵ء

دشتِ وغا میں نورِ خدا کا ظہور ہے — ذرّوں میں روشنیِ تجلّیِ طور ہے
اک آفتابِ رُخ کی ضیا دور دور ہے — کوسوں زمیں عکس سے دریائے نور ہے
اللہ رے حسن طبقۂ عنبر سرشت کا — میدانِ کربلا ہے نمونہ بہشت کا

حیراں زمیں کے نور سے ہے چرخِ لاجورد — مانندِ کہربا ہے رُخِ آفتاب زرد
ہے رو کشِ فضائے ارم وادیِ نبرد — اُٹھتا ہے خاک سے تتقِ نور جائے گرد
حیرت سے حاملانِ فلک اُن کو تکتے ہیں — ذرّے نہیں زمیں پہ ستارے چمکتے ہیں

ہے آبِ نہر صورتِ آئینہ جلوہ گر — تاباں ہے مثلِ چشمۂ خورشید ہر بھنور
لہریں بسانِ برق چمکتی ہیں سر بسر — پانی پہ مچھلیوں کی ٹھہرتی نہیں نظر
یہ آب و تاب ہے کہ گہر آب آب ہیں — دریا تو آسمان ہے ستارے حباب ہیں

پرتو فگن ہوا جو رُخِ قبلۂ انام — مشہور ہو گئی وہ زمیں عرش احتشام
اور سنگریزے دُرِّ نجف بن گئے تمام — صحرا کو مل گیا شرفِ وادی السلام
کعبہ سے اور نجف سے بھی عزّت سوا ہوئی — خاک اُس زمینِ پاک کی خاکِ شفا ہوئی

پھیلا جو نورِ مہرِ امامت دمِ زوال — ذرّوں سے واں کے آنکھ ملانا ہوا محال
سارے نہال فیضِ قدم سے ہوئے نہال — اختر بنے جو پھول تو شاخیں بنیں ہلال
پتّے تمام آئینۂ نور ہو گئے — صحرا کے نخل سب شجرِ طور ہو گئے

غل تھا زہے حسین کی شوکت نسب و وقار — گویا کھڑے ہیں جنگ کو محبوبِ کردگار
رُخ سے عیاں ہے دبدبۂ شاہِ ذوالفقار — ہے نورِ حق جبینِ منور سے آشکار
کیونکر چھپے نہ ماہِ دوہفتہ حجاب سے — چودہ طبق میں نور ہے اس آفتاب سے

یہ روئے روشن اور یہ گیسوئے مشک فام — یاں شام میں تو صبح ہے اور صبح میں ہے شام
ہالے میں یوں نظر نہیں آتا مہِ تمام — قدرت خدا کی نور کا ظلمت میں ہے مقام
زلفوں میں جلوہ گر نہیں چہرہ جناب کا — ہے نصف شب میں آج ظہور آفتاب کا

قرباں کمانِ ابروئے مولا پہ جان و دل — گر ماہِ نو کہیں تو ہے تشبیہ مبتذل
چشمِ غزالِ دشتِ ختن چشم سے خجل — دیکھا جسے کرم سے خطائیں ہوئیں بحل
پتلی بسانِ قبلہ نما بے قرار ہے — گریاں ہیں وہ یہ گردشِ لیل و نہار ہے

رخسار ہیں ضیا میں قمر سے زیادہ تر — جن پر ٹھہر سکی نہ کبھی شمس کی نظر
ریشِ مخضب اور یہ رُخِ شاہِ بحر و بر — پیدا ہیں صاف معنیِ واللیل والقمر
قرآں سے عیاں ہے بزرگی امام کی — کھائی قسم خدا نے اسی صبح و شام کی

کس منہ سے کیجیے لبِ جاں بخش کا بیاں — چوسی جنھوں نے احمدِ مختار کی زباں
کیا دُرِّ آبدار ہیں اس درج میں نہاں — گویا کہ موتیوں کا خزانہ ہے یہ دہاں
ذرے زمیں پہ عکس سے سارے چمک گئے — جس وقت یہ کھلے تو ستارے چمک گئے

شمعِ حریمِ لم یزلی تھا گلوئے شاہ — تاریک شب میں جیسے ہویدا ہو نورِ ماہ
اے چرخِ بے مدار یہ کیسا ستم ہے آہ — شمشیرِ شمر اور محمدؐ کی بوسہ گاہ
جس پر رسول ہونٹوں کو ملتے ہوں پیار سے — کٹ جائے کربلا میں وہ خنجر کی دھار سے

منظور یاں بھی مدح گلوئے شہِ امم — یاد آگئی مگر یہ حدیثِ غم و الم
مسجد میں جادہ گر تھے رسولِ فلک حشم — ملتے تھے ذکرِ حق میں لبِ پاک دم بدم
روشن تھے بام و در رُخِ روشن کے نور سے — آئینہ بن گئی تھی زمیں تن کے نور سے

تھا جو ستوں کہ رُکنِ رسالت کا تکیہ گاہ
کرسی بھی اُس کی پشت کی تھی ڈھونڈھتی پناہ
تھا جس حصیر پر وہ دو عالم کا بادشاہ
حسرت سے عرش کرتا تھا اُس فرش پر نگاہ
اوجِ زمین ہشت بریں سے دو چند تھا
منبر کا نُہ فلک سے بھی پایا بلند تھا

اصحابِ خاص گرد تھے انجم کی طرح سب
تاباں تھا بیچ میں وہ مہِ ہاشمی لقب
سر پر ملک صفات مگس راں تھے دو عرب
جبریلؑ تہہ کئے ہوئے تھے زانوے ادب
خادم بلال و قنبرِ گردوں اساس تھا
نعلین اُس کے پاس عصا اُس کے پاس تھا

گیسو تھے وہ مفسّرِ "واللیل اذا سجا"
رُخ سے عیاں تھے معنیِ والشمس و الضحیٰ
وہ ریشِ پاک اور رُخِ سردارِ انبیا
گویا دھرا تھا رحل پہ قرآں کھُلا ہوا
اوڑھے سیہ عبا جو وہ عالم پناہ تھا
کعبہ کا صاف حاجیوں کو اشتباہ تھا

پہلو میں بادشاہ کے تھا جلوہ گر وزیر
سردارِ دیں علیؑ ولیِ خلق کا امیر
دونوں جہاں میں کوئی نہ دونوں کا تھا نظیر
احمد تھے آفتاب تو حیدر مہِ منیر
ظاہر میں ایک نور کا دو جا ظہور تھا
گر غور کیجیے تو وہی ایک نور تھا

مصروفِ وعظ و پند تھے سلطانِ مشرقین
جو گھر سے نکلے کھیلتے زہرا کے نورِ عین
نانا بغیر دونوں نواسوں کو تھا نہ چین
بڑھ جاتے تھے حسنؑ کبھی آگے کبھی حسینؑ
کہتے تھے دیکھیں کون قدم جلد اُٹھاتا ہے
نانا کے پاس پہلے بھلا کون جاتا ہے

وہ گورے گورے چہروں پہ زلفیں اِدھر اُدھر
کُرتے گلوں میں نیمہ بدن جن سے جلوہ گر
اختر سے وہ چمکتے ہوئے کان کے گہر
رشکِ ہلال طوق گلے غیرتِ قمر
ہیکل پہ نقش نام خدائے جلیل کے
تعویذ گردنوں میں پرِ جبرئیلؑ کے

مسجد میں آئے ہنستے ہوئے جب وہ گلبدن
خوشبو سے صحنِ مسجدِ جامع بنا چمن
تسلیم کو حسینؑ سے پہلے جھکے حسنؑ
خوش ہو کے مسکرانے لگے سرورِ زمن
بڑھ بڑھ کے خم سلام کو چھوٹے بڑے ہوئے
بیٹھے رہے رسولؑ ملک اُٹھ کھڑے ہوئے

بیٹوں کو تھا علی کا اشارہ کہ بیٹھ جاؤ
پھیلا کے ہاتھ بولے محمدؐ کہ آؤ آؤ
بھائی حسن جو آپ کی گودی میں آئیں گے
بولے حسن کہ واہ ہمیں اور کریں نہ پیار
بولے بچشمِ نم یہ حسینِ فلک وقار
سب سے سوا جو ہیں سو ہمیں اُن کے پیارے ہیں
بھائی سے تب کہا یہ حسن نے بالتفات
نانا ہمارے کیا نہیں سلطانِ کائنات
غصہ نہ اتنا چاہیئے خوش خو کے واسطے
یہ سُن کے منہ علی کا لگے دیکھنے رسولؐ
میں چاہتا ہوں ایک کی خاطر نہ ہو ملول
ہووے نہ رنج میرے کسی نورِ عین کو
شبّر سے پھر اشارہ کیا ہو کے بے قرار
پھر بولے دیکھ کر سوئے شبیرؑ نامدار
چھاتی سے ہم لگائیں گے جان اپنی جان کر
دوڑے یہ بات سُن کے برابر وہ خوش سیر
لپٹے حسینؑ ہنس کے اُدھر اور حسنؑ ادھر
نانا کے ساتھ پیار میں دونوں کا ساتھ تھا
پھر پھر کے دیکھتے تھے شہنشاہِ مشرقین
بیٹھے جو زانوؤں پہ وہ زہرا کے نورِ عین
جھک جھک کے منہ رسولِ زمن چومنے لگے

لازم نہیں کہ وعظ میں نانا کو تم ستاؤ
شبیر نے کہا ہمیں پہلے گلے لگاؤ
ہم تم سے نانا جان ابھی روٹھ جائیں گے
اقرار کر چکے ہیں شہنشاہِ نامدار
دیکھیں تو کون ہوتا ہے کاندھے پہ اب سوار
آگے نہ بڑھیئے آپ کہ نانا ہمارے ہیں
بے وجہ ہم سے روٹھے ہو تم اے نکو صفات
ہوتی ہے ناگوار تمھیں تو ذرا سی بات
مچلے تھے یونہی بچۂ آہو کے واسطے
ہنس کر کہا یہ دونوں ہیں میرے چمن کے پھول
روئیں گے یہ تو گھر سے نکل آئیں گی بتولؑ
تم لو حسنؑ کو گود میں میں لوں حسینؑ کو
غصہ نہ کھاؤ پہلے تمھیں کو کریں گے پیار
آ اے حسینؑ آ تری باتوں کے میں نثار
دیکھیں تو پہلے کون لپٹتا ہے آن کر
پاس آئے آفتابِ رسالت کے دو قمر
تھے پاؤں زانوؤں پہ تو بالائے دوش سر
گردن میں ایک اُن کا اور اک ان کا ہاتھ تھا
گہ جانبِ حسنؑ تو کبھی جانبِ حسینؑ
تھا اُن کو لطفِ قلب تو راحت جگر کو چین
اِن کا گلا تو اُن کا دہن چومنے لگے

شبیرؑ چاہتے تھے کہ چومیں مرے بھی لب
نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب
بھائی کو دیکھ کر جو حسنؑ مسکراتے تھے
اُٹھے حسینؑ زانوے احمدؐ سے خشمگیں

رُخ پر پسینہ جسم میں رعشہ جبیں پہ چیں
گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے
بیت الشرف میں آئے جو شبیرؑ نامدار
دوڑیں یہ کہہ کے فاطمہ زہرا جگرفگار
تجھ کو رُلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا

میرا کلیجہ پھٹتا ہے اے دل رُبا نہ رو
سر میں نہ درد ہو کہیں اے مہ لقا نہ رو
میری طرف تو دیکھو کہ بیتاب ہوتی ہوں
تو منہ تو کھول اے مرے شبیرؑ خوش خصال
گُل گُل کے پشتِ دست سے آنکھیں کرو نہ لال
گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو

تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں
اُن سے نہ بولیو وہ تمھیں لاکھ گر منائیں
واری اگر حسنؑ نے رولایا بُرا کیا
بولے حسینؑ ہم تو ہیں اس بات پر خفا
تم اماں جان منہ کو تو سونگھو مرے ذرا
بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں

پر کچھ گلے کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب
جھک جھک کے چومتے تھے گلا سیدِ عرب
غیرت سے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے
غصّہ سے رنگ زرد اور آنکھوں پہ آستیں
پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

کرتے کو منہ پہ رکھ کے لگے رونے زار زار
ہے ہے حسینؑ کیا ہوا تو کیوں ہے اشکبار
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا
زہرا ہزار جان سے تجھ پر فدا نہ رو
بس بس نہ رو حسینؑ برائے خدا نہ رو
چادر سے منہ کو ڈھانپ کے لو میں بھی روتی ہوں

تر ہو گئے ہیں آنسوؤں سے گورے گورے گال
سلجھاؤں آؤ اُلجھے ہوئے گیسوؤں کے بال
سمجھی میں کچھ حسنؑ سے خفا ہو کے آئے ہو
گزری ہیں کھیل میں مرے بچّے کو کیوں رُلائیں
لو آؤ جانے دو تمھیں چھاتی سے ہم لگائیں
پوچھوں گی کیا نہیں مرے پیارے نے کیا کیا

نانا نے چومے بھائی کے ہونٹھ اور مرا گلا
کچھ بوسے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا
اب ہم نہ جائیں گے ہمیں نانا رُلاتے ہیں

منہ رکھ کے منہ پہ بولی یہ زہرا جگر فگار
چوما اگر گلا تو خفا ہو نہ میں نثار
یہ مشک میں مہک نہ گلِ یاسمن میں ہے

کہنے لگے حسینؑ یہ ماں سے بچشمِ نم
یہ کیا انھیں پہ لطف و عنایت ہے دم بدم
رو رو کے جان آج ہم اپنی گنوائیں گے

یہ بات سن کے ہو گیا زہرا کا رنگ فق
صدقے گئی کرو نہ کلیجے کو میرے شق
میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے

یہ کہہ کے اوڑھ لی سرِ پُر نور پر ردا
در تک گئی جو گھر سے وہ دلبندِ مصطفیٰ
پیشِ نبیؐ حسینؑ کو گودی میں لائی ہیں

اللہ ری آمدِ زہرا کا بند و بست
احمد کے گرد و پیش سے اٹھے خدا پرست
آئیں تو شاد شاد رسولِ زمن ہوے

تعظیمِ فاطمہؑ کو اٹھے سیدالبشر
خم تھے حسینؑ دوش پہ ماں کے جھکائے سر
ماں کہتی تھی نہ رو مگر چپ نہ ہوتے تھے

گھبرا کے پوچھنے لگے محبوبِ ذوالجلال
بولیں بتول آج قلق ہے مجھے کمال
آتے ہیں ہنستے روتے ہوئے گھر میں جاتے ہیں

بوے گلاب آتی ہے اے میرے گلعذار
تم کو زباں چوساتے تھے محبوبِ کردگار
خوشبو اسی دہن کی تمھارے دہن میں ہے

کیا جانو تم حسن سے ہمیں چاہتے ہیں کم
معلوم ہو گیا انھیں پیارے نہیں ہیں ہم
پانی نہ اب پئیں گے نہ کھانے کو کھائیں گے

بولی پسر سے رو کے وہ بنتِ رسولِ حق
ہے ہے یہ کیا کہا مجھے ہوتا ہے اب قلق
کاہے کو ماں جئے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

موزے پہن کے گود میں شبیر کو لیا
فضہ نے بڑھ کے بوذر و سلماں کو دی صدا
ہٹ جاؤ سب کہ فاطمہؓ مسجد میں آتی ہیں

ساتوں فلک تھے اوجِ شرافت سے جس کے پست
انساں تو کیا ملک کو نہ تھی قدرتِ نشست
گھر میں خدا کے ایک جگہ پنجتن ہوے

دیکھا کہ چشمِ فاطمہؑ ہے آنسوؤں سے تر
تھا اک ہلال مہر کے پہلو میں جلوہ گر
آنکھیں تھیں بند ہچکیاں لے لے کے روتے تھے

روتا ہے کیوں حسینؑ یہ کیا ہے تمھارا حال
رویا ہے یہ حسینؑ کہ آنکھیں ہیں دونوں لال
شفقت بھی آپ ہی کی ہے تم آپ ہی رلاتے ہیں

ہاتوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہِ بحر و بر
شفقت کی اس کے حال پہ ہر دم رہے نظر
رونے سے اس کے ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر
مجھ فاقہ کش غریب کا پیارا ہے یہ پسر
حیدر سے پوچھیے مری عسرت کے حال کو
کس کس دکھوں سے پالا ہے اس نونہال کو

اشک اس کے جتنے ٹپکے ہیں یا شاہِ نیک خو
اتنا ہی گھٹ گیا ہے مرے جسم کا لہو
روئے ہیں پھوٹ پھوٹ کے پیمبر رو برو
تر ہو گیا ہے آنسوؤں سے چاند سا گلو
دیکھا نہ تھا یہ میں نے جو حال اس کا آج ہے
حضرت تو جانتے ہیں کہ نازک مزاج ہے

شفقت سے آج آپ نے چومے حسنؑ کے لب
بوسہ لیا نہ ان کے لبوں کا یہ کیا سبب
رتبے میں دونوں ایک ہیں یا سرورِ عرب
میں سچ کہوں یہ سن کے مجھے بھی ہوا عجب
اس کو جو ہو خوشی تو دل اس کا بھی شاد ہو
چھوٹے سے چاہیے کہ محبت زیادہ ہو

آپ ان کے ناز اٹھاتے ہیں یا شاہِ بحر و بر
پھر کس سے روٹھیں آپ سے روٹھیں نہ یہ اگر
اکثر انھیں چڑھایا ہے حضرت نے دوش پر
گیسو دیے ہیں ننھے سے ہاتھوں میں بیشتر
روٹھے تھے یہ تو قدموں پہ سر دھر دیے ہیں
منہ کے نہ چومنے کا گلا کرنے آئے ہیں

یہ کہہ کے پھر حسینؑ سے بولیں بچشم تر
لو جا کے اب نبی کے قدم پر جھکا دو سر
آئے حسینؑ ہاتھ جو ننھے سے جوڑ کر
بے اختیار رونے لگے سید البشر
رہ رہ کے دیکھتے تھے علیؑ و بتولؑ کو
نزدیک تھا قلق سے غش آئے رسول کو

تھی آنسوؤں سے ریشِ مبارک تمام نم
فرطِ بکا سے خاک پہ جھکتے تھے دم بدم
گاہے ستوں سے لگ کے ہوئے راست گاہ خم
ہر لحظہ اضطراب زیادہ تھا صبر کم
ہو سکتا تھا نہ ضبط شہِ مشرقین سے
روتے تھے بار بار لپٹ کر حسینؑ سے

شبیر رو کے کہتے تھے نانا نہ روئیے
روئیں گے اب نہ ہم شہِ والا نہ روئیے
ہلنے لگے گا عرشِ معلّیٰ نہ روئیے
پھٹتا ہے اب ہمارا کلیجا نہ روئیے
سو بار دن میں ہم تو منہ اشکوں سے دھوتے ہیں
حضرت ہمارے رونے پہ کاہے کو روتے ہیں

گھبرا گئے علیؑ ولی شاہِ بحر و بر
کی عرض فاطمہؑ نے جھکا کے قدم پہ سر
بیٹی نثار ہو گئی یا سیدالبشر
کیا وجہ ہے جو آپ ہیں اس طرح نوحہ گر
جلدی بتائیے کہ مجھے تاب اب نہیں
رونا خدا کے دوست کا یہ بے سبب نہیں

حضرت کو علمِ غیب ہے یا شاہِ انس و جاں
آئندہ و گزشتہ کا سب حال ہے عیاں
کیا آئی آج وحیِ خداوندِ دو جہاں
ہونا ہے جو حسینؑ پہ مجھ سے کرو بیاں
فاقوں میں کانپتی ہوں مصیبت جہان کی
کیوں بابا جان خیر تو ہے اس کی جان کی

بولے جگر کو تھام کے محبوبِ ذوالجلال
تجھ سے سنا نہ جائے گا اے فاطمہؑ یہ حال
کس منہ سے میں کہوں کہ قلق ہے مجھے کمال
زہراؑ شہید ہوویں گے تیرے یہ دونوں لال
ماتم کی یہ خبر ابھی جبریلؑ لائے تھے
سارے ملک حسینؑ کے پرسے کو آئے تھے

الماس پی کے ہوئے گا بے جاں ترا حسنؑ
یہ وجہ ہے کہ چومتا ہوں اس کا میں دہن
بھر جائے گا کلیجے کے ٹکڑوں سے سب لگن
ہو گا زمردی ترے اس لال کا بدن
سوئے بہشت جب وہ جہاں سے سدھاریں گے
بدکیش تیر اس کے جنازے پہ ماریں گے

زہرا مجھے کلام کی طاقت نہیں ہے اب
حلقِ حسینؑ چومنے کا کیا کہوں سبب
اک بن میں تین روز رہیں گے یہ تشنہ لب
کٹ جائے گا گلا یہ خنجر سے ہے غضب
نیزے پہ سر چڑھے گا ترے نورِ عین کا
گھوڑوں سے روند ڈالیں گے لاشہ حسینؑ کا

روئے خبر یہ کہہ کے جو محبوبِ ذوالمنن
گھبرا کے منہ حسینؑ کا تکنے لگے حسنؑ
زہراؑ پکاری ہائے لٹے گا مرا چمن
میں مر گئی دہائی ہے یا سرورِ زمن
کیسی آگ ہے کہ مری کوکھ جل گئی
ہے ہے چھری کلیجے پہ زہراؑ کے چل گئی

فریاد یا نبیِ شہِ ابرار الغیاث
اے مرسلانِ حق کے مددگار الغیاث
اے بے کسوں کے وارث و سردار الغیاث
اے جزو و کل کے مالک و مختار الغیاث
قدرت ہے سب طرح کی شہِ مشرقین کو
حضرت سے لو لگی اپنے حسنؑ اور حسینؑ کو

کس جرم پر یہ لال مرے قتل ہوں گے آہ
رو کر کہا رسولِ خدا نے کہ بے گناہ

کی عرض فاطمہ نے کہ اے عرش بارگاہ
بچوں کو میرے کیا نہ ملے گی کہیں پناہ

تلواریں کھینچ کھینچ کے ظالم جو آئیں گے
حضرت نہ کیا نواسوں کو اپنے بچائیں گے

آساں ہے کیا جو قتل کریں گے ستم شعار
کیا شیرِ حق کمر سے نہ کھینچیں گے ذوالفقار

اعدا پہ کیا چلے گا نہ دستِ خدا کا وار
بالوں کو کیا نہ کھولے گی زہرا جگر فگار

ٹکڑے جگر جو ہوئے گا مجھ دل دو نیم کا
ہلا یا نہ کیا ہلاؤں گی عرشِ عظیم کا

زہرا سے رو کے کہنے لگے شاہِ نیک خو
بیٹی مجھے ستائیں گے تربت میں کینہ جو

اُس وقت قتل ہوئیں گے یہ دونوں ماہ رو
دنیا میں جب نہ ہوگا علیؑ اور نہ میں نہ تو

لاشے پہ مجتبےٰ کے تو شبیرؑ روئے گا
شبیرؑ جب مرے گا تو کوئی نہ روئے گا

چلائی سر پٹک کے یہ زہرا کہ ہے ستم
بیٹے کا کون تن سے جو نکلے گا اُس کا دم

ماتم کی صف بچھائے گا کون اے شہِ امم
پُرسے کو کون آئے گا اُس کے بچشمِ نم

ہم میں سے ایسے وقت جو کوئی نہ ہوئے گا
ہے ہے مرے حسینؑ کو پھر کون روئے گا

بچے کی میرے تعزیہ داری کرے گا کون
منہ ڈھانپ ڈھانپ کے یہ وزاری کرے گا کون

دریائے اشک چشم سے جاری کرے گا کون
امداد بعدِ مرگ ہماری کرے گا کون

ہوگا کہاں نبیؐ کے نواسے کا فاتحہ
شربت پہ کون دیوے گا پیاسے کا فاتحہ

بولے نبی کہ آپ کو زہرا نہ کر ملال
فرما چکا ہے مجھ سے یہ وعدہ خدائے پاک

پیدا کریں گے قوم اک ایسی بروئے خاک
جو رات دن رہیں گے اسی غم میں دردناک

بزمِ عزا میں آئیں گے وہ دور دور سے
تن خاک سے بنائیں گے دل اُن کے نور سے

ہوگی انھیں سے مجلسِ ماتم کی زیب و زین
دیں گے انھیں وہ لب کہ رہے جس پہ وا حسینؑ

آنکھیں وہ دیں گے رونے کو سمجھیں جو فرضِ عین
ہاتھ ایسے غیرِ سینہ زنی ہو جنھیں نہ چین

سامان تعزیت کے کبھی کم نہ ہوئیں گے
وہ حشر تک حسینؑ کے ماتم میں روئیں گے

ہوگا عیاں فلک پہ محرم کا جب ہلال
کھولیں گی بی بیاں بھی سب اپنے سر کے بال
رختِ سیاہ پہنیں گے بر میں خوش خصال
ہر گھر میں ہوگا شور کہ ہے ہے علی کا لال
لیں گے صلہ میں خار ترے نورِ عین سے
آنسو عزیز وہ نہ کریں گے حسین سے

پیاسا شہید ہوگا جو تیرا یہ دل ربا
ہووے گی شاد روحِ شہیدانِ کربلا
مومن سبیلیں رکھیں گے پانی کی جا بجا
بھر بھر کے آبِ سرد پکاریں گے بر ملا
محبوب کبریا کے نواسے کی نذر ہے
پیاسے نہ جائیو کہ یہ پیاسے کی نذر ہے

کہنے لگی نبی سے بتول فلک جناب
اے بادشاہ کون و مکاں مالک الرقاب
ہے ہے میں کیا کروں مرے دل کو نہیں ہے تاب
درگاہ حق میں آپ کی ہے عرض مستجاب
کیجے دعا کہ خالقِ اکبر مدد کرے
اللہ یہ بلا مرے بچے کی رد کرے

بیٹی سے رو کے کہنے لگے شاہ کائنات
چاہو تو رد کرے یہ بلا ربِّ پاک ذات
روح الامین نے مجھ سے تو یہ بھی کہی ہے بات
لیکن نہ ہووے گی مری امت کی پھر نجات
محبوبِ حق نثار ترے نورِ عین پر
موقوف ہے یہ امر تو قتلِ حسین پر

اللہ رے صبر دخترِ محبوبِ کردگار
خوشنود ہو کے کہنے لگے شاہ ذوالفقار
امت کا نام سن کے جھکایا سر ایک بار
صدقے حسن حسین تصدق علی نثار
اس راہ میں نہ مال نہ دولت عزیز ہے
پیارے پسر نہیں ہیں امت عزیز ہے

کہنے لگے حسین سے پھر شاہ بحر و بر
بتلا مجھے کہ کیا تری مرضی ہے اے پسر
نانا سے بولے چھوٹے سے ہاتوں کو جوڑ کر
امت کے کام آئے تو حاضر ابھی ہے سر
وعدہ کو ہم نہ بھولیں گے گو خرد سال ہیں
جھوٹے نہیں ہیں مخبرِ صادق کے لال ہیں

روتے ہیں آپ کس لیے یا سید امم
تلواریں بھی چلیں تو نہیں مارنے کے دم
راضی ہیں ہم پہ راہِ خدا میں ہوں جو ستم
امت پہ اپنے سر کو تصدق کریں گے ہم
ہم راست گو ہیں بات پہ جب وقت آتے ہیں
کہتے ہیں جو زباں سے وہی کر دکھاتے ہیں

پچپن میں جو زباں سے کہا تھا کیا وہ کام
گردن جھکائے برچھیاں کھایا کیے امام
تیغیں علی کے لال کے شانے پہ چل گئیں
جس وقت رن میں ٹوٹ پڑی شہ پہ فوجِ شام
خوں میں قبا رسول کی تر ہو گئی تمام
چھاتی کے پار نیزوں کی نوکیں نکل گئیں

مینہ کی طرح برسنے لگے شاہِ دیں پہ تیر
دامن پہ تیر جیب پہ تیر آستیں پہ تیر
داغوں سے خوں کے رشکِ بدن لالہ زار تھا
ٹھہرے ہوئے تھے لگ کے تنِ نازنیں پہ تیر
پہلو پہ تیغ سینہ پہ نیزہ جبیں پہ تیر
شکلِ ضریح سینۂ اقدس فگار تھا

تر تھی لہو میں زلفِ شکن در شکن جدا
درپے تھے نیزہ دار جدا تیغ زن جدا
سیپارہ تھا نہ صدر فقط اُس جناب کا
مجروح لعلِ لب تھے جدا اور دہن جدا
کٹ کٹ کے ہو گیا تھا ہر اک عضوِ تن جدا
پرزے ورق ورق تھا خدا کی کتاب کا

کرتا تھا وار برچھیوں والوں کا جب پرا
نیزوں میں خوں نبی کے نواسے کا تھا بھرا
تھیں سختیاں ستم کی شہِ خوش خصال پر
تیغوں سے دم بھی لینے کی مہلت تھی ذرا
شمشیر و تیر و نیزہ و خنجر کے ماورا
چلتے تھے سنگ فاطمہ زہرا کے لال پر

تھے دو ہزار جسمِ شہِ بحر و بر پہ زخم
گردن پہ زخم سینہ پہ زخم اور کمر پہ زخم
گھوڑے پہ کچھ سنبھلتے تھے کچھ ڈگمگاتے تھے
ماتھے پہ زخم تیر کے تیغوں کے سر پہ زخم
اور اس کے ماورا تھے بہتّر جگر پہ زخم
غش آتا تھا تو ہرنے پہ سر کو جھکاتے تھے

گھوڑے پہ جب سنبھلنے کی مطلق رہی نہ تاب
گرنے لگا جو خاک پہ وہ آسماں جناب
غل تھا کہ خاک پر شہِ کون و مکاں گرا
ہاتھوں سے باگ چھٹ گئی اور پاؤں سے رکاب
مرقد میں بے قرار ہوئی روحِ بوتراب
بس یہ زمیں الٹ گئی اور آسماں گرا

جلتی ہوئی زمین پہ تڑپنے لگے امام
اُس وقت شمر سے یہ عمر نے کیا کلام
ڈر ہو نہ سُن کے فاطمہ زہرا کی آہ کو
بیکس پہ ظالموں نے کیا اور ازدحام
ہاں تن سے جلد کاٹ سرِ سرورِ انام
گل کر دے شمعِ قبرِ رسالت پناہ کو

یہ سنتے ہی چڑھائی ستمگر نے آستیں
تھے قبلہ رو جھکے ہوئے سجدے میں شاہ دیں
سمجھا کہ تشنگی سے جو صدمے گزرتے ہیں
جھک کر قریب کان جو لایا تو یہ سنا
جاری زبانِ خشک پہ یہ ہے کہ اے خدا
شیعوں کا حشر روزِ جزا میرے ساتھ ہو
یہ سن کے مستعد ہوا وہ شہ کے قتل پر
گردن پہ پھیرنے لگا خنجر جو بد گہر
زہرا پکاری کچھ بھی نبی سے حجاب ہے
کیوں ذبح میرے لال کو کرتا ہے بے گناہ
کشتی کو اہلِ بیتِ نبی کی نہ کر تباہ
ہووے گا حشر قتل جو یہ بے وطن ہوا
آواز اپنی ماں کی یہ زینب نے جب سنی
دیکھا کہ ذبح کرتا ہے حضرت کو وہ شقی
ہے ہے نہ تین روز کے پیاسے کو ذبح کر
بانو پکارتی تھی یہ کیا کرتا ہے لعیں
چلاتی تھی سکینہ کہ جینے کی میں نہیں
خنجر نہ پھیر چاند سی گردن پہ رحم کر
زخموں سے چور چور ہے زہرا کا یادگار
بابا کے حلق پر نہ پھرا اب چھری کی دھار
سیّد پہ تشنہ لب پہ ستم اس قدر نہ کر
خنجر کمر سے کھینچ کے آگے بڑھا لعین
لب ہلتے دیکھے شاہ کے آیا وہ جب قریں
اس وقت بد دعا مجھے شبیر کرتے ہیں
حق میں گناہ گاروں کے کرتے ہیں شہ دعا
کر حاجتوں کو میرے محبوں کی تو روا
میرا یہ خوں بہا ہے کہ ان کی نجات ہو
زانو رکھا حسین کے سینہ پہ بے خطر
آئی صدا علی کی کہ ہے ہے مرے پسر
ظالم یہ بوسہ گاہِ رسالت مآب ہے
کیوں کاٹتا ہے میرے کلیجے کو روسیاہ
میں فاطمہ ہوں عرش ہلائے گی میری آہ
یہ مر گیا تو خاتمۂ پنجتن ہوا
دوڑی نکل کے خیمہ سے سر پیٹتی ہوئی
سر پیٹ کر یہ کہنے لگی وہ جگر جلی
ظالم نہ مصطفےٰ کے نواسے کو ذبح کر
پیاسا ہے تین روز سے حیدر کا جانشیں
بابا کو ذبح کرتا ہے کیوں اے عدوئے دیں
بابا کو چھوڑ دے مرے بچپن پہ رحم کر
جس چھاتی پہ میں سوتی تھی اس پر ہے تو سوار
بدلے پدر کے سر کو مرے تن سے تو اتار
پوتی ہوں فاطمہ کی مجھے بے پدر نہ کر

رو کر بیان یہ کرتی تھی وہ سوختہ جگر
دے دے کے دہائی اہلِ حرم پیٹتے تھے سر
کرتا تھا ذبح شہ کو وہاں شمرِ بدگہر
فرماتے تھے یہ شاہ کہ پیاسا ہوں رحم کر
پانی دیا نہ ہائے نبی کے نواسے کو
جلاد ذبح کرنے لگا بھوکے پیاسے کو

آخر سرِ امامِ امم تن سے کٹ گیا
چلا کے فاطمہ نے یہ زینب کو دی صدا
میداں سے جلد لیکے سکینہ کو گھر میں جا
بے جرم کٹ گیا ترے ماں جائے کا گلا
مارا بظلم شمر نے پیاسے کو جان سے
میں لُٹ گئی حسین سدھارے جہان سے

بس اے انیس بزم میں ہے نالہ و فغاں
پوچھ اُن کے دل سے جو ہیں سخن فہم نکتہ داں
حق ہے سُنا نہیں کبھی اس حُسن کا بیاں
گویا کہ یہ خلیق کی ہے سحر زباں
سچ ہے کہ اس زبان کو کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے اور کو وہ مانتا نہیں

رُباعی

اختر سے بھی آبرو میں بہتر ہیں یہ اشک
اللہ ہے مشتری وہ گوہر ہیں یہ اشک
آنکھوں سے لگا کے اُس کو کہتے ہیں ملک
گوہر نہیں نورِ چشمِ کوثر ہیں یہ اشک

رباعی

یکتا گہرِ قلزمِ سرمد ہے حسین
سردارِ امم مثلِ محمد ہے حسین
جب سر کو قدم کیا تو سر کی رہِ عشق
حقا کہ شہیدوں میں سرآمد ہے حسین

فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے
سادات کی بستی کے اُجڑنے کی خبر ہے
در پیش ہے وہ غم کہ جہاں زیر و زبر ہے
گل چاک گریباں ہیں صبا خاک بسر ہے
گل رو صفتِ غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورتِ گلدستہ کھڑے ہیں

آراستہ ہیں بہرِ سفر سرو قبا پوش
عمامے سروں پر ہیں عبائیں سرِ دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش
حیراں کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبر کے قدم پر

عباس کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ
اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر ید اللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسم کے ہوا خواہ
واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جاں کاہ
ہم لوگوں سے شبیر سخن کون کرے گا
یہ اُنس یہ خُلقِ حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ جو عون و محمد کے ہیں ہم سن
کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں نہیں ممکن
گرمی کا مہینہ ہے سفر کے یہ نہیں دن
تم حضرتِ شبیر کے سایہ میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اُٹھانے کو چلے ہو

ہمجولیوں سے کہتے تھے وہ دونوں برادر
ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر
ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حقِ غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم
ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پر نم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
غل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومۂ عالم
خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبرِ نبی کے
روضہ پہ اُداسی ہے رسولِ عربی کے

ہے جب سے کھلا حالِ سفر بند ہے بازار
یہ جلسۂ غم ارزاں ہے کہ روتے ہیں دکاندار
خاک اُڑتی ہے ویرانیِ یثرب کے ہیں آثار
ہر کوچے میں ہے شور کہ ہے ہے شہِ ابرار
اب یاں کوئی والی نہ رہا آہ ہمارا
جاتا ہے مدینے سے شہنشاہ ہمارا

تدبیرِ سفر میں ہیں ادھر سبطِ پیمبر
گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباسِ دلاور
تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبر
شہ کو جنھیں لے جانا ہے وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار
کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار
چلاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبردار
محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لیے فراش کھڑے ہیں

عوراتِ محلہ چلی آتی ہیں بصد غم
کہتی ہیں یہ دن رحلتِ نانا سے نہیں کم
پُرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم
فرش اُٹھتا ہے کیا بچھتی ہے گویا صفِ ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہے زینب
ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینب

لے لے کے بلائیں یہی سب کہتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر
مسلم کا خط آلے تو کریں کوچ کی تدبیر
للہ ابھی قبرِ پیمبر کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

وہ گھر ہے ملک رہتے تھے جس گھر کے نگہباں
کیوں اپنے بزرگوں کا مکاں کرتے ہیں ویراں
کوفے کی بھی خلقت تو نہیں صاحبِ ایماں
بی بی یہ مدینے کی تباہی کا ہے ساماں
ایک ایک شقی دشمنِ اولادِ علی ہے
شمشیرِ ستم واں سرِ حیدر پہ چلی ہے

اُجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہووے گا خالی
بربادیِ یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
کیا جانے پھر آئیں کہ نہ آئیں شہِ عالی
حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی
زہرا ہیں نہ حیدر نہ پیمبر نہ حسنؑ ہیں
اب اُن کی جگہ آپ ہی بادشاہِ زمن ہیں

گرمی کے یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ
قطرہ بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں ملتا
منہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا
کیا ہوگا جو میدان میں ہوا گرم چلے گی
اِن بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر
مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
اماں کی لحد چھوڑ کے میں یاں سے نہ جاتی
بھائی کی طرف دیکھ کے شق ہوتی ہے چھاتی
ظاہر میں تو مابینِ لحد سوتی ہیں اماں
ہے روح پہ اماں کی قلق کرتی ہیں زاری
روداد بیاں کر گئی ہیں مجھ سے وہ ساری
غمخوار ہے تو اور خدا حافظِ جاں ہے
یاد آتی ہے ہر دم مجھے اماں کی وصیت
آہستہ یہ فرماتی تھیں باصد غم و حسرت
اُس دن مری تربت سے بھی منہ موڑیو زینب
اماں کی وصیت کو بجا لاؤں نہ کیوں کر
دو بہنیں ہیں ماں جائیاں اور ایک برادر
جو ہوئے سو ہو بھائی کے ہمراہ ہے زینب

ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
ان کو تو نہ لے جائیں سفر میں شہِ ذیجاہ
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا
آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
لکھا تھا اسی سن میں مسافر انھیں ہونا
یہ پھول سے کمھلائیں گے ماں لُو جو ملے گی
بہنوں ہمیں تربت سے لیے جاتی ہے تقدیر
یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیر
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی
فاقے بھی اگر ہوتے تو غم اُس کا نہ کھاتی
بے جائے مجھے بات کوئی بن نہیں آتی
میں خواب میں جب دیکھتی ہوں آتی ہیں اماں
سرہانے میں نے اُنھیں دیکھا کئی باری
فرماتی تھیں بھائی سے خبردار رہیو واری
نہ باپ ہے سر پر مرے بچے کے نہ ماں ہے
کچھ جان کی تھی فکر نہ اُن کو دمِ رحلت
شبیر سدھارے جو سوئے وادیِ غربت
اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینب
گھر بھائی سے تھا بھائی نہ ہوگا تو کہاں گھر
رسی سے بندھیں ہاتھ کہ بلوے میں کھلیں سر
اس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینب

یہ کہتی تھی زینب کہ پکارے شہ عادل
تیار رہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل
رخصت کرو لوگوں کو بس اب ہونے سے حاصل
چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقت سحر ہے
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

رخصت کرو ان کو کہ جو ہیں ملنے کو آئے
کہدو کوئی گہوارۂ اصغر کو بھی لائے
نادان سکینہ کہیں آنسو نہ بہائے
جانے کی خبر میری نہ صغراؑ کہیں پائے
ڈر ہے کہیں گھبرا کے دم اس کا نہ نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

رخصت کو ابھی قبر پیمبرؐ پہ ہے جانا
کیا جانیئے پھر ہو کہ نہ ہووے مرا آنا
اماں کی لحد پر ہے ابھی اشک بہانا
اس مرقد انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لیے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبر حسن سے

سن کر یہ سخن بانوئے ناشاد پکاری
میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہوگئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری
کس کے لیئے کرتے ہیں سب گریہ و زاری
اب کس پہ میں اس صاحب آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ماں ہوں میں کلیجہ نہیں سینے میں سنبھلتا
صاحب مرے دل کو ہے کوئی ہاتھوں سے ملتا
میں تو اسے لے چلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا
رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دل اس کا بہلتا
دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہے
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے

چلاتی تھی کبراؑ کہ بہن آنکھیں تو کھولو
کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو
ہم جاتے ہیں تم اٹھ کے بغل گیر تو ہولو
چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو
تم جس کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
پھر گھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبر نہ ملے گا

ہشیار ہو کیا صبح سے بے ہوش ہو خواہر
اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
چھاتی سے لگو اٹھ کے کھڑی روتی ہے مادر
ہم روتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اٹھا کر
افسوس اسی طور سے غفلت میں ہو گی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

سُن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے
منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے
جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں
کہکر یہ سخن بیٹھ گئے سیّدِ خوش خو
بیمار نے پائی گلِ زہرا کی جو خوشبو
ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں امّاں
ماں نے کہا ہاں وہی آئے ہیں مری جاں
دیکھو تو ادھر روتی ہیں بی بی شہِ ذیشاں
وہ کونسا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیئے باہر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر
کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے امّاں
شبیر کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیدِ مظلوم
تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
اب شہر میں اک دم بھی ٹھہرنا مجھے دشوار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار
غربت میں بشر کے لیئے سو طرح کا ڈر ہے
لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے

بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے
دانستہ میں کیونکر اُسے لے جاؤں سفر میں
اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں امّاں
جو کہنا ہے کہہ لو کہ یہاں اور ہے ساماں
صغرا نے کہا اُن کی محبت کے میں قرباں
کُھل کر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا
نہ فرش نہ ہے مسندِ فرزندِ پیمبر
اُجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر
کیا سبطِ پیمبر سے وطن چھٹتا ہے امّاں
صغرا کے لیئے رونے لگیں زینب و کلثوم
پردہ رہا اب کیا تمہیں خود ہو گیا معلوم
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغرا
ہیں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحبِ آزار
تکلیف تمہیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے
جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہی مجھے انکار
پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار
تبرید فقط آپ کا ہے شربتِ دیدار
گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اُتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہے سر میں
اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں
قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں
ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا
یاں نیند کسے آتی ہے جو واں سوئے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہو مادر
ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضّہ کی سواری میں بٹھا دو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ
میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو راہ
کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ
ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحتِ حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نورِ بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا
تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا
تپ ہے تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا
یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمھیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم
چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ مرتے ہم
ماں کہتی تھی مختار ہیں بی بی شہِ عالم
میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہے اس دم
وہ درد ہے جس درد سے چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار
سب کی یہی مرضی ہے کہ مر جائے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار
اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار
بیزار ہیں سب باپ بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر
اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر
وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر
پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

کیا ان کو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے
میں کون جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
ہوتی جو غرض چھاتی سے لپٹانے کو آتے
زلفیں جو الجھتیں تو سلجھوانے کو آتے
کل تک تو مرے حالِ پریشاں پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھکو نہ خبر تھی

مانوس سکینہ سے ہیں عباسِ دلاور
میں کون ہوں جو میری خبر پوچھنے آکر
سرسبز رہے خلق میں نوباوۂ شبیر
شادی ہیں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور
بے دولہا بنے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس درد کو میں بیکس و رنجور
بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور
اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور
ہمراہیِ بیمار کسی کو نہیں منظور
دُنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

سب بی بیاں رونے لگیں سُن سُن کے یہ تقریر
بھائی سے لگا کر اُسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر
منہ دیکھ کے چپ ہو گئی وہ بیکس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ
اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ
آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ
روٹھی ہے بہن تم سے گلے اُس کو لگاؤ
چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو
لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو

پاس آن کے اکبر نے کی یہ پیار کی تقریر
کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر
چلانے لگی چھاتی پہ مُنہ رکھ کے وہ دلگیر
محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
صدقے ترے سر پر سے اُتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے — تلوار لیے شان سے چلنے کے میں صدقے
افسوس سے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے — کیوں دل سے ہو اشک آنکھوں سے ڈھلنے کے میں صدقے
جلد آن کے بھینا کی خبر لیجیو بھائی — بے بیر سے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

لکھنا نہ مجھے نسبت کا اگر ہو کہیں سامان — حق دار ہوں میں نیگ کا پھیرے بھی ہیں شایان
اور مر گئی پیچھے تو ہے دل میں یہ ارمان — لے آنا دلھن کو مری تربت پہ میں قربان
خوشنود مری روح کو کر دیجیو بھائی — حق نیگ کا تم قبر پہ دھر دیجیو بھائی

پیارے مرے بھیا مرے مہرو علی اکبر — چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبر
یاد آئے گی یہ جسم کی خوشبو علی اکبر — ڈھونڈھیں گی یہ آنکھیں تمھیں ہر سو علی اکبر
دل سینے میں کیونکر تہ و بالا نہ رہے گا — جب چاند چھپے گا تو اجالا نہ رہے گا

کیا گزرے گی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی — کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
تشریف خدا جانے کب لاؤ گے بھائی — کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی
کیا دم کا بھروسا کہ چراغِ سحری ہیں — تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا — صحت سے جو ہیں ان کا کہاں میرا ٹھکانا
بھیّا جو اٹھ آنا تو مری قبر پہ آنا — ہم گور کی منزل کی طرف ہوں گے روانہ
کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری — وہ راہ تمھاری ہے تو یہ راہ ہماری

مرنا تو مقدم ہے غم اس کا نہیں زنہار — دھڑکا ہے کہ جب ہوں گے عیاں موت کے آثار
قبلہ کی طرف کون کرے گا رخ بیمار — لیسین بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غم خوار
سانس اکھڑے گی جس وقت تو فریاد کروں گی — میں ہچکیاں لے لے کے تمھیں یاد کروں گی

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا ترے قربان — گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان
بیکس مری بچّی ترا اللہ نگہبان — صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا — کنبے کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری
اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمھاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری
آ ای مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
تب ہی تمھیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
رکھ لوں تمھیں ماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار
صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار
جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار
دنیا سے کوئی دن میں گزر جائے گی صغرا
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی صغرا

عباس نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا
چلنے کو ہے اب قافلہ تیار ہمارا
لپٹا کے گلے فاطمہ صغرا کو دوبارا
اُٹھے شہِ دیں گھر تہ و بالا ہوا سارا
جس چشم کو دیکھا سو وہ پرنم نظر آئی
اک مجلسِ ماتم تھی کہ باہم نظر آئی

بیت الشرفِ خاص سے نکلے شہِ ابرار
روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار
پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے
آتا ہو ادھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریم سے سوا حق نے شرف اُن کو دیئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

عباسِ علیؑ سے علی اکبرؑ نے کہا تب
ہیں قافلہ سالارِ حرم حضرتِ زینب
پہلے ہوں وہ اسوار تو محمل پہ چڑھیں سب
حضرت نے کہا ہاں یہی میرا بھی ہے مطلب
گھر میں مرے زہرا کی جگہ بنتِ علیؑ ہے
میں جانتا ہوں ماں مرے ہمراہ چلی ہے

پہونچی جہیں ناقے کے قریں دخترِ حیدرؑ
خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِ پیمبرؐ
فضہ تو سنبھالے ہوے تھی گوشۂ چادر
تھے پردۂ محمل کو اُٹھائے علی اکبرؑ
فرزند کمر بستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اُٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

اک دن تو مہیا تھا یہ سامانِ سواری
اک روز تھا وہ گرد تھے نیزے لیے ناری
محمل تھا نہ ہودج نہ کجاوہ نہ عماری
بے پردہ تھی وہ حیدرِ کرّار کی پیاری
ننھے کئی بچوں کے گلے ساتھ بندھے تھے
تھے بال کھلے چہروں پہ اور ہاتھ بندھے تھے

زینت دہِ محمل جو ہوئی دخترِ زہرا
ناقوں پہ چڑھے سب حرمِ سیدِ والا
آنے لگے رہوار کھلا گرد کا پردا
عباسؑ سے بولے یہ شہِ یثرب و بطحا
صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے روحِ نبیؐ پر
رخصت کو چلو قبرِ رسولِ عربیؐ پر

ہے قبر پہ نانا کی مقدم مجھے جانا
کیا جانیئے پھر ہو کہ نہ ہو شہر میں آنا
اماں کی ہے تربت پہ ابھی اشک بہانا
اُس مرقدِ انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لیئے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسنؑ سے

پیدل شہِ دیں روضۂ احمد کو سدھارے
تربت سے صدا آئی کہ آؤ مرے پیارے
تعویذ سے شبیرؑ لپٹ کر یہ پکارے
ملتا نہیں آرام نواسے کو تمہارے
خط کیا ہیں اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا

خادم کو کہیں امن کی اب جا نہیں ملتی
راحت کوئی ساعت مرے مولا نہیں ملتی
دُکھ کونسا اور کونسی ایذا نہیں ملتی
ہیں آپ جہاں آہ وہ اصلا نہیں ملتی
پابندِ مصیبت ہوں گرفتارِ بلا ہوں
خود پاؤں سے اپنے طرفِ قبر چلا ہوں

ہیں اِک تنِ تنہا ہوں ستمگار ہزاروں
اِک جان ہے اور درپئے آزار ہزاروں
اِک پھول سے رکھتے ہیں خلش خار ہزاروں
اِک سر ہے فقط اور خریدار ہزاروں
واں جمع کئی شہر کے خونریز ہوئے ہیں
خنجر مری گردن کے لیئے تیز ہوئے ہیں

فرمایئے اب جائے کدھر آپ کا شبیرؑ
یاں قید کی ہے فکر اُدھر قتل کی تدبیر
تیغیں ہیں کہیں میرے لیئے اور کہیں زنجیر
خونریزی کو کعبہ تلک آ پہونچے ہیں بے پیر
بچ جاؤں جو پاس اپنے بلا لیجیے نانا
تربت میں نواسے کو چھپا لیجیے نانا

یہ کہہ کے ملا قبر سے شہ نے جو رُخِ پاک
ہلنے لگا صدمے سے مزارِ شہِ لولاک
جنبش جو ہوئی قبر کو تھرّا گئے افلاک
کانپی جو زمیں صحنِ مقدس میں اُڑی خاک
اُس شور میں آئی یہ صدا روضۂ جد سے
تم آگے چلو ہم بھی نکلتے ہیں لحد سے

باتوں نے تری دل کو مرے کر دیا مجروح
تو شہر سے جاتا ہے تڑپتی ہے مری روح
بے تیغ کیا خنجرِ غم نے ترے مذبوح
ہے کشتیِ اُمت پہ تباہی کہ چلا نوح
افلاکِ امامت کا تجھے بدر نہ سمجھے
بے قدر ہیں ظالم کہ تری قدر نہ سمجھے

مارا گیا جس روز سے شبر مرا پیارا
اُس روز سے ٹکڑے ہے کلیجہ مرا سارا
اب قتل میں ہوتا ہوں ترے ساتھ دوبارا
اُمت نے کیا پاسِ ادب خوب ہمارا
زہرا کی جو بستی کو اُجاڑیں تو عجب کیا
اعدا مجھے تربت سے اُکھاڑیں تو عجب کیا

اس ذکر پہ رویا کیئے شہ سر کو جھکا کے
واں سے جو اُٹھے فاطمہؑ کی قبر پہ آئے
پایئں لحد گر کے بہت اشک بہائے
آواز یہ آئی کہ میں صدقے مرے جائے
ہے شور ترے کوچ کا جس دن سے وطن میں
پیارے میں اُسی دن سے تڑپتی ہوں کفن میں

تربت میں جو کی میں نے بہت یہ زاری
گھبرا کے علی آئے نجف سے کئی باری
کہتے تھے کہ اے احمدِ مختار کی پیاری
تم پاس ہو تربت ہے بہت دور ہماری
گھر لُٹتا ہے کیونکر ہمیں چین آئے گا زہرا
کیا ہم سے نہ رخصت کو حسینؑ آئے گا زہراؑ

میں نے جو کہا قبر سے کیوں نکلے ہو باہر
نہ سر پہ عمامہ ہے نہ ہے دوش پہ چادر
فرمایا کہ ماتم میں ہوں اے بنتِ پیمبر
مرنے کو پسر جاتا ہے برباد ہوا گھر
ترسیں گے وہ پانی کو جو نازوں کے پلے ہیں
تلواریں ہیں اب اور مرے بچّوں کے گلے ہیں

پھرتا ہے مری آنکھوں میں شبیر کا مقتل
وہ نہرِ فرات اور کئی کوس کا جنگل
وہ بجلیاں تلواروں کی وہ شام کا بادل
دریا سے وہ پیاسوں کے ہٹا دینے کی ہلچل
شبیر کے سر پہ سے یہ آفت نہ ٹلے گی
دسویں کو محرم کی چھری مجھ پہ چلے گی

سن کر یہ بیاں باپ کا مادر کی زبانی
رو رو کے پکارا اسد اللہ کا جانی
ہاں والدہ سچ ہے نہ ملے گا مجھے پانی
پیاسے ہیں مرے خون کے ظلم کے بانی
بچپن میں کیا تھا مرا ماتم شہِ دیں نے
نانا کو خبر دی تھی مری روحِ امیں نے

پہلو میں جو تھی فاطمہ کے تربتِ شبر
اُس قبر سے پلٹے یہ محبت شہِ صفدر
چلائے کہ شبیر کی رخصت ہے برادر
حضرت کو تو پہلو ہوا اماں کا میسر
قبریں بھی جدا ہیں تہہ افلاک ہماری
دیکھیں ہمیں لے جائے کہاں خاک ہماری

یہ کہہ کے چلے قبرِ حسنؑ سے شہِ مظلوم
رہوار جو مانگا تو سواری کی ہوئی دھوم
یارانِ وطن گرد تھے افسردہ و مغموم
چلاتے تھے خادم کہ چلا خلق کا مخدوم
خالی ہوا گھر آج رسولِ عربی کا
تابوت اسی دھوم سے نکلا تھا نبی کا

جب اُٹھ گئی تھیں خلق سے مخدومۂ عالم
سر پیٹتے تھے لوگ اسی طرح سے باہم
برپا تھا جنازہ پہ علی کے یوہیں ماتم
تھا رحلتِ شبر میں محبوں کو یہی غم
بس آج سے بے وارث و والی ہے مدینہ
اب پنجتنِ پاک سے خالی ہے مدینہ

چلاتی تھیں رانڈیں کہ چلی شہ کی سواری
لے گا خبر اب کون مصیبت میں ہماری
آنکھوں سے یتیموں کے دُرِ اشک تھے جاری
مضطر تھے اپاہج ضعفا کرتے تھے زاری
کہتے تھے گدا ہم کو غنی کون کرے گا
محتاجوں کی فاقہ شکنی کون کرے گا

تھا ناکے تک شہر کے اک شورِ قیامت
سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرت
رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرتے تھے رخصت
پائیں گے کہاں ہم یہ غنیمت ہے زیارت
آخر تو بچھڑ کر کفِ افسوس ملیں گے
دس بیس قدم اور بھی ہمراہ چلیں گے

قسمیں اُنھیں دے دے کے کہا شہ نے کہ جاؤ
اللہ کو سونپا تمھیں آنسو نہ بہاؤ
اُس بےکس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
روتے ہوئے وہ لوگ پھرے شاہ سدھارے
کس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے
اُترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں
روشن ہوئی کعبہ کی زمیں نورِ خدا سے
جھک جھک کے ملے سبطِ پیمبر غربا سے
خوش ہو کے ہوا خواہ یہ کہتے تھے علی کے
کعبہ میں بھی اک دن نہ ملا شاہ کو آرام
اعدا نے گزرنے نہ دیئے حج کے بھی ایّام
عازم طرفِ راہِ الٰہی ہوئے حضرت
جاتے تھے دل افسردہ و غمگیں شہِ ابرار
قبریں نظر آتیں کسی صحرا میں جو دو چار
جز خاک نہ ہوگا نشاں بھی بدنوں کا
احباب کہیں گھر ہیں کہیں آپ کہیں ہیں
خالی ہیں مکاں، آپ تہِ خاک مکیں ہیں
حسرت یہی ہوگی کہ پہنچے نہ وطن میں
باتیں تھیں یہی یاس کی اور درد کی تقریر
شب کو کہیں اُترے تو سحر کو ہوئے راہ گیر
مقتل کا یہ تھا شوق شہِ جن و بشر کو

تکلیف تمھیں ہوتی ہے اب ساتھ نہ آؤ
پھرنے کے نہیں ہم سے بس اب ہاتھ اُٹھاؤ
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا
جو صاحبِ قسمت تھے وہ ہمراہ سدھارے
عابد طرفِ خانۂ اللہ سدھارے
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں
مکے نے شرف اور بھی پایا شرفا سے
آباد ہوا شہر نمازوں کی صدا سے
سب باپ کی خو بو ہے نواسے میں نبی کے
کوفے سے چلے آتے تھے نامے سحر و شام
کھولا پسرِ فاطمہؓ نے باندھ کے احرام
تھی ہشتم ذی حجہ کہ راہی ہوئے حضرت
ہر گام پہ ہوتے تھے عیاں موت کے آثار
فرماتے تھے شہ فاعتبروا یا اولی الابصار
انجام یہی ہم سے غریب الوطنوں کا
آگے تو زمیں پر تھے پر اب زیرِ زمیں ہیں
جو دور نہ رہتے تھے وہ اب پاس نہیں ہیں
کیا مُنہ کو لپیٹے ہوئے سوتے ہیں کفن میں
منزل پہ بھی آرام سے سوتے تھے نہ شبیر
جلدی تھی کہ ہو جائے شہادت میں نہ تاخیر
جس طرح سے ڈھونڈھے کوئی معشوق کے گھر کو

ملتا تھا کوئی مردِ مسافر جو سرِ راہ
یوں پوچھتے تھے اس سے یہ حسرت شہِ ذیجاہ
ایسا کوئی صحرا بھی ہی اے بندہ اللہ
اک نہر سوا جس میں ہو چشمہ نہ کوئی چاہ
کیا ملتا ہی اُس دشت میں اور کیا نہیں ملتا
ہم ڈھونڈھتے پھرتے ہیں وہ صحرا نہیں ملتا

وہ عرض یہ کرتا تھا کہ سبطِ شہِ لولاک
ہی سخت پُر اندوہ وہ صحرا شہِ افلاک
ہنستا ہوا واں جائے تو ہو جاتا ہی غمناک
سُنتا ہوں ہاں دن کو اُڑاتا ہی کوئی خاک
واں رانوں کو آتی ہی صدا سینہ زنی کی
درویش کی ممکن ہی سکونت نہ غنی کی

چلّاتی ہی عورت کوئی ہی ہی مرے فرزند
اس دشت میں ہو جائیگا تو خاک کا پیوند
تلواروں سے ٹکڑے یہیں ہوں گے ترے دلبند
پانی یہیں ہو جائے گا بچّوں پہ ترے بند
پیاسے تو اسی خاک پہ گھوڑے سے گرے گا
ہی ہی یہیں خنجر تری گردن پہ پھرے گا

اک شیر ترائی میں یہ چلّاتا ہی دن رات
کٹ جائیں گے یاں ہاتھ مرے لال کے ہیہات
کیا حال کہوں نہر کا ای شاہِ خوش اوقات
پانی تو نہیں شور یہ مشہور ہی یہ بات
طائر بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں پیتے
وحشی کبھی واں آن کے پانی نہیں پیتے

اُس جا نہ اُترتا ہی نہ دم لیتا ہی رہ گیر
ہی شور کہ اس آب میں ہی آگ کی تاثیر
پیاسوں کے لیئے اس کی ہر اک موج ہی شمشیر
اس طرح ہوا چلتی ہی جس طرح چلیں تیر
بجھتی نہیں واں پیاس کسی تشنہ گلو کی
بو آتی ہی اُس نہر کے پانی میں لہو کی

اُس شخص سے یہ کہہ کے چلے قبلۂ عالم
اللہ نے چاہا تو بسائیں گے اُسے ہم
عاشق پہ بلا بعدِ بلا آتی ہی ہر دم
غم اور بڑھا وصل کا عرصہ جو رہا کم
آفت یہ نئی فوجِ شہنشاہ میں آئی
مسلم کی شہادت کی خبر راہ میں آئی

غربت میں نہ ماتم کی سنا سے خبر اللہ
طاری ہوا حضرت پہ عجب صدمۂ جانکاہ
گوندھے ہوئے سر کھول کے بیٹھے حرمِ شاہ
فرماتے تھے شہ سب کو ہی درپیش یہی راہ
ہوگا وہی اللہ کو جو مدِ نظر ہی
آج اُن کا ہوا کوچ کل اپنا بھی سفر ہی

وارث کے لیئے زوجۂ مسلم کا تھا یہ حال
محمل سے گری پڑتی تھی کھولے ہوئے بال
روتے تھے بہن کے لیئے عباسِ خوش اقبال
وہ کہتی تھی ساتھ آئے تھے چھوٹے مرے دو لال
پوچھو تو کدھر وہ مرے پیارے گئے دونو
فرماتے تھے شبیر کہ مارے گئے دونو

محمل تھے سب اس بی بی کے ہودج کے برابر
تھا شور کہ بیوہ ہوئی شبیر کی خواہر
گھبرا گئی تھی مسلمِ مظلوم کی دختر
ہر بار یہی پوچھتی تھی ماں سے لپٹ کر
کیوں پیٹتی ہو کون جدا ہو گیا امّاں
غربت میں مرے باپ پہ کیا ہو گیا امّاں

اس دن سے تو اک ابرِ ستم فوج پہ چھایا
کھانا کئی دن قافلے والوں نے نہ کھایا
رستے میں ابھی تھا اسد اللہ کا جایا
جو چاند محرم کا فلک پر نظر آیا
سب نے مہِ نو لشکرِ شبیر میں دیکھا
منہ شاہ نے آئینۂ شمشیر میں دیکھا

خویش و رفقا چاند کی تسلیم کو آئے
مجرے کو جھکے اور سخن لب پہ یہ لائے
یہ چاند مبارک ہو ید اللہ کے جائے
کفار پہ تو فتح اسی چاند میں پائے
رتبہ مہ و خورشید سے بالا ہے تیرا
تا حشر زمانے میں اُجالا رہے تیرا

حضرت نے دعا پڑھ کے یہ کی عرض مناجات
کر رحم گنہگاروں پہ اے قاضی حاجات
سر دینے کا مشتاق ہوں عالم ہے تری ذات
خنجر مری آنکھوں میں پھرا کرتا ہے دن رات
باقی ہیں جو راتیں وہ عبادت میں بسر ہوں
یہ زیست کے دس دن تری طاعت میں بسر ہوں

پہونچا دے مجھے جلد بس اے خالقِ افلاک
اس خاک پہ جس خاک سے ملتی ہے مری خاک
طالب ہے ترے قرب کا سبطِ شہِ لولاک
نہ ملک کی خواہش ہے نہ درکار ہے املاک
بیتاب ہے دل صبر کا یارا نہیں مجھ کو
اب فصل بجز وصل گوارا نہیں مجھ کو

اتنے میں یہ فضہ علی اکبر کو پکاری
لو دیکھ چکیں چاند ید اللہ کی پیاری
عادت ہے کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمہاری
آنکھوں کو کیئے بند یہ فرماتی ہیں واری
آئے تو رخِ اکبرِ ذی قدر کو دیکھوں
شکلِ مہِ نو دیکھ چکی بدر کو دیکھوں

شہ داخلِ خیمہ ہوئے فرزند کے ہمراہ
منہ دیکھ کے یوں کہنے لگی بنتِ یداللہ
یہ چاند ہے کس طرح کا ای فاطمہ کے ماہ
فرمانے لگے رو کے بہن سے شہِ ذیجاہ
سر تن سے مرا اس مہِ پرغم میں کٹے گا
زینب یہ مہینہ تمھیں ماتم میں کٹے گا

یہ آلِ نبی کی ہے مصیبت کا مہینا
یہ ظلم کا عشرہ ہے یہ آفت کا مہینا
پہونچا ہے غریبوں کی شہادت کا مہینا
آخر ہے بس اب عمر کی مدّت کا مہینا
یہ بارِ امانت مری گردن سے اُتر جائے
ہو خاتمہ بالخیر جو سر تن سے اتر جائے

گردوں پہ مہِ نو جو نمایاں ہے یہ ہمشیر
چڑھتی ہے مرے سر کے لئے چرخ پہ شمشیر
اس چاند میں کٹ جائے گا سب لشکرِ شبیر
نیزہ کوئی کھائے گا کلیجے پہ کوئی تیر
برچھی کسی جانباز کے پہلو میں لگے گی
شمشیر کسی شیر کے بازو میں لگے گی

خیمے کو جلا دیں گے لٹے گا زر و زیور
اس ماہ میں ہوں گے نہ پدر اور نہ برادر
ماؤں سے پسر چھوٹیں گے بہنوں سے برادر
بیوہ کئی سیدانیاں ہوویں گی مقرّر
گھڑکیں گے ستمگار جو رووے گی سکینہ
اس ماہ میں بے باپ کی ہووے گی سکینہ

دولہ کوئی ٹاپوں کے تلے ہوئیگا پامال
پیٹے گی کوئی تازہ دُلھن کھولے ہوئے بال
تیروں سے کسی ماں کا جگر ہوئے گا غربال
نکلے گی کوئی کہتی ہوئی ہائے مرا لال
معصوموں کے سونے کی جگہ پائیں گی خالی
بچّوں سے بھری گودیاں ہو جائیں گی خالی

اس عشرۂ اول میں نہ ہوئیں گے بہن ہم
تاریخِ سفر ہے دہم ماہِ محرّم
عشرہ یہ وہ عشرہ ہے کہ ای زینبِ پُرغم
جس لال کی عاشق ہو وہ ہو جائے گا بیدم
دیکھو گی نہ پھر منہ علی اکبر سے پسر کا
اب شام میں ہووے گا تمھیں چاند صفر کا

رونے کے لیے حق نے بنائے ہیں دس دن
ان روزوں خوشی ہووے کسی کو نہیں ممکن
لیویں گے مرا تعزیہ ہر شہر کے ساکن
اکبر کو جواں روئیں گے معصوموں کو کمسن
بھولیں ہمیں ایسے نہیں غمخوار ہمارے
ہوئیں گے سیہ پوش عزادار ہمارے

غش ہوگئی سن کریہ بیانِ پدرِ غم — خیمے میں اُسی رات سے برپا ہوا ماتم
بیدار رہیں صبح تلک بی بیاں باہم — خیموں کو اُکھڑوا کے چلے قبلۂ عالم
آخر وہی صحرا وہی جنگل نظر آیا — تھی دوسری تاریخ کہ مقتل نظر آیا

اُترے اُسی میدانِ بلاخیز میں سرور — استادہ ہوئے خیمۂ ناموسِ پیمبر
صحرا کی طرف دیکھ کے خوش ہوگئے اکبر — دریا پہ ٹہلنے لگے عباسِ دلاور
شہ بولے ہوا نہر کی بھائی تمھیں بھائی — ہاں شیر ہو دریا کی ترائی تمھیں بھائی

خامے کو بس اب روک انیسِ جگر افگار — خالق سے دُعا مانگ کہ اے ایزدِ غفار
زندہ رہیں دُنیا میں شہِ دیں کے عزادار — غیر از غمِ شہ اُن کو نہ غم ہو کوئی زنہار
آنکھوں سے مزارِ شہِ دلگیر کو دیکھیں — اس سال میں سب روضۂ شبیر کو دیکھیں

رباعی

جس دن کہ فراقِ روح وتن میں ہوگا — مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رختِ نو پہن کر غافل — اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

رُباعی

مرقد میں انیس نہ کفن میں ہوگا — وہ روضۂ سلطانِ زمن میں ہوگا
چل کر گلزارِ کربلا میں ڈھونڈیں — بلبل کا مزار بھی چمن میں ہوگا

مرثیہ (۳)

سبطِ نبیؐ سے منزلِ مقصد قریب ہے
آرام گاہِ جانِ محمدؐ قریب ہے
مولد تو دور رہ گیا مشہد قریب ہے
جس جا لحد بنے گی وہ سرحد قریب ہے
جاتے ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو
آئی ہے کربلا سے اجل پیشوائی کو

ہے شورِ آمد آمدِ شاہِ فلک سریر
فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے بھیر
دعوت کے واسطے ہیں سنانیں لیے شریر
حضرت کی پیشکش کو کمانیں ہیں اور تیر
پانی پہ چوکیاں ستم آرا اٹھاتے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں

شُقّے گئے ہیں شام کے حاکم کے جابجا
ہر پرگنے سے ہے طلبِ لشکرِ جفا
آکر اُترتی جاتی ہیں فوجیں جدا جدا
لیتا ہے جائزہ عمرِ سعدِ بے حیا
غل ہے کریں گے قتل جو زہراؑ کے ماہ کو
انعام میں ملے گا دوماہہ سپاہ کو

تیغیں سلاح خانہ سے نکلی ہیں بے شمار
ہے جابجا درستیِ اسبابِ کارزار
ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کئی ہزار
خنجر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار
نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر
پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

وہ سالکِ طریقِ ہدایت ہے شاد شاد
ہے آرزو کہ جلد ملے گوہرِ مُراد
بہتے ہیں اشک جوش پہ ہے بحرِ اتحاد
لب پر اُسی کا ذکر ہے دل میں اُسی کی یاد
معشوق کے سوا کوئی پیشِ نظر نہیں
یہ شوقِ وصل ہے کہ کسی کی خبر نہیں

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی رہ سخت
پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت
سنولا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
توسن ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

چلتی ہے لو حرارتِ خورشید ہے دو چند
مرجھا گئے ہیں نخل ہوا میں ہے یہ گزند
جھیلوں میں ہیں نہ درختوں پہ ہیں پرند
ہے دھوپ میں رسول کا فرزندِ ارجمند
غربت میں بیکسی ہے شہِ دیں پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہرا کے ماہ پر

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر
لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوے مشک بار اٹے ہیں غبار سے

اہلِ حرم ہیں محمل و ہودج میں بے قرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ یا شاہِ نامدار
گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیرخوار
کیونکر یہ دکھ اٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کریں خیمہ کہیں بپا
ٹھنڈی ہوا میں لے کے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ چاہ ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت تباہ ہے

جب طے ہوئی وہ منزلِ آفت قریبِ شام
اس روز ثعلبیہ میں شہ کا ہوا مقام
اکبر نے آن کر کیا پردے کا اہتمام
ناقوں سے اترے آلِ نبی با صد احترام
ڈوبے ہوئے عرق میں سبھوں کے لباس تھے
دل رندھ گئے تھے چاند سے چہرے اداس تھے

اترے رفیقِ خاص قریبِ خیامِ شاہ
کچھ فاصلے سے گرد فروکش ہوئی سپاہ
نکلا حرم سے حضرتِ خیر النسا کا ماہ
کرسی پہ جلوہ گر ہوا وہ عرش بارگاہ
ہر نخل غیرتِ شجرِ طور ہو گیا
صحرا خدا کے نور سے معمور ہو گیا

اس دن بہت اداس تھا زہرا کا یادگار
زردی تھی رخ پہ گیسوؤں پر راہ کا غبار
صحرا پہ گہہ نظر تھی گہے سوے کوہسار
کہتے تھے دیکھ دیکھ کے گردوں کو بار بار
کس کو نہ بے وطن کیا کس پہ جفا نہ کی
اے دہر تو نے آہ کسی سے وفا نہ کی

یہ کہہ کے رو رہے تھے شہِ دیں کہ ناگہاں
ناقے پہ ایک شخص ہوا دور سے عیاں
عباسؑ سے یہ کہنے لگے شاہ دو جہاں
تم جا کے اس عرب کو بُلا لاؤ بھائی جاں
تشویش ہے رسولِ خدا کے حبیب کو
کچھ پوچھنا ہے اُس سے حسینِ غریب کو

جلدی چلے یہ سُنتے ہی حکمِ شہِ انام
پاس اُس کے جا کے آپ نے کی سبقتِ سلام
ناقہ بٹھا کے کود پڑا تب وہ نیک نام
عباسِ نامور نے یہ اُس سے کیا کلام
آیا ہے تو جدھر سے اُدھر ہم بھی جاتے ہیں
اے شخص جلد چل تجھے آقا بلاتے ہیں

دیکھا جو رعب و دبدبہ و شوکت و جلال
دستِ ادب کو جوڑ کے اُس نے کیا سوال
ہے کون شخص آپ کا آقائے خوش خصال
عباس نے کہا کہ رسولِ خدا کا لال
نورِ نگاہِ فاتحِ بدر و حُنین ہے
آقا کا میرے اسمِ مبارک حسین ہے

یہ سُن کے اشک آنکھوں سے اُس شخص نے بہائے
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولا کہ ہائے ہائے
کیوں اس طرف کو سیدِ والا وطن سے آئے
آفت سے نورِ چشمِ علی کو خدا بچائے
سب اہلِ شہر ہیں کوفیوں کو اُن سے بیر ہے
پھر جائیں آپ جانبِ یثرب تو خیر ہے

گھبرا گئے یہ سُنتے ہی عباسؑ با وفا
فرمایا اے عرب ترے رونے کی وجہ کیا
مسلم نے بھی یہ حال تو خط میں نہیں لکھا
اُس نے کہا کہ اور ہے کچھ واں کا ماجرا
سب شہر پھر گیا ہے شہِ خاص و عام سے
کہنا ہے جو کہوں گا مفصل امام سے

پہونچا وہ جب قریبِ شہنشاہ سرفراز
تسلیم کر کے پاؤں پہ رکھا سرِ نیاز
ہاتھ اُس کا لے کے ہاتھ میں اُٹھے شہِ حجاز
بولا کنارے جا کے وہ امت کا کارساز
گر نیک ہو سفر تو وسیلہ ظفر کا ہے
آنا ہوا کدھر سے ارادہ کدھر کا ہے

کی عرض اُس نے اے پسرِ سیّد البشر
کوفے کے شہرِ شوم سے آتا ہوں میں ادھر
فرمایا شہ نے ہے تجھے مسلم کی کچھ خبر
رونے لگا وہ مردِ مسافر جھکا کے سر
شہ بولے وجہ کیا جو ترا حال غیر ہے
جلدی بتا کہ میرے مسافر کی خیر ہے

گھبرا کے حال پوچھتے تھے شاہِ نامدار
پھر چلیے اب وطن کی طرف بہرِ کردگار
آلِ رسولِ پاک پہ کیا کیا جفا نہ کی
ہاتوں کو جوڑتا ہوں میں شاہا نہ جائیے
اُس جا دغا ہی سیّدِ والا نہ جائیے
کیا دور ہی جو آ کے عدو سدِّ راہ ہوں
بچوں پہ رحم کیجیے یا شاہ انس و جاں
بچھڑے نہ اس ضعیفی میں اکبر سا نوجواں
پھولا پھلا رسولِ خدا کا چمن رہے
یہ فکر ہی جو آپ کو لکھّے ہیں سب نے خط
مضمون بھی غلط ہیں عبارت بھی سب غلط
حاکم کا مدعا ہی کہ ظلم و ستم کروں
کوفی تمام مایۂ جور و فساد ہیں
تربت میں فاطمہؓ کے رُلانے پہ شاد ہیں
بے ہمتوں نے کونسا وعدہ وفا کیا
پھر بولا سر کو پیٹ کے با صد غم و محن
نیزے پہ سر ہی جسم ہی بے گور و بے کفن
تربت نہیں نصیب تنِ پاش پاش کو
باقی جو تھا حضور کا غمخوار و خیرخواہ
کوڑے لگے پہ منہ سے نہ کی اُس جری نے آہ
صادق جو تھے وفا میں تو کامل تھے عشق میں

گر گر گے وہ قدم پہ یہ کہتا تھا بار بار
کوفے میں سب ہیں عہد شکن اور ستم شعار
یہ ہیں وہی جنھوں نے علی سے وفا نہ کی
بہرِ علیؑ و احمدؐ و زہراؑ نہ جائیے
آقا نہ جائیے مرے مولا نہ جائیے
ایسا نہ ہو کہ آلِ محمدؐ تباہ ہوں
پہونچے نہ ان گلوں کو کہیں صدمۂ خزاں
رکھّے خدا جہان میں یداللہ کا نشاں
روشن سدا چراغِ مزارِ حسن رہے
مطلب یہ ہی کہ یاں تلک آویں کسی نمط
یہ خط نہیں ہیں قتل کی تدبیر ہی فقط
گر جھوٹ ہو تو ہاتھوں کو اپنے قلم کروں
مفسد ہیں بدطریق ہیں بداعتقاد ہیں
تیغیں ادھر ہیں دل ہوے ابنِ زیاد ہیں
کیونکر کہوں کہ مسلمِ بیکس سے کیا کیا
آقا ہوا شہید وہ مظلومِ بے وطن
اور اب تلک بندھی ہوئی ہی پاؤں میں رسن
گلیوں میں لوگ کھینچتے پھرتے ہیں لاش کو
مسلم نے لی تھی گھر میں اُسی دستِ کے پناہ
مسلم کے ساتھ وہ بھی ہوا قتل بے گناہ
دونوں کے سر روانہ ہوے ہیں دمشق میں

شہ نے سنا عرب سے جو سارا یہ ماجرا
جو مسلمِ غریب پہ ہونا تھا ہو چکا
فرمایا بازگشت ہے سب کی سوئے خدا
باقی ہے کچھ جو ظلم وہ اب ہم پہ ہوئے گا
خواہانِ مرگ سبطِ رسالت مآب ہے
ان کا جہاں سے کوچ مرا پا تراب ہے

یہ بات کہہ کے رونے لگے شاہِ نامدار
وا مسلما کہا کبھی باری بحالِ زار
فرماتے تھے کہ ہائے مرے یارِ غم گسار
بھائی حسین تیری غریبی پہ ہو نثار
میں جانتا تھا اب مرے لینے کو آؤگے
اس کی خبر نہ تھی کہ ہمیں چھوڑ جاؤگے

دوڑے ہوئے جب آئے تم اس شہر کے قریب
مارے گئے وہاں کوئی جس جا نہ تھا حبیب
پردیس میں لحد بھی نہ تم کو ہوئی نصیب
کیسا سفر تھا ہائے مرے قاصدِ غریب
تکتے تھے مجھ کو یاس سے منہ پھیر پھیر کے
کوفے میں لے گئی تھی اجل تم کو گھیر کے

کوئی بدی کریں گے یہ مجھ کو نہ تھی خبر
شرمندہ ہے حسین تمہیں پہلے بھیج کر
درپیش ہے ہمیں بھی اسی طرح کا سفر
اب ہم بھی آن پہونچے ہیں تم گئے جدھر
رتبے بڑے ہیں کشتۂ اول کے واسطے
سبقت تو ہے ضرور ہراول کے واسطے

اتنے میں روتے روتے جو کچھ آگیا خیال
مسلم کے دونوں بیٹوں کا پوچھا عرب سے حال
اس نے کہا کہ کیا کہوں اے شاہِ خوش خصال
حارث کے ہاتھ آگئے وہ دونوں نونہال
بے رحم نے یتیموں پہ کیا کیا ستم کیے
بازو بندھے تھے دونوں کے جب سر قلم کیے

آتا تھا شہرِ کوفہ سے جس دم میں نوحہ گر
حاکم کے آگے جاتے تھے وہ چھوٹے چھوٹے سر
آنکھیں کھلی تھیں چاند سے چہرے تھے خوں میں تر
رخ پہ پڑی لٹکتی تھیں زلفیں ادھر ادھر
ماتھوں سے آشکار نشانِ سجود تھے
بے رحم کے طمانچوں سے عارض کبود تھے

فریاد کر کے کہنے لگے سرورِ عرب
خاموش رہ کہ صبر کی طاقت نہیں ہے اب
بندوں کا اختیار ہی کیا جو رضائے رب
دونوں یتیم بھی نہ بچے اس کے ہے غضب
معلوم تھا کسے کہ تباہی یہ آئے گی
ماں ان کی جب سنے گی تو کیا خاک اڑائے گی

رو رو کے پوچھا بچوں کی قبروں کا جب پتا
کی عرض کچھ نہ پوچھیے ای ابنِ مرتضا
یوں دفن کم ہوا ہی کوئی کائنات میں
یہ سُن کے اُٹھ کھڑے ہوے حضرت بچشمِ نم
اب کس طرف کا قصد ہی ای سرورِ اُمم
مُنہ کو سنان و تیغ سے موڑا نہ جائے گا

رخصت ہوا وہ مردِ مسافر بصد فغاں
آنکھوں سے اشکِ ریشِ مبارک تھے رواں
صدمے سے رنگ بانوے بیکس کا فق ہوا
کلثوم سر کو پیٹ کے آئی بہن کے پاس
تکتی تھی منہ کو شہ کے سکینہ بچشمِ یاس
خیمے سے صحن تک جو گئی جا بجا گری

رونے سے شہ کے ہوش کسی کے نہ تھے بجا
کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ باوفا
پوچھوں تو حال کیوں شہِ والا کا غیر ہی
گھبرا کے پکارتی تھی کہ صغرا کی خیر ہو
مسلم کی بیٹی کہتی تھی بابا کی خیر ہو
ہی ہی وطن سے آن کے وہ لٹ گئے نہ ہوں

کہتی کبھی سکینہ سے رو کر وہ بے قرار
وجہ بکا تو پوچھو بہن تم پہ ہیں نثار
پڑتا ہی دل میں شک کہ ہی چھاتی دھڑکتی ہی
وہ شخص دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا
تجہیز کیسی قبر کجا اور کفن کجا
خندق میں لاش باپ کی بیٹے فرات میں

کہنے لگا وہ مردِ عرب چوم کر قدم
شہ نے کہا کہ جائیں گے مقتل پہ اپنے ہم
مجھ سے خدا کی راہ کو چھوڑا نہ جائے گا
نہوڑا لے سر کو گھر میں گئے شاہِ دوجہاں
حضرت کو روتے دیکھ کے گھبرائیں بی بیاں
زینب نے بین پہ اٹھ کے گری پُرقلق ہوا

قاسم کی والدہ میں نہ مطلق رہے حواس
سب سے زیادہ زوجۂ مسلم کو تھا ہراس
چہرے سے رنگ اُڑ گیا سر سے ردا گری
سینوں میں دل دھڑکتے تھے لرزاں تھے دست و پا
باہر سے یاں اُٹھیں تو بلا ے کوئی ذرا
کیا ہو گیا وطن میں تو لوگوں کی خیر ہی

یا رب مریضِ بیکس و تنہا کی خیر ہو
غربت میں قاصدِ شہِ والا کی خیر ہو
بھائی مرے پدر سے کہیں چھٹ گئے نہ ہوں
ہی دل میں شہ کے سب سے زیادہ تمھارا پیار
حضرت تجھی کو دیکھ کے روتے ہیں بار بار
رہ رہ کے غم کی آگ جگر میں بھڑکتی ہی

اتنے میں بڑھ کے شاہ سے زینب نے یہ کہا
بھیّا مجھے بتاؤ تو رونے کی وجہ کیا
فرمایا شاہ نے کہ بہن قہر ہو گیا
بیٹوں سمیت قتل ہوا ابنِ عم مرا
مسلم سے کوفیوں نے بڑی بے وفائی کی
گاڑی نہ لاش بھی مرے مظلوم بھائی کی

پیٹو کہ رانڈ ہو گئی عباسؑ کی بہن
رنڈسالہ اس کو دو کہ نہ اُس کو ملا کفن
مارا گیا مرے لیئے ہے ہے وہ صف شکن
اب ہم نہ پھر کے جائیں گے ہم سے چھٹا وطن
آ پہونچی فصل فاطمہ کے خاک اُڑانے کی
زینب یہ ابتدا ہے مرے مارے جانے کی

سمجھو تم اس خبر کو مرے قتل کی خبر
بانو بھی ساتھ زوجۂ مسلم کے کھولے سر
پُرسے کو آئے زوجۂ عباسؑ نامور
بیکس تھا وہ شہر بپا عزا ہو تمام گھر
رنڈسالہ بی بیاں اُسے جس دم پنہائیں گی
اماں نکل کے قبر سے پُرسے کو آئیں گی

کہدو سکینہؑ دخترِ مسلم کے پاس جائے
چھاتی کو جب وہ پیٹے تو یہ سر پہ خاک اُڑائے
کبرا برابر اُس کے زمیں پر پچھاڑیں کھائے
باپ اُس کا مر گیا ہے گلے سے اُسے لگائے
ہم بھی خدا کی راہ میں اب قتل ہوئیں گے
اک دن اسی طرح ہمیں سب مل کے روئیں گے

حُسینؑ کے چھاتیوں کو لگے پیٹنے حرم
چلائی روکے زوجۂ مسلم کہ ہے ستم
مارا گیا سفر میں غلام شہِ امم
فریاد ہے کہ رانڈ ہوئی میں اسیرِ غم
صدمے اجل کے تین دموں پر گزر گئے
وارث بھی مر گیا مرے بچے بھی مر گئے

غل سُن کے آئے خیمے میں عباسؑ نامور
دیکھا بہن تڑپتی ہے سر ننگے خاک پر
دل غم سے ٹکڑے ہو گیا روئے جھکا کے سر
بولے قریب آکے خدا پر کرو نظر
سمجھیں گے اُن سے قاتلِ مسلم نظر میں ہیں
پیٹو نہ سر کہ سیدِ والا سفر میں ہیں

وابستہ جس کے دم سے ہو اس کا رہے خیال
لازم نہیں تمہیں کہ بھرے گھر میں کھولو بال
ہم سب غلام جس کے ہیں دیکھو تو اُن کا حال
مانگو دعا جہاں میں رہے فاطمہؑ کا لال
لازم ہے تم کو صبر کہ دنیا میں نام ہو
اُس کا زہے شرف کہ نثارِ امام ہو

مسلم ہوئے ہراولِ فوجِ شہِ انام
کیا بہ بابِ کوچ تھا کہ ہوا خلد میں مقام
ماں سے سوا شفیق ہیں اور حق شناس ہیں
شوہر تمھارا صاحبِ عزت تھا ای بہن
زخموں کے بدلے ہاتھ لگا خلد کا چمن
راضی علی ہوں شاد خدا کا حبیب ہو
مسلم کا خوں جو راہ خدا میں ہوا سبیل
تائیدِ ذوالجلال سے رتبہ ہوا جلیل
سمجھو نہ یہ سفر کی تباہی میں مر گیا
سمجھاتے تھے بہن کو یہ عباسِ نامور
مسلم کو یاد کرکے حرم پیٹتے تھے سر
تم بن ہماری زیست کی صورت بگڑ گئی
شور بکا ذرا نہ ہوا کم تمام رات
تڑپا کیے امامِ دو عالم تمام رات
بس ای انیس اب نہیں لکھنے کی تاب ہے

دنیا میں تا قیامِ قیامت رہے گا نام
مخدومۂ جہاں انھیں روویں گی صبح و شام
بچے تمھارے فاطمہ زہرا کے پاس ہیں
حُلّے ملے بہشت میں پایا نہ گر کفن
ہمسایۂ رسولؐ ملا گو چھٹا وطن
مانگو دعا کہ ہم کو یہ دولت نصیب ہو
پہونچا کنارِ کوثر و تسنیم و سلسبیل
عاقل کمال تھا پسرِ حضرتِ عقیل
زندہ ہے وہ جو راہِ الٰہی میں مر گیا
روتے تھے سر جھکائے ہوئے شاہِ بحر و بر
بیٹی پکارتی تھی کہ ہے ہے مرے پدر
بیٹوں کو ساتھ لے گئے بیٹی بچھڑ گئی
سویا نہ کوئی خیمے میں اک دم تمام رات
گھر میں رہا حسین کے ماتم تمام رات
اس آتشِ الم سے کلیجہ کباب ہے

جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا
دشت بلا نمونۂ خلد بریں ہوا
سر جھک گیا فلک کا یہ اوج زمیں ہوا
خورشید محو حسن حسین حسیں ہوا
پایا فروغ نیّر دیں کے ظہور سے
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

زہرا کے اختروں سے زمیں آسماں ہوئی
غازی جہاں چلے وہ زمیں کہکشاں ہوئی
سب ارض پاک غیرت باغ جناں ہوئی
ایسا مکیں ملا کہ رفیع المکاں ہوئی
دامن جو پاک صاف تھا دشت مصاف کا
احرام باندھا کعبہ نے اُس کے طواف کا

ہاتف نے دی صدا کہ زہے شان کربلا
مختار کائنات ہے مہمان کربلا
پھولوں سے آج بھر گیا دامان کربلا
بس اب تواں بہشت ہے بستان کربلا
خورشید دیں کے فیض سے کیا کیا شرف ملے
روشن ہے جس سے عرش وہ درّ نجف ملے

یہ دشت ہولناک کہاں یہ چمن کہاں
جنگل کہاں بتول کے گل پیرہن کہاں
کنبہ کہاں نبیؐ کا یہ دار محن کہاں
قربت کہاں شکستہ دلوں کی وطن کہاں
آئے ہیں ڈھونڈتے ہوئے اس ارض پاک کو
سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو

غل تھا چمن چمن کہ بہار آئی اب قریب
باغی جو چین دیں تو یہ ہے موسم عجیب
بولی یہ آشیاں سے جدا ہو کے عندلیب
آیا گل ریاض محمدؐ خوشا نصیب
فخر اُس زمیں کا جس پہ شہ انس و جن پھرے
دیکھو خدا کی شان کہ جنگل کے دن پھرے

خوشبو سے اُن گلوں کی ہوا دشت باغ باغ
غنچے کھلے ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ
پہنچا سر فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ
دریا نے بھی حبابوں کے روشن کیے چراغ
خورشید بن گئے طبقے ارض پاک کے
تاروں کو گرد کر دیا ذرّوں نے خاک کے

جنگل ہیں بن گیا شجرِ طور ہر درخت
آئی صدا فلک سے کہ جاگے زمیں کے بخت
رفعت کا اس کی فرش سے غل عرش تک گیا

کہتی تھی آسماں سے زمینِ فلک حشم
مجھ پر ہیں وہ جو مُہرِ نبوت پہ تھے قدم
اب تو یہ خاکسار بھی کیواں اساس ہے

پھیلی جو نکہت چمنِ شاہِ بحر و بر
جلدی ہوا نے جا کے یہ دریا کو دی خبر
جب تا نکہ وہ بحرِ فیض برائے وضو بڑھے

ساحل پہ ہوں گے جلوہ نما اب امامِ دہر
یہ سن کے بے قرار ہوئی علقمہ کی نہر
آمد سنی جو سبطِ رسالت مآب کی

بولے فرس کو روک کے شاہ فلک وقار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار
قربان اس مکانِ سعادت نشان کے

اُترو مسافرو کہ سفر ہو چکا تمام
مقتل یہی زمین ہے یہی مشہدِ امام
بستر لگاؤ شوق سے اس ارض پاک پر

مثلِ زمینِ خلد مُصفّا ہے یہ زمیں
روئے زمیں پہ عرش معلےٰ ہے یہ زمیں
اس کے مکین ہوں گے پراگندہ نشر میں

بالیدگی سے ہو گئے ٹکڑے گلوں کے رخت
اب اس زمین پہ سوئے گا مختارِ تاج و تخت
لو آج خاک کا بھی ستارا چمک گیا

کیوں آج مجھ سے بن زیادہ ہے تو کہ ہم
ذرّے سے بھی یہاں ترے شمس و قمر ہیں کم
زیور جو عرش کا تھا وہ سب میرے پاس ہے

صحرا میں لہلہا گیا سبزہ بھی سر بسر
آہا ترے کچھار میں مختارِ خشک و تر
بڑھ کر قدم تو لے کہ تری آبرو بڑھے

دریا دلی کا ہوگا ترے شور شہر شہر
سر کو قدم کیے ہوئے دوڑی ہر ایک لہر
ساحل سے آنکھ لڑ گئی اک اک حباب کی

منزل پہ ہم پہنچ گئے احسانِ کردگار
یہ وہ زمیں ہے جس کے لیے دل تھا بے قرار
پایا دُرِ مراد بڑی خاک چھان کے

کوچ اب نہ ہوگا حشر تلک ہے یہیں مقام
اونٹوں سے بار اُتار کے برپا کرو خیام
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقا یاں کی خاک پر

ساتوں فلک سے اوج میں بالا ہے یہ زمیں
فردوس کا کھنچا ہوا نقشا ہے یہ زمیں
بے سر اسی زمیں سے ہم اُٹھیں گے حشر میں

مرغوب طبع ہے یہ زمینِ فلک جناب
سوئے گا اس کی خاک پہ فرزندِ بوتراب
ہے اس طرح یہ ساری زمینوں میں انتخاب
جس طرح ذی شرف ہے ستاروں میں آفتاب
مرنا لکھا ہوا ہے یہیں سرنوشت میں
جائے گا ہاتھوں ہاتھ یہ طبقہ بہشت میں

سجدے کریں گے جس پہ ملک وہ زمیں یہ ہے
جس پر کھدا ہے نقشِ شفا وہ نگیں یہ ہے
بطحا یہ ہے مدینۂ اربابِ دیں یہ ہے
کعبہ یہ ہے نجف یہ ہے خلدِ بریں یہ ہے
تھی اس زمین کی قدر رسولِ پاک کو
آنکھوں سے سب لگا گئے ہیں یاں کی خاک کو

ذرّوں سے اس کے اشرفیِ مہر زرد ہے
مٹی طلا ہے نسخۂ اکسیر گرد ہے
کردے سقر کی آگ کو پانی یہ سرد ہے
کحلِ بصر ہے داروئے اندوہ و درد ہے
زندے الم سے بچتے ہیں مردے فشار سے
آنکھوں میں نور آتا ہے اس کے غبار سے

خاک اس کے دل میں ہو جسے اس خاک سے غبار
مجرم بھی اس کے فیض سے اُٹھے گا رستگار
پڑ جائے جس کے جسم پہ خاک اس کی ایک بار
سایہ سے اس کے آتشِ دوزخ کرے فرار
یوں دور ہوں گناہ سب اس نیک بخت سے
پتے خزاں میں گرتے ہیں جیسے درخت سے

کام آئے گی لحد میں یہ ہنگام درد و یاس
اس خاک سے بنے گا کفن نور کا لباس
تسبیح اس کی قبر میں ہوئے گی جس کے پاس
سو سو طرح کی پائے گا راحت وہ حق شناس
فرمائیں گے ملک ارم اس کا مقام ہے
سونے دو چین سے یہ مطیعِ امام ہے

دیں گے جو اس کی خاک سے لکھا ہوا کفن
میّت پہ پھر نہ ہوگا کوئی صدمۂ محن
ڈھانپے گا اس کو چادرِ رحمت سے ذوالمنن
خوشبو سے ہوگا کنجِ لحد صندل کا چمن
پھولوں میں خاکِ پاک کفن کو بسائے گی
صدّوں سے نکہتِ گلِ فردوس آئے گی

توشہ مسافروں کا یہی اور یہی ہے زاد
یہ خاک آبِ خضر سے بہتے میں ہے زیاد
طوفاں میں اس کو ڈالے گا جو مردِ خوش نہاد
لے آئے گی ہوا اسے موافقِ دُرِ مراد
دیکھے گا یاس میں کرم کارساز کو
تھامے گا دستِ موج سے دریا جہاز کو

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا
دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا
اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سربلند
کیوں یہ مقام ہے تمھیں شاید بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہِ ارجمند
بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
سیراب یہیں رہیں گے عنایت یہ رب کی ہے
میں کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

گرمی میں ایسی سرد ہوا یا شہِ انام
ہے لیٹنے کی جا یہ زمینِ فلک مقام
مشہور غازریہ ہے شاید اسی کا نام
جی چاہتا ہے یاں سے سرکیئے نہ ایک گام
ایسی جگہ بس اب ملے گی کسی جگہ
کیا لطف ہے جو قبر بھی ہووے اسی جگہ

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام
گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام
شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام
زلفیں ہوا سے اُڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونوں لال
پھولوں سے کھیلنے لگے زینب کے نونہال
سبزے سے اُن کے ابنِ حسن خوش ہوئے کمال
کی عرض اس زمین کا ہر اک گل ہے بے مثال
اے خسروِ زمیں یہ جگہ ہے جلوس کی
خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی

صحرا سے آئے پھر سوے دریا شہِ امم
الیاس شاد ہو کے پکارے زہے حشم
اُبھریں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم
بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم
پانی میں روشنی ہوئی حسنِ حضور سے
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے

ٹھہرے کنارِ نہر جوانانِ ماہرو
دھویا کسی نے رخ کسی نے کیا وضو
گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو
بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیر نیک خو
کھینچی اک آہ سرد ترائی کو دیکھ کر
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نامور — خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہِ بحر و بر
ایذا ہی محملوں میں بہت اہلِ بیت پر — بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر
کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے — گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوئے

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا — زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسؑ باوفا — جا کر قریبِ محملِ زینبؑ یہ دی صدا
حاضر ہی جاں نثار امامِ غیور کا — برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

بولی بہن کہ دخترِ خاتونِ روزگار — اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل ہے نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار — ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار
مختارِ کائنات کے تم نورِ عین ہو — اترو وہاں جہاں سے بھائی کو چین ہو

عاقل ہو تم تو نامِ خدا ہی علی کے لال — مجھ سے زیادہ بھائی کی راحت کا ہے خیال
دریافت کر لو پہلے کسی سے یہاں کا حال — داری کسی طرح کا نہ آقا کو ہو ملال
گوشہ ملے کہیں نہ فضا ہو نہ سیر ہو — اب تو یہی پڑی ہے کہ جانوں کی خیر ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر — کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر — دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اجاڑ تھا — ایک ایک کوس راہ جبل ہیں پہاڑ تھا

آج اس زمیں پہ ہمیں لایا ہے آسماں — اب دیکھیے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں — یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
دشمن بہت ہیں بادشہِ خوش خصال کے — بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

بھائی سے اس زمیں کی سنی ہے یہ صفت — ہے وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
جو جو سن ہیں ان سے بھی لازم ہے مصلحت — صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مشورت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو — بھیّا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردوبدل نہ ہو

دستِ ادب کو جوڑ کے اُس شیر نے کہا
تشویش کچھ نہ کیجیے ای بنتِ مرتضا
ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا
لیکن کوئی ترائی سے بہتر نہیں ہے جا
جو مہرِ فاطمہ میں ہے یہ وہ فرات ہے
گرمی میں قربِ نہر کا آبِ حیات ہے

جس سر زمیں پہ دلبرِ زہرا عمل کرے
زہرہ کسی کا کیا ہے جو رد و بدل کرے
مانع وہ ہو جو دینِ نبی میں خلل کرے
کافر ہے جو حسین سے جنگ و جدل کرے
دخل اس میں روم کا ہے نہ سلطانِ شام کا
دنیا کی سب زمیں پہ ہے قبضہ امام کا

حضرت کے حکم کا مترصد ہے جاں نثار
ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار
آیا حضورِ سبطِ پیمبر وہ ذی وقار
کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہے خاکسار
اُتریں یہیں یہ مرضیِ آلِ رسولؐ ہے
بولا وہ بحرِ فیض کہ اچھا قبول ہے

یہ سن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں
فرّاش آکے جلد مصفّا کریں زمیں
حاضر ہوں آب پاش محل دیر کا نہیں
یاں ہوگا خیمۂ حرمِ بادشاہِ دیں
جلد اُن کو بھیجو لوگ ہیں جو کاروبار کے
لے آؤ اشتروں سے قناتیں اُتار کے

بولے زہیرِ قیں کہ حاضر ہیں سب غلام
بڑھ کر حبیب بھی ہوئے مصروفِ اہتمام
کرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام
رُتبے میں ہوگئی وہ زمیں عرش احتشام
پرتو فگن تھا نورِ رسالت مآب کا
سر پہ لگا تھا چتر زری آفتاب کا

تھا فکر میں خموش دو عالم کا تاجدار
کھلوا رہے تھے خیموں کو عباسِ ذی وقار
ناگہ اُٹھا شمال کی جانب سے اک غبار
رایت سیاہ و سرخ نظر آئے تین چار
مُڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے

یک جا ہوئے حسینؑ کے جوانانِ صف شکن
نکلا ہر اک ولی کی زباں سے یہی سخن
آئے ہیں ملکِ غیر میں ہم چھوڑ کر وطن
تو سب کی خیر کیجیو ای ربِّ ذوالمنن
اعدائے دیں کے شر سے حفاظت میں ہم رہیں
ناحق کوئی لڑے بھی تو ثابت قدم رہیں

کہنے لگے پکار کے عباسِ حق شناس
دل میں نہ خوف ہو نہ زباں پر کلامِ یاس
گرم گئے تو روضۂ رضواں کی سیر ہے
کیا ڈر فشونِ روم ہے یہ یا جنودِ شام
جو مرد ہیں ہراس کیے کرتے نہیں کلام
سرسبز ہیں وہی جو علی کے نشان ہیں

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
ایک ایک پیل زورِ تہمتن شکوہ تھا
بولے ملازموں سے یہ عباسِ باوفا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کونسا
لازم رسول زادیوں کا احترام ہے

کرسی نشیں ہے لختِ دلِ سید البشر
آتی ہے اڑکے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر
بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
اُس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام
چھوڑیں گے ہم اُسے کہ جو راحت کا ہے مقام
لشکر کشی ہے بادشہِ کائنات پر

کوفے سے کل جواں ادھر آئے ہیں دس ہزار
خالی ہیں منزلیں نہ بیاباں نہ کوہسار
لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا

ہاں ناصرانِ قبلۂ کونین باحواس
جیتے ہو تو حسین سے ہو قدرداں کے پاس
دونوں طرف تو آل تمہارا بخیر ہو
ہم اپنے کام میں ہیں ہمیں کیا کسی سے کام
ہونے دو گر ہیں سرخ علم یا سیاہ فام
خود جھک کے وہ ملیں گے کہ ہم میہماں ہیں

ڈنکے کی دستِ ظلم سے کوسوں صدا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی
ابنِ رکابِ سبز قدم سرگروہ تھا
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
کہدو کہ اہلِ بیت کے خیمہ کی ہے یہ جا
اُتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

آئینِ خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں
حکمِ امیر ہے یہیں اُتریں سپاہِ شام
دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجیے خیام
کل مورچے سپاہ کے ہوں گے فرات پر

رستے میں شام کی ابھی فوجیں ہیں بے شمار
شہروں سے پرگنوں سے چلے آتے ہیں سوار
گیتی ہلے گی جب پسرِ سعد آئے گا

فوجوں کا جائزہ تھا وہاں ہم چلے تھے جب
دشتوں کی روم و شام کے آمد ہی روز و شب
کیجے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہیں ادھر
سُنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیرِ نر
کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیرِ برق دم
گر فوج قاہرہ کی ہی آمد تو کیا ہی غم
بپھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
دُنیا ہو اک طرف تو نہ آئے خیال میں
گیتی ہو بے نشاں اگر آئیں جلال میں
دریا ہی کیا یہ شیر ہٹیں جس کو چھوڑ کے

تم کون ہو حسینؑ ہیں مختارِ خشک و تر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
دریا تو ابتدا سے ہمارا ہی تم ہو کون؟
اللہ نے زمیں کو سنوارا ہی تم ہو کون؟
ہیہات غصبِ حق ہے چھٹے آج تک نہیں

کیا ابنِ سعدِ شوم کی فوج اور کیا حشم
اُترے ہیں آ کے فخرِ سلیماں کے ساتھ ہم
کچھ ڈر نہیں چھ لاکھ اگر بدخصال ہیں
گروے میں بیس کوس کے لشکر پڑا تھا سب
اس ارض پر نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

ہی آج شب کو داخلۂ شمر کی خبر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم
گرتا ہی کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
یہ آنکھ وہ ہی جس میں سماتا نہیں کوئی

لاکھوں پہ اپنی تیغ چلی ہی جدال میں
ہی سب طرح کا نور محمدؐ کی آل میں
جب پل بنا دیا درِ خیبر کو توڑ کے
ان کے سوا ہی کون شہنشاہِ بحر و بر
شیروں کا یاں عمل ہی تمھیں کیا نہیں خبر
بس کہدیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

اس کا محق رسول کا پیارا ہی تم ہو کون؟
ساحل پہ کچھ کسی کا اجارا ہی تم ہو کون؟
منزل مسافروں کی یہ ہی کچھ فدک نہیں
سر لوٹتے پھریں گے بڑھایا اگر قدم
کیا اُن کے مورچے کہ جو ہوں چیونٹیوں سے کم
ہم بھی کشندۂ درِ خیبر کے لال ہیں

کیا سر پہ موت آئی ہے بس سامنے سے جاؤ — فوجوں کا ذکر کرکے کسی اور کو ڈراؤ
دعویٰ ہے کچھ سپاہ گری کا اگر تو آؤ — بیٹا رحیم کا ہوں مجھے غیض میں نہ لاؤ
تلوار ادھر کھچی کہ ادھر کھیت پڑ گیا — پھر کچھ نہ بن پڑے گا اگر میں بگڑ گیا

ہم شیر ہیں قسم اسدِ کردگار کی — رکھتے ہیں ناخنوں میں بُرش ذوالفقار کی
تُو کی نہ اصل یاں نہ حقیقت ہزار کی — ٹوکے یہ کیا مجال کسی نابکار کی
گرجیں بھی تو رعد ہیں برسیں تو ابر ہیں — اک میں نہیں بہت ابھی ایسے ہزبر ہیں

چھوڑیں نہ یہ زمیں جو گرے سر پہ آسمان — بڑھ کر ہٹا نہیں کبھی اس فوج کا نشان
جب تک کہ دم میں دم ہے نہ جائے گی آن بان — ریتی پہ ہم بپا کریں خیمہ خدا کی شان
مرجائیں وہ جو ساتھ کئی شیر خوار ہیں — فی الواقعی ہم ایسے ہی تقصیر وار ہیں

ہم پہلے آئے ہیں کہ تم آئے ہو تا بہ نہر — کیوں غاصبو یہ نہر نہیں فاطمہ کا مہر
چھوڑ آئے ہیں تمھارے بلانے پہ اپنا شہر — کوئی مسافروں پہ یہ کرتا ہے جبر و قہر
اُترے ابھی نہیں کہ لڑائی ٹھہر گئی — وعدے وہ کیا ہوئے وہ محبت کدھر گئی

شر اس قدر زمیں پہ اٹھائے سروں پہ خاک — مٹی ہوئے لکھے تھے عریضوں میں جو تپاک
ہے بو ترابیوں کی جگہ یہ زمینِ پاک — ہوئیں گی تربتیں بھی یہیں گر ہوئے ہلاک
تم لوگے کس طرح یہ جگہ ہم کو بھائی ہے — مشہور ہے کہ شیروں کا مسکن ترائی ہے

سوچو تمھیں دلوں میں کہ حق دار کون ہے — عالم میں بر و بحر کا مختار کون ہے
ہادی ہے کون سیدِ ابرار کون ہے — ہے بے قصور کون گنہگار کون ہے
لازم ہے تم کو پاس کلامِ مجید کا — کلمہ نبی کا پڑھتے ہو تم یا یزید کا

پر کس کے گھر سے دین کی دولت ملی تمھیں — صدقہ ہے کس ولی کا جو عزت ملی تمھیں
خوانِ کرم سے کس کے یہ نعمت ملی تمھیں — ہادی ہوئے جو ہم تو ہدایت ملی تمھیں
پھلتا نہیں نہالِ حسد بھولتا نہیں — محسن کو اس طرح سے کوئی بھولتا نہیں

ہم تو تمہیں سمجھتے ہیں سید کا خیر خواہ
کیا خوب مہمانوں کی دعوت ہے واہ واہ
الفت نہ دلدہی نہ تعارف نہ رسم و راہ
معصوم سے وہ کونسا ایسا ہوا گناہ
چشمے پہ جنگ فاطمہ کے نورِ عین سے
نا منصفو پھراتے ہو آنکھیں حسینؑ سے

ہر چند خاکسار ہیں فرزندِ بوتراب
پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب
کہنی تک آستیں کو جو الٹیں دمِ عتاب
گردوں میں تھرتھرا کے چھپے قرصِ آفتاب
آجائے انقلاب کی آفت جہان پر
ہو آسماں زمیں پہ زمیں آسمان پر

ارض و سما کو ہم تہ و بالا کریں ابھی
جو سرکشی کرے اُسے پسپا کریں ابھی
اس سرزمیں کو خون کا دریا کریں ابھی
ساحل تک آئے جو اُسے ٹھنڈا کریں ابھی
بولے کوئی تو تن سے سر اُس کا جدا کریں
خیمہ بپا نہ ہو تو قیامت بپا کریں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب
بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے الم کیے ہوئے تھے نیزہ دار سب
باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اُس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابو ثمامہ و سعدِ فلک سریر
تولی زہیر قین نے شمشیرِ بے نظیر
جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے ایک تیر
بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر
عابس کو غیظ لشکرِ بد خو پہ آگیا
غصے سے بل ہلال کی ابرو پہ آگیا

بولے اُٹھا کے نیزے کو ضرغامۂ دلیر
بس اب سزا یہی ان کی مناسب نہیں ہے دیر
بولے شبیب ادھر سے جو نکلے گا ایک شیر
بھاگیں گے سب یہ گھوڑوں کی باگوں کو پھیر پھیر
آقا کا ہی یہ پاس کہ ہم دور دور ہیں
کثرت پہ اپنی پھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

اُلٹی جناب قاسمِ ذی شاں نے آستیں
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبرِ حسیں
بولے پکڑ کے ہنچے زینب کے مہ جبیں
شیروں سے کیا لڑائی کو لیں گے یہ اہلِ کیں
کہیے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرتِ عباسؑ ذی حشم
تیغیں جو تولتے تھے اُدھر بانیِ ستم
لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر اک نابکار کو
بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیرِ نر
تیغیں جو کھنچ گئیں تو ہوا اور شور و شر
آغوش میں پھوپھی کی سکینہ دہل گئی
چلّائی رو کے زینبِ ناشاد و نامراد
غربت زدوں سے کیا سبب کینہ و عناد
ہمشیر کو نثارِ امامِ اُمم کرو
محمل سے منہ نکال کے فضّہ نے یہ کہا
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
زینب پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال
کہہ دے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال
قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو
لڑنے کو تیغ میان سے کھینچو گے تم اگر
عباسؑ تم تو ساقیِ کوثر کے ہو پسر
مر جاؤں گی سفر میں جو بچھڑوں گی بھائی سے
دریا کو روکتے ہیں اگر بانیِ ستم
غربت زدوں پہ چاہیئے اللہ کا کرم
ثابت ہوا کسی کو ہماری ولا نہیں

بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دم بدم
کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم
رو کے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو
گرتا تھا کوئی ڈر کے اِدھر اور کوئی اُدھر
گھبرا ئے اہل بیتِ شہنشاہِ بحر و بر
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی
اے ہے خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد
دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہِ خوش نہاد
لوگو دعائیں اکبرِ مہرو پہ دم کرو
بلوہ کنارِ نہر ہے اے بنتِ مرتضےٰ
قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسِ باوفا
سب دشت گونجتا ہے یہ غصّہ ہے شیر کو
اے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال
غربت پہ ابنِ فاطمہ کی تم کرو خیال
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصّے کو تھام لو
محمل سے گر پڑوں گی زمیں پر میں ننگے سر
یہ نہر کیا ہے جس کے لیئے رنج اس قدر
جنگل مجھے پسند ہے گزری ترائی سے
جلتی زمیں پہ بچّوں کو لیکر رہیں گے ہم
پھر آؤ بس سکینہ کے سر کی تمھیں قسم
پانی بھی اب نہ دیں تو ہمیں کچھ گلا نہیں

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امام
کرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ انام
یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں

ہرچند اس میں کوئی تمھارا نہیں قصور
خیر امتحاں کا دن بھی کچھ ایسا نہیں ہے دور
ادنٰی سے بحث ننگ ہے عالی مقام کا

لے سکتے ہیں ترائی کو تم سے یہ نابکار
جراُت میں تم نہ ایک نہ یہ اہل کیں ہزار
بے آب تیغ دم میں یہ ناری ہلاک ہوں

ہے گرچہ ان کی بے ادبی قابلِ سزا
جنگل ہو یا ترائی ہو ہے ہر جگہ خدا
کرتا ہے عاجزی وہی جو حق شناس ہے

صدقے ترے جلال کے اے میرے آفتاب
تم سے مقابلے کی یہاں ہیں کسے ہے تاب
یہ کیا ہیں تم تو سدِّ سکندر کو توڑ دو

لازم ہے ان پہ رحم یہ اُمت ہیں بے شمار
ان کے لیے حسن نے کیا جبر اختیار
ہو نوجواں مزاج میں غصہ ہے آپ کے

آؤ تمھیں قسم ہے جنابِ امیر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی
کیا دشت کم ہے بہرِ شناگر کے واسطے

عباس اُدھر غضب میں بڑھے سوئے فوجِ شام
بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

ناحق فساد کرتے ہیں تم سے یہ بے شعور
جانے دو جاہلوں سے یہ تکرار کیا ضرور
بس خامشی جواب ہے ان کے کلام کا

کس پر یہ خشم اے شہِ مرداں کے یادگار
بخشا ہے ہر طرح کا تمھیں حق نے اختیار
گر منہ سے اُف کرو تو ابھی جل کے خاک ہوں

پر تم پسر رحیم کے ہو بخشدو خطا
مظلوم کو غریب کو غصے سے کام کیا
ہم کو نبی کی روحِ مطہر کا پاس ہے

یاد آگیا مجھے اسد اللہ کا عتاب
جعفر ہو دبدبے میں شجاعت میں بو تراب
لو ہم کو چاہتے ہو تو دریا کو چھوڑ دو

کرتے تھے مصطفٰے انھیں بیٹوں کی طرح پیار
دشمن پہ بھی رہا کرمِ شبیرِ کردگار
بیٹا وہ ہے قدم بہ قدم ہو جو باپ کے

بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
سب سے جدا ہی چاہیے منزل فقیر کی
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

تھوڑے سے بستروں کی ہو درکار ہم کو جا
ہے عمر بے ثبات زمانہ ہے بے وفا
اب وہ کہاں ہیں شہر جنھوں نے بسائے ہیں
آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور
حکم خدا ہے حکم شہنشاہ بحر و بر
میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
اترے گی آکے نہر پہ اب شام کی سپاہ
اس دشت میں نہ اور ہے چشمہ کوئی نہ چاہ
اس فکر میں غلام کا دل آب آب ہے
گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
لو اب اٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا
وہ شیر ہو کہ دھاک ہے ساری خدائی میں
اس قوم سے نہ رد و بدل چاہیئے تمھیں
قرب خدائے عز و جل چاہیئے تمھیں
بھائی جگہ مزاروں کی پہچانتا ہوں میں
ہے منکشف امام پہ احوال بحر و بر
صدمہ ہے دل پہ کیا میں کہوں تم سے بے خبر
دولت لٹے گی یاں اسد کردگار کی

جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا
آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
سب اس زمیں پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
چپ ہو گئے قریب جب آئے شہ امم
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے
کہہ دیجے ان سے کاٹ کے لے جائیں میرا سر
اب کچھ کہوں زباں سے کیا تاب کیا جگر
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا
پانی بھی ہم پہ بند کریں گے یہ روسیاہ
سب قافلہ حضور کا ہو جائے گا تباہ
پر عین مصلحت ہے جو حکم جناب ہے
کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا
دریا کو تم تو لے چکے اے مہر مہ لقا
دیکھو کوئی تمھارے سوا ہے ترائی میں
غصہ نہ یہ ہی نہ جدل چاہیئے تمھیں
جو ہم کہیں اسی پہ عمل چاہیئے تمھیں
جو ہوگا اس زمیں پہ وہ سب جانتا ہوں میں
حق نے کیا ہے واقف اسرار خشک و تر
قبضہ تمھارا تا بہ قیامت ہے نہر پر
بھیا یہی جگہ ہے تمھارے مزار کی

ہوتا ہے کیا ہزار کہیں ساکنانِ شام
بخشا ہے تم کو خالقِ اکبر نے یہ مقام
کہتے ہیں اس زمین پہ ملک آکے صبح و شام
یاں ہوگی قبر حضرتِ عباس نیک نام
دیندار گرد قبر کے بستی بسائیں گے
شہروں سے لوگ یاں کی زیارت کو آئیں گے

سچ ہے کہ ہاتھ آپ کے آئی ہے کیا جگہ
پیارے ہمارے بھائی کو بھائی ہے کیا جگہ
ٹھنڈی ہوا میں سونے کو پائی ہے کیا جگہ
کیا سبزہ کیا نفیس ترائی ہے کیا جگہ
لنگر ہو تم نجات کی کشتی کے واسطے
لازم ہے قربِ نہر بہشتی کے واسطے

آداب اپنی قبر کی جا ہم تمھیں دکھائیں
مقتل ہیں نخل بھی نہیں سایہ کہاں سے لائیں
قسمت میں یہ لکھا ہے کہ جنگل کی دھوپ کھائیں
چالیس روز تک نہ کفن اور نہ غسل پائیں
میدان ہو اور لاشِ حسین غریب ہو
بھائی قریب ہو نہ ترائی قریب ہو

عباس آب دیدہ ہوئے سن کے یہ کلام
بھائی کا ہاتھ ہاتھ میں لیکر چلے امام
فرمایا واں پہونچ کے جو تھا قتل کا مقام
دیکھو حسین ہوگا یہیں قتل تشنہ کام
بھائی مقامِ خیمۂ آلِ عبا ہے وہ
باہر ہے جو نشیب سے تربت کی جا ہے وہ

رونے لگے پکار کے عباس نامدار
شہ نے کہا کہ ضبط کرو تم پہ میں نثار
سن پاوے گی جو زینبِ بیکس یہ حالِ زار
مر جاوے گی تڑپ کے ابھی وہ جگر فگار
مجھ کو بہت خیال ہے زہرا کی جائی کا
مرنا کوئی بہن نہ سنے اپنے بھائی کا

قدموں پہ سر جھکا کے یہ بولا وہ نیک نام
ارشاد یہ تو کیجیے اے قبلۂ انام
پہلے مرے گا آپ سے یہ باوفا غلام
رو کر کہا کہ ہاں یہی ہوئے گا لاکلام
مجبور ہے کہ بھائی کو ہاتھوں سے کھوئیں گے
روؤ گے تم نہ ہم کو ہمیں تم کو روئیں گے

مژدہ یہ سن کے شاد ہوا وہ اسیرِ غم
سجدہ کیا کہ بھائی سے پہلے مریں گے ہم
ریتی پہ آکے گاڑ دیا شیر نے علم
برپا ہوئے خیامِ شہِ آسماں حشم
ذرے نجوم بن گئے سارے زمین پہ
اترے خدا کے عرش کے تارے زمین پہ

کھینچا فلک پہ خیمۂ زنگار گوں نے سر
روشن ہوئے کلس کی تجلّی سے دشت و در
تارِ شعاع تھے کہ طنابیں تھیں جلوہ گر
پردا حرم کا تھا کہ قناتیں اِدھر اُدھر
جنگل کا اوج ہوگیا خیمہ کی شان سے
پلّہ زمیں کا اُٹھ کے ملا آسمان سے

تھا اُس کے ارتفاع میں کرسی کا سا جو طور
سکّانِ عرش دیکھتے تھے فرش کو بغور
شمسے کا اوج اوج تھا خیمے کا دور دور
گویا کہ آسماں کے تلے آسماں تھا اور
سر جا ملا جو شمسۂ کیواں جناب کا
سونا اُتر گیا ورقِ آفتاب کا

خیمے میں جا چکے جو حرم باصد احترام
ڈیوڑھی پہ آ کھڑے ہوئے عباسِ نیک نام
کمریں اِدھر کھلیں اُدھر اُتری سپاہِ شام
بھائی کو لے کے خیمہ میں داخل ہوئے امام
اُمڈا تھا دل جو سبطِ نبیؐ کی جدائی سے
زینب لپٹ کے رونے لگی چھوٹے بھائی سے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن
صدقہ اُتارو کچھ مرے بھائی پہ اے بہن
تھے دس ہزار مستعدِ جنگ تیغ زن
جیتا ہیں زخمی ہوتے جو عباسؑ صف شکن
آزردہ ہیں کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا
دیکھو ابھی تلک نہیں ابرو سے بل گیا

لیکر بلائیں کہنے لگی وہ جگر فگار
کیا جی میں آگئی تھی یہ بھیّا بہن نثار
محمل میں میں تو سر کو پٹکتی تھی بار بار
صدقے کروں وہ نہر لٹیں جس پہ نابکار
پیارا ہے اُنھیں جنھیں پانی عزیز ہے
بھیّا ہمیں تمھاری جوانی عزیز ہے

منہ رکھ کے منہ پہ بالی سکینہ نے یہ کہا
عاشق کو میرے پھیر کے لایا مرا خدا
روتی تھی میں سُنی بھی نہ تم نے مری صدا
بس اب کہیں نہ جائیو اچھے مرے چچا
اِس بیکسی میں دلبرِ زہرا کا کون تھا
آتے نہ تم تو پھر مرے بابا کا کون تھا

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش بیان
غصّے میں ان کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
ہر بات میں ہے شیرِ الٰہی کی آن بان
یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں
یہ تو فقط حسین کے صدقے میں جیتے ہیں

فرمایا شہ نے بھائی سے اب کھولیے کمر
زینب نے لے لی ہاتھ سے شمشیر اور سپر
بیٹھے نہ تھے ابھی کہ یہ اکبر نے دی خبر
فوج اور آئی شام سے یا شاہِ بحر و بر
مجمع غضب سپاہ کا دریا کے پاس ہے
شہ نے کہا کہ ہونے دے تمھیں کیا ہراس ہے

آخر ہوا وہ دن تو ہوئی رات کو یہ دھوم
آ پہونچا لے کے فوجِ گراں ابنِ سعدِ شوم
اک لاکھ سے سوا ہیں جوانانِ شام و روم
آفت کی ہے یہ بھیڑ قیامت کا ہے ہجوم
کیسا شمار حصر نہ تھا انتہا نہ تھی
دیکھا جو صبح کو کہیں بستر کی جا نہ تھی

آمد اسی طرح رہی لشکر کی روز و شب
نرغے میں آ گیا پسرِ سیدِ العرب
گرمی میں ساتویں سے ہوئی شدتِ تعب
پانی مسافروں پہ ہوا بند ہے غضب
مرجھا گیا چمن شہِ گردوں جناب کا
شور آٹھویں سے ہونے لگا آب آب کا

غش تھے ہم کو پیاس سے اطفالِ شاہِ دیں
جز آبِ اشک پانی کا قطرہ کہیں نہیں
تھا دودھ خشک پیٹتی تھی بانوے حزیں
دم توڑتا تھا جھولے میں اصغر سا نازنیں
خندق میں گرد خیمے کے آتش بھڑکتی تھی
باقر تڑپ رہا تھا سکینہ بلکتی تھی

رونے میں وہ پہاڑ سا دن جب ہوا تمام
آئی سیہ بلا کی طرح شامِ تیرہ فام
شب تھی مسافروں کے لیے موت کا پیام
غل تھا کہ ایک رات کے مہماں ہیں امام
مل لو جنابِ فاطمہ کے نورِ عین سے
خالی سحر کو ہوگا زمانہ حسین سے

لکھوں سیاہی شبِ عاشور کا جو حال
دفتر سیاہ ہوں شبِ دیجور کی مثال
چھایا ہوا تھا ابرِ غم و حسرت و ملال
کھولے تھے اہلِ بیتِ محمد سروں کے بال
پیاسوں سے پوچھو رات وہ کیونکر بسر ہوئی
بس مختصر یہ ہے کہ غضب کی سحر ہوئی

مطلع دوم

گردوں پہ جب بیاضِ سحر کا ورق کھلا
یعنی کتابِ ذکرِ خدا کا سبق کھلا
بزمِ جہاں میں دفترِ نظم و نسق کھلا
ظلمت نہاں ہوئی درِ باغِ شفق کھلا
پہونچا فلک پہ ماہ کو حکم انقلاب کا
موجِ ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا

ہونے لگے چراغِ نجوم آسماں پہ گل
قرنا پھکی سپاہِ عدو میں بجا دہل
برپا ہی سینیوں میں ہوا یاں اذاں کا غل
پڑھنے لگے نماز شہنشاہِ جزو و کل
قدسی ہوئے نثار جماعت کی شان پر
نعرے نمازیوں کے گئے آسمان پر

سجدوں میں یاں جھکے تھے ابھی عابدوں کے سر
فوجِ ستم میں ہو گئیں صف بندیاں اُدھر
دو چار تیر آ کے گرے جب قریبِ در
حضرت پہ آ کے روک لی عباسؑ نے سپر
کی عرض سرکشی پہ یہ سب فوجِ شام ہے
فرمایا آپ نے یہ اجل کا پیام ہے

پھر بیٹھے جا نماز پہ شاہِ فلک وقار
شانہ کیا محاسنِ اقدس میں چند بار
سر پر رکھا عمامۂ محبوبِ کردگار
پہنی قبا سے خسروِ عالم بہ افتخار
پیدا ہوئے تھے خلق میں رحمت کے واسطے
باندھی کمر شفاعتِ امت کے واسطے

رخصت کو اہلِ بیتِ نبی میں گئے امام
قدموں پہ لوٹنے لگیں سیدانیاں تمام
وہ شورِ الفراق کا وہ یاس کے کلام
بچے بھی سر پٹکتے تھے لے لے کے شہ کا نام
روتے تھے یوں تو لپٹے ہوئے سب حسینؑ سے
لیکن کلیجے پھٹتے تھے زینبؑ کے بین سے

روتے تھے ماں کے پہلو میں زینبؑ کے نونہال
پر غم میں بھائی کے اُسے مطلق نہ تھا خیال
گرنے میں تھامتے تھے جو ماں کو وہ خوش خصال
کہتی تھی مرنے جاتا ہے خیر النسا کا لال
قربان جاؤں منہ نہ پھرانا لڑائی سے
ہشیار رہیو بہرِ خدا میرے بھائی سے

قاسم سے کوئی کہتی تھی اے میرے نوجوان
چھپ جائے گی اب آنکھوں سے یہ حسن کی شان
اک سو تھا مادرِ علی اکبر کا یہ بیان
اٹھارھویں برس میں بچھڑتے ہو میری جان
رخصت کو ماں سے آئے ہو زلفیں سنوار کے
چڑھنا جہاد پر مجھے صدقے اُتار کے

دیکھا گیا نہ شاہ سے سیدانیوں کا حال
بس الوداع کہہ کے چلا فاطمہ کا لال
باہر جو آئے روتے ہوئے شاہِ خوش خصال
دیکھا کہ فوج سب ہے مسلح پئے جدال
جھک کر سلام غازیوں نے باادب کیا
گھوڑا سوارِ دوشِ نبیؐ نے طلب کیا

آیا عجب شکوہ سے شبدیز تیز گام
طاؤس و کبک دیکھتے تھے جلوۂ خرام
دامن قبا کا رکھ کے کمر میں بڑھے امام
عباس نے رکاب کو تھاما با احترام
چھوٹی قدم سے ہیں یہ ہوا غم زمین کو
جبریل جھاڑنے لگے شہپر سے زین کو

حاصل ہوا جو فیضِ قدم بوسیِ جناب
اللہ ری ضیا مہِ نو بن گئی رکاب
روشن تھے بدر سے سمِ اسپِ صبا شتاب
ثابت تھا صدر زیں سے کہ ہے برجِ آفتاب
انساں تو کیا ہیں دیدۂ انجم بھی بند ہیں
تارِ شعاع موئے ایالِ سمند ہیں

کس اوج سے خدیوِ زمین و زماں چلا
رہوار کیا زمیں پہ چلا آسماں چلا
لیکر نشاں علیِ ولی کا نشاں چلا
دامن بھرے ہوئے علمِ زرفشاں چلا
اختر نثارِ بخششِ سبطِ رسول تھے
ذرّے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے

سادات کے وہ چہروں کی ضو وہ علم کی شان
تکتا تھا اُس زمیں کے ستاروں کو آسمان
وہ برچھیاں سنبھالے ہوئے ہاشمی جوان
رَن میں نہ مرتے مرتے گئی جن کی آن بان
وار اُن کے معرکے میں ہزاروں پہ چل گئے
قبضے چھٹے نہ ہاتھوں سے اور دم نکل گئے

پہونچے جو اس شکوہ سے وہ غازیانِ دیں
گاڑا سپاہِ کفر کے آگے نشانِ دیں
اللہ رے جلوۂ قمرِ آسمانِ دیں
روشن تھا جس کے نور سے سب خاندانِ دیں
افروختہ تھا چہرۂ اقدس جناب کا
شوکت تھی عرش کی تو جلال آفتاب کا

چلّوں میں جوڑنے لگے واں تیر اہلِ شر
سینے حسینیوں نے ادھر کر دیئے سپر
لشکر سے چند گام بڑھے شاہِ بحر و بر
حجّت تمام کی پہ نہ سمجھے وہ بدگہر
مطلق نہ کی تمیز خطا و صواب میں
تیر آئے سرکشوں کی طرف سے جواب میں

عباس نے کہا کہ ہوا پر ہیں یہ شریر
مولا کہاں کلامِ نصیحت کہاں یہ تیر
خاموش ہیں ادب سے جوانانِ بے نظیر
موقع بس اب ہے جنگ کا اے آسماں سریر
کیا قدرتِ خدا ہے کہ روباہ شیر ہوں
جب اُن سے چھین لے کوئی دریا تو شیر ہوں

بولے حبیب رحم کی بھی انتہا ہے اب
گزرے ہیں سات روز کہ ہے روح پر تعب
کٹ جائیں بیاسے حلق ادا سر سے دین ہو
فرمایا واں کثیر ہے لشکر یہاں قلیل
نزدیک اب ہے کوثر و تسنیم و سلسبیل
ہاں اشتیاقِ خنجرِ قاتل ہمیں بھی ہے
یہ سُن کے شاد شاد ہوئے وہ خوش اعتقاد
تیغیں پکڑ پکڑ کے جو نکلے پئے جہاد
کس آبرو سے فدیۂ راہِ خدا ہوئے
نصف النہار تک تھا یہی شورِ کارزار
رخصت اسے کیا تو اُسے روئے زار زار
ایک ایک نے سعادتِ عقبیٰ حصول کی
لُٹنے لگی علی کی بضاعت دمِ زوال
زینب کے نورِ عین بھی جب کر چکے جدال
ستّر دلیر قتل ہوئے حق کی راہ میں
اُس وقت تھا عجب شہِ دیں پر ہجومِ یاس
لاشے پڑے ہوئے تھے عزیزوں کے آس پاس
اُٹھتا تھا دردِ دل تو قدم لڑکھڑاتے تھے
ہَل مِن مُبارِز کی جو اعدا میں تھی پکار
ڈیوڑھی پہ تھا یہ شور کہ یا شاہِ نامدار
ہے ہے یہ کیسی آگ لگی ہے زمانے کو

دیجے رضا جہاد کی یا شاہِ تشنہ لب
بچوں کو بھوک پیاس میں تیسری ہے شب
اب سلسبیل پر کہیں پہنچیں تو چین ہو
اچھا لڑو کہ خالق کونین ہے کفیل
دے گا مجاہدوں کو خدا رُتبۂ جلیل
درپیش عصر تک یہی منزل ہمیں بھی ہے
رخصت اُنھیں ملی کہ ملا گو ہرِ مراد
میداں سے اُٹھ گئے قدمِ لشکرِ عناد
سر دے کے سب امام کے حق سے ادا ہوئے
مرنے کو یہ چلا وہ تڑپ کر ہوا نثار
جاتے تھے آپ لاش اُٹھانے کو بار بار
دم نکلے سب کے گود میں سبطِ رسول کی
کام آئے رن میں جعفر و مسلم کے نونہال
حضرت کو داغ دے کے سدھارے حسن کے لال
دو تشنہ کام رہ گئے ساری سپاہ میں
ڈھلنا وہ دوپہر کا وہ آندھی وہ لو وہ پیاس
رو کر فلک کو دیکھتے تھے شاہِ حق شناس
فرما کے یا علی ولی بیٹھ جاتے تھے
بھائی کو دیکھتے تھے کنکھیوں سے بار بار
دوڑو چلی جہاں سے سکینہ جگر فگار
قطرہ نہیں ہے پانی کا منہ میں چوانے کو

گردن جھکائے چپ تھے شہنشاہِ بحر و بر
لب برگ گل سے خشک تھے رخ آنسوؤں سے تر
صدمے سے ہاتھ ملتے تھے عباسِ نامور
پانی تھا غم سے اکبرِ ذی جاہ کا جگر
تلخ اُن کو زیست تھی اُنھیں سر بار دوش تھا
دونوں دلاوروں کو شجاعت کا جوش تھا

بڑھ کر چچا سے کہتے تھے اکبر یہ دم بدم
رخصت کو عرض کرتے ہیں اب شاہِ دیں سے ہم
فرماتے تھے اشارے میں عباسِ ذی حشم
کہیو نہ کچھ تمھیں سرِ شبیر کی قسم
پہلے فدا وہ ہوگا جو خدمت گزار ہے
مر لے یہ جاں نثار تو پھر اختیار ہے

یہ کہہ کے رکھ دیا قدمِ شاہِ دیں پہ سر
حضرت سمجھ گئے کہ اب ان کا بھی ہے سفر
صدمے سے قلب ہل گیا تھرا گیا جگر
طاقت نے تن سے کوچ کیا جھک گئی کمر
کیا سنبھلے جس پہ ظلم کا یوں آسماں گرے
دل تھام کر زمیں پہ امامِ زماں گرے

بھائی کے سر کو چھاتی سے لپٹا کے یہ کہا
بتلاؤ کیا ارادہ ہے اے میرے مہ لقا
دستِ ادب کو جوڑ کے بولا وہ باوفا
پیاسی سکینہ مرتی ہے یا شاہِ کربلا
گزرے ہیں تین دن یوہیں اُس خوش صفات پر
گر اذن ہو تو پانی کو جاؤں فرات پر

بولے بہا کے اشک امامِ فلک جناب
یہ موت کا پیام ہے بچوں کا اضطراب
صابر ہے ہر اک بلا میں ہے فرزندِ بوتراب
اچھا یہ ہے صلاح تو کیجیے تلاشِ آب
مشتاق آپ پہلے سے جنگ و جدل کے ہیں
پانی کہاں کا سب یہ بہانے اجل کے ہیں

کیا اختیار خیر دغا دیجیے ہمیں
جینے کی کوئی شکل بتا دیجیے ہمیں
ملیئے گا اب کہاں یہ پتا دیجیے ہمیں
رولیں لپٹ کے اتنی رضا دیجیے ہمیں
بھائی کی زیست قوتِ بازو کے ساتھ ہے
پوچھو ہمارے دل سے کہ برسوں کا ساتھ ہے

یہ کہہ کے اس طرح ہوئے شہ نوحہ گر
روئے جوان پسر کے لیے جس طرح پدر
رخصت کی اہل بیت کو بھی ہو گئی خبر
گھبرا کے آئی بالی سکینہ قریبِ در
چلائی عمو جان ادھر آکے جایئے
دیدار آخری تو مجھے دکھلا کے جایئے

یاں چڑھ چکے تھے گھوڑے پہ عباسِ حق شناس
آئے صدا بھتیجی کی سنتے ہی در کے پاس
بولی یہ مشک دے کے سکینہ پدر دو پاس
قربان عمو جان بجھا دو ہماری پیاس
پھکتا ہے دل عطش سے کلیجہ کباب ہے
سقائی کیجیے کہ یہ کارِ ثواب ہے

عباس نے کہا کہ مرا فخر ہے یہ کام
بی بی تمھارے باپ کا ادنیٰ ہوں میں غلام
دی تم نے آبرو مجھے اے دخترِ امام
اب ہو گیا جہاں میں بہشتی ہمارا نام
کوثر میں سمجھوں خوش پہ گر مشک آب ہو
تم بھی دعا کرو کہ چچا کامیاب ہو

کہہ کر یہ بات باگ اٹھائی سمند کی
صورت بدل گئی فرسِ سربلند کی
چھل بل ہرن کی تیز پری تھی پرند کی
سرعت بلا میں لیتی تھی ہر جوڑ بند کی
بجلی چمک کے چھپ گئی پارا تڑپ گیا
جنگل میں یوں اڑا کہ چکارا تڑپ گیا

مرکب قدم زمیں پہ نہ رکھتا تھا ناز سے
بجلی کو خوف کہا ہے نشیب و فراز سے
چالاکیاں دکھاتا تھا کس امتیاز سے
اڑتا تھا پر صدا نہ نکلتی تھی ساز سے
راکب وہ ہیں جو فرقِ دو عالم کے تاج ہیں
گھوڑا بھی جانتا ہے کہ نازک مزاج ہیں

وہ تھوتنی وہ ابلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال
گویا کھلے تھے حور کے گیسو ہری کے بال
وہ جلد وہ دماغ وہ سینہ وہ سم وہ چال
دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال
وہ قصرِ آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر اگر خدا اسے دیتا براق تھا

گھوڑے کی یہ شکوہ وہ شوکت سوار کی
تصویر کھنچی ہوا پہ شہِ ذوالفقار کی
وہ نور وہ چمک علمِ زرنگار کی
خوشبو مہک رہی تھی نسیمِ بہار کی
پنجہ نہ تھا نشان ثریا مآب کا
تھا فرقِ جبرئیل پہ تاج آفتاب کا

بڑھ کر صدا یہ دیتا تھا اقبال دم بدم
افزوں ترا جلال دو بالا ترا حشم
نصرت پکارتی تھی جلو میں قدم قدم
جب تک ہے آفتاب درخشاں رہے علم
مطلب منافقوں کے جو ہیں ملتوی رہیں
یارب ترے حسینؑ کے بازو قوی رہیں

اللہ رے جلالت و شوکت حضور کی
دہشت سے اُٹھ نہ سکتی تھی گردن غرور کی
ہر جا فرس شکوہ دکھاتا تھا طور کی
بجلی قدم قدم پہ چمکتی تھی نور کی
ذرّوں کی ضو سے مہرِ جہاں تاب زرد تھا
مٹی میں یہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا

پہونچا جو اس جلال سے وہ آفتابِ دیں
دیکھا سپاہ کو صفتِ شیرِ خشمگیں
گاڑا جو دبدبے سے علم ہل گئی زمیں
ہٹ ہٹ کے مورچوں سے پکارے یہ اہلِ کیں
غازی ہے صف شکن ہے جری ہے دلیر ہے
ہٹنا نہ تھا ترائی سے جو یہ وہ شیر ہے

گردے کے اپنے سر کی قسم لے نہ جاتے شاہ
دریا سے اس جری کو ہٹا سکتی تھی سپاہ؟
گویا کھڑے تھے تیغ بکف ضیغمِ الٰہ
کیا قہر کی نگاہ تھی اللہ کی پناہ
پلکوں کی تیزیوں سے کلیجے فگار تھے
جنبش بھوؤں کی تھی کہ سروہی کے وار تھے

خود اب تو دی ہے شہ نے اسے رخصتِ جدال
دریا کو ایک حملے میں لے گا یہ خوش خصال
اس کا جلال حیدرِ صفدر کا ہے جلال
سرکش جو لاکھ ہوں تو کرے دم میں پائمال
اُس معرکہ میں بس نہ چلا اس کا بھائی سے
دیکھو یہ شیر اب نہ ہٹے گا ترائی سے

یہ سُن کے تہلکہ صفِ اعدا میں پڑ گیا
ٹوٹا یہ مورچہ وہ رسالہ بگڑ گیا
ہر غول میں عَلَم سے عَلَم جھک کے لڑ گیا
جو رہ گیا نشان وہ خجالت سے گڑ گیا
پل چل میں چٹکیوں سے جو چلّے نکل گئے
اس صف کے تیر سہم کے اُس صف پہ چل گئے

تیغیں کھنچی لیے ہوئے بھاگے جو اہلِ شر
کٹ کر کسی کا ہاتھ گرا اور کسی کا سر
تلواریاں پڑی تھی کسی کی تو واں سپر
برچھی تھی اس شقی کی تو اُس نحس کا جگر
یہ جنگ تھی کہ حشر کوئی جانتا نہ تھا
بیٹے کو باپ خوف سے پہچانتا نہ تھا

گھبرا کے ابنِ سعد نے لشکر کو دی صدا
چھوڑ آئے مورچوں کو شجاعو یہ کیا کیا
اتنا ہراس ناموَر و ننگ کی ہے جا
وہ کون تھے علیؑ سے لڑے جو دمِ وغا
سب مل کے روکتے نہیں اس تشنہ کام کو
کھوتے ہو معرکے میں بزرگوں کے نام کو

قاتل تمھارے جد و پدر کا تھا جو دلیر
کرتے ہیں رستموں کو زبردستیوں سے زیر
بڑھ بڑھ کے یوں لڑو کہ تہمتن بھی گرد ہو
یہ سُن کے سب کو جوش حمیّت کا آگیا
پھرا برِ فوجِ شام لبِ نہر چھا گیا
جو جو تھے منتشر وہ پرے پھر بہم ہوئے
پڑھکر رجز علی ولی کا پسر بڑھا
دریائے قہرِ خالقِ جن و بشر بڑھا
تڑپا جو رخش برق نگاہوں سے گر گئی
کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
اُٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
گرمی سے رن کی ہوش اُڑے وحش و طیر کے
نکلی اُدھر غلاف سے وہ برقِ شعلہ ریز
چمکے شرر بھڑکنے لگی آتشِ ستیز
آیا خدا کا قہر ہر اک روسیاہ پر
چمکی گری تڑپ کے کلیجے ہلا گئی
بھڑکی دلوں میں آگ وہ پانی پلا گئی
دعویٰ تھا خونِ قاسمِ یوسف جمال کا
کھا کھا گئی صفوں کو برابر لڑائی میں
ثابت رہے تھے جن کے قدم ہر لڑائی میں
دو ٹکڑے ہو کے گرتا تھا جو رہوار سے

ہاں غازیو اُسی کا جگر بند ہے یہ شبیر
دشمن کو پا کے واہ یہ کم جرأتی یہ دیر
لو کشتگانِ بدر کا بدلہ جو مرد ہو
ابلیس آکے راہِ ضلالت بتا گیا
شورِ دہل سے رعد کا دل تھرتھرا گیا
پھر سب نشان کھل گئے نیزے علم ہوئے
گویا شکار کھیلنے کو شیرِ نر بڑھا
بہرِ نبرد مالکِ فتح و ظفر بڑھا
آمد خدا کے شیر کی آنکھوں میں پھر گئی
مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے
چلنے میں ذوالفقار تھی جس کی زبان تیز
گھبرا اجل نے بند ہوئے کوچہ گریز
بجلی محیط ہوگئی ساری سپاہ پر
جو تھے ہوا پہ خاک میں اُن کو ملا گئی
جوہر دکھا کے فوج کو ہیرا کھلا گئی
یوں تیغ نے عوض لیا شبیر کے لال کا
ٹھہری نہ بے لہو پیئے دم بھر لڑائی میں
پہلے اُنھیں نے کاٹ گئی سر لڑائی میں
پہ اُٹھ کے داد مانگتی تھی ذوالفقار سے

جس غول پر گری نہ رُکی نہ تھمی کہیں — اک دم بھی کی نہ اُس کی برش نے کمی کہیں
چمکی کہیں کسی پہ کسی جا دَمی کہیں — فوجوں میں لی بتری تھی کہیں برہمی کہیں
کاٹے ہوئے نشاں تھے زمیں پر پڑے ہوئے — ہر جا تھے ضرب تیغ کے جھنڈے گڑے ہوئے

جل جل کے آب تیغ سے کفار مر گئے — پس پس کے بھاگنے میں جفاکار مر گئے
نامی تھے جتنے سب وہ نمودار مر گئے — دو ہاتھ جب اِدھر سے چلے چار مر گئے
غل تھا کہ زلزلے میں زمیں آج رن کی ہے — کہتا تھا شیر ہاں یہ مدد پنجتن کی ہے

جب وار چل گیا سپر آہنیں کٹی — دستانہ کٹ کے ہاتھ کٹا آستیں کٹی
مغفر کٹا دو نیم ہوا سر جبیں کٹی — سینے کو لیکے زیں سے جو اُتری زمیں کٹی
چورنگ تھا فرس تو دوپارا سوار تھا — اللہ رے منہ کہ تیغ نے جانا خیار تھا

آئی جدھر لہو میں سراسر بھری ہوئی — خالی صفوں میں اور سوا اُتری ہوئی
بے جاں تھا جس پہ سایہ فگن وہ پری ہوئی — پھرتی تھی ساتھ ساتھ اجل پر ڈری ہوئی
آنچ اُس کی تھی کہ کوئی کیونکر لگا کے جائے — چھپتی تھی برق بھی کہ ہوا اس کی لگ نہ جائے

بے سر تھا جس کے فرق پہ وہ جانگزا لگی — اک آگ تھی کہ چنبرِ گردن میں جا لگی
چار آئینہ پہ ضربتِ قہرِ خدا لگی — کڑیاں کھلیں زرہ کی جب اُس کی ہوا لگی
برپا تھا شور چار طرف بھاگ بھاگ کا — پانی اثر دکھاتا تھا لوہے کو آگ کا

پلٹی اِدھر سے جب تو اُدھر کا پرا نہ تھا — کاٹے تھے سر پہ فرق بُرش میں فرا نہ تھا
چھلکا ہوا تھا سم بدن اُس کا ہرا نہ تھا — خون سب کا پی گئی تھی مگر دم بھرا نہ تھا
سیلِ فنا تھا جنگ میں کاٹ اُس کی دھار کا — دم خم تھا گھاٹ باڑھ میں سب ذوالفقار کا

گورا وہ ہاتھ اور وہ تلوار کی چمک — تھی صاف تیغِ حیدرِ کرار کی چمک
موجوں پہ عکس ڈالتی تھی دھار کی چمک — اُس پار تک پہونچتی تھی اس پار کی چمک
اک شور تھا کہ آگ لگی آب میں — خشکی میں زلزلہ تھا تلاطم فرات میں

بڑھ بڑھ کے چل رہی تھی جو تلوار چار سو | کشتوں کے بڑھتے جاتے تھے انبار چار سو
تھا رن میں گرم موت کا بازار چار سو | پھرتا تھا جھوم جھوم کے رہوار چار سو
تیغ آئی جس پہ اس کا بھی وار اُس پہ چل گیا | وہ سر گرا گئی تو یہ لاشہ کچل گیا

ثابت ہو جس پہ زد کوئی ایسی کماں نہ تھی | تیر افگنوں کی خوف سے خاطر نشاں نہ تھی
گر میان تھا تو تیغ دمِ امتحاں نہ تھی | یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زباں نہ تھی
جرار سر جھکائے تھے تلوار کی طرح | سرکش خموش تھے لبِ سوفار کی طرح

جب ضرب کی زمیں کے طبق ہل کے رہ گئے | سر اُڑ گئے گاؤں سے گلے مل کے رہ گئے
زخموں کے پھول چار طرف کھل کے رہ گئے | بسمل تڑپ کے سامنے بسمل کے رہ گئے
برہم مزاجِ لختِ دلِ بوتراب تھا | لاشے اُلٹ گئے یہ نیا انقلاب تھا

ممکن نہ تھا کہ ایک کو سو میں اماں ملے | مارا اُنھیں چھپے ہوئے ظالم جہاں ملے
جو نامور بڑے تھے نہ اُن کے نشاں ملے | ریتی پہ گر ملے بھی تو لاشے تپاں ملے
کیوں معرکے میں تیغ دو دم سُرخرو نہ ہو | ایسی جگہ نہ تھی کوئی جس جا لہو نہ ہو

زہرہ کسی کا آب تھا ڈر سے کسی کا دل | بھائی ٹھہر نہ سکتا تھا بھائی کے متّصل
آفت تھی قہر تھی برشِ تیغ جاں گسل | کرتی تھی شکل کو وہ ہیولیٰ سے منتقل
ٹکڑے تھے منہ سزا تھی یہ اعمالِ زشت کی | ہیئت بدل گئی تھی ہر اک بدسرشت کی

ڈوبے لہو میں گھاٹ ستمگار روک کے | دم بھر نہ رک سکا کوئی اک وار روک کے
جب بھاگتا سپر کو سیہ کار روک کے | عباس مسکراتے تھے تلوار روک کے
ٹھہرا جہاں لیا وہیں گھوڑے کو پھیر کے | کوئی شکار بچتا ہی پنجے سے شیر کے

وہ تیغِ شعلہ زا کی چمک وہ فرس کی جست | رستے کھلے ہوئے نہ صفیں وہ نہ بند و بست
بجلی گری پھرا جو ذرا دستِ حق پرست | غارت وہ مورچہ ادھر آفت اُدھر شکست
افسر سے فوج فوج سے افسر چھٹے ہوئے | سب چھاؤنی اُجاڑ محلے لٹے ہوئے

ہر اک علم کی چوبِ ضلالت نشاں کٹی — منہ تیغ کا کٹا تو سناں کی زباں کٹی
ترکش کٹے قلم ہوئے نیزے سناں کٹی — ٹکڑے ہوئی زرہ کمرِ پہلواں کٹی
روحوں کے ساتھ تن تھے نہ روحیں تنوں کے ساتھ — تارِ نفس بھی کٹ گئے تھے گردنوں کے ساتھ

ناری صفوں میں جل گئے جب شعلہ زن ہوئی — چمکی ادھر یہ تیغ تجلّی اُدھر ہوئی
شب کو چمن کھلا جو سپر خوں سے تر ہوئی — سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی
چلائی موت صدقے تری کج ادائی کے — بولی نکل کے روح نثار اس صفائی کے

جب سن سے فوجِ کفر پہ وہ جنگجو چلی — گویا سمومِ قہرِ خدا چار سو چلی
بسمل پھڑک کے رہ گئے یوں تند خو چلی — ٹکڑے اُڑا کے ذبح کیا سرخرو چلی
غل تھا برش یہ قہر کی جوہر بلا کے ہیں — دم بھر میں فیصلہ، یہ کرشمے قضا کے ہیں

جس کے گلے سے مل کے چلی مر کے رہ گیا — بسمل بھی تیغِ تیز کا دم بھر کے رہ گیا
آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا — سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا
دو پُتلیاں بھی بہرِ تماشا کھُلی رہیں — سر کٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کھلی رہیں

کہنی سے دونوں ہاتھ جدا تن سے سر جدا — ہر نخلِ قد کی شاخ جدا اور ثمر جدا
اِس ہاتھ سے جو تیغ تو اُس سے سپر جدا — بھائی سے بھائی اور پسر سے پدر جدا
وہ تہلکے بھی ہولِ قیامت سے کم نہ تھے — کیا تفرقہ پڑا تھا کہ اعضا بہم نہ تھے

اسوار کو گرا کے سنبھلنے نہ دیتی تھی — لاکھوں میں ہاتھ ایک کا چلنے نہ دیتی تھی
برچھیت کو پرے سے نکلنے نہ دیتی تھی — رستم بھی ہو تو ہاتھ بدلنے نہ دیتی تھی
جو اُس کا کام تھا سو وہ پھرتی کے ساتھ تھا — جس کا قدم بڑھا نہ سپر تھی نہ ہاتھ تھا

اُٹھی چلی سپاہ میں آئی جدا ہوئی — پنجہ جو بچ گیا تو کلائی جدا ہوئی
صف کی جدا پرے کی صفائی جدا ہوئی — پیری جگر میں خوں میں نہائی جدا ہوئی
دم توڑتے یا مرے کوئی پروا ذرا نہ تھی — نکلی جو خوں میں پیر کے پھر آشنا نہ تھی

چھپتی تھی برق اس کی چمک دیکھ دیکھ کے
رہ جاتی تھی سما کو سماں دیکھ دیکھ کے
تھرّاتا تھا زمیں کو فلک دیکھ دیکھ کے
خورشید کانپتا تھا جھلک دیکھ دیکھ کے
جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کے جال کا
بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا

تنتی تھی سر تنوں سے جدا دیکھ دیکھ کے
کرتی تھی ناز حشر بپا دیکھ دیکھ کے
بےخود تھی آپ اپنی ادا دیکھ دیکھ کے
چشمک قضا کی تھی کہ ذرا دیکھ دیکھ کے
کہتی تھی تیغ گو کہ سروہی کا ہاتھ ہوں
تو میرے دم کے ساتھ ہے میں تیرے ساتھ ہوں

سب سے جدا اٹھی تیغ کے چلنے کی قطع راہ
اس صف کے ہاتھ پاؤں قلم وہ پرا تباہ
خط جا بجا تھے خاک پہ مابین رزم گاہ
کٹ کٹ کے تیغیں کہتی تھیں اللہ کی پناہ
کترا کے جو پھر آئی ہو چاٹتی ہوئی
چلتی ہے یہ تو راہ کو بھی کاٹتی ہوئی

گھیرا جو یک بیک غضب کردگار نے
گھوڑے بھگا سے فوج ضلالت شعار نے
کھینچا سر آسماں پہ زمیں کے غبار نے
سر پر اڑائی خاک سیہ روزگار نے
دن چھپ گیا یہ گرد پڑی روئے مہر پر
مٹی کا پل بندھا تھا محیط سپہر پر

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے اٹھی برکت اب جہان سے
ڈول گیا زمیں کا طبق آسمان سے

دریا کی فوج گھاٹ سے جب ہٹ گئی تمام
ساحل تک آئے حضرت عباس نیک نام
نعرہ کیا ترائی تو شیروں کا ہے مقام
وہ زور شور کیا ہوا اے ساکنان شام
تم سب کی کیا بساط ہے دامن کی گرد ہو
ہاں اب ہمیں ہٹاؤ تو جانیں کہ مرد ہو

وہ حکم اور تھا کہ نہ تھی بولنے کی تاب
ریتی پہ کیا سپاہ کی مٹی ہوئی خراب
لاکھوں میں اب تو دے کوئی اس تیغ کا جواب
یوں خاک میں ملاتے ہیں فرزند بوتراب
افسوس ابن سعد ستمگار ٹل گیا
پر خیر کچھ بخار تو دل کا نکل گیا

یہ بات کہہ کے ڈال دیا نہر میں سمند
چمکا جو عکسِ روے علمدارِ ارجمند
دریا کے دل میں تھی جو کدورت وہ دھو گئی
جلوے جو نہر میں علمِ سبز نے دکھائے
پانی میں جب کہ شرم سے خورشید ڈوب جائے
ہر سنگ ریزہ نور سے درِ خوش آب تھا
چھاتی تک اُس نے پانی کو دیکھا جو ایک بار
حسرت سے منہ پھرا کے نظر کی طرف سوار
تو پی لے اے فرس کہ بہت تشنہ کام ہے
گردن ہلا کے کہنے لگا اسپِ تیز گام
اُس قوم میں نہیں کہ ڈبو دوں وفا کا نام
مطلب یہ ہے کہ ذکرِ وفا چار سو رہے
ہر چند تین روز سے ہے پیاس کا وفور
پر ہے یہ امر آپ کی دریا دلی سے دور
ناموسِ مصطفےٰ میں تلاطم ہے رات سے
بچّوں کا حال سُن کے لگا دل پہ تیرِ غم
مشکیزہ بھر کے دوش پہ رکھا بچشمِ نم
بڑھتے ہی بحرِ ظلم کی موجوں میں گھر گیا
ہاں راہ روک لو یہ ہوئی چار سو پکار
ڈھالیں بڑھیں بہم کہ اُٹھا ابرِ کوہسار
ہلتا تھا چرخ غلغلۂ دار و گیر سے

طاؤس دُم اُٹھا کے بنا اسپِ سربلند
پانی کی آب و تاب ہوئی چاند سے دو چند
آنکھوں میں مچھلیوں کے چکا چوند ہو گئی
اک شور تھا کہ خضر علیہ السلام آئے
پھر آنکھ میں حباب کی کیا آسماں سمائے
لہریں جو تھیں کرن تو بھنور آفتاب تھا
گھوڑے کا دل ہوا صفتِ موج بے قرار
بولے یہ باگ چھوڑ کے عباسؑ نامدار
ہم پر تو بے حسینؑ یہ پانی حرام ہے
بے ذوالجناح مجھ پہ بھی پانی ہے یہ حرام
آقا ابھی حسینؑ کے بچے ہیں تشنہ کام
تر خشک لب نہ ہوں تو نہ ہوں آبرو رہے
پیتا یہ خانہ زاد بھی پیتے اگر حضور
جائیں بچیں صغیروں کی فکر اس کی ہے ضرور
اب جلد مشک بھر کے نکلیئے فرات سے
روے لہو کے اشکوں سے عباسؑ باکرم
نکلا پلٹ کے نہر سے شبدیز خوش قدم
سقا نبیؐ کی آل کا فوجوں میں گھر گیا
برچھے اُٹھا اُٹھا کے بڑھے سیکڑوں سوار
تیغیں علم ہوئیں کہ بندھا آہنی حصار
حلقہ کسی کماں کا نہ خالی تھا تیر سے

کہتا تھا گرز تول کے ایک ایک پہلوان
بڑھ کر جواب دیتے تھے عباسؑ نوجوان
کیا منہ جو مشک لے کوئی جب تک یہ ہاتھ ہے
طفلی سے تھی ہمیں انھیں عہدوں کی آرزو
اک مشک اک نشانِ شہنشاہِ نیک خو
گر مر گئے تو رنج و الم لیکے جائیں گے

جھپٹے یہ کہہ کے تیغِ دو دستی علم کیے
حملے صفوں پہ صورتِ شبیر و ثرم کیے
سن سن پلٹ کے چلنے میں اکبر جو کٹ گئیں
بوچھار ایک بار ہوئی تیروں کی ہے غضب
یہ شکل دو جہاں کے امیروں کی ہے غضب
نیزے تھے اور چاند سے پہلو دلیر کے

زخمی تھے پر فرس کو ڈپٹتے تھے بار بار
بڑھ بڑھ کے غول فوج کے ہٹتے تھے بار بار
دکھلا رہے تھے رنگ علی کی لڑائی کا
جھکتے علم کو روک کے کہتے تھے بار بار
دیتے تھے دم بدم یہ صدا شاہ ذوالفقار
پانی کے واسطے یہ کبھی رن پڑا نہیں

واحسرتا وہ فوج کا بلوہ وہ ایک جان
لڑنے کی فکر مشک کا دھڑکا علم کا دھیان
چمکی سناں تو رفرح بدن سے رواں ہوئی

رکھدو یہ مشک اے اسد اللہ کے نشان
چہرہ بگاڑ دوں گا سنبھالے ہو زبان
اے بے حمیّتو مری جاں اس کے ساتھ ہے
دونوں امانتیں ہیں یہ اے فوجِ کینہ جو
اس سے جہاں میں نام ہے اور اس سے آبرو
مختار اُن کا جو ہے اُسے دے کے جائیں گے

دونوں طرف کے نیزۂ خطی قلم کیے
تیغِ دو دم سے بند لعینوں کے دم کیے
آدھی صفیں تو بچھ گئیں آدھی اُلٹ گئیں
تیغیں چلیں عقب سے شریروں کی ہے غضب
بجھنے نہ پائی پیاس صغیروں کی ہے غضب
تیروں نے چھان ڈالا تھا سینے کو شیر کے

چہرے پہ زخم کھا کے جھپٹتے تھے بار بار
سرتن سے پانچ سات کے کٹتے تھے بار بار
اعدا کے خوں سے لال تھا سبزہ ترائی کا
قوت عطا کر و مجھے یا شبیر کردگار
بیٹا ترے تھکے ہوئے بازو کے میں نثار
کاندھے پہ مشک لیکے کوئی یوں لڑا نہیں

فاقہ وہ تین دن کا وہ سوکھی ہوئی زبان
جی سن سے ہو گیا کہیں کڑکی اگر کمان
روکا سپر پہ تیر تو خاطر نشاں ہوئی

کھاتے تھے تن پہ زخم کچھ اپنا نہ تھا الم
مضطر تھا مشک کے لیئے وہ صاحب کرم
بہتا تھا خون رکابوں میں تھمتے نہ تھے قدم
قوت کو ضعف ضعف کو قوت تھی دم بدم
اعدا ہدف بنائے تھے کینے سے مشک کو
پر یہ جدا نہ کرتے تھے سینہ سے مشک کو

تلوار ہاتھ میں علم شاہ دوش پر
گرنے پہ گاہ مشک رکھی گاہ دوش پر
اک تیغ تیز چل گئی ناگاہ دوش پر
تلوار کیا پہاڑ گرا آہ دوش پر
صدمہ ادھر تو مشک کا جان حزیں پہ تھا
دیکھا جو پھر کے دست مبارک زمیں پہ تھا

شانے سے یوں اُبل کے بہا خون کہ الاماں
تیورا کے جھومنے لگے عباس نوجواں
مچھلی کی طرح ہاتھ تو ریتی پہ تھا طپاں
لیکن جدا نہ ہوتی تھیں قبضے سے انگلیاں
بے دست ہو گئی تھی جو اس صفدری کے ساتھ
تلوار بھی تڑپتی تھی دست جری کے ساتھ

دہنا تھا ہاتھ تیغ اسی میں تھی ہے ستم
اب تھاما بائیں ہاتھ میں مشکیزہ و علم
تلواریں دو چلیں جو کمیں گاہ سے بہم
اُلجھا ہوا وہ ہاتھ بھی بس ہو گیا قلم
کس سے ہٹائیں فوج کو کس سے دغا کریں
بتلاؤ اب کہ حضرت عباس کیا کریں

ڈر سے قریں تو آ نہ سکا کوئی نابکار
پر تیر سب لگانے لگے باندھ کر قطار
اک تیر لگ کے مشک پہ گزرا جگر کے پار
پانی کے ساتھ سینے سے چھوٹی لہو کی دھار
ہے ہے سکینہ کہہ کے فلک پر نگاہ کی
گرنے پہ سر پٹک کے بہشتی نے آہ کی

گرز ستم سے شق ہوا تا کہ سر جناب
تھرائے ہونٹ چھٹ گئی دانتوں سے مشک آب
فرمایا ہائے دیں گے سکینہ کو کیا جواب
گھوڑے سے تھرتھرا کے گرے مثل آفتاب
تڑپے اُٹھے کراہ کے خاموش ہو گئے
منہ رکھ کے خالی مشک پہ بے ہوش ہو گئے

اِن کا تو یاں ہے کوچ سنو واں کی اب خبر
ڈیوڑھی کے پاس بیٹھے ہیں حضرت برہنہ سر
لپٹا ہوا ہے چھاتی سے عباس کا پسر
روتی ہے سر جھکائے سکینہ قریب در
زینب کھڑی ہے ڈیوڑھی پہ اور دل پہ ہاتھ ہے
بکھرائے بال زوجۂ عباس ساتھ ہے

زینبؑ شاہ سے عرض کرتی ہے وہ کروہ دل فگار
کچھ دم اُلجھ رہا ہے نہیں قلب کو قرار
خیر اب نہیں ہے خیر کے انداز اور ہیں
کس سے کہوں جو دوڑ کے لائے کوئی خبر
یہ ذکر تھا کہ فتح کے باجے بجے اُدھر
ماتم میں نوجواں کے دل اندوہ ناک تھا

رستے میں لڑکھڑاتے تھے جب ضعف سے قدم
فرماتے تھے تڑپ کے پسر سے شہِ اُمم
بازو پکڑ کے دلبرِ زہراؑ کو لے چلو
اک اک قدم پہ ضعف و نقاہت ہے سدِ راہ
جینے رہے تھے ٹھوکریں کھانے کو آہ آہ
شق ہو جگر جو صبر اُدھر سے عطا نہ ہو

ٹھہرو کہ پاؤں اب نہیں قابو میں اے پسر
سینہ لہو ہے دل ہے تپاں چاک ہے جگر
لو اتنے بولنے میں بدن سرد ہو گیا
اس شکل سے ترائی میں پہنچے جو شاہِ دیں
بابا یہی ہے لاشِ علمدارِ مہ جبیں
رکھے ہوئے ہیں مشک پہ منہ پیار دیکھیے

ہے ہے یہ شور نہر پہ کیسا ہے ہیں نثار
گرتی ہے کا پتے ہیں ردا سر سے بار بار
بی بی یہ سب تمہارے رنڈاپے کے طور ہیں
پردا اُٹھا کے اب میں نکلتی ہوں ننگے سر
دوڑے زمیں سے اُٹھ کے شہنشاہ بحر و بر
تلوار ہاتھ میں تھی گریبان چاک تھا

اکبر سنبھال لیتے تھے بابا کو دم بدم
جو حال ہو بجا ہے کہ بھائی کا ہے الم
بیٹا چچا کی لاش پہ بابا کو لے چلو
عباس کیا بچھڑ گئے گھر ہو گیا تباہ
وہ کہتے ہوں گے لاش پہ اب تک نہ آئے شاہ
یارب کسی سے خلق میں بھائی جدا نہ ہو

تم ہاتھ تھامتے ہو جھکی جاتی ہے کمر
اکبر بتاؤ ہاتھ میں رکھوں کدھر کدھر
کیا دکھ ہے یہ کہ میں ہمہ تن درد ہو گیا
رو کر یہ شہ سے کہنے لگے اکبرؑ حزیں
گھوڑا کہیں ہے تیغ کہیں ہے علم کہیں
شانے کٹے ہیں شانِ علمدار دیکھیے

یا مر گئے تڑپ کے مرے انتظار میں
پر منہ سے بولتے نہیں کچھ احتضار میں
آنکھیں کھلی ہیں دیکھ رہے ہیں حضور کو
حضرت پکارے جان بھی ہے جسمِ زار میں
کی عرض دم تو ہے جسدِ زخمدار میں
کیجے ذرا ملاحظہ چہرے کے نور کو

چلائے گر کے لاش پہ شبیرؑ نامدار — بھیا تمہاری نرگسی آنکھوں کے میں نثار
اس نزع میں بھی تھا تمہیں بھائی کا انتظار — آنکھیں بھرا کے ڈھونڈتے ہو ہم کو بار بار
شاید زبان ہی بند ہے جو لب کھولتے نہیں — روتے ہوئے ہم آئے تو آپ بولتے نہیں

مرجائے گا حسینؑ برادر جواب دو — ای میرے نوجوان مرے صفدر جواب دو
اب جاں بلب ہے سبطِ پیمبرؐ جواب دو — ای نورِ چشم ساقیِ کوثر جواب دو
لکنت زبانِ خشک کو ہے تشنہ کام ہیں — بھیا تمہارے سر کی قسم ہم تمام ہیں

سُن لو تمھیں دیا ہے سکینہ نے کچھ پیام — ایسا نہ ہو کہ یاں چلی آوے وہ تشنہ کام
جنبش ہوئی لبوں کو بھتیجی کا سُن کے نام — کی عرض اب غلام کی رخصت ہے یا امام
قدموں پہ آنکھیں ملنے کو دل بے قرار تھا — مولا کے دیکھنے کا فقط انتظار تھا

منہ رکھ کے منہ پہ کہنے لگے شاہ خوش خصال — کیوں چپ ہو کچھ کہو اور کہو اپنے دل کا حال
ان سوکھے ہونٹوں پہ صدقے علی کا لال — بھیا مدد کو آئے ہیں اب شبیرؑ ذوالجلال
رخ کیوں ہے زرد کون سی ایذا گزرتی ہے — کیوں دم بدم کراہتے ہو کیا گزرتی ہے

گودی میں ہے مری دم آخر تمہارا سر — اور ہائے نتی جوان بھتیجا ہے نوحہ گر
گزرے گی ہم پہ جو تمھیں اُس کی بھی ہے خبر — سینہ پہ ہوگا تیغ لیے شمرِ بد گہر
شمشیر حلقِ خشک پہ چلتی ہے کس طرح — دیکھیں ہماری جان نکلتی ہے کس طرح

یہ بات سُن کے نزع میں عباسؑ تھرتھرائے — قطرے لہو کے آنکھوں سے عارض پہ بہہ کے آئے
دو بار سر پٹک کے پکارے کہ ہائے ہائے — پرخوں دہن حسینؑ کے قدموں کے پاس لائے
ہچکی کے ساتھ موت کا خنجر بھی چل گیا — سر پاؤں پر دھرا رہا اور دم نکل گیا

اکبر نے عرض کی کہ چچا جان مر گئے — جھک کر پکارے شاہ کہ بھیا کدھر گئے
منہ تو اٹھاؤ خاک سے رخسار بھر گئے — واحسرتا حسینؑ کو بے آس کر گئے
اب کون دے گا دکھ میں نبی کے پسر کا ساتھ — دم بھر میں تم نے چھوڑ دیا عمر بھر کا ساتھ

ای میرے شیر صف شکن ای میرے نوجواں
پاؤں گا تم سا چاہنے والا میں اب کہاں
شبیر خدا کا آج جہاں سے مٹا نشاں
تم کو حسین جانتا تھا اپنے تن کی جاں
تیغوں میں اب سپر نہیں بھائی کی ہوتے ہو
بازو کٹائے شیر سے دریا پہ سوتے ہو

آتے ہی بھا گئی تھی ترائی کی جا تمھیں
اللہ کیا پسند تھی یاں کی ہوا تمھیں
بخشی خدا نے قبر بھی سب سے جدا تمھیں
آخر وہی ہوا کہ جو منظور تھا تمھیں
اتنی جگہ کے واسطے بچھڑے حسینؑ سے
بھیا ہوا اُسے سر دیں اب سوؤ چین سے

قسمت میں ہے کہ دھوپ میں جنگل کی او رہم
کیا تفرقہ دکھایا ہے گردوں نے ہے ستم
کیا خوب ہو اگر یہیں نکلے ہمارا دم
اُلفت یہ چاہتی تھی کہ قبریں بھی ہوں بہم
رو میں سرہانے بیٹھ کے جو سوگوار ہوں
ہم دونوں بھائیوں کے برابر مزار ہوں

آئی صدا یہ حضرتِ خاتونِ روزگار
ہے ہے جہاں سے اُٹھ گیا ایسا وفا شعار
ای میرے لال تیرے تڑپنے کے میں نثار
میرا پسر ہے آج سے عباسِ نامدار
بیٹا بلائیں لاش کی لینے کو آئی ہوں
پرسا اٹھا کے بھائی کا دینے کو آئی ہوں

وارث تم اب یہ مشک و علم لیکے جاؤ گھر
ایسا نہ ہو نکل پڑے زینبؑ برہنہ سر
چلائے تب یہ رو کے شہنشاہِ بحر و بر
اماں کمر تو ٹوٹ گئی جائیں اب کدھر
ہم مر گئے کہ خلق سے بھائی گزر گیا
بازو ہمارا اٹھانے والا تو مر گیا

اکبر سے پھر کہا کہ علم خاک سے اُٹھاؤ
پُرخون یہ مشک خیمۂ عصمت میں لیکے جاؤ
بیوہ ہوئی پھپھی اُسے پُرسا دو خاک اُڑاؤ
بیٹا چچا کے بچوں کو جا کر گلے لگاؤ
پوچھیں جو سب کہ سبطِ پیمبر کدھر گئے
کہہ دیجیو کہ بھائی کے لاشے پہ مر گئے

اکبرؑ یہ شہ سے سُن کے جو روئے بصد بکا
تڑپے اِک آہ کر کے شہنشاہِ کربلا
ناگاہ آئی در سے سکینہ کی یہ صدا
بابا میں اب نکلتی ہوں گھر سے برہنہ پا
روتے ہیں آپ کیوں مرے عموؑ کدھر گئے
حضرت نے دی صدا کہ جہاں سے گزر گئے

فرما کے یہ زمین سے اُٹھے شاہِ انس و جاں
رو کر علم سے باندھی وہ مشکِ خوں چکاں

پہونچے حرم سرا کے جو نزدیک ناگہاں
سر پیٹ کے سکینہ نے تب یہ کیا بیاں

اندھیر ہی جہان مجھے کچھ سوجھتا نہیں
ہی ہی علم تو آیا ہی میرا چچا نہیں

ڈھونڈوں کہاں ہیں ہی مرے عمو کدھر گئے
مجکو پتا دیا نہ وہاں کا جدھر گئے

دریا سے مشک بھیجدی اور خود گزر گئے
پانی پیا نہ تشنہ دہن کوچ کر گئے

شانے کٹے تھے مشک بھی تیروں سے کٹ گئی
وہ کیا کریں ہماری ہی قسمت الٹ گئی

غل پڑ گیا کہ شہ کے علمدار ہائے ہائے
ای نورِ چشم حیدرِ کرّار ہائے ہائے

ای ابنِ فاطمہؑ کے مددگار ہائے ہائے
ای فوجِ شہ کے جعفرِ طیار ہائے ہائے

چھوٹے سے ہاتھ رکھ کے دلِ دردناک پر
دے مارا سر کو بالی سکینہ نے خاک پر

حضرت نے لاکے گاڑ دیا صحن میں علم
اور گر پڑے زمیں پہ شہنشاہِ باکرم

سب سے کہا کہ جینے نہ دیگا ہمیں یہ غم
جن سے جدا نہ ہوتے تھے کھوآے اُن کو ہم

پوچھو ہمارے دل سے مصیبت جدائی کی
بھائی ہی جانتا ہی محبت کو بھائی کی

بھائی سے ساتھ بھائی کا چھوٹا ہزار حیف
چھوٹا نہ پھل نہ پھول نہ بوٹا ہزار حیف

بازو مرا قوی تھا سو ٹوٹا ہزار حیف
اُمّت نے میرے باغ کو لوٹا ہزار حیف

فریاد ہی لعینوں نے ہم پر ستم کیا
تیغوں سے سروِ باغِ علی کو قلم کیا

زیرِ علم تھا زوجۂ عباسؑ کا یہ حال
ماتھا بھرا تھا خاک سے بکھرے ہوے تھے بال

چلاتی تھی یتیم ہوے میرے دونوں لال
دنیا سے کھو گئے مجھے عباسِ خوش خصال

ہی ہی علی کا نورِ نظر مجھ سے چھٹ گیا
میں رانڈ ہو گئی مرا اقبال لُٹ گیا

ناگہ صدا علی کی یہ آئی کہ ای بہو
زانو پہ تھا مرے سرِ عباسِ نیک خو

آئی ہی تیرے پُرسے کو زہرا کشادہ مو
بی بی بس اب حسینؑ کو رو کر رُلا نہ تو

بھائی کے غم میں لال مرا دردمند ہی
اب صبر کر کہ صبر خدا کو پسند ہی

ہاں روؤ مومنو یہ بکا کا مقام ہے
اب رخصت حسین علیہ السلام ہے
موت آئی تو شریک عزا کون ہووے گا
آگے تمہارے مرتے جو عباس با وفا
تم سب کو دیکھتے ہیں شہنشاہ کربلا
سمجھو شریک بزم شہ مشرقین کو

یہ کہہ کے ہائے حضرت عباس خاک اڑاؤ
ہائے ہائے حسین کہہ کے زمیں پر پچھاڑیں کھاؤ
کل خاک میں ملائیں گے اس تشنہ کام کو

اے بے دیار و بے سر و سامان الوداع
اے دو جہان کے سید و سلطان الوداع
آہ و بکا سے ہم کبھی غافل نہ ہوئیں گے

مولا ضریح پاک پہ بلوائیے شتاب
رہ جائے گی ہوس جو دیا زیست نے جواب
اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے

تم ہیں شریک روح رسول انام ہے
چہلم کی مجلسوں کا بھی آج اختتام ہے
جو سال بھر جیے گا وہ پھر تشنہ کو روئے گا

پرسا نہ دیتے سبط رسول خدا کو کیا
زہرا ابھی ننگے سر ہے قیامت ہے بپا
دے لو جوان بھائی کو پرسا حسین کو

پیٹو سروں کو ہاتھوں سے اور اشک خوں بہاؤ
پرسا پسر کا فاطمہ زہرا کو دے کے جاؤ
رخصت کرو حسین علیہ السلام کو

اے بنت مصطفےٰ کے دل و جان الوداع
اے شیعیان ہند کے مہمان الوداع
جب تک جئیں گے آپ کی غربت پہ روئیں گے

اب ہجر کی انیس کے دل کو نہیں ہے تاب
خاک شفا ملے مجھے یا ابن بوتراب
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کے ضریح سے

رباعی

گھر میں ڈھونڈو نہ انجمن میں ڈھونڈو
مرقد میں نہ ڈھونڈو نہ کفن میں ڈھونڈو
گلزار نجف میں مدح خواں ہوگا انیس
بلبل کو جو ڈھونڈو تو چمن میں ڈھونڈو

مرثیہ (۵)

بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر — ایک ڈلاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر
نارِ دوزخ سے ابوذر کی طرح حُر تھا حُر — گوہرِ تاجِ سرِ عرش ہو وہ در تھا حُر
ڈھونڈھ لی راہِ خدا کام بھی کیا نایاب ہوا — پاک طینت تھی تو انجام بھی کیا نیک ہوا

واہ رے طالعِ بیدار زہے عزت و جاہ — حُر پہ کیا فضلِ خدا ہو گیا اللہ اللہ
پیشوائی کو گئے آپ شہِ عرش پناہ — خضرِ قسمت نے بتا دی اُسے فردوس کی راہ
مدتوں دور رہے جو وہ قریب ایسا ہو — بخت ایسے ہوں اگر ہو تو نصیب ایسا ہو

نار سے نور کی جانب اُسے لائی تقدیر — ابھی ذرہ تھا ابھی ہو گیا خورشیدِ منیر
شافعِ حشر نے خوش ہو کے بحل کی تقصیر — تکیہ زانوئے شبیر ملا وقتِ اخیر
اوج و اقبال و حشم فوجِ خدا میں پایا — جب ہوا خاک تو گھر خاکِ شفا میں پایا

اللہ اللہ حُرِ صفدر و غازی کا نصیب — جانِ محبوبِ الٰہی جسے فرمائے حبیب
ہجر میں لطفِ ملاقات کا دوری میں قریب — وہی کام آتے ہیں محسن کے جو ہوتے ہیں نجیب
صدقے ہو جائے اسے عشقِ دلی کہتے ہیں — اس کو دنیا میں سعیدِ ازلی کہتے ہیں

آیا کس شان سے کعبہ کی طرف چھوڑ کے دیر — کوئی حضرت کا یگانہ کبھی نہ سمجھا اُسے غیر
حق نے لکھ دی تھی جو تقدیر میں فردوس کی سیر — فتنہ و شر سے بچا ہو گیا انجام بخیر
ذکرِ خیر اُس کے موئے پر بھی ہوئے جاتے ہیں — عملِ نیک ہر اک وقت میں کام آتے ہیں

کفر کی راہ سے کارہ تھا جو وہ نیک طریق — کس بشاشت سے ہوا رہبرِ ایماں کا رفیق
تھے تو لاکھوں پہ کسی کو بھی ہوئی یہ توفیق — خُلق طینت میں ہے جن کے وہی ہوتے ہیں خلیق
اوجِ دیندار کو بے دین کو سدا پستی ہے — اصل جس تیغ کی اچھی ہے وہی کستی ہے

کیوں نہ بالیدہ ہو اُس کا چمنِ جاہ و جلال
جس کو سرسبز کرے خود اسداللہ کا لال
ہو گیا فاطمہؑ کے باغ میں آتے ہی نہال
وہ ثمر پائے کہ پہونچے نہ جہاں دستِ خیال
کھل گیا غنچۂ دل عذر جو منظور ہوئے
صورتِ برگِ خزاں دیدہ گنہ دور ہوئے

حُر کہاں اور کہاں احمدِ مرسل کا خلف
بخت نے دَیر سے پہونچا دیا کعبہ کی طرف
دِل صفا ہو گیا سینے میں تو پائے شرف
جب کہ آنکھیں ہوئیں حق بیں تو ملا دُرِّ نجف
نیک جو امر ہیں دل پر وہی ٹھن جاتے ہیں
جب خدا چاہے تو بگڑے ہوئے بن جاتے ہیں

وصفِ حُر میں ہے زباں معترفِ عجز و قصور
آمد آمد کی بہادر کا سنو اب مذکور
جب ہوئی مستعدِ جنگ سپاہِ مقہور
مہرِ افلاکِ امامت نے کیا رن میں ظہور
غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
ای فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

کیا کہوں شانِ جوانانِ جنود اللہ
کوئی ہم صورتِ خورشید کوئی غیرتِ ماہ
باندھی شیروں نے صفِ جنگ بیابانِ جگاہ
چمنِ خلد سے کرنے لگیں حوریں بھی نگاہ
واں لعینوں نے درِ ظلم و ستم کھول دیا
بڑھ کے عباسؑ نے یاں سرِ علم کھول دیا

ہو گئے سرخ شجاعت سے رُخِ آلِ نبیؐ
آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئے تشنہ لبی
رن میں کڑکا ہوا بجنے لگے باجے عربی
یکہ تازوں نے کیا شورِ مبارز طلبی
اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

برچھیاں تول کے ہر غول سے خونخوار بڑھے
نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلّوں میں کماں دار بڑھے
بولے شہ یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے
اسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبیؐ زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام
ای سپاہِ عرب و روم و ری و کوفہ و شام
تم پہ کرتا ہے حسینؑ آخری حجت کو تمام
پسرِ مصحفِ ناطق ہوں سنو میرا کلام
سخنِ حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا کا خروش
تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش

ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش
کیا بجاتے کہ بجاتے تھے نہ کسی شخص کے ہوش

چھیڑنا اُن کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رعب فرزند نبیؐ سرمۂ آواز ہوا

کم ہوا غلغلۂ فوج ستم جب یک بار
یوں گہر بار ہوئے شہ کے لب گوہر بار

صف کشی کس پہ ہے یہ ای سپہ ناہنجار
قتل سادات کی لشکر میں یہ کیسی ہے پکار

وطن آواروں پہ یہ قہر ہے کیوں پانی کا
کیا زمانے میں یہی طور ہے مہمانی کا

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
تیر جوڑے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو

کیوں نبیؐ زادہ پہ غربت میں جفا کرتے ہو
دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم برا کرتے ہو

شمع ایماں ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا
یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائے گا

میں ہوں سردار شبابؑ چمن خلد بریں
میں ہوں خالق کی قسم دوش محمدؐ کا مکیں

میں ہوں انگشتر پیغمبرؐ خاتم کا نگیں
مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے

قلزم عز و شرف کا دُر شہوار ہوں میں
سب جہاں زیر نگیں ہے وہ جہاندار ہوں میں

آج گو مصلحتاً بیکس و ناچار ہوں میں
ورثۂ احمد مختار کا مختار ہوں میں

بخدا دولت ایمان اسی دربار میں ہے
سب بزرگوں کا تبرک مری سرکار میں ہے

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار
یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار

بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ جوہر دار
کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پہ ہوں سوار

کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

تنگ آ جائے گا تو رکنے کا نہیں پھر شبیر
ایک حملے میں فنا ہوں گے یہ دو لاکھ شریر

چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ نہ تلوار نہ تیر
کاٹ جائے گی گلے سب کے یہ بُرّان شمشیر

شیر ہوں لخت دل غالب ہر غالب ہوں
ہیں جگر بند علیؑ ابن ابی طالبؑ ہوں

[illegible] آواز بند ہو جاتی ہے ۱۲ ۳؎ مرقع [illegible] ۱۲ ۴؎ بُرّان [illegible] ۱۲

مجھ کو ہوتا نہ اگر بخشش امت کا خیال | روک لیتا مجھے رستے میں یہ تھی حر کی مجال
تھام سکتا تھا لجامِ فرسِ برق مثال | پوچھ لو دیکھا ہے اس نے مرے شبیر کا جلال
گفتگو میں سپر اس کی جو نہ ہم ہو جاتے | ہاتھ اک وار میں پہونچوں سے قلم ہو جاتے

غیظ سے ہونٹھ چباتے تھے علیؑ کے دلدار | پیچھے تو لیتے تھے عون و محمد ہر بار
انگلی پڑتی تھی جگہ بندِ حسنؑ کی تلوار | میں نے جب سر کی قسم دی تو رکے وہ جرار
چلتی تلوار تو جنگل نہ وبالا ہوتا | پھر نہ حر خلق میں ہوتا نہ رسالا ہوتا

تھا یہ بپھرا ہوا عباسؑ مرا شیر جواں | سینۂ حر پہ رکھے دیتا تھا نیزے کی سناں
میں یہ کرتا تھا اشارہ کہ نہ اے بھائی جاں | رحم لازم ہے ہمیں ہم ہیں امامِ دو جہاں
کچھ تردد نہیں سر تن سے اتارا جائے | کوئی بندہ نہ مرے ہاتھ سے مارا جائے

گرچہ یہ امر نہیں اہلِ سخا کے شایاں | کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے سب پہ عیاں
پوچھ لو حر تو ہے موجود عیاں را چہ بیاں | اسی جنگل میں مع فوج تھا یہ تشنہ دہاں
شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی | منہ کے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی

زیست ہر شے کی ہے پانی سے شجر ہو کہ بشر | مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پسر
میں نے عباسِ دلاور سے کہا گھبرا کر | مشکوں والے ہیں کہاں اونٹ ہیں پانی کے کدھر
کرمِ ساقیِ کوثر کو دکھا دو بھائی | جتنا پانی ہو وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی

رہ نہ جائے کوئی گھوڑا کوئی ناقہ بے آب | چھاگلیں جلد منگاؤ مرا دل ہے بے تاب
سنتے مشکیزوں کے منہ کھول کے آپہنچے شتاب | متوجہ ہوا میں خود کہ وہ تھا کارِ ثواب
چین آیا نہ مجھے بے انھیں آرام دیئے | تھا جو اک جام کا پیاسا اسے دو جام دیئے

تھی یہی فصل یہی دھوپ یہی گرم ہوا | ٹھنڈے پانی پہ گرے پڑتے تھے حر کے رفقا
تشنہ کاموں کا یہ مجمع تھا کہ ملتی نہ تھی جا | سقے بھر بھر کے کٹوروں کو یہ دیتے تھے صدا
بھاگ ہو آؤ جو پانی کی طلبگاری ہے | چشمۂ فیضِ حسینؑ ابنِ علیؑ جاری ہے

آبِ شیریں کا جو دریا ہوا جنگل میں رواں
شکر کرنے لگی تر ہوگئی ہر خشک زباں
شور تھا ابنِ یداللہ نے جاں بخشی کی

ایک وہ دن تھا اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ
چشمِ امید ہو کیا سب نے پھرائی ہے نگاہ
ہر مسلمان پہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے

کئی طفل اُن میں ہیں کم سن کہ موئے جاتے ہیں
پانی پانی جو وہ کرتے ہیں تو شرماتے ہیں
سچ ہے غربت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ
بولا وہ اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ
اُن کے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے

ایک میں کیا ہوں زمانے پہ ہے احسان ان کا
خشک و تر پہ ہے کرم خلق میں یکساں ان کا
جنتی ہے جسے حاصل یہ شرف ہووے گا

یہ ابھی ہاتھ اُٹھا کر جو دعا فرمائیں
حق سے جس شے کے طلبگار ہوں فوراً پائیں
مثلِ خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے

ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں
پیٹ سائل کا یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں
اس مجرم کی گنہگار کی امید ہیں یہ

فرس و اشتر و قاطر نہ رہے تشنہ دہاں
پانی پی پی کے دعائیں مجھے دیتے تھے جواں
دین و دنیا کے شہنشاہ نے جاں بخشی کی

کہ اسی طرح ہمیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ
کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں آہ
بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

دم اکھڑتا ہے مرا جب انھیں غش آتے ہیں
پاس دریا ہے پہ اک بوند نہیں پاتے ہیں
تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے

عمر سعد نے کی مڑ کے رخِ حر پہ نگاہ
محسن و منعم و آقا ہے مرا یہ ذی جاہ
سخن حق ہیں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

ابرِ رحمت ہیں خطا پوش ہے داماں ان کا
اے خوشا حال جو غربت میں ہے مہماں ان کا
جو اُدھر ہوگا خدا اُس کی طرف ہووے گا

جتنے عالم کے گنہگار ہیں بخشے جائیں
جامِ کوثر ہمیں فردوس سے حوریں لائیں
یہ وہ بندے ہیں کہ اللہ پہ حق جن کا ہے

ہیں سخی ابن سخی بات پہ سر دیتے ہیں
یاں تو زر دیتے ہیں فردوس میں گھر دیتے ہیں
ذرہ پرور جنھیں کہتے ہیں وہ خورشید ہیں یہ

حُر سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعد شریر
یہ تو ہے صاف طرفداریِ شہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریفِ امیر
اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدحِ شبیر
سُن چکا ہوں میں کہ مضطر ہے کئی راتوں سے
الفتِ شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں نہ وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج
سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہے آج
تختہ بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج
جن کو سمجھا ہے غنی دل ہیں وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

کیا کسی حور کا دکھلا دیا حضرت نے جمال
رل گیا سایۂ طوبیٰ کہ جو ایسا ہے نہال
قصرِ یاقوت میں پہونچا جو ترا رنگ ہے لال
کون سے میوۂ شیریں پہ ٹپکتی ہے رال
دفعتاً حقِ نمک کو بھی فراموش کیا
کیا تجھے بادۂ تسنیم نے بےہوش کیا

میں جہاں دیدہ ہوں سب مجھ کو خبر ہے تیری
قرۃ العینِ محمدؐ پہ نظر ہے تیری
ہونٹ بھی خشک ہیں اور چشم بھی تر ہے تیری
جسم خالی ہے اِدھر جان اُدھر ہے تیری
راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہے
تو نے فرزندِ ید اللہ سے سازش کی ہے

نہیں مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور
لکھیں گے عہدۂ اخبار پہ جو ہیں مامور
حاکمِ شام ہے جابر وہ سزا دے گا ضرور
گر تجھے دار پہ کھینچے تو کچھ اُس سے نہیں دور
سب ہی قوم کے سرِ تن سے جدا ہوویں گے
زن و فرزند گرفتارِ بلا ہوویں گے

نفع اُس امر میں کیا جس میں ہو مردم کا ضرر
آنکھیں کھلیں گی محبت سے جو دیکھے گا اُدھر
شجرِ قامتِ سرور پہ جو ڈالے گا نظر
سر چڑھے گا ترا برچھی پہ یہ ہے اس کا ثمر
الفتِ زلف سے بھی پیچ میں تو آوے گا
خالِ رُخ دیکھا تو گھر خاک سے لگ جائے گا

بدر پیشانیِ سرور کا جو ہے سر میں خیال
تو ہی ماہ میں نقصان ترا ہووے گا کمال
سب میں ہو جائے گا انگشت نما شکلِ ہلال
تیر و شمشیر ہے ابرو کی محبت کا مآل
عشقِ رخسار میں یہ قد ترا گھٹ جائے گا
منہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ابھی کٹ جائے گا

خوف کس بات کا پیاسوں سے یہ تھرّانا کیا
ننگ کی بات ہی دشمن کی طرف جانا کیا
ابھی لے جائیں جو شبیر کا سر ہاتھ لگے

حُر پکارا کہ زباں بند کر او ناہموار
ابنِ زہرا ہی جگر بندِ رسولِ مختار
اک زمانہ صفتِ آلِ عبا کرتا ہی

وصف ایسوں کا زباں پر کوئی کیونکر لاوے
کسی انساں نے یہ دنیا میں ہیں رتبے پاے
الفتِ آل میں مرئے تو خوش اقبالی ہی

اسفلوں سے ہی محبت تجھے او سفلہ مزاج
جس کو کاندھے پہ محمدؐ کے ملی ہی معراج
کیوں ترے سامنے مُکروں کہ نہیں بخشا ہی

باغ جو مجھ کو دکھایا اُسے کیا جانے گا تو
مجھ کو اللہ نے بخشی ہیں وہ حوریں خوشرو
نام کوثر کا نہ لے تو کہ مجھے جوش آتا ہی

عزتِ دیں شرفِ کون و مکاں ہی شبیر
سنگ پانی ہو وہ اعجاز بیاں ہی شبیر
مہرباں ہوں تو ابھی عقدہ کشائی ہووے

کیا میں اور کیا وہ ریاست ہی کیا میرے عیال
واں کی املاک نہ دولت کا ہو کیا مجھ کو خیال
گھر کا اب دھیان نہ بچوں کا الم ہی مجھ کو

لب پہ ہر مرتبہ بے کس کی ثنا لانا کیا
ہو نبیؐ یا کہ وصی جنگ میں شرمانا کیا
غلط ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ زہ ہاتھ سے لگے

قابلِ لعن ہی تو اور وہ تیرا سردار
میرا کیا منہ جو کروں مدحِ امامِ ابرار
آپ قرآں میں خدا اُن کی ثنا کرتا ہی

تین سو آیہ ہوں تعریف میں جن کی آئے
اپنا محبوب و ولی جن کو خدا فرماے
سنگ ہی اُن کی محبت سے جو دل خالی ہی

خاک پا اُس کا ہوں میں ہی جو سرِ عرش کا تاج
میرے آقا سا سخی کون ہی کونین میں آج
ہاں مجھے شاہ نے فردوسِ بریں بخشا ہی

راحتِ روح ہی جس باغ کے ہر پھول کی بو
کہ جنھیں تیرے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو کبھو
اُنھیں چھینٹوں سے تو بے ہوش کو ہوش آتا ہی

جانِ زہرا کی محمدؐ کی زباں ہی شبیر
جان کیوں ہو نہ اُدھر جانِ جہاں ہی شبیر
وہ نہ بخشیں تو خدا تک نہ رسائی ہووے

جب کبھی آفت میں پھنسی احمدِ مختار کی آل
یاں ہوئی جاتی ہی سادات کی کھیتی پامال
خانہ بربادیِ شبیر کا غم ہی مجھ کو

دولتِ حاکمِ دوں پر ہی ترا دار و مدار
دارِ دنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیندار
کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدّار
خوابِ غفلت ہے اُسے میرا ہے طالع بیدار
کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہوگا
دارِ طوبےٰ کا مرے فرق پہ سایا ہوگا

ہے سرافرازِ سرا عاشقِ پیشانیِ شاہ
سجدے کیجے کہ ہے بیت ابرؤوں کی بیت اللہ
عشق آنکھوں کا ہے مردم کے لیئے نورِ نگاہ
ہے وہ یوسف جسے ہے مصحفِ رخسار کی چاہ
عاشقِ لب کو خدا لعل و گہر دیتا ہے
وہ دہن چشمۂ کوثر کی خبر دیتا ہے

خالِ رخسار نہیں گو سے سعادت ہے یہ
مجھ سے مجرم کے لیئے مُہرِ شفاعت ہے یہ
ہوں جو آشفتۂ گیسو تو عبادت ہے یہ
بخدا سلسلۂ بخششِ اُمت ہے یہ
شبِ معراجِ رسولِ دو جہاں سمجھا ہوں
اُس کے ہر تار کو میں رشتۂ جاں سمجھا ہوں

وصفِ دنداں ہیں رہے جس کی زباں گوہربار
موتیوں سے دہن اُس شخص کا بھر دے غفار
شوق ہیں سیبِ ذقن کے جسے آئے نہ قرار
حوریں غرفوں سے دکھائیں اُسے نارنگِ رخسار
دم بدم چاہنے والوں کے لہو گھٹتے ہیں
یہ گلا وہ ہے گلے جس کے لیئے کٹتے ہیں

صدقے اُس سینہ پہ ہیں عاشقِ صافی سینہ
خاک اُس دل پہ جو اس سینے سے رکھے کینہ
حق نما ہے تو جہاں میں ہے یہی آئینہ
اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا
فیض پاتا ہے وہ جس دل میں وِلا ہوتی ہے
چشم کو اُن کی زیارت سے جِلا ہوتی ہے

پاؤں یہ وہ ہیں کہ ان پاؤں کو جو ہاتھ لگائے
تو سرِ دست سرافرازیِ کونین وہ پائے
گردِ نعلینِ مبارک جو اثر اپنا دکھائے
توتیا ہوئے خجل کحل جواہر شرمائے
صدقے کردیں گے سر ان پاؤں پہ ہم ایسے ہیں
دوشِ احمد پہ رہے جو یہ قدم ایسے ہیں

عملِ خیر سے بہکا نہ سکے او ابلیس
یہی کونین کا مالک ہے یہی راسِ رئیس
کیا سزا مجھے دے گا ترا حاکم ملعون و خسیس
کچھ تردد نہیں کہدے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں سوئے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر جو سنا تا تھا تو اب جاتا ہوں

کہہ کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار
تن کے دیکھا طرفِ فوجِ امامِ ابرار
سرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آئے اک بار
پاؤں رکھنے لگا بن بن کے زمیں پر رہوار
غل ہوا سیدِ والا کا ولی جاتا ہے
لو طرفدارِ حسینؑ ابنِ علی جاتا ہے

حُر نے نعرہ کیا یا حیدرِ صفدر مدد دے
زوجِ زہرا مدد دے نفسِ پیمبر مدد دے
وقتِ امداد ہے یا فاتحِ خیبر مدد دے
بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر مدد دے
تنِ تنہا ہے غلام اور بہت ظالم ہیں
آئی آواز کہ اے حُر ترے حامی ہم ہیں

مل گئی راہِ خدا واہ رے اقبال ترا
جُرمِ ماضی ہوے سب عفو خوشا حال ترا
پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا
جا، جا جلد کہ مشتاق ہے مرا لال ترا
مرد ہے جس کی یہ ہمت یہ ارادہ ہووے
ہاں بہادر تری توفیق زیادہ ہووے

منتظر ہیں ترے سب فوجِ حسینی کے جواں
راہ تکتی ہیں تری پرسے حورانِ جناں
درِ فردوس پہ مشتاق کھڑا ہے رضواں
شور کوثر پہ ہے شبیرؑ کا مہماں ہے کہاں
فوجِ قدسی تری ہمت کی ثنا کرتی ہے
فاطمہ آج ترے حق میں دُعا کرتی ہے

تو بہشتی ہے یہ کافر ہیں کنشتی اے حُر
دیکھ اب صورتِ حورانِ بہشتی اے حُر
مٹ گئی سب ترے اعمال کی زشتی اے حُر
کس تلاطم میں بچی ہے تری کشتی اے حُر
غضب اللہ کا شبیرؑ کی ناراضی ہے
پنجتن تجھ سے ہیں راضی تو خدا راضی ہے

اور بالیدہ ہوا سُن کے یہ مژدہ وہ ہژبر
اب تو اس فوج میں اک دم کی بھی تعویق ہے جبر
دلِ بیتاب پُکارا کہ نہیں طاقتِ صبر
قعرِ دوزخ ہے مسلماں کے لیے صحبتِ گبر
ہاں اُٹھا باگ جو شیدائے شہِ عالی ہے
فوجِ اللہ و نبیؐ میں تری جا خالی ہے

سُن کے یہ باگ جو لی اسپ سبکتاز اُڑا
کیا اُڑا رخش کہ طاؤس بصد ناز اُڑا
ڈر سے رنگِ عمرؔ شعبدہ پرداز اُڑا
دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اُڑا
باغِ زہرا میں نسیمِ سحری جاتی ہے
غل تھا دربارِ سلیماں میں پری جاتی ہے

[illegible] ابن سعد ۱۲

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند — حر کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گرد سمند
کٹتے تھے شرم سے وہ لے کے جو دوڑے تھے کمند — یہ چھلاوا تھا کہ آندھی یہ فرس تھا کہ پرند
کیا سبک سوئے چمن باد بہاری پہونچی — ہم یہیں رہ گئے واں حر کی سواری پہونچی

ہاں ہوئے علم امامت سے شہ دیں آگاہ — ہنس کے عباس سے فرمایا کہ اے غیرت ماہ
پھرے لشکر کی طرف ہے رخ حر ذی جاہ — سب سے کہہ دو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ
جاؤ لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے — میرا مہمان مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار — الغیاث اے جگر و جان رسول مختار
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار — عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیض غفار
پار دریا سے خطا سے مری کشتی ہو جائے — دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہو جائے

کئی روزوں سے تلاطم میں ہوں اے شاہنشاہ — مدد اے نوح غریباں مرا بیڑا ہے تباہ
دست و پا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ — شور کرتا ہوں کہ بتلائے کوئی جائے پناہ
ابر رحمت کی طرف جا یہ صدا دیتے ہیں — سب ترے دامن دولت کا پتا دیتے ہیں

تیرے دامن کے نثار اے مرے آقائے جلیل — رحم کر رحم کہ شرمندہ ہے یہ عبد ذلیل
دل خنک ہو مرے جو نکلے کوئی کوثر کی سبیل — جان آجائے جو مولائے دو عالم ہوں کفیل
نہ وزیروں میں یہ ہمت نہ شہنشاہ میں ہے — سب مرے درد کا درماں تری درگاہ میں ہے

خلق میں آپ کے والد کے کرم ہیں مشہور — بات میں بخش دیئے سیکڑوں بندوں کے قصور
مجھ سے ہیں باگ پکڑ لینے پہ آزردہ حضور — بخش دیجے تو کرم سے نہیں کچھ آپ کے دور
یہ تو کیونکر کہوں میں لائق تعزیر نہیں — مگر اس حد سے زیادہ مری تقصیر نہیں

اے مددگار و معین الضعفا ادرکنی — اے خبر گیر گروہ غربا ادرکنی
پاؤں لغزش میں ہیں اے دست خدا ادرکنی — ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اے عقدہ کشا ادرکنی
دیجیے حر کو سند نار سے آزادی کی — آئیے جلد خبر لیجیے فریادی کی

میرے اعمال میں ہر چند سراسر ہی بدی ہوں گنہگار خدا سے ازلی و ابدی
آپ ہیں مالکِ سرکارِ جنابِ احدی ای خداوندِ جہاں خذ بیدی خذ بیدی
جو تہی دست ہیں تکتے ہیں شہنشاہ کا ہاتھ آپ کا ہاتھ زمانے میں ہی اللہ کا ہاتھ
ایک یہ خستہ تن اور دو پہ جاں لاکھ حریف ای سلیماں کہیں پامال نہ ہو مورِ ضعیف
چھوڑ کر آپ کی سرکار کہاں جائے نحیف کیجئے اب نظرِ لطف کہ ہوتا ہی خفیف
ہوں سرافراز جو اتنا ہی کرم ہو جائے نام قنبر کے غلاموں میں رقم ہو جائے

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو با دیدۂ نم جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہ اُمم حُر کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اُس دم
شکر کر سبطِ رسول الثقلین آتے ہیں لے بہادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں
حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ دوڑ کر چوم لیئے پاے شہِ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا ای با توقیر میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر
میں رضا مند ہوں کس واسطے مضطر ہی تو مجھ کو عباسِ دلاور کے برابر ہی تو

کس کے کیوں باندھا ہی ہاتھوں کو میں ہوتا ہوں خجل سہل کر دیں اُسے گر اور کوئی ہو مشکل
بھائی آ مجھ سے بغلگیر تو ہو کھول کے دل غافر و راحم و توابؐ ہی ربِ عادل
جرم سب محو کیئے حق نے ترے دفتر سے آج پیدا ہوا گو یا شکمِ مادر سے
حُر پکارا بابی انت و امی یا شاہ قابلِ عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ
مجھ سے گمراہ کو اک آن میں مل جائے یہ راہ سب ہی صدقہ انھیں قدموں کا خدا ہی آگاہ
مہر ذرّہ ہو جو ہو نیّرِ تاباں ہو جائے آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

کون مقداد تھے سلمان و اباذر تھے کون آپ فرمائیں کہ عمّارِ دلاور تھے کون
شور عالم میں جو ہی مالکِ اشتر تھے کون ای خداوندِ جہاں حضرت قنبر تھے کون
انھیں قدموں کا تصدق تھا کہ ممتاز ہوئے اسی سرکار کے خلعت سے سرافراز ہوئے

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب ۔۔۔ دے کسی شخص کو بندے ہیں یہ مقدور ہے کب
اس مسبب کی عنایت کے ہیں سارے یہ سبب ۔۔۔ وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب
اپنے کیسے سے نہ دام اور درم دیتے ہیں ۔۔۔ جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

لاکھ ہاتھ اس کے ہیں دینے کے وہ ایسا ہے جواد ۔۔۔ ہم اسے بھولیں تو بھولیں اسے ہر وقت ہے یاد
رزق وہ حوصلۂ حرص سے دیتا ہے زیاد ۔۔۔ شکر معبود کا اس پر بھی نہیں کرتے عباد
وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زمانہ اس کا ۔۔۔ کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ اس کا

جس قدر اس سے طلب کیجیے خوشنود ہے وہ ۔۔۔ صاحب جود ہے وہاب ہے محمود ہے وہ
ہاتھ پھیلائے جو سو بار تو موجود ہے وہ ۔۔۔ بخش دیتا ہے کہ ہم عبد ہیں معبود ہے وہ
پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے ۔۔۔ یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے

کہہ کے یہ ساتھ لیے حر کو چلے شاہ امم ۔۔۔ ہاتھ میں ہاتھ تھا مہمان کا اللہ رے کرم
راست و چپ قاسم و اکبر تھے نئی شان و حشم ۔۔۔ سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرت عباسؑ علم
دور سے اہل خطا تیر جو برساتے تھے ۔۔۔ رفقا سایہ میں ڈھالوں کے لیے آتے تھے

لائے اس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امام ۔۔۔ بولے عباس کمر کھول اب ہے نیک انجام
شہ نے فرمایا مناسب ہے کوئی دم آرام ۔۔۔ عرض کی حر نے کمر خلد میں کھولے گا غلام
فاتحہ پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہے ۔۔۔ آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے

ہے بہت شمر و عمر سے مجھے لڑنے کی امنگ ۔۔۔ ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چورنگ
لشکر شام سے پیہم چلے آتے ہیں خدنگ ۔۔۔ شاہزادوں کی سپر ہوں کہ عبادت ہے یہ جنگ
لیکن ایسا نہ ہو بچہ کوئی بے جاں ہو جائے ۔۔۔ پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قرباں ہو جائے

شہ نے فرمایا کہ دشوار ہے فرقت تیری ۔۔۔ مجھ کو مر کر بھی نہ بھولے گی محبت تیری
وا دریغا ہوئی کچھ ہم سے نہ خدمت تیری ۔۔۔ خیر فردوس میں ہو جائے گی عزت تیری
آج رتبہ ترا خیل شہدا میں ہوگا ۔۔۔ شب کو تو صحبت محبوب خدا میں ہوگا

تجھ پہ مخفی نہیں مفہم سے جو کچھ ہے مرا حال
قحط پانی کا ہے اس دشت میں گندم کا ہے کال
سب کو ایذا عوض آب و غذا ملتی ہے
حُر نے رو کر سر تسلیم جھکایا بادب
جب چڑھا گھوڑے پہ وہ عاشق سلطان عرب
دم بدم یاں سے جو آواز بکا جاتی تھی
حُر چلا فوج مخالف پہ اڑا کے توسن
وہ جلال اور وہ شوکت وہ غضب کی چتون
دوسرے دوش پہ شملے کے جو بل کھاتے تھے
زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے
برچھیوں اڑتا تھا دب کے فرس رانوں سے
خود رومی کی جو ضو تابہ فلک جاتی تھی
نیزۂ حُر کی سناں پر نہ ٹھہرتی تھی نگاہ
قبضۂ تیغ پہ رکھے تھا سر عجز سپاہ
قدر اندازوں کو جانوں کے ادھر لالے تھے
رن میں جب جنت کی طرف سے حر دیندار آیا
غل ہوا سید مظلوم کا غمخوار آیا
تیغ نور سر راہ نظر آتا ہے
آنے جانے کا بہادر کے کروں کیا مذکور
اے خوشا رتبہ فیض قدم پاک حضور
صحبت اہل ولا دل کو جلا کرتی ہے

راہیں ہر سمت کی روکے ہوئے ہیں اہل ضلال
نان جو کا بھی ہے ملنا کسی قسم میں محال
دودھ اصغر کو نہ عابد کو دوا ملتی ہے
شہ نے رومال رکھا آنکھوں پہ رونے لگے سب
شاہ بولے کہ عجب دوست چھٹا ہائے غضب
گریۂ آل محمد کی صدا آتی تھی
چوکڑی بھول گئے جس کے تکاپو سے ہرن
ہاتھ میں تیغ سپر دوش پہ بر میں جوشن
کاکل حور کے سب پیچ کھلے جاتے ہیں
دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے
چشم خورشید میں بجلی سی چمکتی جاتی تھی
تھا یہ ظاہر کہ نکالے ہے زباں مار سیاہ
آفتابی وہ سپر جس سے خجل گردۂ ماہ
تیر ترکش کے نہ تھے آگ کے پرکالے تھے
کس بشاشت سے اڑاتا ہوا رہوار آیا
جاں نثار خلف حیدر کرار آیا
جلوۂ قدرت اللہ نظر آتا ہے
پہلے کچھ اور ہی جلوہ تھا پر اب اور ظہور
غل تھا آتا ہے ملک پہنے ہوئے خلعت نور
مس کو اک آن میں اکسیر طلا کرتی ہے

واہ کیا فیض ہے سرکار شہ عالم میں
نور یہ حور میں دیکھا نہ بنی آدم میں
ذرۂ خاک کو خورشید کیا اک دم میں
یہ وہی حر جری ہے جو ابھی تھا ہم میں
تن ہے خوشبو رخ گلرنگ ترو تازہ ہے
خاک نعلین مبارک کی عجب غازہ ہے

مہر ذرہ ہے جہاں چہرۂ روشن ایسا
حرز ہو بازوے داؤد کا جوشن ایسا
چاندنی جس سے کرے کسب ضیا تن ایسا
ہوش پریوں کے اڑے جاتے ہیں توسن ایسا
گلشن دہر میں لو باد بہاری آئی
قاف میں غل ہے سلیماں کی سواری آئی

حر پکارا کہ بجا کہتے ہو لاشک لاریب
دولت دیں سے نہ دامن مرا خالی ہے نصیب
دامن حضرت شبیر نے ڈھانپے مرے عیب
بارک اللہ کی دیتا ہے صدا ہاتف غیب
فیض پاکر پئے شبیر نئی آیا ہوں
یاں سے محتاج گیا واں سے غنی آیا ہوں

مجھ کو خورشید کیا نور خدا کی ضو نے
بخت پلٹے ہیں سکندر کے غلام تو نے
نور بخشا پسر فاطمہؑ کے پرتو نے
گنج وہ لایا ہوں دیکھا جو نہ تھا خسرو نے
دور دورہ آج سے میرا ہے زمانہ میرا
کبھی خالی نہیں ہووے گا خزانہ میرا

رخ روشن کو مرے تکتے ہو کیا حسرت سے
نور وہ ہے جسے دیکھیں نظر رغبت سے
مل کے آیا ہوں منہ اپنا قدم حضرت سے
وائے وہ لوگ جو محروم ہیں اس دولت سے
مجھ کو بھی دیکھ کے بیدار نہیں ہوتے ہو
ہے غضب آنکھیں تو کھولے ہو مگر سوتے ہو

جان سلطان رسالت کو غنیمت جانو
نور خالق کی زیارت کو غنیمت جانو
پسر شاہ ولایت کو غنیمت جانو
قمر برج امامت کو غنیمت جانو
ساتھ اس کے برکت خلق سے اٹھ جائے گی
پھر جو ڈھونڈھو گے یہ دولت تو نہ ہاتھ آئے گی

ایک سید کے مٹا دینے میں ہے کونسا نام
گر ہو دانا تو کہو بد ہے کہ ہے نیک کلام
اس ہوا پر ہو کہ بجھ جائے چراغ اسلام
خوش نما کب ہے وہ تسبیح نہ ہو جس میں امام
شکر احسان جناب احدی کرتے ہیں
پیشوا سے کہیں پیرو بھی بدی کرتے ہیں

یہ سخن سُن کے پکارا پسرِ سعدِ شریر
ہاں طرفدارِ شہِ دیں پہ چلیں نیزہ و تیر
لیے حربوں کو بڑھا فوج کا انبوہِ کثیر
فاتحہ پڑھ کے جواں مرد نے کھینچی شمشیر
حُر کا منہ سُرخ ہوا فوجِ ستم زرد ہوئی
شعلۂ تیغ سے بجلی کی چمک گرد ہوئی

رعد تھرّا گیا نعرے جو سُنے ضیغم کے
استخواں کانپ گئے زیرِ زمیں رستم کے
تہ و بالا ہوئیں لشکر کی صفیں جم جم کے
برقِ شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے
نوبتِ جنگ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
بیرقیں گر گئیں ہاتھوں سے نشاں چھوٹ گئے

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا
غیظ میں آن کے گھوڑا بھی غضب کف لایا
شیر سا فوجِ مخالف پہ جھپٹ کر آیا
روند ڈالا اُسے دم میں جسے سرکش پایا
اُس کا قاتل تھا جو دشمن شہِ عالی کا تھا
کاٹ ہر نعل میں شمشیرِ ہلالی کا تھا

حشر برپا تھا کہ تیغِ حُرِ ذی جاہ چلی
آگ برسانے کو بجلی سوئے جنگاہ چلی
کس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی
گہہ بڑھی گاہ پھری گاہ تھمی گاہ چلی
زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی
کج ادائی کو نہ چھوڑا وہ لڑائی نہ گئی
کاٹ چھانٹ اور وہ لگاوٹ وہ ڈھٹائی نہ گئی
سیکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی
شور تھا برق پئے جلوہ گری نکلی ہے
جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

جس طرف دیدۂ جوہر سے نظر کرتی ہے
ہل نہ گر جائے کہ صفیں زیر و زبر کرتی ہے
چشم ہر چند کہ پتلی کو سپر کرتی ہے
ہے وہ طرار کہ آنکھوں میں بھی گھر کرتی ہے
اُس کے افسوں سے جو ساحر ہو وہ جل جاتا ہے
سحر پریوں کا اسی طرح سے چل جاتا ہے

پھونکے بجلی کو یہ اُس آگ کی ہے پرکالا
کاٹ جائے تو کبھی لہر نہ لے پھر کالا
برچھیاں چل گئیں اُن پر جسے دیکھا بھالا
آگیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا
اُس کے پانی میں ہیں کفّار سیہ گھولا ہے
بارڑھ ہے یا ملک الموت نے منہ کھولا ہے

آئی جس غول پہ لاشوں سے زمیں پاٹ گئی　　دست و پا صدہ و کمر گردن و سر کاٹ گئی
چاٹ ایسی تھی لہو کی کہ صفیں چاٹ گئی　　دیکھی تیغوں کی جدھر باڑھ اسی گھاٹ گئی
جس پہ چلتی تھی نہ بے جان کیے پھرتی تھی　　ایک بجلی تھی مگر لاکھ جگہ گرتی تھی

گل نئے پھولے جو برچھی پہ لگا پھل اس کا　　زور دکھلاتا تھا ہر ضرب میں کس بل اس کا
ڈھیر تھا خاک پہ کاٹا ہوا جنگل اس کا　　جو بڑھا جنگ میں قصہ ہوا فیصل اس کا
شور تھا دیکھیے کیونکہ یہ بلا ٹلتی ہے　　اس قدر جلد تو سیفی بھی نہیں چلتی ہے

جنگ میں تیغ کو دعوا تھا کہ یکتا ہوں میں　　سر اٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا ہوں میں
چرخ کہتا تھا کہ یارب تہ و بالا ہوں میں　　برق کہتی تھی کہ تلوار ہے یا ہوں میں
کس میں ہے یہ جو تڑپ برقِ فلک سیری ہے　　تیغ کرتی تھی اشارا یہ چمک میری ہے

نہ تھمی سنگ سے وہ اور نہ رکی آہن سے　　ہاتھ اڑا دیتی تھی پہونچوں سے تو سر گردن سے
نہ اٹھی اس کی کڑی ضرب کسی جوشن سے　　چل گئی بادِ مخالف جدھر آئی سن سے
جوش طوفاں کا دکھا کر وہ خوش اسلوب گئی　　غوں کیے ریا میں ہر اک کشتیِ تن ڈوب گئی

کثرتِ جوہرِ ذاتی سے وہ گو جال میں تھی　　پر تڑپ صورتِ ماہی ہی ہر حال میں تھی
تھی چمک جانے میں بجلی تو پری چال میں تھی　　کبھی مغفر میں کبھی سر میں کبھی ڈھال میں تھی
کہیں دم لینے کی مہلت تھی نہ بسمل کے لیے　　تھی جگر کے لیے برچھی تو چھری دل کے لیے

صید کرنے کو جدھر صورتِ شہباز آئی　　لاکھ تڑپا وہ نہ بچ جان لیے باز آئی
غل ہوا شہپرِ قضا ہیں کہ تلے قاز آئی　　اڑ گیا طائرِ دل اور نہ آواز آئی
گرچہ قبضے میں لیے تھی اسے پر چھوڑ دیا　　تھا زبس صیدِ زبوں کاٹ کے سر چھوڑ دیا

آب نے آتشِ سوزاں کا اثر دکھلایا　　تاب نے مرگِ مفاجات کا گھر دکھلایا
باڑھ نے جادۂ صحرائے سفر دکھلایا　　گھاٹ نے آئنۂ فتح و ظفر دکھلایا
تیغ کہتی تھی درِ فتح کی مفتاح ہوں میں　　قول قبضہ کا یہ تھا قابضِ ارواح ہوں میں

خم وہ پایا تھا کہ شرمائے ہلالِ مہِ عید — حر کے ہاتھ آگئی تھی گلشنِ جنت کی کلید
برش ایسی تھی کہ کٹ کٹ گئی سب فوجِ یزید — جا بجا کفر کے پرتلے بھی ہوئے قطع و برید
نہ بچا تارِ نفس خلق میں جینے کے لیے — چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لیے

کئی حملے کیے پیہم جو کمانداروں پر — چل گئے تیرِ ملامت کے جفاکاروں پر
چٹکیاں سب کی دھری رہ گئیں سوفاروں پر — رخ پھرا تھا کہ گری برق ستمگاروں پر
جل کے خرمن ہوا یوں خاک کہ خوشہ نہ ملا — کشمکش میں کہیں چھپنے کو بھی گوشہ نہ ملا

نیزۂ فوجِ ستمگار تھے دیکھے بھالے — دم میں اس شیرِ نیستاں نے قلم کر ڈالے
گرچہ تھے جان لڑاتے ہوئے لڑنے والے — آفتِ مرگ کو سر سے کوئی کیونکر ٹالے
جب سواروں کے پرے جنگ کو تل جاتے تھے — بند سب ناخنِ شمشیر سے کھل جاتے تھے

الفِ گرز کو کر دیتی تھی ہر ضرب میں دال — تھی نئی آمد و رفت اور نئی طرح کی چال
کبھی برچھی کی انی تھی تو کبھی تیر کی بھال — کبھی تلوار کبھی خنجرِ براں کبھی ڈھال
ضرب کیا نوک سے دشمن کو فنا کرتی تھی — دم بدم فوجِ ستمگر بھی ثنا کرتی تھی

شور تھا آگ ہے تلوار میں یا پانی ہے — جل بجھے کشتیِ تن خون میں طوفانی ہے
ضرب میں فرد ہے یہ زور میں لاثانی ہے — کہتا تھا حر یہ فقط قوتِ ایمانی ہے
زور تھا مجھ میں نہ ایسا نہ وغا کی طاقت — سب ہے یہ سبطِ پیمبر کی دعا کی طاقت

کہہ کے یہ فوج میں پھر تشنہ جگر ڈوب گیا — ورطۂ قلزمِ آفت میں گہر ڈوب گیا
لشکرِ شام کے بادل میں قمر ڈوب گیا — کشمکش تھی کہ عرق میں گلِ تر ڈوب گیا
تھا کبھی شیر سا پھرا ہوا شمشیروں میں — کبھی نیزوں کے نیستاں میں کبھی تیروں میں

گہہ چھپا اور گہے نکلا وہ مہ برجِ شرف — گہے اس صف میں در آیا گہے وہی وہ صف
گہے دریا کے کنارے گہے صحرا کی طرف — گہے نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہِ نجف
جتنے مجروح تھے دم ان کے نکل جاتے تھے — شیر بھی نام علیؑ سن کے دہل جاتے تھے

نخل تھرّاتے تھے سب گونج رہا تھا جنگل
کوندجاتی تھی سروں پر جو وہ شمشیرِ اجل
حشر برپا تھا سواروں پہ فرس لوٹتے تھے
بڑھ کے فرماتے تھے عباسؑ ہے عزت و جاہ
کہتے تھے ابنِ حسنؑ واہ حُرِ غازی واہ
اپنی جاں بازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا
حیف جھکنے میں لعینوں نے جو فرصت پائی
لاکھ خونریز اُدھر اور اِدھر تنہائی
آگیا موت کے پنجہ میں نہ کچھ دیر لگی
سینہ غربال ہوا تیر چلے اعدا کے
علی اکبرؑ نے یہ حضرت سے کہا چلّا کے
خادمِ حضرت زہرا و علیؑ گرتا ہے
شاہ رونے لگے یہ سنتے ہی مہماں کی خبر
علی اکبرؑ سے کہا تم ابھی ٹھہرو دلبر
کس سے اس وقت کہوں میں جو قلق مجھ پہ ہے
عرض کی حضرتِ عباس نے جاتا ہے غلام
میری الفت میں ہوا قتل جری نیک انجام
اُس پہ جب سخت گھڑی ہوگی تو کام آویں گے
اُس کے لاشے پہ نہ جائیں جو مروت سے ہے دور
قصرِ خلد اُس کو دکھائیں کہ ہوئے عفو قصور
ایسا ذی رتبہ کوئی خلق میں کم نکلے گا

سرکی جاتی تھی صفیں اُن کی غضب تھی ہلچل
منہ کے بھل گرتا تھا کوئی تو کوئی سر کے بھل
دو پہ چار ایک پہ دو پانچ پہ دس لوٹتے تھے
بارک اللہ کی دیتا تھا صدا دلبرِ شاہ
شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے ماشاء اللہ
مسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا
سامنے چھوڑ کے سب فوج عقب سے آئی
باگ گھوڑے کی پھراتا تھا کہ برچھی کھائی
فرق پر گرز لگا دوش پہ شمشیر لگی
رکھ دیا شبیر نے قربوس پہ سر نہوڑا کے
گر ہو ارشاد تو مہماں کو بچاؤں جا کے
خاک پر اب وہ سعیدِ ازلی گرتا ہے
ہوگئی آنسوؤں سے ریش مبارک سب تر
حُر کی امداد کو ہم جائیں گے اے نورِ نظر
لاش اُٹھاؤں گا کہ مہماں کا حق مجھ پہ ہے
جوشِ وقت میں کہا شہ نے نہیں اے گلفام
دوست کیسے جو برے وقت میں ہم آئے نہ کام
لاش کیا قبر میں مہماں کی ہم جاویں گے
اُس سے ہم شاد ہوئے وہ بھی تو ہو کچھ مسرور
سرخرو جاتا ہے دنیا سے وہ خالق کے حضور
میرے مہماں کا مری گود میں دم نکلے گا

یہ سخن کہہ کے چلے رن کو جنابِ شبیر
دیکھ کر شاہ کو آتے ہوئے بھاگے بے پیر
چمنِ ہستی مہمان کو اُجڑتے دیکھا
گر کے لاشے کے برابر یہ پکارے سرور
گرز کیا تجھ کو لگا ٹوٹ گئی میری کمر
دوست کے ہجر میں کب دوست کو چین آیا ہے
واہ رے حُرِ جری میں تری ہمت کے فدا
ہے یہ بیکس ترا شرمندۂ احساں بخدا
حق تعالے چمنِ خلد میں گھر دے بھائی
حُر کو چونکا کے حبیب ابنِ مظاہر نے کہا
دیکھ دیدارِ جگر بندِ جنابِ زہرا
دم رُکا ہے تو اشارے سے وصیت کر لے
کسی آقا نے کبھی کی ہے یہ توقیرِ غلام
بھائی فرماتے ہیں شفقت سے شہِ عرش مقام
حشر تک خلق میں یہ ذکرِ غم انگیز رہا
نیم وا چشم سے حُر نے رُخِ مولا دیکھا
مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا
عرض کی حُسنِ رُخِ حور نظر آتا ہے
باغِ فردوس دکھاتا ہے مجھے اپنی بہار
شاخ سے میری طرف بڑھتے ہیں میوے ہر بار
ہے یہ رضواں کی صدا دھیان کدھر تیرا ہے

واں گرا خاک پہ گھوڑے سے حرِ با توقیر
پہونچے لاشے پہ امامِ دو جہاں وقتِ اخیر
ایڑیاں خاک پہ زخمی کو رگڑتے دیکھا
میرے مہمان و مددگار و معین و یاور
گر پڑا گھوڑے سے اور آہ نہ کی مجھ کو خبر
کھول دے چشم کو بھائی کہ حسین آیا ہے
اس کو کہتے ہیں محبت اسے کہتے ہیں وفا
بس یہی بھائی بھی کرتے ہیں جو کچھ تو نے کیا
اس ریاضت کا خدا تجھ کو ثمر دے بھائی
آپ بے تاب ہیں اے حُرِ جری ہوش میں آ
کوچ درپیش ہے یہ وقت نہیں غفلت کا
نزع میں نورِ الٰہی کی زیارت کر لے
دیکھ تو رحم ترے واسطے روتے ہیں امام
اے خوشا حال خدا سب کا کرے نیک انجام
تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا
زیرِ سر زانوئے شبیرؑ کا تکیا دیکھا
شہ نے فرمایا کہ اے حُرِ جری کیا دیکھا
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے
صاف نہریں ہیں رواں جھوم رہے ہیں اشجار
حوریں لاتی ہیں جواہر کے طبق بہرِ نثار
دیکھ اے شاہ کے مہمان یہ گھر تیرا ہے

مجھ کو لینے چلے آئے ہیں فرشتے یا شاہ
ملک الموت بھی کرتا ہے محبت کی نگاہ
خلد سے شیرِ خدا نکلے ہیں اللہ اللہ
لو برآمد ہوئے شبر بھی پدر کے ہمراہ
ننگے سر احمدِ مختار کی پیاری آئی
دیکھئے آپ کے نانا کی سواری آئی

قبلہ رو کیجئے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں
پڑھئے یٰسین کہ اب ہے یہ دمِ بازپسیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہِ عرش نشیں
لیجئے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی لب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اُڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیر کے لی انگڑائی
آیا ماتھے پہ عرق چہرے پہ زردی چھائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی
چل بسے حُرِّ جری پھر نہ کچھ آواز آئی
طائرِ روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

لاش اُٹھا کر شہِ دیں خیمہ کے در پر آئے
پاؤں مہماں کے سنبھالے علی اکبر آئے
غل ہوا خیمۂ عصمت میں کہ سرور آئے
پیچھے پردے کے حرم کھولے ہوئے سر آئے
دُخترِ فاطمہ سامانِ عزا کرنے لگی
فضّہ پردے کے اُدھر آ کے بُکا کرنے لگی

شاہ چلّائے کہ اے زینب و امِ کلثوم
ہم بھی مظلوم ہیں مہمان بھی موا ہے مظلوم
ماں ہے یاں اس کی نہ خواہر تمہیں ہے معلوم
کون لاشے پہ کرے نالہ و فریاد کی دھوم
اجر ہوگا تمہیں اشکوں سے جو منہ دھوؤ گی
اُس کو یوں روؤ کہ جس طرح مجھے روؤ گی

کہہ دو کبرا سے کہ ماتم کے لیے کھول دے سر
رشتے ناداں سکینہؑ اسے عمو کہہ کر
جاں گزا بین کرے بانوئے تفتیدہ جگر
ہم ادھر لاش پہ ماتم کریں تم روؤ اُدھر
غل ہے فریاد کا آوازِ بکا آتی ہے
سن لو امّاں کے بھی رونے کی صدا آتی ہے

میری جانب سے کہو لاش پہ آئیں سجّاد
بعد مرنے کے ہو تا روح مرے دوست کی شاد
یہ مصیبت مری شیعوں کو ہی رکھیں اسے یاد
نام حُر کے کریں آہ و فغان و فریاد
جس عزاخانہ میں وہ تعزیہ میرا رکھیں
اُس کا ماتم بھی اسی بزم میں برپا رکھیں

دوستی دوست کا غم دوست سدا کرتے ہیں
حق محبت کا وفادار ادا کرتے ہیں
فاتحہ دیتے ہیں سامان عزا کرتے ہیں
غیر مرجاتا ہی گھر میں تو ہنسا کرتے ہیں

تھا یہ وہ دوست کہ جاں اس پہ فدا ہوتی ہی
فاطمہؑ اپنا پسر کہہ کے اُسے روتی ہی
سُن کے یہ شور ہوا حُرِ دلاور ہی ہی
ای مددگار جگر بندِ پیمبرؐ ہی ہی
خوں میں سب اتر اہی ترا روے منورؔ ہی ہی
تشنہ و بیکس و مظلوم کے یاور ہی ہی

ادھر آنا تھا کہ تیری اجل آئی بھائی
گھر میں سادات کے دعوت بھی نہ کھائی بھائی
بس انیس اب یہ دعا مانگ کہ ای ربِ عباد
لکھنؤ کے طبقے کو تو سدا رکھ آباد
رونے والے شہِ والا کے رہیں خلق میں شاد
اُن کے سایہ میں برومند ہو ان کی اولاد
عشرۂ ماہ عزا نالہ کشی میں گزرے
سال بھر شہ کے غلاموں کو خوشی میں گزرے

رباعی

افسوس زمانے کا عجب طور رہا
کیوں چرخ کہن آہ نیا دور رہا
بس یاں سے کہیں اور چلو جلد انیس
اب یاں کی زمیں اور فلک اور رہا

رباعی

مال و زر و افسر و حشم ملتا ہی
ممکن ہی نگیں طبل و علم ملتا ہی
عنقا کو گر و سرخ پارس اکسیر
یہ سب ملتے ہیں دوست کم ملتا ہی

مرثیہ (۶)

جب حر کو ملا خلعتِ پُرخونِ شہادت جنّت میں گیا راکبِ گلگونِ شہادت
مسند جب رحمت تھا وہ مفتونِ شہادت جان بیچ کے پایا دُرِ مکنونِ شہادت
بے سر دیے ہرگز یہ مہم سر نہیں ہوتی ہاتھ آئی وہ دولت جو میسّر نہیں ہوتی

یہ مرتبہ بے شکر گزاری نہیں ہوتا یہ اوج بجز رحمتِ باری نہیں ہوتا
بے فیض یہ چشمہ کبھی جاری نہیں ہوتا کم قدر کا پلہ کبھی بھاری نہیں ہوتا
راحت بھی اُٹھائی ہے جب آزار ملے ہیں غواص کو اکثر دُرِ شہوار ملے ہیں

غل تھا کہ یہ اچھوں کی رفاقت کا ثمر ہے جنّت گلِ زہرا کی محبّت کا ثمر ہے
ایمان فقط نخلِ ولایت کا ثمر ہے سرسبزیِ حُر باغِ ریاضت کا ثمر ہے
مولا جسے چاہیں وہ گناہوں سے بری ہو کھیتی یہ ہراول کی ہے کیونکر نہ ہری ہو

اک جا تھے حر و شمر یہ عالم میں ہے مشہور کیا شانِ خدا ہے کہ یہ مغفور وہ مقہور
وہ ہوتا ہے جو ہوتا ہے اللہ کو منظور انسان رہے حق کی طرف اپنے بمقدور
دولت کو نہ حشمت کو نہ آرام کو دیکھے آنکھیں وہی رکھتا ہے جو انجام کو دیکھے

اللہ کے محبوب کے دربار میں پہونچا سر دے کے ید اللہ کی سرکار میں پہونچا
بے رنج و خلش گلشنِ بے خار میں پہونچا وہ نار میں یہ خلد کے گلزار میں پہونچا
مالک نے لیا اُس کو اسے شاہِ عرب نے رحمت نے اسے گھیر لیا اس کو غضب نے

رویا اسے زہرا کا پسر واہ ری قسمت زانو پہ حسین اور وہ سر واہ ری قسمت
طوبیٰ کے تلے خلد میں گھر واہ ری قسمت دُنیا سے یہ راحت کا سفر واہ ری قسمت
کیا جلد گیا سوئے ارم دارِ فنا سے سوکھا جو پسینہ بھی تو جنت کی ہوا سے

خواہش یہ ہر اک حور کی تھی حر ادھر آئے ۔ یہ صاحب اقبال و تہوّر ادھر آئے
لہراتا تھا کوثر بھی کہ یہ ڈر ادھر آئے ۔ فرماتے تھے حیدر یہ بہادر ادھر آئے
مشتاق ملاقات کے سب چھوٹے بڑے تھے ۔ محبوب خدا ہاتھوں کو پھیلائے کھڑے تھے

فرماتی تھی زہرا مرے غمخوار کو لاؤ ۔ جلدی مرے پیارے کے مددگار کو لاؤ
تعظیم سے تکریم سے جرّار کو لاؤ ۔ لاؤ مرے آگے حُرِ دیندار کو لاؤ
پایا نہ کفن واں تو یہاں شاد کروں گی ۔ میں حلۂ جنت اُسے امداد کروں گی

حوروں کا وہ میووں کے طبق سامنے لانا ۔ در پردہ اشارے ۔ کہ ہماری طرف آنا
کوثر ہی وہ ۔ منظور ہے گر پیاس بجھانا ۔ اس قصرِ جواہر سے کہیں اور نہ جانا
جو کہئے وہ کریں ۔ تُم ہی خدمت شہدا کی ۔ ہم سب ہیں کنیزیں پسرِ شیرِ خدا کی

حقا کہ یہ رتبہ شہِ ذی جاہ نے بخشا ۔ ایمان کا شرف فاطمہؑ کے ماہ نے بخشا
طالب تھا وہ جس کا وہی اللہ نے بخشا ۔ بخشا اُسے خالق نے جسے شاہ نے بخشا
جنّت ادھر آئی جدھر آیا قدم اُن کا ۔ کر دیتا ہے انساں کو فرشتہ کرم اُن کا

اے حُرِّ دلاور تری تقدیر کے صدقے ۔ رتبے کے فراغت و توقیر کے صدقے
مہماں کے تصدّق شہِ دلگیر کے صدقے ۔ اُس صحبتِ ذی قدر کی تاثیر کے صدقے
ناکام کا یوں کام ملاقات میں بن جائے ۔ برسوں کا جو بگڑا ہو وہ اک بات میں بن جائے

اب یاں سے رقم کرتا ہے یوں راوی صادق ۔ جب قتل ہوا حُر سا مددگار موافق
پھر فوج پہ برسانے لگے تیر منافق ۔ مر جانے پہ اک دل ہوئے سب شاہ کے عاشق
ایک ایک سے پہلے تھا خریدار اجل کا ۔ سر کٹ لیے تھے گرم تھا بازار اجل کا

یوں جاتے تھے میدان شہادت میں وہ جرّار ۔ جس طرح کہ بچھڑی ہوئی بلبل سوئے گلزار
خود روکتے تھے فرق پہ جب آتی تھی تلوار ۔ باراں کرم جانتے تھے تیروں کی بوچھار
برچھی جو لگی نخل شہادت میں پھل آیا ۔ جاں آ گئی جس وقت پیام اجل آیا

زخموں کو عطائے صمدی جانتے تھے وہ
آزار کو لطف احدی جانتے تھے وہ
جینے کو مقدر کی بدی جانتے تھے وہ
مرنے کو حیاتِ ابدی جانتے تھے وہ
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ محمد کی ثنا تھی
دو روز کی پیاس اُن کیلئے آبِ بقا تھی

قربانِ تولائے حبیب ابن مظاہر
یکساں صفتِ مہرِ مبیں باطن وظاہر
عصیاں سے بری طیّب و پاکیزہ وطاہر
جاں بازِ جہاں دیدہ فنِ جنگ سے ماہر
سر ہلتا تھا پیری سے قدِ راست میں خم تھا
اس پر بھی کچھ آگے ہی جوانوں سے قدم تھا

رعشا تھا کہ قابو میں نہ تھے دستِ نکوکار
پر ایک میں محکم تھی سپر ایک میں تلوار
جب شہ کی طرف تیر لگاتے تھے ستمگار
یہ بڑھ کے اُسے روکتے تھے سینے پہ ہر بار
بھائی مرے پاس آؤ یہ فرماتے تھے حضرت
جب تیر اُنھیں لگتا تھا تڑپ جاتے تھے حضرت

جب ایسے رفیقوں کا بھرا ہو گیا خالی
بھرتا تھا دمِ سرد وہ کونین کا والی
پھر تھا کوئی مولا کا نہ ہمدم نہ موالی
لاشوں کو لگاتے تھے گلے سرورِ عالی
بے تاب تھے اس طرح ہر اک دوست کے غم میں
جیسے کوئی روتا ہے برادر کے الم میں

لاشوں کے اُٹھانے سے نہ پائی تھی فراغت
جو نوک کے نیزوں کو بڑھے اہلِ شقاوت
مولا کے یگانوں نے کیا عزمِ شہادت
لٹنے لگی زہرا و محمد کی بضاعت
سیدانیوں کا دودھ جو پی پی کے پلے تھے
جلادوں کی تلواریں تھیں اور اُن کے گلے تھے

لاکھوں سے لڑے حضرتِ عباس کے بھائی
حملوں میں دکھائی شہِ مرداں کی لڑائی
سب شانِ پدر بیٹوں نے جعفر کے دکھائی
مسلم کی جو میراث تھی فرزندوں نے پائی
لاکھوں میں پھر اس شان سے شاہِ دوجہاں تھے
دو طفل جو ہیں فقط اور تین جواں تھے

دو طفل وہ جو تین شبانہ روز کے پیاسے
زینب کے پسر شیرِ الٰہی کے نواسے
خود اپنی شہادت کے طلب گار خدا سے
بے تاب کہ کیوں رہ گئے پیچھے شہدا سے
جینے کی ہماری جو خبر پائیں گی اماں
لاشے بھی یقیں ہے کہ نہ منگوائیں گی اماں

قاسم حسن سبز قبا کا مہ تاباں
عباس علی چشم و چراغ شہ مرداں
ہم شکل نبی نور نگاہ شہ ذی شاں
زینب کے پسر جعفر و زہرا کے دل و جاں
تاباں نظر آتا تھا قمر پاس قمر کے
پانچوں یہ جری چاند تھے شبیر کے گھر کے

ایک ایک جری ملک شجاعت کا شہنشاہ
بچپن میں اولوالعزم کہ العظمۃ للہ
ذی قدر سرافراز و وفاکیش و دل آگاہ
شیر ان کی نظر دیکھ کے بن جاتے تھے روباہ
پیدا یہ تہور سے کہ لاکھوں ہیں تو کیا ہیں
دعویٰ تھا ہر اک کو کہ ہمیں شیر خدا ہیں

کھولے ہوئے رایت کوئی تولے ہوئے شمشیر
بے تاب تھے تلوار کے چلنے میں ہے کیوں دیر
فاقوں میں نہ بردست کیے لاکھوں سے نہ ہوں زیر
بیٹھے ہیں پلے جو اسد اللہ کے وہ شیر
جز سجدۂ حق سر کبھی ان کے نہ جھکے تھے
یہ قبلۂ عالم کا ادب تھا جو رکے تھے

اس وقت عجب غم تھا شہ جن و بشر کو
نہ روح کو راحت تھی نہ آرام جگر کو
کھو سکتے تھے بھائی کو نہ اکبر سے پسر کو
نہ عون و محمد کو نہ شبر کے قمر کو
ہوتے تھے سب اک باغ کے پھول ایک چمن کے
وہ بھائی کا بیٹا تھا یہ بیٹے تھے بہن کے

فرماتے تھے موت آئے تو چھٹ جاؤں الم سے
یارب مرا گھر ہی انھیں جراروں کے دم سے
بچھڑیں نہیں ان سے یہ جدا ہوئیں نہ ہم سے
کٹ جائے گلا جلد کہیں تیغ دودم سے
باتوں سے یہ محبوب گنوائے نہیں جاتے
داغ ان کے تو بندے سے اٹھائے نہیں جاتے

ناگاہ ہوا شور مبارز طلبی کا
پھر قصد لعینوں نے کیا بے ادبی کا
منہ سرخ ہوا غیظ سے ہم شکل نبی کا
رایت بھی بڑھا فوج رسول عربی کا
حیدر کے نواسوں کی بھی ابرو پہ بل آیا
چھوٹا تو یہ بگڑا کہ پرے سے نکل آیا

گھبرا کے پکارے جو اسے سید ابرار
بس پھر کے گرے پاؤں پہ آقا کے وہ جرار
کی عرض بصد عجز کہ اے کل کے مددگار
ہم دونوں غلام اب ہیں اجازت کے طلبگار
بے تاب ہیں دل جان لڑائی میں پڑی ہے
اے نور خدا ذرہ نوازی کی گھڑی ہے

مرنے کو اگر پہلے گئے قاسمؑ و اکبرؑ
یا شاہ ہمیں دودھ نہ بخشیں گی مادر
شبرؑ کی وہ تصویر یہ ہم شکل پیمبرؐ
توقیر اسی میں ہے کہ ہم صدقے ہوں اُن پر
مالک ہیں خداوند ہیں سردار ہیں دونوں
ہم ان کے بزرگوں کے نمک خوار ہیں دونوں

بسمل جو ہوئے مسلمِ مظلوم کے پیارے
ہم خیمے میں جا سکتے نہیں شرم کے مارے
اماں نے کہا ہوگا کہ ابتک نہ سدھارے
جانوں کو بچاتے ہیں جگر بند ہمارے
قاصر ہیں جو توقیرِ شہادت نہیں ملتی
کیا جانیں اسے وہ کہ اجازت نہیں ملتی

حضرت پہ ہے روشن جو ہمارا ہے ارادہ
سِن کم ہیں پہ ہمت ہے جوانوں سے زیادہ
نانا تو علیؑ جعفرِ طیار سے دادا
ہم ڈھونڈھتے ہیں صبح سے فردوس کا جادہ
شیروں کی طرح بیشۂ حیدرؑ میں پلے ہیں
تلواروں سے ہم کھیل کے اس گھر میں پلے ہیں

وہ تیغ کے مالک ہیں تو مختار ہیں ہم بھی
دادا کی طرح مرنے پہ تیار ہیں ہم بھی
نانا تھے جو کرار تو جرار ہیں ہم بھی
سر دے کے شہادت کے طلبگار ہیں ہم بھی
ہے جوشِ وفا عمر کے پیمانے بھرے ہیں
ہم صبح سے سر نذر کو ہاتھوں پہ دھرے ہیں

ہم آپ سے مرنے کے لئے جا نہیں سکتے
زخمِ تبر و تیر و سناں کھا نہیں سکتے
بے حکم جو مطلب ہے اُسے پا نہیں سکتے
آداب سے کچھ لب پہ سخن لا نہیں سکتے
پیچھے رہے اوروں سے یہ تقدیر ہماری
ہاتھ آپ کے ہے عزت و توقیر ہماری

ہم دونوں غلام اکبرؑ و اصغرؑ کے ہیں یا شاہ
الفت کو بس اب دل سے اٹھا دیجیے واللہ
اماں کا تو نازک ہے مزاج آپ ہیں آگاہ
بنتِ اسدِ حضرتِ باری ہیں وہ ذی جاہ
پوچھیں گی خفا ہو کے تو کیا اُن سے کہیں گے
آزردہ ہوئیں وہ تو کہیں کے نہ رہیں گے

عورت ہیں یہ خو بوئے شہِ مرداں کی ہے ساری
شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری
تم یہ نہ سمجھو کہ ہیں عاشق ہوں تمہاری
بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیاری
کس کام کے پھر سر جو تصدق نہ کرو گے
تب دودھ میں بخشوں گی جو عزت سے مرو گے

یہ کہہ کے جو رونے لگے زینب کے جگر بند
حضرت نے کہا ہیں ہمیں ہر حال رضامند
کھوئے ہیں کسی بھائی نے ہمشیر کے فرزند
کس منہ سے کہوں آہ کہ ہو خاک کے پیوند
تنہائی کا دُکھ فاطمہ کا لال سہے گا
لاشے کے اُٹھانے کو بھی کوئی نہ رہے گا

اکبر کو تو ہمشیر نے میں نے تمھیں پالا
ماموں سے جدا ہوتے ہو جب ہوش سنبھالا
اب کون ہے غربت میں مرا اٹھانے والا
دل کا کوئی ارمان بھی تم سے نہ نکالا
دس سال بھی پورے نہیں دونوں کے سنوں میں
دنیا سے اجل لے چلی شادی کے دنوں میں

دونوں سے یہ فرما کے اُدھر روتے تھے شبیرؑ
چپ بیٹھی تھی اندوہ میں اُدھر شاہ کی ہمشیر
سرزانو پہ تھا فکر میں اور لب پہ یہ تقریر
محجوب کیا بیٹوں نے یہ ہے مری تقدیر
میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے
اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے

آتا ہے دمِ صبح سے یاں لاشے پہ لاشا
اُن کے لیے اوروں کی لڑائی ہے تماشا
پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا
باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں حاشا
رُکتے ہیں وہ لاور کہیں روکے سے کسی کے
وہ سب بھی تو پیارے تھے حسین ابن علیؑ کے

بانو نے کہا دونوں کی عمریں ابھی کیا
نہ گھر سے وہ نکلے نہ کوئی معرکہ دیکھا
میدان کی رضا دیتے نہ ہوں گے شہِ والا
آزردہ نہ ہوں آپ یہ غصّے کی نہیں جا
سُن لیجیے گا رن میں جو کچھ کام کریں گے
حیدر کے نواسے ہیں بڑا نام کریں گے

فرمایا کہ ہاں جو مجھے تقدیر دکھائے
جی جاؤں گی مر کر جو وہ میدان سے آئے
کیوں شاہ سے رخصت کا سخن لب پہ نہ لائے
کیا جانیے کس فکر میں ہیں وہ مرے جائے
جو چاہیں کریں بیٹوں کے قابل میں کہاں ہوں
اب وہ مرے فرزند نہیں دونوں کی ماں ہوں

یہ ذکر تھا فضّہ جو خبر لے کے یہ آئی
فریاد کہ اب لٹتی ہے زینب کی کمائی
لو میرے خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی
اے بنتِ علیؑ روتے ہیں آپ کے بھائی
بچے بھی شریکِ شہدا ہوتے ہیں لوگو
دو بھانجے ماموں سے جدا ہوتے ہیں لوگو

فضہؑ سے یہ سُننا تھا کہ بس رونے لگے سب
فرمایا کہ صد شکر بر آیا مرا مطلب
بہتر ہی جو لڑنے کو وہ پیارے گئے دونوں
بچّے ہیں لڑائی کے نہیں ننگ سے واقف
فوجوں سے نہ آگہ نہ فنِ جنگ سے واقف
بوڑھا سے ہیں قد بھی نہیں کچھ ایسے بڑھے ہیں
دہ سالہ و نہ سالہ تھے نکلے جو وطن سے
بچّے مرے کمزور ہیں فاقوں کے محن سے
محسوب ہیں ان فدیوں میں علی ابن ولی کے
بانو نے کہا دیکھ لو پھر اُن کو بُلا کر
اصرار کیا سب نے تو گردن کو جھکا کر
صدقے گئی کچھ کام ہی یاں آکے سدھارو
فضہؑ گئی اور خیمے میں لائی اُنھیں ہمراہ
قدموں پہ گرے ہاتوں کو جوڑے جو وہ ذیجاہ
ماموں پہ فدا ہوتے ہو میں تم پہ فدا ہوں
چھوٹے نے کہا جوڑکے ہاتھوں کو کہ مادر
جانا تھا وہاں ایک کے بعد ایک تو لاور
کس سے کہیں آقا پہ جو کچھ رنج و تعب تھا
لاشوں کا وہ آنا وہ ہجومِ الم و یاس
آزردہ نہ ہوں آپ یہی تھا ہمیں سواس
جوڑے ہیں کبھی ہاتھ کبھی گر و پھرے ہیں

اور خاک پہ سجدے کو جھکیں حضرتِ زینبؑ
عزت مرے بچّوں کی ترے ہاتھ ہی یارب
یہ خوشخبری آئے کہ مارے گئے دونوں
نیزے کے نہ تلوار کے ہیں جنگ سے واقف
دونوں میں نہیں ایک بھی چورنگ سے واقف
گھوڑوں پہ تو وہ پہلے پہل آج چڑھے ہیں
بو دودھ کی آتی ہے ابھی ان کے دہن سے
دھڑکا ہے کہ گھبرا کے چلے آئیں نہ رن سے
تو ان کی مدد کر کہ نواسے ہیں علیؑ کے
فرمایا نہیں آئیں گے خود برچھیاں کھا کر
فرمایا کہ اچھا کوئی کہہ آئے یہ جا کر
جانے ہو تو شکلیں مجھے دکھلا کے سدھارو
آئے صفت مہر لرزتے ہوئے دو ماہ
لپٹا کے گلے کہنے لگی بنتِ یداللہ
لو آؤ کہ میں اب تو نہ غصّے نہ خفا ہوں
ہر دم تھے اسی فکر میں ہم دونوں برادر
ہر دوست سے مل ملکے گلے روتے تھے سرور
اس وقت میں رخصت طلبی ترکِ ادب تھا
جرات نہ پڑی عرض کی تھے گرچہ بہت پاس
جب بڑھتے تھے ہم روکتے تھے حضرتِ عباس
راضی ہوئے جب پاؤں پہ اس وقت گرے ہیں

خوش ہو کے کہا ماں نے کہ شاباش دلیرو — اب دیر نہیں خوب سدھارو مرے شیرو
ہاں چاہیئے منہ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو — دو شیر ہو مل کر عمر و شمر کو گھیرو
توقیر تمھاری ہو مری ناموری ہو — سر دونوں کے لاؤ تو میں جانوں کہ جری ہو

دادا کو جو پوچھو تو علمدار پیمبرؐ — ہاتھوں کے عوض جن کو خدا نے دیئے دو پر
نانا سا تو عالم میں نہ تھا کوئی دلاور — کرّار کی جرأت تو سنی ہوگی مکرّر
یوں سب ہیں پہ سرتاج دلیروں کے تمھیں ہو — ماں صدقے گئی شیر تو شیروں کے تمھیں ہو

اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے — جو فقر میں کرتا ہے سخاوت وہ غنی ہے
کیا شہرۂ خیبر شکنی بت شکنی ہے — جو بات پہ سر دے وہ سخاوت کا دھنی ہے
بودے کی کہاں آنکھ کہاں مرد کے تیور — چھپتے نہیں لاکھوں میں جوانمرد کے تیور

ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ — جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ
سر بیچ کے ذی قدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ — ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ
مرکر نہ ہٹے قابلِ احسنت وہی ہے — جو کھیت میں سرسبز ہو سادات وہی ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی — گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی — بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی
آفت میں حواس اُن کے بجا ہوتے ہیں پیارو — جرّاروں کے تیور ہی جدا ہوتے ہیں پیارو

شیروں کی مہم بات میں سر کرتے ہیں صفدر — آقا کے دلِ پاک میں گھر کرتے ہیں صفدر
تلواروں میں سینوں کو سپر کرتے ہیں صفدر — عزت پہ بزرگوں کی نظر کرتے ہیں صفدر
دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی — مرتے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

نانا نے تمھارے درِ خیبر کو جو توڑا — مانندِ سپر ہاتھ سے اس در کو نہ چھوڑا
ہر وار میں بچتا تھا نہ اسوار نہ گھوڑا — خالی ہوا جب قلعہ تو منہ جنگ سے موڑا
تھرّاتے تھے کفار تزلزل میں زمیں تھی — تھا زور تو یہ اور غذا نانِ جویں تھی

جب دستِ ید اللہ میں تیغ دو سر آئی
بس قبضۂ قدرت میں یکایک ظفر آئی
چھلتے یہ ادھر فوج پہ نصرت ادھر آئی
بعد آپ پھرے فتح کی پہلے خبر آئی
پڑھتے ہیں وہ کلمہ جو مسلماں ہوئے دبکے
اب تک تو سر اُٹھتے نہیں کفارِ عرب کے

خندق کی وغا عمرو سیہ کار کی وہ دھوم
تھراتا تھا تلوار سے جس کی عرب و روم
رد کرکے جو حربوں کو بڑھا خاصۂ قیوم
جھپٹا اسد آہو پہ یہ سب کو ہوا معلوم
اِک ضرب میں نے گرز نہ مغفر تھا نہ سر تھا
خندق کے ادھر لاش سرِ نحس اُدھر تھا

جس وقت ظفریاب ہوئے حیدرِ کرّار
اک ہاتھ میں سر عمرو کا اور ایک میں تلوار
فرمایا نبی نے یہ باعلان و بہ تکرار
افضل ہے دو عالم کی عبادت سے یہ اک وار
سر فتح کا تھا پاؤں پہ خالق کے ولی کے
جبریلِ امیں چومتے تھے ہاتھ علی کے

واری یونہیں تم بھی مرے کام آؤ تو جانوں
آقا کی اطاعت کو بجا لاؤ تو جانوں
اِن چھاتیوں پر زخمِ سناں کھاؤ تو جانوں
لڑ بھڑ کے جب اس فوج سے مر جاؤ تو جانوں
جرّار ہو سب حال سے محرم ہیں تمھارے
مجکو بھی یہ دھڑکا ہے کہ سن کم ہیں تمھارے

ماں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نہ جانا
پانی کی طرف پیاس میں گھبرا کے نہ جانا
ساحل پہ کبھی سرد ہوا پا کے نہ جانا
صابر ہو تو رہواروں کو گرما کے نہ جانا
ایسے تو نہیں جو مجھے محجوب کروگے
ہیں دودھ نہ بخشوں گی جو پیاسے نہ مروگے

جس پانی کو ترسے اسد اللہ کا پیارا
کیوں جاؤ اُدھر نہر پہ کیا کام تمہارا
عاقل کے لیئے کافی و وافی ہے اشارا
گر آبِ بقا ہو تو مناسب ہے کنارا
وہ کام ہو جس کام میں کوثر پہ گزر ہو
دم بھر کے لیئے کیوں عرقِ شرم میں تر ہو

بھائی کسی ہنگام میں بھائی کو نہ چھوڑے
دونوں ہیں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے
جرات کو جلالت کو لڑائی کو نہ چھوڑے
ہمت کو مروت کو بھلائی کو نہ چھوڑے
جو امر کہ مشکل ہے وہ دشوار نہ ہوگا
اک دل ہوئے جب دو تو کوئی چار نہ ہوگا

اِک بھائی لڑتے بڑھکے جو ہاتھ ایک کا تھک جائے
بلوا جو پھر اُس پہ ہو تو یہ پھر کمک جائے
ہاتھوں میں صفائی ہو کہ بسمل بھی پھڑک جائے
گر صف ہو تو پسپا ہو پرا ہو تو سرک جائے
حملوں میں سب انداز ہوں خالق کے ولی کے
پہچان لیں وہ سب کہ نواسے ہیں علی کے

نیزوں کی طرف چھاتیاں تانے ہوئے جانا
ہاں تیروں کی بارش میں سپر منہ پہ نہ لانا
ہنس ہنس کے میں قربان گئی برچھیاں کھانا
لازم ہے وہ ہمت کہ معرّف ہو زمانا
اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا
دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

دونوں نے کہا ہوگا یہی فضلِ خدا سے
کیا بات ہے جیتے ہیں تو مر جائیں گے پیاسے
ہم اور نہیں کوئی علی کے ہیں نواسے
غافل نہ رہیں آپ غلاموں کی دعا سے
کچھ ہم سے نہ تلوار سے نہ ڈھال سے ہوگا
جو ہوگا وہ سب آپ کے اقبال سے ہوگا

ارشاد نہ حضرت کا بجا لائیں تو مجرم
بھولے سے بھی دریا کی طرف جائیں تو مجرم
ڈر جائیں تو بے وقر جو ہٹ جائیں تو مجرم
بڑھ بڑھ کے نہ شمشیر و سناں کھائیں تو مجرم
مر جائیں گے دنیا میں سدا کون جیا ہے
دودھ آپ کا ہم دونوں غلاموں نے پیا ہے

جیتے ہیں تو بے صف شکنی ہم نہ رہیں گے
مجبور ہیں سینوں میں اگر دم نہ رہیں گے
سر کاٹے گا پاؤں جو محکم نہ رہیں گے
لڑکے ہیں جوانوں سے مگر کم نہ رہیں گے
جینا کسی صورت ہمیں مطلوب نہیں ہے
اب کیا کہیں خود اپنی ثنا خوب نہیں ہے

چھوٹے تو ہیں کیا منہ سے بڑی بات نکالیں
ان سینوں پہ کھدے کوئی سو نیزوں کی بھالیں
سیدانیاں ایسی جنھیں آغوش میں پالیں
تلواروں میں روکیں گے وہی سینوں پہ ڈھالیں
ہم جینے پہ مرتے نہیں مرنے کو جیے ہیں
سینے ہمیں کس واسطے خالق نے دیے ہیں

مختار ہیں یوں آپ سزا دیں کہ خفا ہوں
ہوتے ہیں مکدّر کہیں دل جن کے صفا ہوں
وہ نام پہ کیونکر نہ مریں جو شرفا ہوں
تب وقت ہے غصّہ کا جو وعدے نہ وفا ہوں
کیا زیست پھر اُن کی جنھیں ماں باپ نہ بخشیں
تیور بھی جو میلے ہوں تو دودھ آپ نہ بخشیں

ایسے تو نہیں ہم جو شجاعت نہ دکھائیں
سب نام کریں اور ہمیں جرأت نہ دکھائیں
نانا کی اگر شان و جلالت نہ دکھائیں
مصحف کی قسم آپ کو صورت نہ دکھائیں
خندق ہو تو لاشوں سے زمیں پاٹ کے مرجائیں
تیغیں نہ چلیں گر تو گلا کاٹ کے مرجائیں

جب کہہ چکے یہ جوشِ شجاعت میں وہ گلرو
آنکھوں سے ٹپکنے لگے رخساروں پہ آنسو
لپٹا کے گلے کہنے لگی زینبِ خوش خو
اللہ یہ غصہ ہے کہ بل کھاتے ہیں گیسو
لڑنا ہے تمھیں فوج سے مطلوب لڑو گے
لو رو نہ معلوم ہوا خوب لڑو گے

صدقے میں ارادوں کے مرے شیر جوانو
اے بے وطنو فاقہ کشو تشنہ دہانو
اب غیظ سے تھرّاؤ نہ کہنا مرا مانو
ماں کہتے تھے پر اب مجھے تم خادمہ جانو
یہ فصل لڑائی کی نہیں کھیل کے دن ہیں
میں اس لیے کہتی ہوں کہ چھوٹے ابھی سن ہیں

شیر اُس کے ہو تم شیر ہے جو بنتِ اسد کا
سر جس نے لیا معرکۂ صفین و اُحد کا
دُنیا میں بڑا نام ہے تم دونوں کے جد کا
ماں صدقے گئی وقت ہے ماموں کی مدد کا
ایک ایک جگہ دشتِ ستم لاشوں سے بھر دے
اللہ تمھیں لشکرِ اعدا پہ ظفر دے

لو بخشدیا دودھ سدھارو مرے پیارو
اُلجھے ہوئے گیسو تو سنوارو مرے پیارو
میلی ہے یہ پوشاک اُتارو مرے پیارو
دولھا تو بنا لوں مرے پیارو مرے پیارو
خوش ہونگی میں تب گھوڑوں پہ جس آن چڑھوگے
شادی ہے بڑی آج کہ پروان چڑھوگے

فرما کے یہ لیں دونوں کے چہروں کی بلائیں
اور تھام کے بازو کو پڑھیں آپ دعائیں
فرمایا کہ رخصت جنھیں ہونا ہو وہ آئیں
لو بی بی ہو سب آؤ تو بچّے مرے جائیں
رن میں یہ برات اپنی دکھانے کو چلے ہیں
دونوں دُلھنیں بیاہ کے لانے کو چلے ہیں

سب بیبیاں آئیں جو کلیجوں کو سنبھالے
تسلیم کو جھک جھک گئے وہ نازوں کے پالے
جس وقت چلے خیمے سے وہ گیسوؤں والے
در تک آ گئی ماں خاکِ عزا فرق پہ ڈالے
ڈیوڑھی سے جو دونوں دُرِ یکتا نکل آئے
نزدیک تھا یہ ماں کا کلیجہ نکل آئے

خیمے سے برآمد ہوئے زینبؑ کے جو دلبر — دیکھا کہ حسین ابن علی روتے ہیں در پر
بس جھک گئے تسلیم کو حضرت کی وہ صفدر — منہ کر کے سوئے چرخ پکارے شہ بے پر
یہ وہ ہیں جو آغوش میں زینب کی پلے ہیں — بچے بھی تری راہ میں مرنے کو چلے ہیں

کہکر یہ سخن دونوں کو گھوڑوں پہ چڑھایا — دونوں نے شرف پایۂ معراج کا پایا
بجلی کا سب انداز سمندوں نے دکھایا — دوڑے کہ دکھائی نہ دیا دھوپ میں سایا
ثابت نہ ہوا ایک پہ کیا ہو گئے دونوں — جنگل کو جو دیکھا تو ہوا ہو گئے دونوں

ایک ایک سے جاندار گراں قدر سبک رو — وہ جست وہ کاوے وہ طرارے وہ دوا دو
کیلوں کی وہ تابش وہ ہر اک نعل کا پرتو — تاروں میں دکھاتے تھے چمک چار مہ نو
اک چاند تھا وہ جو سم توسن کا نشاں تھا — بالائے زمیں عالم بالا کا سماں تھا

شکلیں بھی پری جرات و سرعت کے علاوا — دو گام تھا جن کے لیے سو کوس کا دھاوا
قد ایک سے شکل ایک سی اور ایک سا کاوا — گہ پشت میں بجلی وہ روا رو میں چھلاوا
شوخی میں یہ آہو تھا اگر طیر تھا وہ بھی — یہ بادیہ پیما تو فلک سیر تھا وہ بھی

ہاں کبک تو یہ رنگ یہ انداز دکھائے — قائل ہوں جو طاؤس یہ پرواز دکھائے
جائیں جو پری چال میں یہ ناز دکھائے — آہو یہ طرارے یہ تگ و تاز دکھائے
ہوگا وہی لاریب تصور میں جو ہے — دعویٰ ہی تو آئیں یہی میداں یہی گو ہے

تھم تھم کے بھی چلنے میں سب انداز ہوا کا — لڑنے میں سماں برق کا اڑنے میں ہما کا
پائے انھیں مقدور یہ کب پیک صبا کا — نہ وہم کا واں دخل نہ فہم شعرا کا
یہ عجز ہے تعریف جو کرتا نہیں کوئی — باندھیں کسے مضموں تو ٹھہرتا نہیں کوئی

یوں ذہن میں آتے ہی نکل جاتے ہیں سن سے — جس طرح نسیم آکے نکل جائے چمن سے
جرات میں فزوں شیر سے سرعت میں ہرن سے — آگاہ ہیں وہ جرات و سرعت کے چلن سے
نعل ان کے سروں ہی سے چلے فوج ستم پر — پڑتے تھے قدم دونوں کے ٹلدل کے قدم پر

گھوڑوں کو اڑاتے ہوئے پہونچے جو بہادر
فوجِ ستم آرا ہوئی سب غرقِ تحیر
اک شور ہوا کون سے دریا کے ہیں یہ دُر
لڑکے ہیں پہ اللہ رے اقبال و تہور
کیا جانیے کیا نام ہیں ان کے اب و جد کے
تیور سے یہ پیدا ہے کہ بچے ہیں اسد کے

پیشانیاں خورشیدِ جہاں تاب سے بہتر
رخسارۂ رنگیں گلِ شاداب سے بہتر
دانتوں کی صفا گوہرِ نایاب سے بہتر
چہروں کا عرق موتیوں کی آب سے بہتر
ابرو نہیں پیشانیِ ذی قدر کے نیچے
ہیں دو مہِ نو بال سے اک بدر کے نیچے

حیراں ہیں عدو حسن پہ اور دونوں کے سن پہ
ابرو وہ کمانیں ہیں کہ قرباں ہیں سب ان پر
آنکھیں وہ کہ پریوں کی نظر پڑتی ہے جن پر
گیسو ہیں کہ سایہ کیا ہے رات نے دن پر
گیسو و رخ خوں میں بھرے رنج کی جا ہے
دو بدر شبیں چار شش و پنج کی جا ہے

آنکھوں کی سیاہی پہ فدا نرگسِ شہلا
یہ عینِ شجاعت ہے کہ ہے معرکہ پہلا
ہیں پنجتنی دل کبھی ان کا نہیں دہلا
بے تیغوں کے کھیلے کوئی بچہ نہیں بہلا
تلوار چلی پھر گئی چتون جدھر ان کی
غصے میں سروہی سے سوا ہے نظر ان کی

دل بر ہیں دلیروں کے حسینوں کے حسیں ہیں
گویا یہ دہن خاتمِ قدرت کے نگیں ہیں
شیریں سخن اس طرح کے عالم میں نہیں ہیں
یہ طرفہ حلاوت ہے کہ باتیں نمکیں ہیں
جملے ہیں وہی صاف وہی شرط و جزا ہے
تقریر میں سب مصحفِ ناطق کا مزا ہے

شرمندہ ہے شمشاد بھی قد معتدل ایسے
رکھ دیتے ہیں سینوں کو ستانوں پہ دل ایسے
مختوم ہیں خط خال کے نقطے سجل ایسے
دیکھے ہیں کسی چشم کی پتلی نے تل ایسے
سطریں ہیں یہ سب گیسوؤں کے بال نہیں ہیں
مہریں ہیں یہ خطِ حسن پہ ہیں خال نہیں ہیں

وہ چاند سے سینے کہ صفا کا ہے گھر ان میں
عدل و کرم و صنعت و علم و ہنر ان میں
شیروں کا ہے یہ بیشہ کہ دل ان میں جگر ان میں
اسرارِ جنابِ احدی کے گہر ان میں
خود جن میں ہو دریا یہ سفینے نہیں دیکھے
اس طرح کے سینے تو کسی نے نہیں دیکھے

مضموں ہیں سردست یہ ہاتھوں کی ثنا کے
ناخن ہیں ہری ونوں کے ہر عقدہ کشا کے
قبضے پہ اگر ہاتھ رکھیں غصّے میں آ کے
دم بھر میں ہلا دیں طبقے ارض و سما کے
ہے کونسا سرکش جو یہاں پست نہیں ہے
ان سے کوئی دنیا میں تہ دست نہیں ہے

بت کعبہ سے جن سب نے نکالے یہ وہی ہیں
رُکتے نہیں جن لوگوں کے بھالے یہ وہی ہیں
ہے فتح و ظفر جن کے حوالے یہ وہی ہیں
خیبر کے جو ہیں توڑنے والے یہ وہی ہیں
پروانے ہیں شمع حرم لم یزلی پر
قبضہ انھیں لوگوں کا ہے شمشیر علی پر

فوجیں نہیں ٹھہریں یہ جہاں جم کے لڑے ہیں
ہاتھ ان کے تو فولاد کے پنجے سے کڑے ہیں
چھوٹے ہیں جو اس گھر کے وہ جرار بڑے ہیں
دیکھو یہ کہ بچپن سے ہٹے تو شیر کھڑے ہیں
یہ پاؤں ہٹانے نہیں ہیں جنگ پہ چڑھ کے
سر کٹنے پہ بھی گرتے ہیں تو کھیت سے بڑھ کر

ناگاہ یہ بڑھ کر پسر سعد پکارا
ای شیر دلو نام و نسب کیا ہے تمھارا
تلواریں پکڑ کر یہ پکارے وہ دل آرا
خالق نے ہمارے لیے دنیا کو سنوارا
خورشید زمیں تاج سر عرش بریں ہیں
پہلا یہ شرف ہے کہ غلام شہ دیں ہیں

دادا ہے شہنشاہ دو عالم کا مددگار
سردار جہاں فخر عرب جعفر طیار
وہ شُقّہ طراز علم احمد مختار
آلودہ رہی خوں میں جس شیر کی تلوار
ہاتھوں کے عوض جن سے سردست لیے ہیں
اللہ نے پر اُن کو زمرد کے دیے ہیں

نانا اسد اللہ مددگار دو عالم
دیندار نمودار جہاں دار دو عالم
سلطان قضا منتظم کار دو عالم
سرتاج فلک جیغۂ دستار دو عالم
سب امر اہم عقل کی میزان میں تلے تھے
عقدے وہ مٹے حل جو کسی سے نہ کھلے تھے

بازوے نبی دست خدا نفس پیمبر
طیب و زکی و طاہر و پاکیزہ و اطہر
لشکر شکن و بت شکن و فاتح خیبر
سرتاج عجم میر عرب حیدر صفدر
اصنام سے کیا خانۂ حق پاک کیا ہے
کھوا لیے ہیں اژدر کا دہن چاک کیا ہے

وہ رعب کہ شیروں کو بھی عبرت ہوئی جس سے
وہ حکم کہ خورشید کو رجعت ہوئی جس سے
وہ زور کہ ایمان کو قوت ہوئی جس سے
وہ ضرب بنا کفر کی غارت ہوئی جس سے
دیکھے اُسے آگاہ جو حیدر سے نہیں ہو
بہتر کوئی شاہد درِ خیبر سے نہیں ہو

کانپا کیا روم و عرب اک تیغ دو سر سے
گزری سر مرحب سے تو عنتر کی کمر سے
دینداروں کو امن اس نے دیا فتنہ و شر سے
ضرب اُس کی نہ رُکی گئی جبریل کے پر سے
کیا کیا نہ بدل جائے گا کیا کیا نہ مٹے گا
پر حشر تک اُس ضرب کا سکہ نہ مٹے گا

اللہ رے اوج و شرف و عزت و مقدار
دشمن کو بھی تھا فضل پہ جس کے نہیں انکار
خالق کا ولی احمد مرسل کا مددگار
خاکِ کفِ پا سرمۂ چشمِ اولوا الابصار
پاتے ہیں اندھے ہیں شفا کور و کر اُس سے
بینا ہے وہی جس کو ہے چشمِ نظر اُس سے

ہم دونوں نواسے ہیں اُسی فیض رساں کے
فرزند ہیں ہمشیرِ شہِ کون و مکاں کے
دکھلائیں گے جوہر تمھیں تیغِ دو زباں کے
بڑھ بڑھ کے اُلٹ دیں گے پرے فوج گراں کے
تم یہ نہ سمجھنا کہ یداللہ نہیں ہیں
ہم شیر تو ہیں گر اسداللہ نہیں ہیں

سُن کر یہ رجز فوج کے سردار پکارے
ای قوم یہ شبیر کے ہیں بھانجے پیارے
تابندہ ہیں افلاکِ شرافت کے ستارے
ہاں بھر لے طلا سے وہ سپر جو انھیں مارے
حیدر کی طرح صاحبِ شمشیر ہیں دونوں
لڑکا انھیں سمجھے نہ کوئی شیر ہیں دونوں

یہ سُن کے کیا سب نے لڑائی کا سر انجام
کھلنے لگے ہر صف میں علمہائے سیہ فام
برچھی کہیں چمکی کہیں جمدھر کہیں صمصام
بدلی کی طرح جھوم کے آئی سپہِ شام
یوں آتے تھے سب ٹوٹ کے فوج آتی ہے جیسے
بچوں پہ صفیں آتی تھیں موج آتی ہے جیسے

اُس شور میں بشاش کھڑے تھے وہ دلاور
پروا تھی نہ مطلق کہ یہ فوج آتی ہے کس پر
کہتا تھا بڑے بھائی سے چھوٹا کہ برادر
دیکھیں تو ذرا آپ قریب آ گیا لشکر
وہ کہتا تھا تکیہ ہے عنایاتِ احد پر
آنے دو اجل ان کو لیے آتی ہے زد پر

اتنا ہی شکار آپ سے جس دم طرف شہر
دانستہ وہ کرتا ہی جھپٹنے ہیں ذرا دیر
جاتے ہیں کہاں اب تو ہیر آئے نہ شمشیر
جس جا ہیں صفیں ہوتے ہیں لاشوں کے وہیں ڈھیر
کھل جائے گا جب نیچے کھینچیں گے کمر سے
عرصہ فقط اتنا ہی کہ سبقت ہو ادھر سے

تھوڑے ہیں اُبل پڑتے ہیں وہ جو ہیں تنک ظرف
جب گرم ہوا مہر درخشاں تو کہاں برف
سر جائے پہ آئے نہ شجاعت پہ کوئی حرف
اس نحو سے عمر اپنے بزرگوں کی ہوئی صرف
ہاتھ اپنا چلے گا تو جگہ پا کے چلے گا
ٹھوکر وہی کھائے گا جو گھبرا کے چلے گا

تقریر ادھر یہ تھی کہ تیر آئے اُدھر سے
پیغام وغا لے کے سفیر آئے اُدھر سے
سب موت کے حلقے میں اسیر آئے اُدھر سے
دو بچوں پہ دو لاکھ شریر آئے اُدھر سے
اس جھمپڑ پہ بھی بند تھے دہشت سے دم اُن کے
بڑھ بڑھ کے ہٹے جاتے تھے پیچھے قدم اُن کے

برچھی لیے انبوہ سواروں کا جب آیا
شہزادوں نے رانوں میں سمندوں کو دبایا
اک شور ہوا غیظ رحیموں کو اب آیا
وہ نیمچے بجلی سے جو چمکے غضب آیا
آخر وہ جری لخت دل ضیغم دیں تھے
سر تھے صف اول کے کہیں جسم کہیں تھے

بس پھر تو دھنسے فوج میں وہ شیر درندہ
تلواروں سے ڈر ڈر کے چھپے مردوں میں زندہ
آہو سے بھی چالاک تھے اسپان دوندہ
مڑتے ہیں جو بجلی تھے تو اُڑتے ہیں پرندہ
مانند براق نبوی عرش سما تھے
گھوڑے نہ کہو اوج سعادت کے ہما تھے

مارا انہیں چن چن کے جو تھے فوج میں چیدہ
رہواروں سے پامال تھے سر لاشے بریدہ
باہم تھے کمانداروں سے دونوں جو کشیدہ
بدکیش و خطا کار تھے سب زخم رسیدہ
سہمے ہوئے تھے تیر کہ آفت تھی جہاں پر
پیکاں نہ سرے پر تھا نہ چلہ تھا کماں پر

خالی تھی جو یہ صف تو پریشاں وہ پرا تھا
جنگل ستم ایجادوں کی لاشوں سے بھرا تھا
رنگ اُڑ گئے تھے چہروں سے لشکر یہ ڈرا تھا
تھرّاتا تھا وہ ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا
ڈر سے نہ بڑھاتے تھے جو سرکش قدم اپنے
تیغیں بھی نیاموں میں چھپائے تھیں دم اپنے

وہ مر گیا تلوار اٹھا کر جسے ڈانٹا
گلہائے جراحت کو عجب حسن سے بانٹا
اب تک یہ ہوا باغِ جہاں میں نہیں دیکھی
تلوار نے چھوٹے کی نیا رنگ دکھایا
حیرت ہوئی وہ زور و ہم جنگ دکھایا
ایسا کوئی طفلی میں نمودار نہ ہوگا
وہ نیمچہ اور پھول سی وہ نرم کلائی
وہ انگلیاں جن میں ہنرِ عقدہ کشائی
زور ایسا جہاں کو وہ سبک ہاتھ کے تل سے
دو شیروں سے بچکر ستم ایجاد کدھر جائے
خالی بھی جو دے وار تو پھر خون میں بھر جائے
بزدل جو ہے کیونکر وہ دلیروں سے بچے گا
کس میں تھی ضیا نیمچوں کی ضو کے برابر
بجلی نہ چمک سکتی تھی پر تو کے برابر
بچتا تھا نہ وہ نوک بھی جا لگتی تھی جس کو
کاٹی جو سپر فرقِ جفا جو پہ نہ ٹھہری
چار آئینۂ ظالمِ بدخو پہ نہ ٹھہری
کیا روز تھا کیا ضربتِ شمشیر نکو تھی
بھالوں میں جو تیغوں کو سنبھالے نظر آئے
رہتی پہ طپاں برچھیوں والے نظر آئے
غل تھا کہ رن ایسا کبھی پڑتے نہیں دیکھا

اس نخل کو تلوار سے کاٹا اسے چھانٹا
نکلی نہ کوئی شاخ نہ الجھا کوئی کانٹا
غل تھا کہ بہار ایسی خزاں میں نہیں دیکھی
ضربِ ید اللہ کا سب ڈھنگ دکھایا
راکب کو بھی مرکب کو بھی چو رنگ دکھایا
ہاتھ ایسا تو جعفر کا بھی طیار نہ ہوگا
سب جس سے ہویدا یدِ بیضا کی صفائی
ضیغم کے بھی پنجے نے یہ قوت نہیں پائی
ضرب ایسی کہ پوچھے کوئی جبریل کے دل سے
گر منہ پہ چڑھے یہ تو سپر تخس اتر جائے
بس زیست اسی میں ہو کہ تلوار سے مر جائے
بھاگے گا تو کیا صید یہ شیروں سے بچے گا
گویا کہ مہِ نو تھا مہِ نو کے برابر
سر خاک پہ گر پڑتے تھے تو نو کے برابر
رہ جاتا تھا وہ جل کے ہوا لگتی تھی جس کو
دشمن کی زرہ کاٹ کے پہلو پہ نہ ٹھہری
دشمن کی زرہ کاٹ کے پہلو پہ نہ ٹھہری
گھوڑے کی بھی گردن ہی اک وار میں دو تھی
افسر نظر آئے نہ رسالے نظر آئے
ہر صف کی جگہ خون کے نالے نظر آئے
بچوں کو اس انداز سے لڑتے نہیں دیکھا

چار آئے جو لڑنے کو تو اک ہو گئے دونوں
ٹھہرے نہ ہٹے نہ متامل ہوئے دونوں
گرما کے فرس جنگ پہ مائل ہوئے دونوں
چاروں سے یہ فرما کے مقابل ہوئے دونوں
شمشیر نہیں ہٹتے جو شجاعت کے دھنی ہیں
تم چار ہو ہم دو ہیں مگر پنجتنی ہیں

یہ سنتے ہی پنجوں پہ جھپٹ کر وہ چلے آئے
غصے سے دلیروں کے بھی ابرو پہ بل آئے
لشکر نے یہ جانا کہ وہ بچ کر نکل آئے
آنا تھا کہ چاروں تہِ تیغِ اجل آئے
احسنت کا برپا ہوا غل چرخِ بریں پر
ٹکڑے جو گنے چار کے تھے آٹھ زمیں پر

کیا ذکر بھلا آٹھ کا یا چار سروں کا
کشتوں کے جو پشتے تھے تو انبار سروں کا
گننا ہوا اب تو ہمیں دشوار سروں کا
اک مینہ سا برس جاتا تھا ہر بار سروں کا
تھم سکتے نہ تھے پاؤں کسی عربدہ جو کے
کٹتی تھی زمیں رن کی تریروں سے لہو کے

اعدا تھے دمِ جائزہ ہر بار ندارد
منشی کے قلم ہاتھ علمدار ندارد
پیدل نظری فوج کے اسوار ندارد
دو آئے تو دو چار تھے پھر چار ندارد
یوں فوج کے دفتر کو الٹتے نہیں دیکھا
یوں چہرے پہ چہرہ کبھی کٹتے نہیں دیکھا

یہ تھک کے جو ٹھہرا تو وہ لشکر میں در آیا
رستے کو تڑپتے ہوئے لاشوں سے بھر آیا
یہ ڈوب گیا جب وہ ادھر سے ادھر آیا
اک چاند تہِ خاک چھپا اک نظر آیا
ہٹ جائے گا لشکر تو یہ خود چڑھ کے لڑیں گے
چھوٹے ہیں مگر بھائی سے کچھ بڑھ کے لڑیں گے

جانبازیاں دکھلاتے تھے میداں میں وہ جانباز
دل تھامے ہوئے دیکھتے تھے شاہِ سرافراز
قاسم کا سخن تھا کہ علی کا ہو سب انداز
فرماتے تھے اکبر یہ لڑائی ہے کہ اعجاز
بڑھتے تھے کبھی گاہ سمٹ جاتے تھے عباس
جب وار وہ کرتے تھے پھڑک جاتے تھے عباس

ہر بار صدا دیتے تھے اے گیسوؤں والو
کیا کہنا ہے پھر بڑھ کے یہی ہاتھ نکالو
رہوار بڑھے جاتے ہیں باگوں کو سنبھالو
حلقہ ہے کڑی آنکھ زرہ پوشوں پہ ڈالو
اب ہٹنے کی مہلت مری جاں ان کو نہ دینا
منت بھی کریں گر تو اماں ان کو نہ دینا

ہاں شیروں کے شیروں کا یہی کام ہے شیرو
بس آج لڑائی ہیں بڑا نام ہے شیرو
پیچھے ہیں تمھارے سپہ شام ہے شیرو
تم دونوں کا جد صاحب صمصام ہے شیرو
اک شمس تو اک برج شرافت کا قمر ہے
ماں کس کی ہے بیٹی تو پدر کس کا پسر ہے

شہ کہتے تھے بچّے ہیں لڑیں ہائے کہاں تک
لاکھوں سے لڑے دونوں میں طاقت تھی جہاں تک
دو روز سے پانی نہیں پہونچا ہے وہاں تک
اب پھیر کے کوئی انھیں لے آئے یہاں تک
سیراب بھی پر تشنہ وہاں ہوتے نہ پائے
ہے ہے مرے گھر میں یہ جواں ہونے نہ پائے

سیدانیاں دروازوں پہ تھیں کھولے ہوئے سر
اصغر کو لیے کانپتی تھی بانوے بے پر
فضّہ تھی پریشاں کبھی سوئے خیمے کے باہر
پردے سے لگی کہتی تھی یہ شاہ کی خواہر
بتلاؤ مجھے بچّے مرے کیا کرتے ہیں دونوں
وہ کہتی تھی لاکھوں سے وغا کرتے ہیں دونوں

دو رخ پہ نظر آتے ہیں اڑتے ہوئے گیسو
وہ تیغیں بجلی کی طرح گرتے ہیں ہر سو
ڈھالیں لیے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفاجو
وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں مہ رو
بہتا ہے لہو چھاتیوں سے چور ہیں دونوں
کس طرح پکاروں کہ بہت دور ہیں دونوں

زینب نے کہا دونوں ہیں یکجا کہ جدا ہیں
کی عرض یہ رو رو کے کہ نہیں ایک ہی جا ہیں
لاکھوں ہیں عدو اور وہ دو ماہ لقا ہیں
منہ نہر سے پھیرے ہوئے سرگرم وغا ہیں
دم خوف سے سینے میں سماتا نہیں اب تو
ہے ہے مجھے چھوٹا نظر آتا نہیں اب تو

یہ سنتے ہی ڈیوڑھی سے ہٹیں حضرت زینب
فرمایا کہ بچوں کا مرے خاتمہ ہے اب
اب کچھ نہیں وسواس بر آیا مرا مطلب
لو بی بی بھول کر صف ماتم پہ چلو اب
بچے مرے داخل ہوئے خیل شہدا میں
سجدہ تو کروں شکر کا درگاہ خدا میں

یہ ذکر تھا جو طبل بجا فتح کا ناگاہ
چلائے حرم لٹ گئی بنت اسد اللہ
سجدے کو سوئے قبلہ جھکیں زینب ذی جاہ
دوڑے سے طرف بنت وغا روتے ہوئے شاہ
تلواریں علم قاسم و عباس لیے تھے
ہمشکل نبی چاک گریبان کیے تھے

عباسؑ نے غصّے میں لعینوں کو ہٹایا
بجلی سے بھی کچھ بڑھ کے گرا تیغ کا سایا
پسپا ہوئے کفّار کوئی تاب نہ لایا
شبیرؑ نے لاشوں کو تڑپتا ہوا پایا
آلودۂ خوں دو مہِ کامل نظر آئے
گودی کے پلے خاک پہ بسمل نظر آئے

سر تا بہ قدم چور تھے زخموں سے تن زار
انگڑائیاں لینے سے رگیں کھنچتی تھیں ہر بار
پیکاں سہ پہلو تھے کئی چھاتیوں کے پار
تلواریں تھیں قبضوں میں مگر ہاتھ تھے بیکار
لب پہ یہ سخن تھا شہِ والا نہیں آئے
دم ہونٹوں پہ آئے مگر آقا نہیں آئے

لاشوں کے قریب آ کے پکارے شہِ صفدر
ای بھانجو موجود ہے یہ بیکس و بے پر
بر گرم زمیں اور یہ گل سے تنِ انور
ریتی سے اٹھا کر مرے زانو پہ رکھو سر
ماموں سے عجب وقت میں منہ موڑ رہے ہو
کن آنکھوں سے دیکھوں میں کہ دم توڑ رہے ہو

ای عونؑ و محمدؑ یہ جفا تم نے اٹھائی
ایذائے عطش سب سے سوا تم نے اٹھائی
راحت مرے گھر میں نہ ذرا تم نے اٹھائی
کیا کیا نہ مصیبت بخدا تم نے اٹھائی
مانع جو ہوئی ماں تو مرے پھر نہیں دیکھا
اس عمر میں تم سا کوئی صابر نہیں دیکھا

ای شیر جوانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
ای تیز زبانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
ای مرتبہ دانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
ای تشنہ دہانو مجھے طاقت تھی تمھیں سے
ساتھ اپنے جہاں سے مجھے لیتے نہ گئے تم
کاندھا مرے تابوت کو دیتے نہ گئے تم

اکبر نے کہا عون کے بازو کو ہلا کر
بھیّا تمھیں چلاتے ہیں شہ اشک بہا کر
ماموں کو بچاتے تھی نہ تم برچھیاں کھا کر
باتیں شہِ والا سے کرو ہوش میں آ کر
لو گھر میں علی جی بیاں سب غش پڑی ہیں
سر ننگے پھوپھی خیمے کی ڈیوڑھی پہ کھڑی ہیں

خم ہو کے یہ چھوٹے کو علمدار پکارے
ای تشنہ دہن ای مرے جانی مرے پیارے
کیا منہ میں زباں اینٹھ گئی پیاس کے مارے
چونکو کہ عجب حال ہے ماموں کا تمہارے
ہاتھوں کو ذرا جوڑ کے کچھ بات تو کر لو
بھیّا شہِ والا سے ملاقات تو کر لو

سن کر یہ صدا ہوش میں آئے وہ دلاور
سر رکھ دیئے گھبرا کے شہِ دیں کے قدم پر
اٹکے تھے جو اکھڑے ہوئے دم سینوں کے اندر
دو ہچکیاں لیں دونوں صغیروں نے برابر
فردوسِ معلیٰ کے مسافر ہوئے دونوں
کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ آخر ہوئے دونوں

گودی میں سوئے وہ جنھیں آغوش میں پالا
آنکھیں تھیں لہو اور جگر تھا تہ و بالا
بسمل کی طرح گر کے جو تڑپے شہِ والا
عباسؑ نے تھاما علیؑ اکبر نے سنبھالا
رقت کا تھا یہ جوش کہ تھراتے تھے شبیر
ہر مرتبہ لاشوں سے لپٹ جاتے تھے شبیر

عباسؑ نے کی عرض یہ با دیدۂ خونبار
خیمے سے نکل آئیں نہ سیدانیاں یک بار
لے چلئے انھیں خیمے میں اب با شہِ ابرار
بہتر یہی ہے کہ ماں دیکھ لے فرزندوں کا دیدار
لاشے جو نہ جائیں گے تو غم کھائیں گی زینب
یہ قبر میں سوئے تو کہاں پائیں گی زینب

سنتے ہی لاشے شہِ والا نے اٹھائے
خیمے کے قریں دونوں کو روتے ہوئے لائے
غل تھا کوئی جلدی صفِ ماتم کو بچھائے
لو آئے شہنشاہ کی ہمشیر کے جائے
چھوٹے کو علی اکبرِ دلگیر لیے ہیں
اک لاش کو خود گود میں شبیر لیے ہیں

زینب نے کہا کیوں مجھے وسواس نہ آئے
ہے ہے علی اکبر اسے کیوں گود میں لائے
لوگو مرے پیارے نے بڑے رنج اٹھائے
صدقے یہ پھوپھی لاش کے لے آنے کے جائے
دو روز سے وہ سروِ رواں تشنہ دہاں ہے
اس بوجھ کی طاقت مرے بچے میں کہاں ہے

ان دونوں نے گر جان گنوائی تو گنوائی
بن بیاہے مرے لال نے کیوں لاش اٹھائی
میں ماں ہوں نہ صاحب مجھے یہ بات نہ بھائی
اکبر مری اٹھارہ برس کی ہے کمائی
دل سے نہ یہ داغِ الم و یاس مٹے گا
صدقہ اب اتاروں گی تو وسواس مٹے گا

بانو نے کہا کونسی وسواس کی ہے جا
ہمشکلِ نبی لاشوں کو لائے تو ہوا کیا
شق ہوتا ہے مظلوموں کی غربت پہ کلیجا
یہ ہے وہ کوئی غیر تھے اے دخترِ زہرا
گھر تک کوئی واماندوں کو پہونچا نہیں دیتا
بھائی کوئی کیا بھائی کو کاندھا نہیں دیتا

ان دونوں کے عاشق تھے علی اکبر گلرو
چھوڑا نہ انھوں نے بھی کبھی بھائی کا پہلو
ایسا یہ نہیں غم کہ تھمیں آنکھ سے آنسو
بس تلخ ہوئی زندگی اکبر خوشخو
کل تک تھے بہم آج اکیلے ہوئے دونوں
بھائی بھی وہ جو ساتھ کے کھیلے ہوئے دونوں

دونوں تھے اسی بھائی کے آرام کے طالب
جانے وہی جس شخص پہ گزریں یہ مصائب
وسواس کا یہ کونسا ہنگام ہے صاحب
بیجاں ہوئے ہیں ہائے علی اکبر کے مصاحب
ساتھ اب نہ کوئی جوڑے ہوئے ہاتھ رہے گا
شہزادۂ کونین اسے کون کہے گا

ناگاہ شہ عرش نشیں لاشوں کو لائے
غل پڑ گیا لو سرورِ دیں لاشوں کو لائے
تھم کر صفِ ماتم کے قریں لاشوں کو لائے
ہمشیر تھیں جس صف میں وہیں لاشوں کو لائے
دونوں کا لٹا ناتھا کہ غش کر گئیں زینبؑ
ہر بی بی پہ ثابت یہ ہوا مر گئیں زینبؑ

ہوش آیا تو اکبر سے کہا رانڈوں کو سمجھاؤ
ہے ہے نہ کرو صاحبو اک لحظہ ٹھہر جاؤ
عباس کی زوجہ سے یہ بولیں کہ ادھر آؤ
کیا روتی ہو کپڑے علی اکبر کے بدلواؤ
بانو ہیں کدھر آہ یہ کیا بے خبری ہے
سب خوں سے مرے لال کی پوشاک بھری ہے

حضرت سے کہا آپ کو ایذا ہوئی یا شاہ
کس طرح لڑے دونوں غلامانِ ہوا خواہ
حضرت نے کہا مدح میں قاصر ہے زباں آہ
زینب مجھے یاد آ گئی جنگ اسد اللہ
نانا کی طرح دونوں نواسوں نے وغا کی
بچوں کی نہ تھی جنگ یہ قدرت تھی خدا کی

تیغوں میں یہ تیزی یہ صفائی نہیں دیکھی
یہ ضرب یہ پھرتی یہ لڑائی نہیں دیکھی
شیروں کی یہ پُر زور کلائی نہیں دیکھی
اعدا میں یہ ہلچل یہ دُہائی نہیں دیکھی
صفین و جمل میں بھی رن ایسے نہ پڑے تھے
تم پوچھ لو عباس تو نزدیک کھڑے تھے

عباس نے کی عرض زباں لاؤں کہاں سے
جو کر گئے یہ لال وہ باہر ہے بیاں سے
لڑتے تھے اسی طرح علی فوج گراں سے
افسوس کہ یوں اُٹھ گئے یہ شیر جہاں سے
تلواریں جب اُن کی مجھے یاد آتی ہیں بہنا
دو بجلیاں آنکھوں میں چمک جاتی ہیں بہنا

کیا عرض کروں ہائے محمّد کی لڑائی　　گویا کہ یہ دیکھے ہوئے تھا جد کی لڑائی
بس صاف تھی صفیّن کی سرحد کی لڑائی　　غل تھا کہ یہ ہے بازوئے احمد کی لڑائی
رن پر جو چڑھا ہو وہی جانے کہ یہ کیا تھا　　دنیا میں علی آج جو ہوتے تو مزا تھا

یہ سنتے ہی سُرخی سی رُخ زرد پہ آئی　　حضرت سے کہا آپ کا صدقہ ہے یہ بھائی
کونین میں عزت مرے دلبندوں نے پائی　　اب شاد ہوئی ان سے یداللہ کی جائی
آقا مجھے پیار آتا ہے اقبال پہ ان کے　　بیکس ہیں خدا رحم کرے حال پہ ان کے

فرما کے یہ لیں اُن کی بلائیں کئی باری　　شانوں کو ہلا کر کے یہ آہستہ پکاری
کرتے ہیں امامِ دو جہاں مدح تمھاری　　یہ کیا ہے جو تسلیم کو اُٹھتے نہیں واری
صدقے گئی یہ نیند ہے یا غش میں پڑے ہو　　بیٹھے ہیں حسین ابن علی اُٹھ تو کھڑے ہو

کچھ آج ہے غفلت عجب اے نیند کے ماتو　　باعث ہے یہ بچپن کا سبب اے نیند کے ماتو
چونکو مری خاطر سے اب اے نیند کے ماتو　　پھر سو رہو آتی ہے شب اے نیند کے ماتو
پھر کیا ہے جو بچپن کے یہ انداز نہیں ہیں　　گردن ہے کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں ہیں

اب ضبط کی طاقت نہیں اماں کو سنبھالو　　انگڑائیاں لو بات کرو نیند کو ٹالو
سینے میں اُبھتا ہے دم اے گیسوؤں والو　　واری مجھے خدمت کے لیے پاس بلالو
میں ہونگی تو راحت سے تمھیں یاس نہ ہوگی　　کیا گزرے گی منزل پہ جو ماں پاس نہ ہوگی

پہلا تو سفر اور نئے لوگ نئی راہ　　کس طور سے گزریں گی یہ تاریک شبیں آہ
صدقے گئی رستے سے بھی تم تو نہیں آگاہ　　پہونچائے تمھیں خیر سے فردوس میں اللہ
پُرہَول ہے رستہ مجھے تشویش بڑی ہے　　قربان ہو ماں قبر کی منزل بھی کڑی ہے

ٹوکے کوئی رستے میں تو ڈر یو نہ مری جان　　ہاں کلمۂ توحید پڑھے جائیو ہر آن
اقرارِ ثبوت میں فصاحت کا رہے دھیان　　دلبند ہو تم تین اماموں کے میں قربان
کہنا کہ ملازم ہیں ولی ابنِ ولی کے　　ہم آتے ہیں لشکر سے حسین ابنِ علی کے

اے عون خبردار مرے چھوٹے پسر سے
رستے سے نہ واقف ہے نہ غربت کے سفر سے
واماندوں پہ ظاہر ہو یہ وہ بھید نہیں ہے
بچوں کے یہ سن ہائے غضب اور سفر ایسا
برباد نہ ہو یوں کوئی آباد گھر ایسا

کس ناز و نعم سے یہ خوش اقبال پلے تھے
اب کے ن مرے پہلوؤں میں سوئے گا بچّو
یہ داغ تو دنیا سے مجھے کھوئے گا بچّو
راحت کسی کروٹ کسی پہلو نہ ملے گی
دنیا کو نہ دیکھا تھا کہ موت آ گئی تم کو
ماں صدقے ہو جنگل کی ہوا بھا گئی تم کو

ہے ہے مجھے پوشاک شہانی نہ دکھائی
مرتے ہوئے پانی بھی نہ مانگا مرے ڈر سے
بے آب تھے اس عمر میں چھبیس پہر سے
سہوا جو پڑی آنکھ تو منہ موڑ لیا ہے
غصّے ہوئی تھی تم پہ میں واری مجھے بخشو
لب پر سخن عذر ہیں جاری مجھے بخشو

میں بھی تو یہ جانوں کہ دل افسردہ نہیں ہیں
یہ کہہ کے جو چھاتی پہ دوہتڑ کئی مارے
ہمشکل نبی پاؤں پہ گر کر یہ پکارے
اب پیاس میں آب دم شمشیر پئیں گے

شب کو یہ اکیلا کبھی نکلا نہیں گھر سے
محروم رہو گی میں سدا خیر و خبر سے
اے وائے خط آنے کی بھی امید نہیں ہے
لائے گا خبر کون کہاں نامہ بر ایسا
نظروں سے نہ پوشیدہ ہو شمس و قمر ایسا

قبروں کے لیے ہائے مرے لال پلے تھے
تڑپے گا کلیجا مرا دل روئے گا بچّو
دن جا کے شب آئے گی تو کیا ہوئے گا بچّو
مرجاؤں گی زلفوں کی جو خوشبو نہ ملے گی
خیمے سے نکلتے ہی اجل پا گئی تم کو
اے گل بدنو کس کی نظر کھا گئی تم کو

صدقے گئی امّاں کو جوانی نہ دکھائی
پیاسے سوئے فردوس سدھارے مرے گھر سے
دیکھا بھی نہ دریا کو توجہ کی نظر سے
ڈرتے تھے کہ امّاں نے ہمیں منع کیا ہے
ماں اب نہیں لونڈی ہوں تمھاری مجھے بخشو
صدمے سے غشی ہوتی ہے طاری مجھے بخشو

لو کہہ دو بس اتنا کہ ہم آزردہ نہیں ہیں
سینہ ہوا شق ہاتھ بھی نیلے ہوئے سارے
بس والدہ اب رویو لاشے پہ ہمارے
بھائی نہ رہے خلق میں ہم بھی نہ جئیں گے

گھبرا کے وہ مخدومۂ عالم یہ پکاری
مرجائے یہ ناشاد بلا لیکے تمھاری
بن بیاہے ہو تم لاشوں کے پاس آؤ نہ واری
تم روؤگے اس ڈر سے میں کرتی نہیں زاری
باتوں میں بھی کچھ بین کے پہلو نہیں نکلے
آنکھوں سے مری دیکھ لو آنسو نہیں نکلے

فرما کے یہ غش ہوگئیں اور پھر ہوئیں ہشیار
پوچھا کہ کدھر ہے علی اکبر مرادلدار
بانو نے کہا شاہ سے با دیدۂ خونبار
اب فرق بصارت میں بھی ہے یا شہ ابرار
ابھی جو غش آیا تو گزر جائیں گی زینب
لے جایئے لاشے نہیں مر جائیں گی زینب

یہ ماتم اولاد ہے کیونکر اسے ٹالیں
مرجائیں جنھیں دل کی طرح گود میں پالیں
اکبر کی سنیں یا جگر و دل کو سنبھالیں
در آتی ہیں اک قلب میں دو تیروں کی پھالیں
بالائے جگر خنجر بیداد پھرے ہیں
دو غم کے پہاڑ ایک ضعیفہ پہ گرے ہیں

یہ سنتے ہی لاشوں کو اٹھانے لگے سرور
رانڈیں صف ماتم سے اٹھیں کھولے ہوئے سر
بانو نے کھڑے ہو کے ادھر روک لی چادر
چلائی سمجھ کر شہ مظلوم کی خواہر
ٹھہرو ابھی کیوں داغ دیئے جاتے ہو لوگو
ہے ہے مرے بچوں کو لیے جاتے ہو لوگو

دیکھا نہیں جی بھر کے ابھی بیٹوں کا دیدار
دونوں کی بلائیں مجھے لے لینے دو اک بار
چھوٹے کو بھی چھاتی سے لگالے یہ دل افگار
مادر سے مکدر نہ ہوں یہ آئینہ رخسار
گھر میں مرے کب ہے کہ یہ پھر آئیں گے جاکے
دینے دو کفن دونوں کو زہرا کی ردا کے

در تک گئیں لاشوں سے لپٹنے کو کھلے سر
پر رانڈوں نے جانے نہ دیا خیمے کے باہر
چلائیں در خیمہ کے پردے کو اٹھا کر
گاڑو گے کہاں بھائیوں کو اے علی اکبر
ڈر ہے کہ خفا مجھ سے مرے لال نہ ہو جائیں
صدقے گئی لاشے کہیں پامال نہ ہو جائیں

یہ وقت نہیں طول کا خاموش انیس اب
جتنے ہیں سخن فہم وہ عاشق ہیں ترے سب
ہر دم ہے عنایات محمد کرم رب
اب جلد وہ حاصل ہو جو کچھ ہے ترا مطلب
یہ حسن فصاحت ہے یہ شیریں سخنی ہے
پیری میں جواں ہے تو فقیری میں غنی ہے

مرثیہ (۷)

دوزخ سے جو آزاد کیا حُر کو خدا نے
کھلوا دیئے فردوس کے در عقدہ کشا نے
زانو پہ رکھا سر کو امامِ دوسرا نے
اعلیٰ کیا ادنیٰ کو بزرگوں کی دُعا نے
سب جس کے طلبگار تھے جنت میں وہ دُر تھا
حورانِ جناں گرد تھیں اور بیچ میں حُر تھا

چرچا تھا کہ مہمانِ حسین آتا ہے دیکھو
دنیا سے بصد زینت و زیں آتا ہے دیکھو
مولائے شہِ بدر و حنین آتا ہے دیکھو
شیدائے رسول الثقلین آتا ہے دیکھو
دم نکلا ہے گودی میں شہنشاہِ زمن کی
سونگھو اسے خوشبو ہے یہ زہرا کے چمن کی

اللہ کے لشکر کا ہراول ہے یہ غازی
بعد اس کے ہیں سب کُشتۂ اوّل ہے یہ غازی
خاکِ قدمِ احمدِ مرسل ہے یہ غازی
رُتبے میں ملائک سے بھی افضل ہے یہ غازی
اس پر نظرِ لطفِ شہنشاہِ نجف ہے
آنکھیں ہم اگر فرش کریں عین شرف ہے

اللہ کی درگاہ کا مقبول ہے یہ بھی
مقبول نہ کیونکر ہو کہ مقتول ہے یہ بھی
مجرم پہ کرم شاہ کا معمول ہے یہ بھی
گلدستۂ اسلام کا اک پھول ہے یہ بھی
نیکوں سے بدی وہ نہیں کرتا جو بھلا ہے
مرجھا کے یہ پھولا ہے خزاں ہو کے پھلا ہے

کیا اصل تھی اس نخل کی اور کیا ثمر آیا
اللہ کی قدرت یہ کہاں تھا کدھر آیا
لو شام کا بھولا ہوا وقتِ سحر آیا
تلواروں کی دریا سے سلامت اُتر آیا
نیزوں کو عصا تیغوں کو پُل کر دیا اس نے
آتش کو چمن خار کو گل کر دیا اس نے

کس لشکرِ بد خو سے بگڑ کر نکل آیا
دو لاکھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا
تن تنہا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا
نیزہ تھا کہ ہر قلب میں گڑ کر نکل آیا
کعبہ کی طرف دیر میں گر دیر سے پہونچا
شر نے اُسے روکا تھا مگر خیر سے پہونچا

حوروں کے وہ چہرے وہ ضیائے دُرِ دنداں
کوئی متبسّم کوئی حیراں کوئی خنداں
باتوں کی ملاحت لبِ شیریں سے دوچنداں
سُن پائیں تو چاٹا کریں ہونٹوں کو سخنداں
سودا ہو پری دیکھ لے گر حور کی آنکھیں
سورج کی چمک چاند کا منہ نور کی آنکھیں

ہاتوں پہ وہ کوثر کے چھلکتے ہوئے ساغر
پانی وہ سباب اور وہ لپکتے ہوئے ساغر
شیشے وہ بلوریں وہ چمکتے ہوئے ساغر
وہ مشک کی خوشبو وہ مہکتے ہوئے ساغر
پژمردہ اگر غنچۂ خاطر ہو تو کھل جائے
برسوں نہ لگے پیاس گر اک جام بھی مل جائے

وہ نرگسی آنکھیں وہ اُن آنکھوں کے اشارے
اُٹھ سایۂ طوبیٰ سے چل اب گھر میں ہمارے
دیکھ اس طرف اے حضرتِ شبیر کے پیارے
ساماں ہیں مہیّا ترے آرام کے سارے
سیراب ہو گر مے سے اگر تشنہ دہن ہے
وہ کوثر و تسنیم ہے یہ نہرِ لبن ہے

حوریں کریں شوقیہ سخن واہ ری قسمت
مشتاق ہو جنّت کا چمن واہ ری قسمت
سر گود میں لیں شاہِ زمن واہ ری قسمت
بھائی کہیں حضرت کی بہن واہ ری قسمت
مرنا وہ کہ عالم کے خبرگیر سرہانے
پہلو میں علی حضرتِ شبیر سرہانے

اللہ ری وفائے رفقائے شہِ ذی جاہ
دل سینوں میں لبریز ولائے شہِ ذی جاہ
سر دیتے تھے ہنس ہنس کے برائے شہِ ذی جاہ
کرتے تھے سفر چوم کے پائے شہِ ذی جاہ
دنیا کی نہ جانب ہیں نہ دریا کی طرف ہیں
مرتے ہوئے آنکھیں شہِ والا کی طرف ہیں

مرنے پہ کسے تھا کمر ایک ایک سے پہلے
کر دیتا تھا سینہ سپر ایک ایک سے پہلے
دیتا تھا بصد شوق سر ایک ایک سے پہلے
کرتا تھا دلِ شہ میں گھر ایک ایک سے پہلے
دشوار انھیں زیست کی ایک ایک گھڑی تھی
کوثر سے نظر خلد سے جان اُن کی لڑی تھی

ایمان شہِ والا کی وِلا جانتے تھے وہ
مرجانے کو تو عینِ وفا جانتے تھے وہ
جینے کو ہوس دم کو ہوا جانتے تھے وہ
فاقوں کے بیاں کو بھی گلا جانتے تھے وہ
کچھ فرق اطاعت میں وہ ناکام نہ لائے
پانی کا زبانوں پہ کبھی نام نہ لائے

وہ ابن مظاہر کہ حبیبوں میں جو تھے فرد
دنیا میں کسے ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد
اعدا کے لیے تیغ ہلالی دم ناورد
پیری میں اولوالعزم بڑھاپے میں جواں مرد
سب چھوٹے مگر دامن حضرت نہیں چھوڑا
مرنے پہ بھی اب تک درِ دولت نہیں چھوڑا

جب دے چکے سب غیر عزیزوں کی طرح سر
بے جاں ہوئے دو ایلچی شاہ کے دلبر
مرنے پہ کمر باندھتے تھے قاسمِ بے پر
کہتی تھی جھکائے ہوئے سر شاہ کی خواہر
ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجکو
ان بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجکو

سب جاتے ہیں اور رن کی وہ رخصت نہیں لیتے
مرجانے کی ماموں سے اجازت نہیں لیتے
سیّد سے سرافرازی کا خلعت نہیں لیتے
سر دے کے جو ملتی ہے وہ دولت نہیں لیتے
پانی نہ ملے گر دمِ آخر نہ ملے گا
کہدے کوئی ایسا تمھیں دن پھر نہ ملے گا

کم عمر ہیں عزت کی وہ کیا بات کو جانیں
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ پھراتے ہیں زبانیں
ہے ہو انھیں شبیر سے پیاری ہوئیں جانیں
پچھتائینگے روئیں گے نہ کہنا مرا مانیں
اب تیر جگر گوشۂ زہرا پہ چلیں گے
جب وقت نکل جائے گا پھر ہاتھ ملیں گے

وہ نام پہ مرتے ہیں جو ہیں عاقل ذی ہوش
سب دل میں کہیں گے کہ ہوئے جنگ سے روپوش
موقع ہو تو گویا کہیں رہتے بھی ہیں خاموش
کیا جان کا پھر دھیان شجاعت کا ہو جب جوش
فرق ان کے تہوّر میں کسی طور نہیں ہے
باعث یہ لڑکپن کا ہے کچھ اور نہیں ہے

یہ ذکر تھا تو شاہ جو روتے ہوئے آئے
مادر نے جو پوچھا تو سخن لب پہ یہ لائے
اب جاتے ہیں لڑنے کو پھوپی جان کے جائے
ان بھائیوں سے پہلے نہ ہم خوں میں نہائے
اب بھی ہمیں پیغامِ اجل آ نہیں جاتا
یوں رہتے ہیں شبیر کہ دیکھا نہیں جاتا

زینب نے کہا میری مراد آئی سدھاریں
تینوں میں گوارا ہوں مرے دودھ کی دھاریں
دشمن جو ہوں فرزندِ علی کے انھیں ماریں
لڑنے پہ چڑھیں شمر کا سر تن سے اتاریں
یہ کس کا لہو دیکھ کے وہ جوش میں آئے
جب مر چکے دو بھائی تو وہ ہوش میں آئے

خیمہ میں یہ باتیں تھیں کہ آئے وہ دلاور
ساتھ اپنے اُنھیں لیکے گئی بانوے مضطر
یہ نورِ نظر لائقِ الطاف و عطا ہیں
دیکھا کہ الگ بیٹھی ہوئی روتی ہے مادر
کی عرض کہ چھاتی سے لگا لو انھیں خواہر
تقصیر ہوئی کیا جو حضور ان سے خفا ہیں

منہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر
شکوہ ہے مقدّر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
غیرت کی ہے جا غیر تو ہوں فدیۂ شبیر
منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحبِ شمشیر
وہ پہلے نہ بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہو

حُر کون تھا اور کون تھا بن قین بجلی
کیونکر ہو بھلا مادرِ مضطر کو تسلّی
آفت ہے یگانے ہی جو ہمّت نہ کریں گے
ہے عرش تلک جن کے ستاروں کی تجلّی
مقتل میں یہ کوتاہیاں گھر میں یہ تعلّی
کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے

فرزندِ حسن مرنے کو جالیں تو یہ جائیں
ہمشکلِ نبی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ جوشِ شجاعت انھیں کیوں ہے
عباس علی خوں میں نہا لیں تو یہ جائیں
لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہے

کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر
وقت آئے تو دکھلائیں گے تلواروں کے جوہر
جب کوئی نہ ہووے گا تو یہ جنگ کریں گے
خالی ابھی ہونے دیں محمدؐ کا بھرا گھر
جرأت میں وہ جعفر ہیں شجاعت میں یہ حیدر
کیا عیب ہے پہلے نہ مرے بعد مریں گے

تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار
موقع ہو تو دنیا سے گزرتے ہیں وفادار
خنجر دلِ زہرا پہ جو چل لیں تو سدھاریں
سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار
سرداروں سے پہلے کہیں مرتے ہیں وفادار
ماں خیمے سے سر ننگے نکل لے تو سدھاریں

میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈیں گے بہانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمے میں آنا
جس تیغ میں تاثیر زبانوں میں نہیں ہو
کچھ منہ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا
سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانہ
غیروں میں اب الفت ہے یگانوں میں نہیں ہے

وہ ابن مظاہر کہ حبیبوں میں جو تھے فرد
دنیا میں کسے ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد

اعدا کے لیے تیغ ہلالی دمِ ناورد
پیری میں اولوالعزم بڑھاپے میں جواں مرد

سب چھوٹے مگر دامنِ حضرت نہیں چھوڑا
مرنے پہ بھی اب تک درِ دولت نہیں چھوڑا

جب دے چکے سب غیر عزیزوں کی طرح سر
بے جاں ہوئے دو ایلچی شاہ کے دلبر

مرنے پہ کمر باندھتے تھے قاسمِ بے پر
کہتی تھی جھکائے ہوئے سر شاہ کی خواہر

ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجکو
ان بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجکو

سب جاتے ہیں اور ان کی وہ رخصت نہیں لیتے
مرجانے کی ماموں سے اجازت نہیں لیتے

سیّد سے سرافرازی کا خلعت نہیں لیتے
سر دے کے جو ملتی ہے وہ دولت نہیں لیتے

پانی نہ ملے گر دمِ آخر نہ ملے گا
کہدے کوئی ایسا انھیں دن پھر نہ ملے گا

کم عمر ہیں عزت کی وہ کیا بات کو جانیں
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ پھراتے ہیں زبانیں

ہے ہو اُنھیں شبیر سے پیاری ہوئیں جانیں
پچھتائینگے روئیں گے نہ کہنا مرا مانیں

اب تیر جگر گوشۂ زہرا پہ چلیں گے
جب وقت نکل جائے گا پھر ہاتھ ملیں گے

وہ نام پہ مرتے ہیں جو ہیں عاقل ذی ہوش
سب دل میں کہیں گے کہ ہوئے جنگ سے روپوش

موقع ہو تو گویا کہیں رہتے بھی ہیں خاموش
کیا جان کا پھر دھیان شجاعت کا ہو جب جوش

فرق اُن کے تہوّر میں کسی طور نہیں ہے
باعث یہ لڑکپن کا ہے کچھ اور نہیں ہے

یہ ذکر تھا تو شاہ جو روتے ہوئے آئے
مادر نے جو پوچھا تو سخن لب پہ یہ لائے

اب جاتے ہیں لڑنے کو پھوپی جان کے جائے
اُن بھائیوں سے پہلے نہ ہم خوں میں نہائے

اب بھی ہمیں پیغامِ اجل آ نہیں جاتا
یوں روتے ہیں شبیر کہ دیکھا نہیں جاتا

زینب نے کہا میری مراد آئی سدھاریں
تیغوں میں گوارا ہوں مرے دودھ کی دھاریں

دشمن جو ہوں فرزندِ علی کے انھیں ماریں
لڑنے پہ چڑھیں شمر کا سر تن سے اُتاریں

یہ کس کا لہو دیکھ کے وہ جوش میں آئے
جب مر چکے دو بھائی تو وہ ہوش میں آئے

خیمہ میں یہ باتیں تھیں کہ آئے وہ دلاور
دیکھا کہ الگ بیٹھی ہوئی روتی ہے مادر
ساتھ اپنے اُنھیں لیکے گئی بانوئے مضطر
کی عرض کہ چھاتی سے لگا لو انھیں خواہر
یہ نورِ نظر لایقِ الطاف و عطا ہیں
تقصیر ہوئی کیا جو حضور ان سے خفا ہیں

مُنہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر
غیرت کی ہے جا غیر تو ہوں فدیۂ شبیر
شکوہ ہے مقدّر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر
منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحبِ شمشیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
وہ پہلے نہ بے دم ہوں لہو جن میں ملا ہو

حُر کون تھا اور کون تھا بن قین بجلی
ہے عرش تلک جن کے ستاروں کی تجلّی
کیونکر ہو بھلا مادرِ مضطر کو تسلّی
مقتل میں یہ کوتاہیاں گھر میں یہ تعلّی
آفت ہے یگانے ہی جو ہمّت نہ کریں گے
یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے

فرزندِ حسن مرنے کو جالیں تو یہ جائیں
عباس علی خوں میں نہا لیں تو یہ جائیں
ہمشکلِ نبی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں
لاشے ابھی شہزادوں کے آ لیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ جوشِ شجاعت اُنھیں کیوں ہے
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت اُنھیں کیوں ہے

کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر
خالی ابھی ہونے دیں محمّد کا بھرا گھر
وقت آئے تو دکھلائیں گے تلواروں کے جوہر
جرأت میں وہ جعفر ہیں شجاعت میں یہ حیدر
جب کوئی نہ ہووے گا تو یہ جنگ کریں گے
کیا عیب ہے پہلے نہ مرے بعد مریں گے

تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار
سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار
موقع ہو تو دنیا سے گزرتے ہیں وفادار
سرداروں سے پہلے کہیں مرتے ہیں وفادار
خنجر دلِ زہرا پہ جو چل لیں تو سدھاریں
ماں خیمے سے سر ننگے نکل لے تو سدھاریں

میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈیں گے بہانا
کچھ منہ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمے میں آنا
سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانہ
جس تیغ میں تاثیر زبانوں میں نہیں ہے
غیروں میں اب الفت ہے یگانوں میں نہیں ہے

کم عمر ہیں بچّے ہیں یہ کیا وقت کو جانیں
واں تیغوں میں تابش ہے کڑکتی ہیں کمانیں
مذکورِ بزرگانِ خوش اوقات تو رہ جائے
ماں کو تو سبک کر چکے کنبے کی نظر میں
پوچھے کوئی ان سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے

توڑ آئے ہوں خیبر کے کسی در کو تو کہہ دیں
تاکو فہ بھگا آئے ہوں لشکر کو تو کہہ دیں
کچھ چھین لئے نصرت کی خبر لیکے پھرے ہیں
یہ ذکر تھا جو خیمہ میں داخل ہوئے شبیر
فرمایا شکایت کے سخن کیجو نہ ہمشیر
تلواروں میں ہر دم مرے قدموں پہ جھکے تھے

افلاکِ شجاعت کے یہی دو ہیں شہنشاہ
پوچھے کوئی مجھ سے تمھیں قدر ان کی نہیں آہ
ہلتی تھی زمیں غیظ سے خالق کے ولی کے
مالک ہو تم ان دونوں سے بگڑو کہ خفا ہو
ایسے ہیں کہ حق دودھ کا ان سے نہ ادا ہو
سمجھا کہ میں ہاتوں سے انہیں کھوؤ گی زینب

کس طرح میں اس دولتِ بیدار کو کھوتا
موت آتی تو سر دے کے میں اس دشت میں سوتا
کچھ بس نہیں چلتا جو اجل آتی ہو زینبؑ
رُخ زرد ہیں لب خشک ہیں سوکھی ہیں زبانیں
جو نام پہ مرتے ہیں وہ دے دیتے ہیں جانیں
جانیں نہ رہیں گر نہ رہیں بات تو رہ جائے

میں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
کھولیں سے باندھیں ہیں جو ہتیار کمر میں
لو ناز ہے اس پر کہ نواسے ہیں علی کے
مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہہ دیں
خوشنود کیا ہو جو برادر کو تو کہہ دیں
کیا شام کے سردار کا سر لیکے پھرے ہیں

دیکھا کہ ہیں بیٹوں سے خفا زینبِ دلگیر
ملتے ہیں کسے ایسے پسر صاحبِ توقیر
یہ شیرِ دلاور مرے روکے سے رُکے تھے
رکھتے انھیں پردے میں جو ہوتے اسد اللہ
تم تو شہِ مرداں کی جلالت سے ہو آگاہ
یہ اور کی چتون نہیں تیور ہیں علی کے

بہتر ہے وہ غصہ جو مناسب ہو بجا ہو
میں کیا کروں گر دونوں کا مرنا تمھیں چاہو
جب یہ نہ لیں گے تو بہت روؤ گی زینب
جیتا میں جو ان میں سے کوئی پاس نہ ہوتا
رکھتے یہ مری لاش پہ میں ان کو نہ روتا
موت ان کو مرے گھر سے لیئے جاتی ہے زینبؑ

دو داغ جگر سوز ہیں ہمشیر کروں کیا
بچوں کے بچا لینے کی تدبیر کروں کیا
کرتی ہے اکیلا مجھے تقدیر کروں کیا
رکتے نہیں یہ صاحبِ شمشیر کروں کیا
صدمہ اُسے ہوتا ہے زیادہ جسے روکوں
مشکل ہے مجھے کس کو رضا دوں کسے روکوں

زینب نے کہا آپ الم ان کا نہ کیجے
طالب ہیں تو بہتر ہے اجازت انھیں دیجے
قربان ہیں سب بھانجے ہوں یا کہ بھتیجے
گر دھیان ہے میرا تو قسم رونے کی لیجے
بیٹے بھی فدا آپ پہ ہیں میں بھی فدا ہوں
دیر اتنی ہوئی کیوں ہیں اسی پر تو خفا ہوں

تھرّا کے وہ بولی کہ ہماری نہیں تقصیر
قسمت میں خجالت تھی نہ یاور ہوئی تقدیر
فرمایا شجاعت کے منافی ہے یہ تقریر
مسلم کے پسر کاہے کو تھے صاحبِ شمشیر
جاتے ہوئے کس دوست کو آقا نے نہ روکا
روکا انھیں اُن کو شہِ والا نے نہ روکا

جو مرد ہیں۔ پہلے وہی مر جاتے ہیں پیارو
آزردہ تھی پر خیر خوشی اب ہوں سدھارو
صدقے گئی اُلجھی ہوئی زلفیں تو سنوارو
واری یہ تمنّا ہے کہ سر ماموں پہ وارو
سہرے کے جسے پاتے ہیں وہ راہ یہی ہے
صدقے گئی شادی ہے یہی بیاہ یہی ہے

پوشاک بدل کر جو سجے جنگ کے ہتیار
غل تھا کہ چلے شاہ کی ہمشیر کے دلدار
مجرے کو جھکے ماں کے جو وہ آئنہ رخسار
سینے میں تڑپنے لگا زینب کا دلِ زار
فرمایا ادا اس سے کرو حق شہِ دیں کا
لو جاؤ مبارک ہو سفر خلدِ بریں کا

فوجوں کو مرے دودھ کی تاثیر دکھانا
دادا کی طرح جوہرِ شمشیر دکھانا
مظلومیتِ حضرتِ شبیر دکھانا
تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا
تلوار اگر لاکھ چلیں سر نہ فرو ہو
جو سامنے آجائے وہ اک ضرب میں دو ہو

حیدر کی شجاعت کا معرّف ہے زمانا
فوجوں پہ اُسی دبدبہ و شان سے جانا
ہنس ہنس کے تم اُن چھاتیوں پر برچھیاں کھانا
جرأت کے منافی ہے سپر چہرے پہ لانا
ظلمت ہو قمر پر یہ سزاوار نہیں ہے
جو منہ کو چھپاتا ہے وہ رو دار نہیں ہے

بلوہ ہو تو پروانہ رہے بھائی پہ بھائی
مثل جسد و روح نہ دم بھر ہو جدائی
دکھلائیو ان چھوٹے سے ہاتوں کی صفائی
جانیں جو لڑاؤگے تو سر ہوگی لڑائی
گر مر گئے تو قبر بھی عزت بھی ملے گی
میں دودھ بھی بخشوں گی شہادت بھی ملے گی

دم ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے
غش کھا کے جو گریو بھی تو دریا کے کنارے
پانی کو ترستے رفقا مر گئے سارے
یہ آب رواں بند ہو ماموں پہ تمہارے
تلواریں ہیں موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

کی عرض یہی ہووے گا اے مادر غمخوار
کیا بات ہے جیتے ہیں تو مرنا نہیں دشوار
اس پیاس میں صابر ہیں غلامان وفادار
دریا کو نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہگار
دیجے گا سزا فرق اطاعت میں گر آئے
پھر دیکھیں نہ منہ آپ جو رخ تک سپر آئے

یہ کہتے ہوئے خیمے سے صفدر نکل آئے
اک برج سے دو چاند برابر نکل آئے
رومال رکھے آنکھوں پہ اکبر نکل آئے
شبیر بھی روتے ہوئے باہر نکل آئے
قدموں پہ جھکے وہ جو شہنشاہ زمن کے
کس جبر سے رخصت کیا بیٹوں کو بہن کے

شرما کے کہا جاؤ خدا حافظ و ناصر
شمشیر و سناں کھاؤ خدا حافظ و ناصر
اب دل کو نہ تڑپاؤ خدا حافظ و ناصر
چھاتی سے لگو آؤ خدا حافظ و ناصر
ناشاد و پر ارمان مرے گھر سے چلے ہو
گھوڑوں پہ چڑھا لوں مری گودی میں پلے ہو

تھامے جو رہے بازوؤں کو قاسم و اکبر
گھوڑوں پہ چڑھے زینب ناشاد کے دلبر
الفت سے چلے ساتھ علمدار دلاور
تب کہنے لگے جوڑ کے ہاتوں کو وہ صفدر
کچھ فوج شقاوت نہیں دور آپ ٹھہر جائیں
آقا یہ مصیبت ہے حضور آپ ٹھہر جائیں

فرمایا کہ دل سینے میں ٹھہرے تو میں ٹھہروں
دو زخم نہ ہوں دل پہ جو ٹھہرے تو میں ٹھہروں
دریا سے ہٹالوں جو یہ پہرے تو میں ٹھہروں
پانی ہوں ستمگاروں کے زہرے تو میں ٹھہروں
لازم ہے کہ جاؤں تو صفیں توڑ کے جاؤں
زینب سے کہوں کیا جو تمہیں چھوڑ کے جاؤں

جھکنے لگے گھوڑوں سے جو وہ آئنہ رُخسار
تیغوں میں چلے جنسِ شہادت کے طلبگار
ساتھ اُن کے ہرن جست میں گشت میں پہنچے
یوں آئے کہ جس طرح نسیمِ چمن آئے
سنولائے ہوئے دھوپ میں گل پیرہن آئے
شیر آتے ہیں لشکر سے ولی ابنِ ولی کے
دو صاعقہ لشکر پہ چمکتے ہوئے آئے
دو شیر صفِ جنگ کو تکتے ہوئے آئے
تھا شور کہ ہوش اُڑتے ہیں یاں کبکِ دری کے
وہ گردنیں گھوڑوں کی وہ سُم اور وہ سینے
چاروں وہ قدم اور وہ رکابوں کے قرینے
سرعت میں ہو راہِ جبل و بحر صراط ایک
آہو ہیں کہ سرگرم تگ و دو ہیں زمیں پر
نعل ان کے نہیں آٹھ مہِ نو ہیں زمیں پر
طاؤس میں جلوہ ہے پہ یہ چال نہیں ہے
کیا دونوں کو اسپانِ سبک تاز ملے تھے
فتراک نہیں تھے پرِ پرواز ملے تھے
شیروں کا بھی یہ رُعبِ قدمِ جنگ نہیں ہے
غصہ میں جو ہر بار ٹھہر جاتے ہیں چل کے
اس طرح قدم خاک پہ رکھتے ہیں سنبھل کے
ہر گام پہ اُڑ جانے کو تیار ہیں دونوں

مغموم پھرے حضرتِ عباسِ علمدار
باگیں جو اُٹھائیں تو ہوا ہو گئے رہوار
اُڑتے ہوئے طاؤسِ چمن دشت میں پہنچے
گھوڑے تھے کہ دو آہوے چین و ختن آئے
فوجوں میں ہوا شور کہ وہ صف شکن آئے
حضرت نے صدا دی کہ نواسے ہیں علیؑ کے
شعلے تھے کہ آندھی میں لپکتے ہوئے آئے
دو گل تھے ہوا پر کہ مہکتے ہوئے آئے
گھوڑے نہیں جھونکے ہیں نسیمِ سحری کے
غل تھا کہ یہ سینے کبھی دیکھے ہیں کسی نے
کرسی کے یہ پائے ہیں تو ہیں عرش کے زینے
بلقیس کا تخت ایک سلیماں کی بساط ایک
دو شیر تھے یا رہوار وہیں زمیں پر
کیلیں نہ کہو اختر پرضو ہیں زمیں پر
پریوں کے کھلے بال ہیں یہ یال نہیں ہے
جانبازوں کو رہوار بھی جانباز ملے تھے
زینت کے لیے سازِ خدا ساز ملے تھے
رستم کا کمر بند ہے یہ تنگ نہیں ہے
آنکھوں نے نیا حسن دکھایا ہے اُبل کے
گر ہاتھ میں ہو جام لبالب تو نہ چھلکے
بچوں کی سواری سے خبردار ہیں دونوں

زینوں پہ جو ہیں عرشِ الٰہی کے ستارے
جب گریاں جمتی ہیں تو بھرتے ہیں طرارے
خوش فہم ہیں ایسے کہ سمجھتے ہیں اشارے
ہیں شاہسوار آپ یداللہ کے پیارے
کم سن ہیں یہ مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں
کس حسن سے رہواروں کے سر باندھے ہوئے ہیں

ہرچند ہیں دونوں کے رکابوں سے جُدا پاؤں
منہ ملتی ہیں قدموں پہ کھنچی جو ہوا پاؤں
ہیں راہ روِ جادۂ تسلیم و رضا پاؤں
کیا ران ہے کیا باگ ہے کیا ہاتھ ہے کیا پاؤں
شوکت جو دکھاتے ہیں سمندوں کو بڑھا کر
حضرت نے سکھایا ہے یہ کاندھوں پہ چڑھا کر

وہ برق یہ صرصر وہ چھلاوا یہ پری ہے
وہ آہوئے صحرا ہے تو یہ کبکِ دری ہے
سرعت جسے کہتے ہیں وہ رگ رگ میں بھری ہے
ہرگام نئی چال نئی جلوہ گری ہے
نعل اُن کے کہیں برق ہیں شمشیر کہیں ہیں
آہو کہیں چلتے ہیں کہیں شیر کہیں ہیں

گھوڑے ہیں کہ طاؤس شہادت کے چمن کے
باریک وہ جلد ہیں کہ خجل پھول سمن کے
گردن کے یہ نوسے وہ ٹوٹے ہوئے منکے
گھونگٹ میں بھی پیدا ہیں سب انداز دلھن کے
دونوں کے پسینے میں بھی سب عطر کی بو ہے
رفتار میں گرمی یہ پریزادوں کی خو ہے

وہ شان وہ اجلال وہ شیروں کی نگاہیں
نعرے جو کیے بند ہوئیں امن کی راہیں
دعوے کہ فنا کر دیں ابھی ہم جسے چاہیں
ہمت وہ کہ جو منہ سے کہیں اُس کو نباہیں
فوجوں کو بھگایا ہے تو ہم بڑھ کے تھمے ہیں
سرکے نہیں جب ٹھیک ہیں یہ پاؤں جمے ہیں

فوجوں کی صفائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
لشکر میں دہائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
ہاں قلعہ کشائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
بچوں کی لڑائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
یہ منہ کبھی تیغوں سے پھرے ہیں نہ پھریں گے
مرتے ہوئے دشمن بھی قدم بڑھ کے گریں گے

تم سب میں شجاعت کا دھنی جو ہو وہ نکلے
بدخواہ امامِ مدنی جو ہو وہ نکلے
آمادۂ شمشیرزنی جو ہو وہ نکلے
سر دفترِ لشکر شکنی جو ہو وہ نکلے
تنہا نہیں آسکتی تو فوجیں بہم آئیں
کیوں دیر ہے گر تم نہیں بڑھتے تو ہم آئیں

چھوٹا تھا بڑے بھائی سے خونریز زیادہ
کچھ ہاتھ بھی کچھ تیغ بھی تیز زیادہ
سرخیز زیادہ شر انگیز زیادہ
اس گھوڑے سے گھوڑا بھی سبک خیز زیادہ
حیدر کی شجاعت بھی جلالت بھی غضب بھی
غصّہ بھی تہور بھی برادر کا ادب بھی

بڑھ آئے کمیں سے جو کماندار سمٹ کر
پہونچے وہیں شہزادوں کے رہوار سمٹ کر
تھرّاتے تھے ڈر سے جو خطاکار سمٹ کر
چلّے بھی اُتر جاتے تھے ہر بار سمٹ کر
سر کٹ گئے اب شکل کہاں امن و اماں کی
نیزوں کے نہ تھے نخل نہ شاخیں تھیں کماں کی

سر ایک سے لڑنے میں دو چند ایک نے کاٹے
تیر ایک نے اور نیزوں کے بند ایک نے کاٹے
سب حلقۂ گیرآئے کمند ایک نے کاٹے
قلموں کی طرح پائے سمند ایک نے کاٹے
جانبازیاں دیکھیں کہ جگرداری کو دیکھیں
جعفر ہوں تو ان ہاتھوں کی طیاری کو دیکھیں

باندھا کسی برچھیت نے نیزے کا اگر بند
واکردیا بس ناخنِ تدبیر سے ہر بند
نعرہ تھا کہ ہم عقدہ کشا کے ہیں جگربند
کھولیں اُسے خیبر سا اگر ہو کوئی در بند
بھولے ہو تم اس پر کہ تنومند نہیں ہیں
یہ ہاتھ کسی معرکہ میں بند نہیں ہیں

تلواروں میں ہر دم سپر اک بھائی کی تھا ایک
اک ہوتا تھا بے تاب جو ہوتا تھا جدا ایک
رہواروں میں تھا ایک سے چالاک ہوا ایک
چلنے میں ہوا ایک تو اُڑنے میں ہما ایک
دیکھا اُنھیں جس نے تو ہوئے ہوش گم اُس کے
نعل اس کے نہ لگتے تھے زمیں پر نہ سُم اُس کے

غل تھا کہ نہ دیکھی تھی وغا آج تک ایسی
آفت کسی لشکر پہ نہ ڈالے فلک ایسی
دوزخ کے بھی شعلوں میں نہ ہوگی لپک ایسی
زائل ہوئی جاتی ہے بصارت چمک ایسی
آفت تھی قیامت تھی اُسے یا اُسے دیکھیں
دو بجلیاں گرتی ہیں برابر کسے دیکھیں

وہ غل عربی باجوں کا تیغوں کی وہ جھنکار
قرنا کی صدا وہ کہ ہلے گنبدِ دوّار
کالی وہ گھٹا شام کے لشکر کی دھواں دھار
بڑھ بڑھ کے یہ کڑکیت صدا دیتے تھے ہر بار
ہاں آج نمودِ سپہِ شام کا دن ہے
اے لشکریو نام کرو نام کا دن ہے

ای فوج ظفر موج کے جرار جوانو
دو شیر کے بچے ہیں یہ ہشیار جوانو
یہ وقت کے ہیں جعفر طیار جوانو
لشکر کے نشانوں سے خبردار جوانو
پہنچے بھی یہ کاٹیں گے مروڑیں گے علم کو
پنجہ جو بڑھایا تو نہ چھوڑیں گے علم کو

جس غول پہ جس صف پہ چلے نیمچے ان کے
بے جان ہوئے وہ وار چلے دونوں پہ جن کے
کشتہ کیا گنتی کی سواروں کو جو گن کے
تھرانے لگے دانتوں میں سب داب کے تنکے
فوجیں وہ کہاں اور کہاں تشنہ دہان دو
دو لاکھ کے لشکر میں یہ غل تھا کہ امان دو

یہ کہتے تھے لشکر کا نشان دو تو امان دو
دنیا کی محبت پہ نہ جان دو تو امان دو
ہاں صلح کی حضرت کو زبان دو تو امان دو
اصغر کو جو ہو آب روان دو تو امان دو
خون پسر سعد بہا دو تو رکیں ہم
ہاں شمر کا سر کاٹ کے لا دو تو رکیں ہم

بتلا دو ہمیں خونی خونخوار کدھر ہے
شبث ابن ربعی سا جفاکار کدھر ہے
ارزق جسے کہتے ہیں وہ مکار کدھر ہے
کیوں حرملہ سرکش و غدار کدھر ہے
ہم نیمچہ چمکا کے بڑھاتے ہیں فرس کو
ہاں بھیجو وہ میداں میں سنان ابن انس کو

تھراتے ہیں سن سن کے یہ نعرے وہ جفا جو
ڈھالوں میں چھپا تھا پسر سعد سیہ رو
کہتا تھا کہ ان بچوں میں ہے شیر کی خو بو
ٹکڑے مرے کر دیں گے اگر پائیں گے قابو
آفت میں مددگار ہو رنجوں سے بچاؤ
یارو مجھے ان شیروں کے پنجوں سے بچاؤ

یہ سنتے ہی سب شام کا بادل امنڈ آیا
اک دل کا ہٹانا تھا کہ اک دل امنڈ آیا
اک ظلم کا دریا سوئے مقتل امنڈ آیا
نیزوں کا نیستاں تھا کہ جنگل امنڈ آیا
پاس آ کے لڑا ایک نہ اس فوج عدو میں
نہلا دیا بوچھار نے تیروں کی لہو میں

زخمی ہوئے جب شیر تو لشکر میں در آئے
آفت ہوئی برپا غضب آیا جدھر آئے
وہ نیمچے جب سن سے کسی غول پر آئے
ہاتھ اڑ کے گئے واں تو ادھر کٹ کے سر آئے
دونوں کے فرس ابر کہیں برق کہیں تھے
دستانے کہیں خود کہیں فرق کہیں تھے

شبیروں نے دل اس فوج بد آئیں کے توڑے
گویا کہ پرے خیبر و صفین کے توڑے
ہاتھ آیا تو بازو کسی بے دین کے توڑے
جھنجلائے تو لشکر کے نشاں چھین کے توڑے
چھینٹیں بھی ادھر خون کی نہروں کی اڑاتی ہیں
کیا دھجیاں علموں کے پھریروں کی اڑاتی ہیں

بیٹھی تھیں پس پردہ ادھر زینب ناچار
چہرہ تھا کبھی زرد کبھی سرخ تھے رخسار
بے تابی میں فضہ سے یہ فرماتی تھیں ہر بار
تو دیکھ تو پہونچے ہیں کہاں تک مرے دلدار
کھاتے ہیں ابھی زخم نہ گھوڑوں سے گرے ہیں
معلوم یہ ہوتا ہے کہ فوجوں میں گھرے ہیں

نکلی جو عصا تھام کے وہ خیمے کے باہر
خم تھی کمر اور منہ عرق شرم سے تھا تر
چلنے میں قدم کانپتے تھے ضعف سے تھر تھر
ہلتا تھا ضعیفی کے سبب سے سر انور
کیونکر یہ نہ ہو خادمۂ آل عبا تھی
برقع نہ عصا یہ نہ قضا یہ نہ ردا تھی

شہزادوں کی سب معرکہ آرائی بھی دیکھی
جرأت بھی جلالت بھی توانائی بھی دیکھی
دانائی بھی غربت بھی شکیبائی بھی دیکھی
جانبازی بھی مظلومی بھی تنہائی بھی دیکھی
شبیر کو لہو میں بھی نہاتے ہوئے دیکھا
آگے جو بڑھیں تیر بھی کھاتے ہوئے دیکھا

روتی ہوئی خیمے میں جو آئی وہ دل افگار
زینب نے کہا قتل ہوئے کیا مرے دلدار
کی عرض نہیں تو ابھی لڑتے ہیں وہ جرار
آفت ہے بپا بھاگتے پھرتے ہیں جفاکار
وہ کونسا یکتا ہے جو چو رنگ نہیں ہے
سب کہتے ہیں طوفان ہے یہ جنگ نہیں ہے

بے سر اسے کرتے ہیں جسے پاتے ہیں دونوں
سب ہٹتے ہیں جب تیغ چمکاتے ہیں دونوں
ڈھالوں کی گھٹا میں کبھی گھر جاتے ہیں دونوں
لڑ بھڑ کے کبھی صاف نکل آتے ہیں دونوں
کس جنگجو کی پتلی میں وہ کاوا نہیں پھرتا
یوں پھرتے ہیں گھوڑے کہ چھلاوا نہیں پھرتا

لاکھوں تو بلائیں ہیں وہ بچے کسے ٹالیں
تلواریں ادھر ہیں تو ادھر نیزوں کی بھالیں
زرہوں پہ نہ چار آئنہ نہ ہاتھوں پہ ڈھالیں
مہلت نہیں جو سینوں سے تیروں کو نکالیں
تلواروں میں بھائی کی سپر ہوتا ہے بھائی
بہتا ہے جو بھائی کا لہو روتا ہے بھائی

قایم رہے ان بھائیوں کی خلق میں جوڑی
الٹا جو پرا اس نے تو صف اس نے بھی توڑی
تیور وہی آواز وہی آن وہی تھی
ساونت ہیں ان اپنے خوزادوں کی ہیں واری
تلواریں بھی ان نیچوں سے ہوگئیں آری
بچے کہیں اس شان سے توسن پہ چڑھے ہیں
چھایا ہوا تھا چار طرف شام کا بادل
تلواریں علم ہاتوں میں تھیں برؤں پر بل
ایک ایک کی آنکھیں تھیں کہ دو ساغرِ خوں تھے
تیغیں وہ کہ منہ لوہے کی ڈھالوں سے نہ موڑیں
ہم پنجہ ہو رستم تو کلائی کو مروڑیں
ہر دم تھا اشارہ پسرِ سعدِ لعیں سے
تلوار اٹھا کر جو چلے عونِ دلاور
للہ نہ فرمائیے تکلیف برادر
لڑلیں اگر ان دونوں کو لڑنے کی ہوس ہو
بی بی وہ جلالت مجھے بھولے گی نہ وہ شان
بھائی نے جو خاطر سے کہا خیر مری جان
دکھلا دیئے انداز وغائے اب وجد کے
اک ضرب میں ہاتھ اس کے اڑائے تو سر اس کا
ٹکڑے تھا دل اس کا تو لہو تھا جگر اس کا
دم بھر میں نہ غرہ تھا نہ شورش رہی سر میں

ہل چل تھی ادھر باگ جدھر رخش کی موڑی
چھوٹے نے کوئی بات علی کی نہیں چھوڑی
نعرے وہی تو قہر وہی شان وہی تھی
حملوں میں ہی شوکت اسد اللہ کی ساری
خود غیرتِ گلشن تو فرس بادِ بہاری
میں نے تو یہ جانا کہ علی رن پہ چڑھے ہیں
ہیں تھی وہیں لڑنے کے لیے آئے جو دو ویل
نعروں سے فلک گونج اٹھا ہل گیا جنگل
کچھ مرحب و عنتر سے بھی دل بر میں فزوں تھے
نیزے وہ قیامت کہ دلِ کوہ کو توڑیں
حملہ کریں جس پر نہ سلامت اسے چھوڑیں
اک نیزے میں دونوں کو اٹھا لیتے ہیں زیں سے
چھوٹے نے یہ کی عرض بڑے بھائی سے جھک کر
آئے ہیں تو جاتے ہیں کہاں آپ بپھر کر
بھیا یہ غلام آپ کا ان کے لیئے بس ہے
ای شیر کے بچے تری ہمت کے میں قربان
گھوڑے کا اڑانا تھا کہ بس لے لیا میدان
غل تھا کہ غزال آگئے پنجے میں اسد کے
اس نخل کی شاخیں تھیں نہ دار و ثمر اس کا
دم سینے سے نکلا ادھر اس کا ادھر اس کا
ساتھ آئی تھی اور ساتھ گئی قعرِ سقر میں

تم لاکھ ہو ہم وہ ہیں پہ راضی ہیں رضا پر لاکھوں ہوں تو کیا ہیں نظر اپنی ہے خدا پر
کھل جائیں نشاں چوب لگے طبل وغا پر جلدی ہے کہ صدقے ہوں امام دوسرا پر
دیر اب نہ کرو جان لڑائی میں لڑی ہے ہم پیاسے ہیں دو روز کے اور دھوپ کڑی ہے

یہ ذکر ابھی تھا کہ خدنگ آئے ادھر سے شمعوں کی طرح اڑ کے پتنگ آئے ادھر سے
سرہنگ جفا جو پئے جنگ آئے ادھر سے یاں سے جو بڑھے لعل تو سنگ آئے ادھر سے
ڈھالیں تھیں بہم گرز بھی ہاتوں میں تلے تھے نیزے بھی چمکتے تھے پھریرے بھی کھلے تھے

کڑکیں وہ کمانیں کہ ہوا فوج کا کڑکا تیغوں کی سفیدی تھی کہ تھا نور کا تڑکا
گہہ بجھ گیا خورشید کا شعلہ کبھی بھڑکا ہر دل کو ہلا دیتا تھا سر کٹنے کا دھڑکا
نعرے تھے کہ حیدر کے دلیروں سے وغا ہے گھوڑے بھی بھڑکتے ہیں کہ شیروں سے وغا ہے

دانتوں میں شجاعانِ عرب کے داڑھیاں دابے وہ صورتیں خونخوار وہ گھوڑے وہ رکابے
وہ گردنیں وہ سر تھے کہ معکوس قرابے وہ آگ کے پتلے تھے تو شدید بزشتابے
خوں آلِ محمد کا بہایا تھا انھیں نے سادات کے خیموں کو جلایا تھا انھیں نے

قبضوں پہ ادھر ہاتھ سلحشوروں نے ڈالے تیر آئے کمانوں سے بڑھے ظلم کے بھالے
یاں نیمچے شیروں نے نیاموں سے نکالے فوجوں پہ چلے شاہ کی آغوش کے پالے
اک برق گری لشکرِ بدخو کی صفوں پر دو شیروں نے حملہ کیا آہو کی صفوں پر

تتر بتر ہوا لشکر وہ صف اس جا تھی یہ اس جا آفت تھی نہ کس صف میں قیامت تھی نہ کس جا
ہل چل ہوئی دو شیر گئے فوج میں جس جا لشکر میں یہ تھا شور کہ دنیا ہے نجس جا
سمجھے تھے کہ شبیر کا سر ہاتھ لگے گا جائیں تو چلیں اب کسے زر ہاتھ لگے گا

اے سیفِ زباں تازہ لڑائی مجھے دکھلا اے تیغِ علی قلعہ کشائی مجھے دکھلا
شمشیرِ طلاقت کی صفائی مجھے دکھلا اے ذہنِ رسا اپنی صفائی مجھے دکھلا
پشتی کو ہے موجود وہ صفدر جو علی ہے پھر کھینچ وہ تلوار جو سو بار چلی ہے

یا شیرِ خدا سیف دو دم دیجیے مجھ کو
سر بر نہ ہو لشکر وہ حشم دیجیے مجھ کو
بیڑے سپہ شام کے ہٹتے نظر آئیں
کوثر کا بھرا جام پلا دیجیے مولا
ہر غنچۂ خاطر کو کھلا دیجیے مولا
میں وہ نہیں یا خلق میں انصاف نہیں ہے
گو پیر ہوں پر زورِ جوانی ہے ابھی تک
دنداں نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک
جوہر ہے وہی باڑھ وہی گھاٹ وہی ہے
تصویرِ پریشانیٔ کفار دکھا دوں
جعفر کو ابھی جنگ پہ تیار دکھا دوں
رُخ سب قدر اندازوں کے پھرتے نظر آئیں
لو نیچے شہزادوں کے چلتے ہیں خبردار
رنگ افعیِ خونخوار بدلتے ہیں خبردار
جل جاتا ہے وہ آنچ ذرا لگتی ہے جس کو
دو ناگ ہیں پُر زہر کہ لہراتے ہیں سر پر
نکلے جو زمیں سے تو جگہ پاتے ہیں سر پر
کچھ پڑھ کے بھی پھونکے گا جو ناری تو جلے گا
بے مثل و عدیل ایک تو یکتائے زماں ایک
اک آتشِ جاں سوز ہے اور آبِ رواں ایک
میان اس کا الگ ہے تو غلاف اس کا جدا ہے

یا شاہِ نجف طبل و علم دیجیے مجھ کو
میداں جو نہ چھوڑے وہ قدم دیجیے مجھ کو
سب فوج کے چہرے ابھی کٹتے نظر آئیں
بالائے ولا اور ولا دیجیے مولا
شمشیرِ فصاحت کو جلا دیجیے مولا
مدت سے جو ہوں چپ تو زباں صاف نہیں ہے
سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک
قبضے میں وہ تیغِ صفہانی ہے ابھی تک
کہنہ تو ہے شمشیر مگر کاٹ وہی ہے
غیظ و غضبِ حیدرِ کرار دکھا دوں
ہر بند پہ چلتی ہوئی تلوار دکھا دوں
سرداروں کے سر خاک پہ گرتے نظر آئیں
لو بانبیوں سے ناگ نکلتے ہیں خبردار
لو مارِ سیہ زہر اُگلتے ہیں خبردار
پڑ جاتے ہیں نیل اُن کی ہوا لگتی ہے جن کو
گہہ پاؤں پہ آتے ہیں کبھی جاتے ہیں سر پر
چاٹا ہے لہو گرم ہوا کھاتے ہیں سر پر
اعجاز ہے ان پر کوئی افسوں نہ چلے گا
اُن باغیوں پہ بادِ سموم ایک خزاں ایک
گھاٹ ایک روش ایک چمک ایک زباں ایک
اک جان ہے دو قالب اُسے کہیے تو بجا ہے

نصرت کا وہ یہ فتح کے گنجینے کا مشتاق — ایمان کا وہ دین کے آئینے کا مشتاق
وہ سر کا یہ چار آئنہ میں سینے کا مشتاق — جویندہ وہ دم کا یہ لہو پینے کا مشتاق
وہ تیر کے دل سے نکل آیا یہ جگر سے — جوشن سے اُسے لاگ اسے بیر سپر سے
وہ نیچے خالی نہ کبھی جا کے پھر آئے — اعدا کا لہو خاک پہ برسا کے پھر آئے
گہہ سن سے گئے اور کبھی لہرا کے پھر آئے — دم لیکے لہو پیکے صفیں کھا کے پھر آئے
مخدوش جو رہیں تھیں وہ شفاف ہوئی ہیں — کیا ہاتھ منجھے ہیں کہ صفیں صاف ہوئی ہیں

وہ ہاتھ وہ اُن چھوٹی سی تلواروں کا پرتو — چلنے میں جو بجلی تو ٹھہرنے میں ہما تو
سرپٹ میں وہ یک رنگیِ اسپانِ سبک تو — دو ہاتھ جدھر چل گئے سر اڑ گئے سو سو
چلتی تھی غضب تیز ہوا دشتِ بلا میں — کیا چیز تھے پتّے ثمر اُڑتے تھے ہوا میں

تیروں کو جو چلّوں میں کمانداروں نے جوڑا — پھر آئے تو بد کیشوں نے منہ سہم کے موڑا
دونوں نے بزرگوں کے طریقے کو نہ چھوڑا — صف ایک نے اُلٹی تو پرا ایک نے توڑا
تلواروں کی گھاٹوں میں شناور رہے دونوں — موجیں بھی جو آئیں تو برابر رہے دونوں

گر برق کہوں برق میں یہ تاب کہاں ہے — پانی میں روانی ہے پہ یہ آب کہاں ہے
آئینہ میں جوہر ہے پہ یہ آب کہاں ہے — آتش ہے تو آتش میں بھلا آب کہاں ہے
خم ہے پہ دم ایسا تو مہِ نو میں نہیں ہے — ایسی تو چمک مہر کی پرتو میں نہیں ہے

ٹوٹی ہوئی صف عہد شکن دیکھ کے بھاگے — حیدر کی لڑائی کا چلن دیکھ کے بھاگے
نامرد فراقِ سر و تن دیکھ کے بھاگے — بپھرے ہوئے شیروں کو ہرن دیکھ کے بھاگے
دریا پہ بھی ڈر سے کوئی ٹھہرا نہیں جاتا — بھاگڑ میں یہ ہے شور کہ ٹھہرا نہیں جاتا

بڑھ کر سپر اس بھائی نے کاٹی تو سر اُس نے — زخمی کیا دشمن کا دل اس نے جگر اُس نے
صدر اس نے کیا چاک تو کاٹی کمر اُس نے — دکھلائے علی کے چلن اس نے ہنر اُس نے
مطلب تھا کہ نہ عمر کو نہ زید کو چھوڑیں — دو شیر جب ایسے ہوں تو کب صید کو چھوڑیں

کیا دخل جو قابو میں سوار آ کے نکل جاے — کیا جان جو بھاگڑ میں جگہ پا کے نکل جاے
کیا تاب جو گھوڑا کوئی چمکا کے نکل جاے — کیا منہ ہو جو تلوار کوئی کھا کے نکل جاے
جز کنج لحد اور کہیں امن نہیں تھا — پٹکا جسے ریتی پہ وہ پیوند زمیں تھا

یہ شوکت اسپان سبکرو نہیں دیکھی — یہ جست یہ سرعت یہ تگ و دو نہیں دیکھی
گردوں پہ یہ تنویر مہ نو نہیں دیکھی — چلتی ہوئی تلواروں میں یہ ضو نہیں دیکھی
کالا تھا جو دن دھوپ بھی سیاہ ہوئی تھی — لشکر کی سیاہی شب مہتاب ہوئی تھی

تھا شور کہ دریا یہ روانی نہیں رکھتا — یہ کاٹ کسی تیغ کا پانی نہیں رکھتا
خنجر کوئی یہ تیزی زبانی نہیں رکھتا — ایک ایک وہ کہتا ہے کہ ثانی نہیں رکھتا
جد ان کا اُٹھاتا تھا پیمبر کے علم کو — یہ چھین کے لے جائینگے لشکر کے علم کو

بہتے ہوئے دریا کی روانی ہوانھیں ہیں — یاں کند ہیں سب تیز زبانی ہوانھیں ہیں
بجلی کی طرح شعلہ فشانی ہوانھیں ہیں — جو آگ کو بھڑکائے وہ پانی ہوانھیں ہیں
موجوں کا تلاطم ہے کہ فوجیں لب جو کی — ٹاپو ہے وہ لاشوں کا یہ ندی ہے لہو کی

بہتے ہوئے دریا کا بھی کیا زور گھٹا ہے — ڈھالوں کی سیاہی ہے کہ گھنگور گھٹا ہے
مقتل میں برستا ہے لہو زور گھٹا ہے — تلواریں برستی ہیں سلح شور گھٹا ہے
ڈوبی ہوئی ہے خوں میں پڑی فوج عدو کے — بوچھار سروں کی ہے ڈریرے ہیں لہو کے

سینوں کو سنانوں سے ملا دیتے ہیں دونوں — ہر ضرب میں گیتی کو ہلا دیتے ہیں دونوں
آئینۂ نصرت کو جلا دیتے ہیں دونوں — پانی انھیں تیغوں کا پلا دیتے ہیں دونوں
یوں مرتے ہیں کرتے ہیں بُرائی جو بھلوں سے — تھا نہر ہلاہل کہ اُترتا تھا گلوں سے

بے دست تھا نیزوں کو اُدھر جس نے اُٹھایا — جاں اُس کی گئی زخم جگر جس نے اُٹھایا
ضرب اُس پہ چلی فوج میں سر جس نے اُٹھایا — پہونچے سے اُڑا ہاتھ تبر جس نے اُٹھایا
کیسے قدر انداز خطا کار کہاں کے — ترکش تھا نہ چلہ تھا نہ گوشے تھے کماں کے

سن کر یہ بیاں شاہ وہ بولیں زینبِ خوش خو
پھر جوشِ محبت سے رہا دل پہ نہ قابو
ہر بی بی سے ارشاد کیا پونچھ کے آنسو
میدان سے سرکے نہیں ہٹک مرے گلرو
لاکھوں سے لڑے تشنہ دہن کام کیا ہے
سنتی ہوں کہ چھوٹے نے بڑا نام کیا ہے

سب بی بیاں بولیں کہ یہ ہے آپ کا اقبال
ان دونوں کا سوچو تو ابھی کیا ہے سن و سال
پرواہ رہی توقیر نہ ہے حشمت و اجلال
فرمایا کہ ہاں صاحبِ غیرت ہیں مرے لال
بھائی کے سوا مجکو نہیں فکر کسی کی
عزت سے وہ مرجائیں ہیں طالب ہوں اسی کی

یہ ذکر ابھی تھا کہ صدا رونے کی آئی
دروازے سے اکبر نے یہ آواز سنائی
لوٹی گئی ہے آج پھوپی اماں کی کمائی
مارے گئے دو ساتھ کے کھیلے ہوئے بھائی
روتے ہوئے عباس بھی ہمراہ گئے ہیں
خود لاشیں اٹھانے کے لیے شاہ گئے ہیں

یہ سنتے ہی قبلے کی طرف جھک گئیں زینبؓ
سجدے سے اٹھیں جب تو کہا شکر ہے یارب
طالب تھی ہیں جس کی وہ بر آیا مرا مطلب
سب مرگئے حضرت کے کوئی تشویش نہیں اب
لٹنے سے محمدؐ کی کمائی کو بچا لے
سب قتل ہوں پر تو مرے بھائی کو بچالے

کس منہ سے ترا شکر کروں بارِ خدایا
تو نے مرے دو بچوں کو پروان چڑھایا
گر بیاہ فلک نے نہ دکھایا نہ دکھایا
جو رتبۂ اعلائے شہادت ہے وہ پایا
عالم میں جو دکھ ان کے لیے میں نے بھرے ہیں
تو رحم کر ان پر کہ یہ مظلوم مرے ہیں

فضہؓ کی صدا آئی کہ اے پیٹنے والو
سب مل کے ارے میرے خوزادوں کو سنبھالو
روتی ہیں کہاں بانوی عالم کو بلا لو
لوٹا گیا گھر خاکِ عزا بالوں پہ ڈالو
مقتل سے حسین ابنِ علی لائے ہیں لاشے
سیدانیوں ڈیوڑھی پہ چلو آئے ہیں لاشے

در تک گئی ناموسِ نبی کھولے ہوئے سر
لاشوں کو لیے خیمے میں داخل ہوئے سرور
اک لاش کو لائے تھے علمدار دلاور
لپٹائے تھے چھوٹے کو گلے سے شہ صفدر
جنباں تھی زمیں غل تھا یہ فریاد و بکا کا
ہلتا تھا کلس خیمۂ سلطانِ شہدا کا

ماتم تھا کہ برباد یہ گھر ہو گیا ہے — زہرا کے نواسوں کا سفر ہو گیا ہے
کس کی نظرِ بد کا گزر ہو گیا ہے — یہ چاند ہر اک خون میں تر ہو گیا ہے
تقدیر میں سر پیٹنا تھا نوحہ گری تھی — خالی ہوئی وہ گود جو بچّوں سے بھری تھی

لاشوں کو شہِ دیں صفِ ماتم پہ جو لائے — سب اہلِ حرم پیٹتے روتے ہوئے آئے
زینب نے نہ فریاد کی نہ اشک بہائے — بیٹھی رہیں سر زانوئے اقدس پہ جھکائے
لب خشک تھے منہ زرد مژہ اشکوں سے تر تھی — نہ اپنی نہ بھائی کی نہ لاشوں کی خبر تھی

بانو جو قریب آئی تو بولی یہ وہ مغموم — بی بی مجھے کچھ آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم
کس جا علی اکبر ہیں کدھر ہیں شہِ مظلوم — کس کی خبر آئی ہے کہ ماتم کی ہے یہ دھوم
پردیس میں جینے سے کسے یاس ہوئی ہے — یہ کونسی ماں بیٹوں سے بے آس ہوئی ہے

عرصہ ہوا بچّوں کو مرے رن میں سدھارے — کیا جانیے سرماموں پہ وارے کہ نہ وارے
دھڑکا ہے کہ کمسن ہیں بہت وہ مرے پیارے — دریا پہ کہیں جا نہ پڑیں پیاس کے مارے
سر دے کے پھریں وہ تو ہو ثابت قدمی کی — میں دودھ نہ بخشوں گی جو لڑنے میں کمی کی

بولے یہ بصد درد علی اکبرِ ذی شاں — حاضر ہے یہ محجوب غلام اے پھوپی امّاں
شبیر پکارے کہ بہن ہیں ترے قرباں — زندہ تھا سحر تک مگر اب ہیں ہوا بے جاں
فوجوں کو بھگایا ہے ہزاروں سے لڑے ہیں — یہ عون و محمد ہیں جو بے جان پڑے ہیں

ہوش آ گیا زینب کو صدا بھائی کی سُن کر — کی عرض یہ سب آپ کا صدقہ ہے برادر
خوشنود ہیں آقا تو رضا مند ہے مادر — لو بخش دیا دودھ انھیں یا شہِ صفدر
یہ آپ پہ قربان ہوئے راہِ خدا میں — نام ان کے خدا عرش پہ لکھے شہدا میں

حضرت نے کہا رو کے گلے ان کو لگا کر — اب پاس تمھارے نہیں یہ آئیں گے جا کر
پانی نہ پیا نزع میں بھی برچھیاں کھا کر — رخصت ہوئے ماموں کو لبِ خشک دکھا کر
کس سے کہوں جیسے یہ وفادار پسر تھے — دم نکلے تو دونوں کے مرے پاؤں پہ سر تھے

بانو نے رکھے زانوئے زینب پہ سر ان کے
جو بی بیاں تھیں آ گئے منہ کو جگر ان کے
زینب نے جو کی جھک کے رخ پر نظر ان کے
دکھلائی دیئے چاند سے منہ خوں میں تر ان کے
رخسار بھی مجروح تھے ابرو بھی کٹے تھے
شانے تھے جدا چاند سے بازو بھی کٹے تھے

منہ چھاتیوں پہ رکھ کے یہ ناشاد پکاری
آرام میں ہو یا ہے غشی پیاس کی طاری
ہوتا ہے بیاں شوکت ہمت کا تمہاری
تسلیم کو قبلۂ کونین کو واری
سمجھی ہیں کہ باعث ہے یہ بیداری شب کا
پیارے یہ طریقہ نہیں ارباب ادب کا

تعریف امام دوسرا کرتے ہیں اٹھو
عباس علمدار ثنا کرتے ہیں اٹھو
ہمشکل نبی مدح و ثنا کرتے ہیں اٹھو
سب لوگ نہ اٹھنے کا گلا کرتے ہیں اٹھو
آقا سے مصیبت میں جدا ہو نہیں جاتے
صدقے گئی یوں جنگ کے دن سو نہیں جاتے

تم تو کہیں یوں رات کو غافل نہیں سوئے
پانی نہیں کاہے سے یہ یاں چہروں کو دھوئے
اب تم نہ ملو گے جو کوئی جان بھی کھوئے
قسمت میں یہ لکھا تھا کہ ماں لاشوں پہ روئے
سر دے کے مرے حق سے ادا ہو کے پھرے ہو
سمجھی ہوں کہ ماموں پہ فدا ہو کے پھرے ہو

احسنت مرے صف شکنو نیک خصالو
گل پیرہنو تشنہ لبو گیسوؤں والو
غش آتا ہے پیارو مجھے اٹھ اٹھ کے سنبھالو
لو چھوٹی سی باہیں تو گلے میں مرے ڈالو
مظلوم ہو دربار میں عادل کے سدھارو
جاتے ہو تو اماں کے گلے مل کے سدھارو

پیارو تم اکیلے کبھی نکلے نہیں گھر سے
رستے سے نہ واقف نہ صعوبات سفر سے
راہیں بھی وہ خالی نہیں جو خوف و خطر سے
جو خاصۂ باری ہیں وہ تھراتے ہیں ڈر سے
اس خوف سے راتوں کو نہ سوتے تھے محمدؐ
جب موت کا ذکر آتا تھا روتے تھے محمدؐ

بھولی نہیں اب تک مجھے بے تابی حیدر
دم بھر شب ضربت کو نہ تکیہ پہ رکھا سر
دالان سے جاتے تھے کبھی حجرے کے اندر
روتے ہوئے حجرے سے کبھی آتے تھے باہر
اٹھتی تھی جب آواز بکا آتی تھی مجھ کو
اعضا کے لرزنے کی صدا آتی تھی مجھ کو

میں عرض یہ کرتی تھی کہ یا شاہِ خوش انجام
فرماتے تھے کس طرح نہ تھرّائے یہ ناکام
وہ کون ہے اعمال کا دھڑکا نہیں جس کو
بیٹی ہیں ہزاروں سے رہا معرکہ آرا
تھا پیر علم آگ سے دوزخ کا کنارا
کلمہ بھلائے ڈر سے زبانوں پہ جنوں کی
کس سے کہوں جو آج مجھے خوف ہے طاری
مجرم کے لیے قبر کی منزل بھی ہے بھاری
لب کھل نہیں سکتے ہیں زباں ہل نہیں سکتی
قہار کی جانب سے جو ہیں حکم پہ معمور
بیزار بدی سے عمل خیر سے مسرور
آنکھیں وہ دکھائیں گے جو خاموش رہونگا
ہے ہائے وہی رستہ تمھیں درپیش ہے پیارو
اب آنکھوں سے چھپ جاؤ گے اے عرش کے تارو
ویرانی میں یا گلشنِ ہستی میں رہو گے
تجویز ہے قبروں کی کہاں ہیں نہیں آگاہ
یہ دہر ہے بے مہر یہ دنیا ہے گزرگاہ
ماموں کی نہ تقصیر نہ کچھ اس میں ہے ماں کی
یہ پھول سے تن اور وہ سرِ تیز سنانیں
گل برگ سے ہونٹوں پہ ہیں خشکیدہ زبانیں
رخ زرد ہیں اور خاک سے گیسو بھی اٹے ہیں

کیا ہے کہ نہ لیٹے نہ کیا آپ نے آرام
سرکار سے آیا ہو جیسے موت کا پیغام
درپیش ہے وہ راہ کہ دیکھا نہیں جس کو
مرحب کو تہِ تیغ کیا عمر کو مارا
کو دا ہیں تو لشکر تہ و بالا ہوا سارا
ہر ضرب میں بن جاتی تھی جانوں پہ جنوں کی
جو ہڈیاں ہیں تن میں گھلی جاتی ہیں ساری
وہ تنگ مکاں رحم کرے خالقِ باری
کروٹ بھی بدلنے کو جگہ مل نہیں سکتی
نرمی و ترحم نہیں اُن لوگوں کا دستور
نہ رفق و مدارا نہ رعایت انھیں منظور
واقف نہیں کیا پوچھیں گے اور کیا میں کہونگا
تم مرد ہو جرّار ہو ہمت کو نہ ہارو
بچو تمھیں منزل کا پتا دے کے سدھارو
تم آج کی شب کونسی بستی میں رہو گے
غربت میں مرو گے یہ نہ تھی مجکو خبر آہ
جاتا ہے تہی دست گدا ہو کہ شہنشاہ
قبریں بھی ملیں گی وہیں ہے خاک جہاں کی
وہ تیر قیامت کے غضب کی وہ کمانیں
بچ جائیں کہو کیونکہ تنِ مجروح سے جانیں
مرتے ہوئے تڑپے ہو کہ سب زخم پھٹے ہیں

کیا تھی خبر اس کی کہ جدا ہوؤ گے بچّو
میں روؤں گی اور تم نہ مجھے روؤ گے بچّو
پردیس میں دنیا سے مجھے کھوؤ گے بچّو
تڑپوں گی میں اور قبر میں تم سوؤ گے بچّو
بیداری میں گزریں گی کہ سونے میں کٹیں گے
اب زیست کے دس دن مجھے رونے میں کٹیں گے

اب جینے سے امّاں کا بھی دل سیر ہے پیارو
جیتی ہوں پہ قسمت کا مرے پھیر ہے پیارو
تم مر گئے دنیا تو مجھے اندھیر ہے پیارو
کیا جانیں مری موت میں کیا دیر ہے پیارو
ہے کونسی دولت جسے کھونے کو رہی ہوں
معلوم نہیں اب کسے رونے کو رہی ہوں

اب دھیان مرا شام و سحر کون رکھے گا
الفت کی محبّت کی نظر کون رکھے گا
پردیس میں بابا کی خبر کون رکھے گا
جھک جھک کے مرے پاؤں پہ سر کون رکھے گا
سب ہوں گے مگر گود کے پالے نہ ملیں گے
اب تم سے مجھے چاہنے والے نہ ملیں گے

ہر سال بہار آئے گی کھل جائیں گے سب گل
سرسبز جوانانِ چمن ہوئیں گے بالکل
سبزہ کہیں ہوگا کہیں نسریں کہیں سنبل
وہ سرو ہوا میں وہ خوش الحانیِ بلبل
دنیا کے نہ بستانِ فرحناک میں ہوگے
گل باغ میں، تم زیرِ زمیں خاک میں ہوگے

حضرت کو لڑائی کے پیام آتے ہیں اٹھو
خیمے کی طرف ساکنِ شام آتے ہیں اٹھو
لو تیرِ ستم ہوئے امام آتے ہیں اٹھو
جرّار بڑے وقت میں کام آتے ہیں اٹھو
جلدی سے قباؤں کو پہنتے ہوئے نکلو
شمشیر و سپر تھام کے تنتے ہوئے نکلو

تاریکی میں ساری تمھیں نیند آئے گی کیونکر
شب آئے گی تو بچوں کو یہ ماں پائے گی کیونکر
مادر دلِ بیتاب کو سمجھائے گی کیونکر
واں تک مرے رونے کی صدا جائے گی کیونکر
بخشوں جو تجھے بس کو تو بیجا نہیں واری
ماں ہوں مرا پتھر کا کلیجا نہیں واری

تم دونوں نے جاں اپنی مرے بھائی پہ واری
شرمندۂ احساں ہے یہ دکھ درد کی ماری
کس منہ سے شہیدوں میں کروں شکرگزاری
ماں پہلے تھی پر آج سے لونڈی ہوں تمھاری
بہتر ہوا گر مجھ پہ چھری چل گئی پیارو
کچھ تو مرے بھائی کی بلا ٹل گئی پیارو

اس دائی نے کی تھی گلہ آمیز جو تقریر
منظور یہ تھا پہلے ہو تم فدیۂ شبیر
روتے تھے کہ امّاں ہیں خفا ہونے کی خو ہے
چلتے ہوئے منظور تلافی تھی میں قربان
لو صدقے گئی جوڑتی ہوں ہاتھ بس اس آن
سمجھی تھی کہ فوجِ شہِ والا میں رہو گے
جنگل میں قیام آج کہاں ہوگا بتاؤ
دن تم کو تمام آج کہاں ہوگا بتاؤ
ہموار زمیں شب کے بچھونے کو ملے گی
ہمراہ نہ تکیے ہیں نہ راحت کا بچھونا
معلوم ہے چھوٹے کا تجھے چونک کے رونا
بے ماں کے سحر رونے میں کٹ جاتی ہے اس کو
ٹکڑے تھے کلیجے یہ بیاں درد کا سن کر
بانو نے کہا قبلۂ کونین سے اٹھ کر
فرزند کا غم خالقِ عالم نہ دکھائے
اکبر سے کہا تم پھوپی امّاں کو سنبھالو
شہزادی کو غش آیا ہے اے پیٹنے والو
پردہ ہو کہ لاشے نہ اٹھاتے ہوئے دیکھے
کیا لاشوں کے جانے کا کہوں حال انیس آہ
اللہ ہی زینب کی مصیبت سے ہے آگاہ
بالائے زمیں عرش کے تاروں کو نہ دیکھا

اُس وقت نہ تھی ہوش میں بیکس و دلگیر
شرمندہ ہوں محجوب ہوں بخشو مری تقصیر
گھڑکا تھا کلیجہ مرا اس غم سے لہو ہے
رونے میں کچھ اس کا نہ رہا مجھ کو ذرا دھیان
نانی سے شکایت مری کیجو نہ مری جان
کیا جانتی تھی آج نہ دنیا میں ہو گے
ماں صدقے مقام آج کہاں ہوگا بتاؤ
بستر سرِ شام آج کہاں ہوگا بتاؤ
کیسی ہے زمیں جو تمھیں سونے کو ملے گی
دو بھائی ہو تم ایک جگہ رات کو سونا
صدقے گئی غافل مرے بچے سے نہ ہونا
پہلو مرا ملتا ہے تو نیند آتی ہے اس کو
اک حشر تھا سیدانیاں سب پیٹتی تھیں سر
مرجائے گی ماں لاشوں کو لے جایئے باہر
اللہ کسی ماں کو یہ ماتم نہ دکھائے
عباس کدھر ہیں انھیں باہر سے بلا لو
ہے ہے نہ کرو خاکِ عزا سر پہ نہ ڈالو
ماں خیمہ سے بچوں کو نہ جاتے ہوئے دیکھے
در تک گئے سب پیٹتے روتے حرم شاہ
گزرے کسی مادر پہ نہ یہ صدمۂ جاں کاہ
غش سے جو کھلی آنکھ تو پیاروں کو نہ دیکھا

مرثیہ (۸)

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روحِ امیرِ عرب آئی
غل تھا کہ شبِ قتلِ شہِ تشنہ لب آئی
سادات کو کیا کیا غمِ جاں کاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اُس شب کی سیاہی
ہر چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغانِ ہوا بر میں طپاں بحر میں ماہی
تربت سے نکل آئے تھے محبوبِ الٰہی
فریاد کا تھا شور رسولانِ سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اُدھر تھی نجف میں

صدمے سے ہوا رنگِ رُخِ ماہ جو کافور
اختر بھی بنے مردمکِ دیدۂ بے نور
غم چھا گیا راحت دلِ عالم سے ہوئی دور
تصویرِ الم بن گئی جنت میں ہر اک حور
کہتے تھے ملک رات نہ ہووے گی اب ایسی
تاروں نے بھی دیکھی تھی نہ تاریک شب ایسی

شمعِ طربِ محفلِ عالم تھی جو خاموش
تھی رات بھی شبیرؑ کے ماتم میں سیہ پوش
کیا غم تھا کہ شادی تھی ہر اک دل کو فراموش
ہر چشم کو تھا غم میں سمندر کی طرح جوش
مضطر تھے علیؑ اشکوں سے منہ دھوتی تھی زہراؑ
مقتل تھا جہاں شاہ کا واں روتی تھی زہراؑ

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہِ والا
آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اُجالا
خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اُڑتی تھی منہ پر حرمِ شبیرِؑ خدا کے
تھا چیں بجبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھرّاتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ وحشت سے نہ جانیں کہیں جائیں
روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچّے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچّے

بچوں کے بلکنے پہ حرم کرتے تھے زاری   غش ہو گئی تھی بالی سکینہ کئی باری
چلاتی تھی رو رو کے وہ شبیر کی پیاری   یا حضرتِ عباس چلی جان ہماری
افسوس کہ پانی کا تو قطرہ نہیں گھر میں   اور آگ لگی ہے مرے ننھے سے جگر میں

تھی سب سے سوا بنتِ علی مضطر و بیتاب   فق ہو گیا تھا شام سے منہ صورتِ مہتاب
مژگاں سے رخِ پاک پہ تھی بارشِ خوناب   تلوار کلیجے پہ چلے جب تو کہاں تاب
اک کرب تھا بسمل کی طرح جانِ حزیں پر   اٹھتی تھی کبھی اور کبھی گرتی تھی زمیں پر

کہتی تھی کبھی آج پیمبر نہیں ہے ہے   حال اپنا دکھاؤں کسے حیدر نہیں ہے ہے
بیٹی پہ فلک ٹوٹا ہے مادر نہیں ہے ہے   شبیر مصیبت میں ہے شبر نہیں ہے ہے
دیکھا نہ سنا یہ جو ستم آج ہے لوگو   نازوں کا پلا پانی کو محتاج ہے لوگو

درپیش ہے کل فوجِ ستمگر سے لڑائی   یاں تھوڑے سے پیاسے ہیں ادھر ساری خدائی
بے سر دیئے رن سے نہ پھرے گا مرا بھائی   ہو جائے گی حیدر کے بھرے گھر کی صفائی
اس غم سے سدا آنکھوں سے منہ دھوتی تھیں اماں   کل دن وہ ہے جس دن کے لیے روتی تھیں اماں

تھے دوسرے خیمے میں ادھر سبطِ پیمبر   دربار میں حاضر تھے رفیقانِ دلاور
اک پہلو میں قاسم تھے اور اک پہلو میں اکبر   اکبر کے ادھر لختِ دلِ زینبِ مضطر
شبیر محبت سے سخن کرتے تھے سب سے   عباس علی سامنے بیٹھے تھے ادب سے

سرگرم تھے مر جانے پہ سب شاہ کے انصار   عباس سے یہ کہتا تھا وہ کل کا مددگار
تم رہیو ذرا خیمۂ ناموس سے ہشیار   ڈر ہے نہ کرے بے ادبی لشکرِ کفار
بے دینوں کو راحت مری منظور نہیں ہے   شب خوں جو ادھر سے ہو تو کچھ دور نہیں ہے

یہ ذکر ابھی تھا کہ یکایک خبر آئی   اے چاند بد اللہ کے شب دوپہر آئی
حضرت کو ستاروں کی جو گردش نظر آئی   دل یادِ خدا کرنے لگا چشم بھر آئی
فرمایا بڑا اجر ہے بیداریِ شب کا   اے تشنہ لبو وقت ہے یہ طاعتِ رب کا

اب عمر بھی آخر ہی نمازیں بھی ہیں آخر — بے توشہ پہونچنا نہیں منزل پہ مسافر
ہر وقت ہے ربِّ دو جہاں حاضر و ناظر — اجر اُن کے مضاعف ہیں جو ہیں صابر و شاکر
مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو — بندہ وہی بندہ ہے جو بھولے نہ خدا کو

نام اُس کا ہے وِرد سفر ہو کہ حضر ہو — موجود سمجھ لے اُسے جنگل ہو کہ گھر ہو
سجدے ہی کرے دکھ میں کہ رحمت میں بسر ہو — تسبیح میں شب ہو تو نمازوں میں سحر ہو
عشقِ گلِ تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے — معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے

چومے لبِ سوفار جو سینے پہ لگیں تیر — دم عشق کا بھرتا ہے تہِ دمِ شمشیر
زخموں کو یہ سمجھے کہ ملا گلشنِ توقیر — تکبیر کا نعرہ ہو زباں پر دمِ تکبیر
کٹنے میں رگوں کے نہ صدا آہ کی نکلے — ہر رنگ میں ہو الفتِ اللہ کی نکلے

شہ نے سخنِ معرفتِ حق جو سنائے — اشک آنکھوں میں ہر عاشقِ صادق کے بھر آئے
کچھ پیاس کا شکوہ بھی زباں پر نہیں لائے — سجادے وہیں لا کے دلیروں نے بچھائے
تکبیریں پڑھیں شکرِ اللہ و نبیؐ میں — سب محو ہوئے یادِ جنابِ احدی میں

تسبیح نہیں تھی کہیں سجدے کہیں زاری — تھا صوتِ حسن سے کوئی قرآں کا قاری
کرتا تھا کوئی عرض کہ یا حضرتِ باری — اب صبح کو عزت ہے ترے ہاتھ ہماری
حرمت ہے شہِ بیکس و شہدا رکھیو یا رب — تو حوصلۂ صبر عطا کیجیو یا رب

ہم ہیں ترے محبوب کے پیارے کے مددگار — مرنے کے لیے آئے ہیں یاں چھوڑ کے گھر بار
یہ بندۂ بیکس ہے مصیبت میں گرفتار — کر رحم کہ ہے ذات تری راحم و غفار
فاقوں کے سبب جسم کی طاقت میں کمی ہے — تجھ سے طلبِ قوتِ ثابت قدمی ہے

بیکس ہیں مسافر ہیں وطن تو ہے گھر دور — ہم تم سے ہیں گھیرے ہے یہ لشکرِ مقہور
تیروں سے ہوں غربال کہ تیغوں سے بدن چور — احمدؐ کے نواسے سے جدائی نہیں منظور
پھر منہ کسے دکھلائیں جو سردار کو چھوڑیں — کیونکر ترے مقبول کی سرکار کو چھوڑیں

مردوں کے لیئے ننگ ہے تلواروں سے ڈرنا
راحت ہو کہ ایذا ہمیں جینا ہمیں مرنا
تو چاہیے تو مشکل نہیں کچھ سر سے گزرنا
ای کل کے مددگار مدد جنگ ہیں کرنا
فاقوں میں ہزاروں سے وغا ہو تو مزا ہے
کچھ حق نمک ہم سے ادا ہو تو مزا ہے

کرتے تھے مناجات اُدھر یاور و انصار
پڑھتے تھے نمازِ شب ادھر سید ابرار
تھی نیتِ تسبیح۔ بتولِ جگر افگار
آوازِ بکا خیمے سے آنے لگی یکبار
اکبر سے اشارہ کیا مڑ کر کہ یہ کیا ہے
کی عرض پھوپھی جان کے رونے کی صدا ہے

یوں تو کئی راتوں سے وہ ہیں مضطر و بیتاب
راحت کی نہ صورت ہے نہ آرام کے اسباب
غش ہیں جو ذرا بند ہوئے دیدۂ پُر آب
روتی ہوئی چونکی ہیں ابھی دیکھ کے کچھ خواب
نعلین کہیں چادرِ پُر نور کہیں ہے
اُس وقت سے بسمل کی طرح چین نہیں ہے

سب بیبیاں ہیں ورد ہیں بچوں کو لیئے پاس
اک ایک کو اندیشہ ہے اک ایک کو وسواس
جو پوچھتا ہے وجہ تو کہتی ہیں بصد یاس
لوگو مجھے شبیر کے بچنے کی نہیں آس
مانگو یہ دُعا غیب سے بیکس کی مدد ہو
صدقے کرو مجکو کہ بلا بھائی کی رد ہو

اُن کا تو یہ احوال ہے اماں کا یہ عالم
اشکوں کی جھڑی آنکھوں سے تھمتی نہیں اک دم
صغریٰ کی بھی ہے فکر سکینہ کا بھی ہے غم
شش ماہ کا بچہ بھی ہوا جاتا ہے بے دم
گودی میں اُٹھائیں اُسے یا اِس کو سنبھالیں
دو روز کے فاقے میں وہ کس کس کو سنبھالیں

رو آتی ہیں عابد کے سرہانے کبھی جاکر
گہوارۂ اصغر پہ کبھی گرتی ہیں آکر
قرآن کی ہوا دیتی ہیں غش میں اُسے پاکر
بہلاتی ہیں بیٹی کو کبھی اشک بہاکر
وہ کہتی ہیں تا صبح نہ سوؤں گی اماں
بابا ہی جب آویں گے تو میں سوؤں گی اماں

بتلاؤ شہِ جن و بشر کیوں نہیں آتے
اب رات بہت کم ہے پدر کیوں نہیں آتے
آزردہ ہیں کچھ مجھ سے ادھر کیوں نہیں آتے
کیا آج وہیں سو گئے گھر کیوں نہیں آتے
اب پیاسوں کی فریاد بھی بابا نہیں سنتے
حضرت مرے رونے کی صدا کیا نہیں سنتے

رو کر علی اکبرؑ نے جو کی شہ سے یہ تقریر
دیکھی جو نہ تھی دیر سے وہ چاند سی تصویر
بیتاب جو پایا بہت اُس تشنہ دہن کو
فرمایا بہن تم نے بنایا ہے یہ کیا حال
ماتھا ہے بھرا خاک سے بکھرے ہوئے ہیں بال
دم تن سے مرا گھٹ کے نکل جائے گا زینبؑ

جیتا ہوں ابھی اور ابھی سے یہ تلاطم
ہوتے ہیں مرے ہوش و حواس آپ سے ہو کے گم
بس صبر کرو جی سے گزر جائیں گے بچے
تلوار کسی نے ابھی تولی نہیں مجھ پر
گردن پہ کسی نے ابھی پھیرا نہیں خنجر
ہر چند کہ ساعت نہیں ٹلتی ہے قضا کی

زینبؑ نے کہا خوش ہوں جو میری اجل آئے
خالق مجھے عابد کی یتیمی نہ دکھائے
وسواس طبیعت کو بہلنے نہیں دیتا
آتا ہے سکینہ کی یتیمی کا مجھے دھیان
سمجھانے سے کچھ دل جو بہلتا ہے میں قربان
باندھے ہوئے کسنے کو رسن لاتا ہے کوئی

منہ ڈھانپ کے بستر پہ جو سو جاتی ہوں میں پھر
اماں کبھی چلاتی ہے یوں کھولے ہوئے سر
کیا لیٹی ہے بستر پہ کدھر دھیان ہے زینبؑ
پڑھتے ہوئے تسبیح گئے حضرتِ شبیرؑ
قدموں پہ محبت سے گری دوڑ کے ہمشیر
شبیرؑ نے لپٹا لیا چھاتی سے بہن کو

نہ سر پہ عصابہ ہے نہ چادر ہے نہ رومال
بیٹھو نہیں جیتا ہے ابھی فاطمہؑ کا لال
رو لیجیو جب قتل کا وقت آئے گا زینبؑ
یہ کرب یہ دکھ درد یہ زاری یہ تلاطم
خنجر کے تلے دیکھو گی کس طرح مجھے تم
تڑپو گی تم اس طرح تو مر جائیں گے بچے

سینہ ابھی تیروں سے مشبک نہیں خواہر
مر جائے گا بھائی تمہیں ثابت ہوا کیونکر
بچ جاؤں تو کیا دور ہے قدرت سے خدا کی
بھائی تمہیں اللہ اس آفت سے بچائے
بھائی کی بلا لیکے بہن خلق سے جائے
مجبور ہوں دل مجھ کو سنبھلنے نہیں دیتا

ہر وقت بھرا گھر نظر آجاتا ہے ویران
پھر جاتا ہے آنکھوں کے تلے موت کا سامان
سر پر سے ردا چھینے لیے جاتا ہے کوئی
تو چاک گریبان نظر آتے ہیں ہمشیر
بیٹی نہ بچے گا ترا مظلوم برادر
شبیرؑ اسی رات کا مہمان ہے زینبؑ

یہ ذکر ابھی تھا کہ سکینہ نے پکارا
سونا تو گیا آپ کے ہمراہ ہمارا
میں جاگتی ہوں اور جہاں سوتا ہے سارا
گردوں پہ چمکنے نہ لگے صبح کا تارا
نیند آئی ہے بیٹی کو سلا جائیے بابا
بس ہو چکیں باتیں اب ادھر آئیے بابا

حضرت نے کہا میں تری آواز کے قربان
اللہ تم اب تک نہیں سوئی ہو مری جان
غربت میں کہاں راحت و آرام کا سامان
بن باپ کے تم کو تو نہیں چین کسی آن
اچھی نہیں عادت یہ نہ رویا کرو بی بی
پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی

کیا ہووے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں
مجبور ہوں ایسے کہ تمھیں چھوڑ کے جائیں
تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمھیں ہم کہیں پائیں
بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں
جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی

جب عمر تھی کم ہم بھی چھٹے تھے یونہیں ماں سے
سوتے تھے لپٹ کر یونہیں ہم خاتونِ جہاں سے
کوچ اُن کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے
ماتم سے ملیں وہ نہ بکا سے نہ فغاں سے
یہ داغ یہ اندوہ و الم سب کے لیے ہیں
ماں باپ زمانے میں صدا کس کے جیے ہیں

رشتہ وہ اجل کا ہے کہ ہوتا ہی نہیں بند
کوچ آج پدر کا ہے تو کل جائے گا فرزند
ہوتا ہے قلق فرقتِ اولاد میں وہ چند
کیا زور ہے بندے کا جو مرضیِ خداوند
جو آئے ہیں دنیا میں وہ سب کوچ کریں گے
اس زیست کا انجام یہی ہے کہ مریں گے

یہ کہتے تھے حضرت کہ صدا آئی اذاں کی
گلدستۂ اسلام پہ بلبل نے فغاں کی
اک دم میں بہار اور ہوئی باغِ جہاں کی
تلوار چلی گلشنِ انجم پہ خزاں کی
مہتاب ہوا گم فلکِ نیلوفری سے
پھولا گلِ خورشید نسیمِ سحری سے

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا
مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا
وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
اس دشت میں رونق تھی جو شبنم شہ دیں پر
تھا موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر

جلوہ وہ دم صبح کا وہ نور کا عالم
دلچسپ صدا نوبت و شہنا کی وہ باہم
سرخی وہ شفق کی افق چرخ پہ کم کم
وہ گل کے کٹوروں پہ دُرافشانیِ شبنم
خشکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
پر مالکِ گلزارِ جہاں تشنہ دہاں تھا

لشکر میں ادھر صبح پہ شاہی کی ہوئی دھوم
یاں عرض ادا کرنے لگے عاشق قیوم
پیچھے تو جماعت تھی اور آگے شہِ مظلوم
صف بستہ ملائک میں بھی ہوتا تھا معلوم
سب ساجد و راکع تھے شہنشاہ کے ہمراہ
تاباں تھے بہتّر مہِ نو ماہ کے ہمراہ

شبہ تھا فلک آپ قمر اور دوست ستارے
تاشے بھی وہ تاروں کو فلک جن پہ اتارے
خم ہو گیا تھا پیرِ فلک شرم کے مارے
کہتی تھی زمیں اوج ہے طالع کو ہمارے
خورشید نہیں روشنیِ نیرِ دیں ہے
خود عرش کو دھوکا تھا یہی عرش بریں ہے

جو صف ہے وہ اک سطر ہے قرآنِ مبیں کی
دیوار ہے قبلہ کی طرف کعبۂ دیں کی
کیا خوب جماعت ہے یہ اربابِ یقیں کی
افلاک کی زینت ہے تو رونق ہے زمیں کی
کس طرح شہنشاہ سے وہ فوج جدا ہو
مشکل ہے کہ دریا سے کہیں موج جدا ہو

اس دم تھی یہ آوازِ پسِ پردۂ قدرت
اے قدسیو دیکھو مرے بندوں کی عبادت
نہ پیاس کا شکوہ ہے نہ فاقوں کی شکایت
پیاسے ہیں یہ فاقے سے یہ اطاعت یہ ریاضت
کونین میں یہ صاحبِ اقبال و شرف ہیں
عالم ہوں کہ ان لوگوں کے دل میری طرف ہیں

کس عجز سے آگے مرے حاضر ہیں یہ بندے
دیکھو مرے محبوب کے ناصر ہیں یہ بندے
مظلوم ہیں بیکس ہیں مسافر ہیں یہ بندے
تھوڑے ہیں نہ ہوں کس طرح کہ شاکر ہیں یہ بندے
صادق ہیں ولی ہیں مرے ان سب کو ثنا ہے
ان کا وہ صلہ ہے جو رسولوں کو ملا ہے

پرسش نہ لحد میں نہ حساب ان کے لئے ہے
یہ لائقِ جنت ہیں ثواب ان کے لئے ہے
موتی سے جو ہے صاف وہ آب ان کے لئے ہے
ہیں حق کا ہو ساقی وہ شراب ان کے لئے ہے
اس نخلِ بیاباں کے ثمر ان کو ملیں گے
جو عرش سے اونچے ہیں وہ گھر ان کو ملیں گے

فارغ جو صلوٰۃ سحری سے ہوئے دیندار
پوشاک پہننے کو اٹھے سید ابرار
فرمانے لگے حضرت عباسؑ علمدار
ہاں غازیو اب تم بھی سجو جنگ کے ہتھیار
قرباں تمہیں ہونا ہے محمدؐ کے پسر پر
کمروں کو کسو گلشن جنت کے سفر پر

آمادہ شر لشکر کفار ہے کل سے
ہونا ہے تمہیں آج ہم آغوش اجل سے
درپیش ہے جنگ و جدل اس فوج کے دل سے
آقا بھی کوئی دم میں نکلتے ہیں محل سے
ہاں صف شکنو وقت ہے نصرت کی دعا کا
کھلتا ہے پھریرا علم فوج خدا کا

ہم لوگ اسی روز کے مشتاق ہیں کب سے
اب ہوگی ملاقات شہنشاہ عرب سے
سیدانیاں تم سب کو دعا دیتی ہیں شب سے
صف باندھکے آؤ در دولت پہ ادب سے
فردوس میں نانا سے حضور آج ملیں گے
کوثر پہ تمہیں خلعت نور آج ملیں گے

اس مژدہ کو سنتے ہی مسلح ہوئے غازی
اصطبل سے آنے لگے جرّاروں کے تازی
شبیر صف جنگاہ تھا اک ایک نمازی
نعرے تھے کہ "قربان شہنشاہ حجازی"
ڈیوڑھی پہ شگفتہ تھا چمن خلد بریں کا
خیمے میں تلاطم تھا وداع شہ دیں کا

تھے گرد حرم بیچ میں وہ عاشق حق تھا
مانند سحر رنگ ہر اک بی بی کا فق تھا
بانوئے دو عالم کا جگر سینے میں شق تھا
زینب پہ تڑپتی تھی کہ حضرت کو قلق تھا
شبیر کے پہلو سے نہ ہٹتی تھی سکینہ
بڑھتے تھے تو دامن سے لپٹتی تھی سکینہ

شہ کہتے تھے بی بی ہمیں اب جانے دو گھر سے
سینہ مرا شق ہوتا ہے لپٹو نہ پدر سے
وہ کہتی تھی سایہ جو یہ اٹھ جائے گا سر سے
ہے ہے میں تمہیں ڈھونڈھ کے لاؤں گی کدھر سے
بیٹی کا سوا آپ کے کوئی نہیں بابا
شب بھر میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا

سمجھاتے تھے حضرت کہ میں صدقے مری پیاری
میداں سے ابھی آئیں گے ہم تو کئی باری
وہ کہتی تھی میں آپ کی مظلومی کے واری
ساماں نظر آتا ہے یتیمی کا ہماری
درپیش لڑائی نہیں گر فوج شقی سے
کیوں آپ سفارش مری کرتے تھے پھوپھی سے

اب آپ کے جانے سے تو ثابت ہے نہ آنا
کیوں کہتے تھے زینب سے چھاتی پہ سلانا
بانو مرے پیچھے نہ سکینہ کو رلانا
پانی جو میسر ہو تو پیاس اس کی بجھانا
پہلا ہو جب داغ تو مجھے یاد کرے گی
تڑپوں گا لحد میں جو یہ فریاد کرے گی

ہیں سنتی تھی عابد سے جو کچھ کی تھی وصیت
اس گھر کی تباہی کی خبر دیتے تھے حضرت
ہے ہائے یہ مری عمر پہ صدمہ یہ مصیبت
لے لو مجھے ہمراہ گوارا نہیں فرقت
ساتھ آپ کے جاؤں گی جو اس رنج و محن سے
کوئی مری گردن تو نہ باندھے گا رسن سے

نادان کی ان باتوں پہ گھر روتا تھا سارا
ماتم میں کسی دل کو نہ تھا صبر کا یارا
حضرت کو بھی فرقت تھی نہ بیٹی کی گوارا
ڈیوڑھی تک اسے گود سے اپنی نہ اتارا
جس دم وہ چھٹی جیتے ہی جی مر گئے شبیر
کس درد سے روتے ہوئے باہر گئے شبیرؑ

جس دم در دولت پہ امیر امم آیا
بیٹھے یہ حرم گھر میں کہ ہونٹوں پہ دم آیا
تسلیم کو اسلام کا لشکر بہم آیا
کس صولت و اقبال و حشم سے علم آیا
جاتی تھی لچکنے میں ضیا عرش تک اس کی
خورشید کو پنجے میں لیے تھی چمک اس کی

آپس میں یہ کہتے تھے رفیقان دلاور
دیکھیں یہ ہما سایہ فگن ہوتا ہے کس پر
اکبر کے تو ہے نام پہ سالاری لشکر
عباس کو دیں گے شہ دیں منصب جعفر
اک عشق ہے اس شہر سے سلطان امم کو
بھائی کو کبھی دیکھتے ہیں گاہ علم کو

زینبؑ کے پسر مشورہ کرتے تھے یہ باہم
کیوں بھائی علم لینے کو ماموں سے کہیں ہم
تائید خدا چاہیئے گو عمر میں ہیں کم
عہدہ تو ہمارا ہے یہ آگاہ ہے عالم
واقف ہیں سبھی حیدر و جعفر کے شرف سے
حق پوچھو تو حقدار ہیں ہم دونوں طرف سے

دادا بھی علمدار ہے نانا بھی علمدار
ہم اپنے بزرگوں کے ہیں منصب کے طلبگار
کہتا تھا بڑا عرض کا موقع نہیں زنہار
ہیں بادشہ کون و مکاں مالک و مختار
عہدہ تو بڑا یہ ہے کہ ماموں پہ فدا ہوں
چپکے رہو اماں نہ کہیں سن کے خفا ہوں

مطلب نہ علم سے نہ حشم سے ہمیں کچھ کام
یہ سر ہوں نثارِ قدمِ شاہِ خوش انجام
آقا سے جا ہیں علمِ فوجِ خدا دیں
روتی تھی یہ پیچھے کے قریں زینبِ دلگیر
فضہ سے یہ کہنے لگی وہ صاحبِ توقیر
کچھ کہنا ہے سن لیں اُسے فرصت انھیں گر ہو
کہتی تھی زینب کہ خود آئے وہ نکوکار
کیا باتیں ابھی بھائی سے تفصیل ہوئے دلدار
سمجھے نہ کہ مادر عقبِ پردہ کھڑی ہے
اللہ بڑا عزم کیا باندھ کے تلوار
دیکھو ابھی تم دونوں سے ہو جاؤں گی بیزار
کیا دخل تمھیں امر میں سلطانِ اُمم کے
کچھ اور ہی تیور ہیں علم نکلا ہے جب سے
استادہ ہو جا کر عقبِ شاہ ادب سے
اس امر میں خاطر نہ کریں اور کسی کی
دو روز سے بھائی پہ مرے ظلم و ستم ہے
چھوٹے سے ہیں قد میں بھی تمھارا ابھی کم ہے
ہرگز نہ ابھی کچھ شہِ ذی جاہ سے کہنا
مانا کہ پہنچتا ہے تمھیں منصبِ جعفر
چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر
بگڑوں گی گلہ گر کسی اسلوب کروگے

مٹ جائیں نشاں بس یہی عہدہ ہے یہی نام
عزت ہے بھائی یہ دعا ہے سحر و شام
مشتاق اجل ہیں ہمیں مرنے کی رضا دیں
سب اس نے مفصل سنی بیٹوں کی تقریر
دونوں کو اشارے سے بلا کے کسی تدبیر
عباس نہ دیکھیں نہ شہِ دیں کو خبر ہو
چھوٹے سے یہ فرمانے لگیں زینبِ ناچار
اس وقت میں یہ کون سے منصب کے طلبگار
گھر لٹتا ہے میرا انھیں منصب کی پڑی ہے
بچو تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی میں زنہار
کچھ کہیو نہ ماموں سے خبردار خبردار
دیکھوں گی نہ پھر منہ جو گئے پاس علم کے
تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے
عہدہ ہے یہ جس کا تمھیں معلوم ہے نسب سے
میں خوش ہوں بجا لائیں وصیت جو علی کی
تم فکرِ علم میں ہو مجھے سخت الم ہے
کہیں اس کو نہ سمجھو یہ محمد کا علم ہے
کہنا بھی تو رخصت کے لیے شاہ سے کہنا
آقا کی غلامی سے ہے عہدہ کوئی بڑھ کر
عاشق کا تو عاشق ہے برادر کا برادر
عباس سے کیا تم مجھے محجوب کروگے

زینب نے عتابانہ جو کی اُن سے یہ گفتار
شاہوں سے غلاموں نے بھی کی ہے کبھی تکرار
رخصت کے لیے تیغ و سپر باندھے ہوئے ہیں

زینب نے کہا لیکے بلائیں کہ سدھارو
ماں صدقے گئی سر قدمِ شاہ پہ وارو
یہ وقت ہے امدادِ امامِ ازلی کا

صدقے گئی سن لو کہ میں کہتی ہوں جتا کر
میدان میں زخمی ہوئے گر قاسمؑ و اکبرؑ
جب دل ہوا ناراض تو فرزند کہاں کے

اُن میں سے اگر رن کی طرف ایک سدھارا
جس وقت سنوں گی کہ سر اُن دونوں پہ وارا
بیجاں ہوئے بعد اُن کے تو ماتم نہ کروں گی

ہیں دونوں بھتیجے مرے پیارے مرے محبوب
جینا نہیں بہتر کسی صورت کسی اسلوب
ایذا جو اُٹھاؤ گے تو راحت بھی ملے گی

دیکھو کہے دیتی ہوں خبردار! خبردار!!
شیروں کے یہ ہیں کام کھنچے جب گھڑی تلوار
توڑی ہیں صفیں جنگ ہیں جب کھیت پڑے ہیں

اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھاؤ
جعفر کی طرح جوہرِ شمشیر دکھاؤ
خورشید امامت سے قرابت میں قریں ہو

یوں کہنے لگے جوڑ کے ہاتھوں کو وہ دلدار
مالک ہیں جسے چاہیں علمِ دیں شہِ ابرار
ہم صبح سے مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں

بس اب مرا دل شاد ہوا ہے مرے پیارو
ہو عید مجھے گر عمر و شمر کو مارو
دے چھوٹے سے ہاتھوں میں خدا زورِ علی کا

تم پہلے فدا کیجیو سر شہ کے قدم پر
پھر تم مرے فرزند نہیں دونوں کی مادر
کس کام کے وہ لال جو کام آئیں نہ ماں کے

زہرا کی قسم مُنہ نہ میں دیکھوں گی تمھارا
اُس وقت تمھیں ہوگا مرا دودھ گوارا
دیکھو جو مروں گی بھی تو ناراض ہوں گی

تم اُن پہ تصدق ہو یہی ہے مجھے مطلوب
بے سر دیئے تو دودھ اپنا میں بخشوں تمھیں کیا خوب!
جب آئیں گی لاشیں تو یہ دولت بھی ملے گی

جینے جو رہے دودھ نہ بخشوں گی میں زنہار
رکھ دیویں گلا بڑھ کے تہِ خنجرِ خوں خوار
جنّات کے لشکر سے علی یونہیں لڑے ہیں

اجلالِ حسن شوکتِ شبیر دکھاؤ
تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھاؤ
تم شیر ہو شیروں کے حسینوں کے حسیں ہو

جعفر سے نمودار کے دلبر ہو دلیرو
جرّار ہو کرّار ہو صفدر ہو دلیرو
تیروں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آؤ
خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو
تیغوں میں دھنسو بھالیوں سے نیزوں کو ریلو
دو اور جلا آئینۂ تیغِ عرب کو
خاقان کا رہے تخت نہ قیصر کا رہے تاج
چڑھنا ہی لڑائی پہ جواں مردوں کو معراج
یوں آئیو چار آئنہ پہنے ہوئے بر میں
میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہنر ہیں
کہ عطر میں ڈوبے ہیں کہ خون میں تر ہیں
وہ اور کسی سے نہ جھلیں گے نہ جھکے ہیں
یہ سُن کے جو نکلے وہ جری خیمے سے باہر
اکبر نے یہ کی عرض کہ ای سبطِ پیمبر
جلدی ہو لڑائی کی اُدھر فوجِ ستم کو
شہ بولے کہ عباسِ دلاور کو بُلاؤ
عاشق کو مددگار کو یاور کو بُلاؤ
یہ اوج یہ رتبہ یہ حشم اس کے لیئے ہے
سب تکنے لگے صورتِ عباسِ فلک جاہ
یعنی مرا حامل ہے نشانِ اسداللہ
جاں آگئی تھی سُنتے ہی اس خوش خبری کو

حیدر سے دلاور کے دلاور ہو دلیرو
ضرغام ہو ضیغم ہو غضنفر ہو دلیرو
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آؤ
بچے اسداللہ کے ہو جان پہ کھیلو
کوفے کو تہِ تیغ کرو شام کو لے لو
لو روم کو قبضہ میں تو قابو میں حلب کو
ہاں غازیو چین و حبش و زنگ سے لو باج
گیتی تہ و بالا ہو وہ تلوار چلے آج
جس طرح علی بعد ظفر آئے تھے گھر میں
جس کے ہیں پسر اُس کے ہیں جلو میں پلے ہیں
صحبت میں مصاحب ہیں لڑائی میں سپر ہیں
عزت میں نہ فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں
کس پیار سے منہ دونوں کا تکنے لگے سرور
تیار ہو سب قبلۂ کونین کا لشکر
ارشاد جیسے ہو وہ بڑھے لینے عَلَم کو
پیارے مرے محبوب برادر کو بُلاؤ
جلدی مرے حمزہ مرے جعفر کو بُلاؤ
زیبا اُسے علم کی ہے عَلَم اس کے لیئے ہے
نازاں ہوا خود اوج پہ اپنے عَلَمِ شاہ
بالیدہ تھا پرچم تو پھریرا تھا ہوا خواہ
پنجہ بھی اشارے سے بُلاتا تھا جری کو

خوش ہو کے یہ عمو کو پکارے علی اکبر　　جلد آئیے یا و آپ کو فرماتے ہیں سرور
حاضر ہوا جوڑے ہوئے ہاتھوں کو وہ صفدر　　ارشاد کیا شہ نے علم بھائی کو دے کر
لیجیے اسے کاندھے پہ یہ ہے آپ کا عہدہ　　لو بھائی مبارک ہو تمھیں باپ کا عہدہ

بوسہ دیا عباسؑ دلاور نے علم پر　　تسلیم کی اور رکھ دیا سر شہ کے قدم پر
کی عرض کہ قربان اس الطاف و کرم پر　　سو سر ہوں تو صدقے ہیں شہنشاہِ امم پر
ادنیٰ جو ابھی تھا اُسے اعلیٰ کیا مولا　　قطرے کو ترے فیض نے دریا کیا مولا

اس چترِ فلک قدر کا سایا مرے سر پر　　اس دھوپ میں ہوگا یہ پھریرا مرے سر پر
یہ ابر مرے سر پہ یہ طوبیٰ مرے سر پر　　قایم رہیں لاکھوں برس آقا مرے سر پر
سلطانِ دو عالم کی غلامی کے صلے ہیں　　سب اوج پہ نعلین اُٹھانے سے ملے ہیں

حضرت نے کہا رو کے یہ کیا کہتے ہو پیارے　　حاضر ہے اگر جان بھی کام آئے تمھارے
حصّہ یہ تمھارا تھا سو پہونچا تمھیں پیارے　　مالک ہو تمھیں ہم تو ہیں اب گور کنارے
تھا دل میں جو کچھ وہ بخدا ہو نہیں سکتا　　بھائی ترا حق مجھ سے ادا ہو نہیں سکتا

یہ کہہ کے بڑھے سرورِ دیں جانبِ توسن　　ہتھیار لگائے ہوئے پہنے ہوئے جوشن
اسوار ہوئے آپ جو گردان کے دامن　　اللہ ری ضیا خانۂ زیں ہو گیا روشن
وہ پاؤں رکابوں کے لیئے باعثِ ضو تھے　　خورشید کے قدموں کے تلے دو مہِ نو تھے

رانوں کے اشارے سے لگا کودنے شبدیز　　اسوار کے دل کا تھا اشارا اُسے مہمیز
گرما کے جو شبیر نے تازی کو کیا تیز　　اعدا پہ چلا غول سواروں کا جلو ریز
ایک ایک جوانِ عربی رشکِ ملک تھا　　اللہ کے لشکر کا علم سمت فلک تھا

کیا فیضِ سواری تھا کہ زر ریز تھی سب راہ　　طالع تھا اُدھر مہر اِدھر تھا علمِ شاہ
مابین دو خورشید تھی فوجِ شہِ ذیجاہ　　پنجہ پہ تجلّی تھی کہ اللہ ہی اللہ
بالا تھی چمک مہرِ منوّر کی چمک پر　　ضو اس کی زمیں پر تھی ضیا اس کی فلک پر

ایک ایک جواں زیورِ جنگی کو سنوارے
نیزوں کی چمک اور وہ سمندوں کے طرارے
جعفر کے جگر بند ید اللہ کے پیارے
رستم سے ہر اک جنگ کرے شیر کو مارے
ستائے ہو مرحب سا تو شمشیر سے ماریں
ارجن سے کماندار کو اک تیر سے ماریں

کمسن کئی لڑکوں کا جدا غول تھا سب سے
سوئے بھی نہ تھے ولولۂ جنگ میں شب سے
روکے ہوئے باگوں کو شہِ دیں کے ادب سے
اعدا کی طرف دیکھتے تھے چشمِ غضب سے
ہتھیار جو باندھے تھے تو کیا تن پہ کھلے تھے
سب نیچے تُلے ہوئے مرنے پہ تلے تھے

وہ چاند سے منہ اور وہ گورے بدن اُن کے
شرمندہ ہوں غنچے بھی وہ نازک دہن اُن کے
یوسف کی طرح عطر فشاں پیرہن اُن کے
مرکر وہی کپڑے ہوئے آخر کفن اُن کے
کیا حُسنِ عقیدت تھا عجب دل کے جوان تھے
آقا پہ فدا ہونے کو سب ایک زباں تھے

عمریں تو کم و بیش پہ سب گیسوؤں والے
اک غول میں تھے چاند کئی اور کئی ہالے
ذی مرتبہ سیدانیوں کے گود کے پالے
غنچہ تھا وہ سب اکبرِ گلرو کے حوالے
اُن تازہ نہالوں میں نمودار یہی تھے
اُس گلشنِ یک رنگ کے مختار یہی تھے

مقتل کو جو پُرنور کیا عسکرِ دیں نے
دیکھا طرفِ چرخ حقارت سے زمیں نے
اونچا نہ کیا سر فلکِ ماہ جبیں نے
کی فرش پہ حسرت سے نظر عرشِ بریں نے
اُٹھ اُٹھ کے چمک اپنی دکھانے لگے ذرّے
خورشید کے پہلو کو دبانے لگے ذرّے

کھولا جو پھریرے کو علمدارِ جری نے
لوٹے گلِ فردوس نسیمِ سحری نے
تاروں کو اُتارا فلکِ نیلوفری نے
پرچم جو کھلا کھول دیے بال پری نے
عیسیٰ نے پکارا کہ نثار اس کے حشم کے
خورشید نے منہ رکھ دیا پنجہ پہ علم کے

ترتیب صفِ فوج کا جس دم ہوا اعلام
باندھی علی اکبر نے صفِ لشکرِ اسلام
ظاہر جو ہوئی شانِ جوانانِ گل اندام
کوفہ کے نشاں جھک گئے کانپی سپہ شام
اللہ ری شوکت شرفا و نجبا کی
اسلام کا لشکر تھا کہ قدرت تھی خدا کی

ناگاہ بجا طبل بڑھا لشکرِ سفاک
تا چرخ گیا غلغلۂ کوسِ شغب ناک
فریاد سے قرنا کی ہلا گنبدِ افلاک
تھرا گیا آوازِ دہل سے کرۂ خاک
نوبت تھی زبس قتلِ امامِ مدنی کی
صاف آتی تھی شاخوں سے صدا سینہ زنی کی

واں شور تھا باجوں کا ادھر نعرۂ تکبیر
ایک ایک جری جھومتا تھا تول کے شمشیر
ناگاہ سوئے فوجِ خدا آنے لگے تیر
عباسِ علمدار نے دیکھا رُخِ شبیرؑ
کی عرض کہ لڑنے کو شریر آتے ہیں مولا
کیا حکم ہے اب پیاسوں پہ تیر آتے ہیں مولا

شہ نے کہا شرم آتی ہے کیا حکم میں دوں آہ
ہفتاد و دو تن یاں ہیں اُدھر سیکڑوں گمراہ
غازی نے یہ کی عرض کہ اے کُل کے شہنشاہ
یہ شیرِ نیستانِ علی ہیں تو وہ روباہ
لاکھوں ہوں تو کیا ڈر ہے شجاعانِ عرب کو
اقبال سے آقا کے بھگا دیتے ہیں سب کو

فرمایا کہ فاقے سے ہے سارا مرا لشکر
پانی نہیں ملتا کہ لبِ خشک کریں تر
بہتر ہے اگر پہلے کٹے تن سے مرا سر
غازی نے کہا شبیر گرسنہ ہیں یہ صفدر
حملوں سے اُلٹ دیں گے پرے فوجِ عدو کے
بھوکے ہیں یہ زخموں کے یہ پیاسے ہیں لہو کے

حضرت نے کہا خیر لڑو فوجِ ستم سے
معلوم ہے سب آج جدا ہووینگے ہم سے
دنیا سے نہ مطلب ہے نہ کچھ جاہ و حشم سے
کٹ جائے گا اپنا بھی گلا تیغِ دو دم سے
مقبول ہیں وہ جو مری امداد کریں گے
اِس جنگ کو بھی لوگ بہت یاد کریں گے

جس دم یہ سنی قبلۂ کونین کی گفتار
جانباز بڑھے فوج سے چلنے لگی تلوار
تھے پیاسوں کے حملے غضب حضرتِ قہار
چوٹی کے جواں بھاگ گئے پھینک کے ہتھیار
کون آنکھ ملا سکتا تھا شیروں سے عرب کے
جب کرتے تھے نعرے قدم اُٹھ جاتے تھے سب کے

لڑتا تھا غضب ایک کے بعد ایک وفادار
دن چڑھتا تھا یاں گرم تھا واں موت کا بازار
سر بیچتے تھے جنسِ شہادت کے طلبگار
بڑھ بڑھ کے خریدار پہ گرتا تھا خریدار
لیں پہلے ہم ایک ایک کی جاں پہ آ بنی تھی
عقبےٰ کا جو سودا تھا تو قیمت بھی کڑی تھی

آیا جو عزیزوں کے لیئے موت کا پیغام
اولادِ عقیل آچکی شبیر کے جب کام
تھا حشر بپا ندیاں بہتی تھیں لہو کی

لشکر میں تلاطم تھا غضب چلتی تھی تلوار
منہ دیکھ کے حضرت کا یہی کہتے تھے ہر بار
جی چاہیں جو مولا ہمیں مرنے کی رضا دیں

کچھ اُن سے کہا چاہتے تھے سرورِ ذیشاں
لاشے بھی ادھر آ چلے جب خوں میں غلطاں
شہ نے کہا یہ داغ تو دشوار ہے ہم پر

حضرت نے کہا ماں سے بھی ہو آئے ہو رخصت
ما یہ ہو تمھیں اُس کا تمھیں اُس کی بضاعت
چھوٹے نہیں ہم آپ ابھی پوچھ لیں سب سے

بچوں نے جو کی جوڑ کے ہاتھوں کو یہ تقریر
فرمایا چھوڑا تا ہے تمھیں بھی فلکِ پیر
وہ سیدۂ پاک نواسی ہے نبی کی

یہ سُن کے جھکے آخری تسلیم کو ذی جاہ
کی سوے فلک دیکھ کے شبیر نے اک آہ
ماں ڈیوڑھی سے چلائی کہ رخصت ہو مبارک

سلطانِ دو عالم نے تخلّع کیا واری
پروان چڑھے ختم ہوئیں شادیاں ساری
صدقے گئی نیزوں کو ہلاتے ہوئے جاؤ

فرزندوں نے جعفر کے بڑے رن میں کیئے نام
لڑنے کو گئے مسلمِ بیکس کے گل اندام
بچوں نے الٹ دی تھیں صفیں فوجِ عدو کی

بیتاب تھے یاں زینبِ ناشاد کے دلدار
ہم جائیں گے بعد اُن کے سوے لشکرِ کفار
ایسا نہ ہو قاسم کو حضور اذنِ وغا دیں

جو غل ہوا مارے گئے مسلم کے دل و جاں
پھر ہاتھوں کو جوڑا کہ ملے رخصتِ میداں
اُن دونوں نے سر رکھ دیئے ماموں کے قدم پر

کیا کہتے ہو لٹوا دوں میں ہمشیر کی دولت
چھوٹے نے یہ حضرت سے کہا تھام کے دامن
اماں تو رضا دے چکیں ہیں مرنے کی نسبت

اُن دونوں کا منہ دیکھ کے رونے لگے شبیرؑ
اچھا میں رضا مند ہوں جو مرضیٔ ہمشیر
فیاض کی ہمشیر ہے بیٹی ہے سخی کی

خورشید کے آگے مہِ نو بن گئے دو ماہ
دو شیر چلے گھوڑوں پہ چڑھ کر سوئے جنگاہ
سرکارِ شہنشاہ سے خلعت ہو مبارک

تم جاتے ہو یا جاتی ہے دولہ کی سواری
لو دور سے لیتی ہوں بلائیں میں تمھاری
تسکین مجھے پھر پھر کے دکھاتے ہوئے جاؤ

تسلیم کو گھوڑوں سے جھکے دونوں وہ گلرو
دل ماں کا یہ امڈا کہ ٹپکنے لگے آنسو
باگیں جو اٹھائیں تو فرس بن گئے آہو
پھر دیکھنے پائی نہ انھیں زینبِ خوشخو
میداں کی طرف یاس سے ماں رہ گئی تک کر
پنہاں ہوئے بدلی میں ستارے سے چمک کر

میداں میں عجب شان سے وہ شیرِ نر آئے
گویا کہ بہم حیدر و جعفر نظر آئے
غل پڑ گیا حضرت کی بہن کے پسر آئے
افلاک سے بالائے زمیں دو قمر آئے
یوسف سے فزوں حسن گراں مایہ ہے ان کا
یہ دھوپ بیاباں میں نہیں سایہ ہے ان کا

وہ چاند سے منہ اور وہ گیسوئے معنبر
وہ بدر سے رخسار زہے قدرتِ داور
سب شان یداللہ کی سب شوکتِ حیدر
چتون وہی غصہ وہی سانچے وہی تیور
یہ دبدبہ کس صاحبِ شمشیر نے دیکھا
دیکھا جسے معلوم ہوا شبیر نے دیکھا

تن تن کے جو شان اپنی دکھاتے تھے وہ ذی جاہ
چھاتی سے لگا لیتے تھے دونوں کو یداللہ
شمشاد سے قامت نہ دراز اور نہ کوتاہ
کھیلے ہوئے تیغوں میں فنِ جنگ سے آگاہ
ناخن میں دلیروں کے سب اندازِ وغا تھے
بچے تھے مگر بچۂ ضرغامِ خدا تھے

تھے حسن میں ان دونوں کے آئینہ رو ایک
پیشانی و ابرو و سر و صدر و گلو ایک
شان ایک شکوہ ایک جو رنگ ایک تو بو ایک
دل ایک جگر ایک جسد ایک لہو ایک
اور ان سا کوئی غرب سے تا شرق نہیں ہے
دو ٹکڑے ہیں اک سیب کے کچھ فرق نہیں ہے

پڑھنے لگے اشعارِ رجز جب وہ دلاور
اللہ ری فصاحت فصحا ہو گئے ششدر
ہر بیت تھی دشمن کے لیے تیغِ دو پیکر
ہر مصرعۂ برجستہ میں تھی تیزیِ خنجر
دے کون جواب ان کا کہ دم بند تھا سب کا
واں قافیہ تھا تنگ فصحاءِ عرب کا

اظہارِ نسب میں جو محمد کا لیا نام
سب پڑھنے لگے صلِ علیٰ صاحبِ اسلام
آگے جو بڑھے نامِ علی لے کے وہ گلفام
دل ہل گئے تھرائے لکا روم سے تا شام
جعفر کا جو کچھ ذکر کیا بعد علی کے
مجرے کو علم جھک گئے سب فوجِ شقی کے

آغاز تھا ذکرِ شرفِ حضرتِ شبیرؑ
اُس وقت بڑے بھائی سے کی چھوٹے نے تقریر
کہیئے تو جدا ہو کے ستمگاروں پہ جائیں
فرمایا بڑے بھائی نے ہنس کر نہیں بھائی
ہو جاتی ہے اک آن میں ہر صف کی صفائی
بازو ہوں قوی ہاتھ سے گر ہاتھ نہ چھوٹے
نانا کی طرح فوج پہ حملے کریں آؤ
ان چھوٹے سے ہاتھوں کا ہمیں زور دکھاؤ
ہم شیروں پہ رستم کا بھی منہ پڑ نہ سکے گا
چھوٹے نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو کہ بہتر
دو بجلیاں کوندیں کہ لرزنے لگا لشکر
برباد کیا روئیں سواروں کو دبا کے
ان چھوٹی سی تلواروں کے تھے کاٹ نرالے
مسل اپنی جارے تھے جو بے مثل سلالے
ناز اپنے ہنر پر تھا شجاعانِ عرب کو
موت آئی اُدھر پہنچے دونوں جدھر آئے
گھر سینے تک آئے تو کبھی تا کمر آئے
ہر پنجہ بجلی تھا ستمگاروں کے حق میں
اُٹھتی تھی نہ ڈر سے کسی خونخوار کی گردن
دو چار کے منہ کٹ گئے دو چار کی گردن
دو تیغے بجلی سے گزرتے تھے کمر سے

ڈنکے پہ اُدھر چوب لگی چلنے لگے تیر
تلوار علَم کیجیئے اب کس لیئے تاخیر
اسواروں پہ ہم آپ کمانداروں پہ جائیں
تم جان ہو دشوار ہے دم بھر کی جدائی
کر دیتے ہیں سرکوبی ایسی ہے لڑائی
سر تن سے اُتر جائے مگر ساتھ نہ چھوٹے
تلواروں میں تن تن کے چلو برچھیاں کھاؤ
ہم سینہ سپر تم پہ ہوں تم ہم کو بچاؤ
جب دو ہوئے اکدل تو کوئی لڑ نہ سکے گا
بس کھینچ لیئے تیغے دونوں نے برابر
نیزوں کے نیستاں میں در آئے دو غضنفر
رہوار بھی اسوار تھے گھوڑوں پہ ہوا کے
تھیں کہنیاں پہنچوں سے جدا ہاتھوں سے بھالے
تھے جائزہ اُن سب کا ہی دیکھنے والے
نیزوں کو قلم کر کے ندارد کیا سب کو
جب چل کے بڑھا پاؤں پہ کٹ کٹ کے سر آئے
خالی نہ پھرے جس پہ گئے خوں میں بھر آئے
ڈوبے ہوئے تھے دو مہِ نو خوں کی شفق میں
سر خود کا جھک جاتا تھا تلوار کی گردن
اسوار کا سر اُڑ گیا رہوار کی گردن
آدھے ہوئے جاتے تھے لعین جان کے ڈر سے

دو چھوٹی سی تیغوں سے قیامت نظر آئی
معصوموں کے ہاتھوں سے کرامت نظر آئی
سر کٹنے کی اعدا کے علامت نظر آئی
لوہے کی سپر بھی نہ سلامت نظر آئی
بے وجہ نہ پھر جاتے تھے منہ اہل جفا کے
دریا کے تھپیڑے تھے طمانچے تھے قضا کے

گردن سے بڑھے کاٹ کے پیکر نکل آئے
جوشن کو دکھاتے ہوئے جوہر نکل آئے
چار آئینہ میں تیر کے باہر نکل آئے
صابون سے دو تار برابر نکل آئے
محراب کے نیچے کسے جھکتے نہیں دیکھا
مچھلی کو بندھے پانی میں کتنے نہیں دیکھا

ہر غول میں غلطاں و تپاں تھے سر و پیکر
دستانے کہیں تھے کہیں ڈھالیں کہیں مغفر
جب نیچے ان دونوں کے اٹھتے تھے برابر
منہ خوف سے ڈھالوں میں چھپاتے تھے ستمگر
روکے انھیں طاقت یہ نہ تھی پیر و جواں کی
صورت نظر آنے لگی تیغ دو زباں کی

غارت تھی وہ صف جس سے وغا کر کے پھرے وہ
دو ہاتھ میں سو سو کو فنا کر کے پھرے وہ
شراروں کے سر تن سے جدا کر کے پھرے وہ
ہر غول میں اک حشر بپا کر کے پھرے وہ
غل تھا کہ پرے ٹوٹے ہوئے جم نہیں سکتے
سر کٹنے کی دہشت سے قدم تھم نہیں سکتے

گھوڑے تھے چھلاوہ کبھی یاں تھے کبھی واں تھے
پتلی میں تو پھرتے تھے پر آنکھوں سے نہاں تھے
یاں تھے جو سبک رو تو ادھر گرم عناں تھے
بجلی تھے کسی جا تو کہیں آب رواں تھے
ہو سکتی تھی بجلی سے یہ سرعت نہ ہرن سے
جھونکے تھے ہوا کے کہ نکل جاتے تھے سن سے

بے آب تھے دونوں سے پہ جاندار تھے گھوڑے
ہر مرتبہ اڑ جانے پہ طیار تھے گھوڑے
اس پار کبھی تھے کبھی اس پار تھے گھوڑے
نقطہ تھی وہ سب فوج کہ پرکار تھے گھوڑے
دل میں جو مڑ جاتے تھے ٹاپوں سے کچل کے
بڑھ سکتا نہ تھا ایک احاطہ سے اجل کے

تانے ہوئے سینوں کو جدھر جاتے تھے دونوں
تلواروں کی موجوں سے گزر جاتے تھے دونوں
ہر غول میں بے خوف و خطر جاتے تھے دونوں
سب ہٹتے تھے پسپا تو ٹھہر جاتے تھے دونوں
الٹی ہوئی صف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی
بھائی کی طرف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی

دم لیکے جو گھوڑوں کو اڑاتے تھے وہ جرار
اعدا کے رسالوں کو بھگاتے تھے وہ جرار

شیروں کی طرح فوج پہ جاتے تھے وہ جرار
دو کرتے تھے یکتا جسے پاتے تھے وہ جرار

شیروں نے جو مارا بھی تو ردو داروں کو مارا
جب آنکھ ملی چن کے نمو داروں کو مارا

جمعیت لشکر کو پریشاں کیا دم میں
جو فوج کی جاں تھے انہیں بیجاں کیا دم میں

تلواروں سے جنگل کو گلستاں کیا دم میں
سر کاٹ کے خونخواروں کو غلطاں کیا دم میں

بے دست تھے علموں کو جو بے دین لئے تھے
بچوں نے جوانوں سے نشاں چھین لئے تھے

دو لاکھ کو دونوں نے کیا تھا تہ و بالا
تیغ ایک کی چلتی تھی تو اک بھائی کا بھالا

اک بڑھ گیا گر ایک نے گھوڑے کو نکالا
دم اس نے لیا اس نے لڑائی کو سنبھالا

یک جا فرس تیز قدم ہو گئے دونوں
جب بھیڑ پڑی کچھ تو بہم ہو گئے دونوں

وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا
دم بھر میں پیادوں کو یہ پامال کر آیا

جب شیر سا پہونچا وہ ادھر یہ ادھر آیا
جاں آ گئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

بچ بچ کے نکلتے تھے جو نیزوں کے تلے سے
اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

کچھ بھائی سے بڑھکر جو دعا کرتا تھا بھائی
بچ جانے کی بھائی کے دعا کرتا تھا بھائی

حق بھائی کی الفت کا ادا کرتا تھا بھائی
ہر زور پہ بھائی کی ثنا کرتا تھا بھائی

تم سا نہیں صفدر کوئی واللہ برادر
کیا خوب لڑے سلمک اللہ برادر

کہتا تھا بڑے بھائی سے چھوٹا بصد آداب
بھائی ہیں بھگا دوں ابھی ان کو جو ملے آب

اب پیاس کی گرمی سے کلیجے کو نہیں تاب
سینے میں مرا دل نہیں آتش پہ ہے سیماب

ہم لوگ محق کیا نہیں اس آب رواں کے
تالو میں خلش ہوتی ہے کانٹوں سے زباں کے

کہتا تھا بڑا بھائی میں صدقے ترے گلفام
ہم خشک زبانوں کو بھلا پانی سے کیا کام

اب جلد اجل آئے تو کوثر کا پئیں جام
غش ہم کو بھی آ جائے گا پانی کا نہ لو نام

آنکھیں تو ستمگاروں کی تیغوں سے لڑی ہیں
چپکے رہو اماں در خیمہ پہ کھڑی ہیں

اِس نہر کا لینا تو کچھ ایسا نہیں مشکل   روکیں ہمیں کیا تاب لعینوں کی ہے کیا دل
پل باندھ لیں لاشوں کے ابھی ہم سرِ ساحل   بتلائیے پھر نہر کے لے لینے سے حاصل
دیکھو نہ اُدھر پیاس سے گو لاکھ تعب ہے   اماں ہمیں گر دودھ نہ بخشیں تو غضب ہے

اشک آنکھوں میں بھر کر کہا چھوٹے نے بہت خوب   ہر دم ہے رضامندیِ مادر ہمیں مطلوب
ایسے تو نہیں ہم کہ بزرگوں سے ہوں محجوب   منظور یہ تھا فخر کا نکلے کوئی اسلوب
دریا کو بھی دیکھیں گے نہ اب آنکھ اُٹھا کے   پینے بھی تو پہلے شہِ والا کو پلا کے

جعفر کے جو پوتے ہیں تو حیدر کے نواسے   کچھ ہم علی اکبر سے زیادہ نہیں پیاسے
یہ کہتے ہی لڑنے لگے پھر اہلِ جفا سے   فریاد کہ بچوں پہ گری فوج قضا سے
خوں بھر کا بہا منہ پہ تو گھبرا گئے دونوں   دو لاکھ کی تیغوں کے تلے آگئے دونوں

ڈوبے ہوئے تھے شام کے بادل میں دو ماہ   پردے سے کھڑی تکتی تھی زینب سوئے جنگاہ
عباس سے کہتے تھے تڑپ کر شہِ ذی جاہ   اب مجھ سے جدا ہوتے ہیں دو شیر مرے آہ
کیونکر متحمل ہو دلِ اس رنج و محن کا   گھر لٹتا ہے بھائی مری نادار بہن کا

اس بی بی کے فاقوں کے ہیں پالے ہوئے یہ لال   دولت ہے یہی اور یہی حشمت و اقبال
سات آٹھ برس کے ہیں ابھی کیا ہے سن و سال   سب ہاتھ ملیں گے جو یہ گل ہو گئے پامال
تازہ یہی دو پھول ہیں جعفر کے چمن میں   مر جائے گا باپ اُن کی خبر سُن کے وطن میں

رو کر دمِ رخصت وہ یہی کہتے تھے ہر بار   میں شاہ کا خادم ہوں یہ دونوں ہیں نمک خوار
آگاہ صعوبات سفر سے نہیں زنہار   اے دُخترِ زہرا مرے بیٹوں سے خبردار
میں رکھ نہیں سکتا ہوں کہ کام آئیں فدا ہیں   ابتو یہی دونوں مرے پیری کے عصا ہیں

شوہر کا تڑپنا اُسے کچھ بھی نہ رہا یاد   ہے یاد مری الفت میں لُٹی زینبِ ناشاد
یوں بھائی پہ صدقے کوئی کرتا نہیں اولاد   ہم دیکھتے ہیں اور بہن ہوتی ہے برباد
روئے گی تو ان بیٹوں کو سمجھائیں گے کیونکر   مُنہ زینبِ دلگیر کو دکھلائیں گے کیونکر

عباس نے کی عرض کلیجہ ہے دوپارا | ان کو تو کسی کی نہیں امداد گوارا
زخمی ہوئے نہ مجھ کو نہ اکبر کو پکارا | جائے یہ غلام آپ جو فرمائیں اشارا
حضرت کی قسم فوج کے میں سمجھاؤں گا ان کو | مچلیں گے تو گودی میں اٹھا لاؤں گا ان کو

حضرت نے کہا صاحب غیرت ہیں وہ دونوں | لخت جگر شاہ ولایت ہیں وہ دونوں
ضرغام نیستان شجاعت ہیں وہ دونوں | واللہ بڑے صاحب ہمت ہیں وہ دونوں
دو لاکھ تو کیا ہیں جو کروروں میں گھریں گے | بے جان دیئے وہ نہ پھرے ہیں نہ پھریں گے

بڑھنے لگے میداں کی طرف قاسم ذیجاہ | اکبر نے یہ کی عرض کہ میں جاتا ہوں یا شاہ
ہے دونوں کی فرقت کا مجھے صدمۂ جانکاہ | لاکھوں میں ہیں تنہا پھوپھی اماں کے پسر آہ
رہتی یہ کہیں گر نہ پڑیں برچھیاں کھا کر | میں ساتھ انھیں لے آتا ہوں عدا کو بھگا کر

گھبرا کے در خیمہ سے زینب یہ پکاری | سر ننگے میں نکلوں گی جو تم جاؤ گے واری
اولاد مجھے تم سے زیادہ نہیں پیاری | بتلاؤ کہ میں ان کی ہوں عاشق کہ تمہاری
میداں کی طرف قاسم بے پر بھی نہ جائیں | تلواروں میں عباس دلاور بھی نہ جائیں

زہرا کی قسم کچھ نہیں بیٹوں کا مجھے دھیان | بھائی پہ تصدق ہوں یہی تھا مجھے ارمان
وہ آئے تو وسواس سے دل ہوگا پریشان | صدقے کو نہیں پھیر کے لاتے ہیں میں قربان
خود روؤں گی پر شاہ کو غم کھانے نہ دوں گی | لاشے بھی اٹھانے کے لیے جانے نہ دوں گی

میداں میں ہے کیا اور بجز نیزہ و شمشیر | مر جاؤں گی زخمی ہوئے گر قاسم دلگیر
دل کس کا بھرے تم کو لگائے جو کوئی تیر | سمجھاؤ میں صدقے گئی کیوں روتے ہیں شبیر
باقی ہے اگر زیست تو پھر آئیں گے دونوں | غم کس لیے کیا ہوگا جو مر جائیں گے دونوں

شہزادوں کو کھوتے ہیں غلاموں کے لیے آہ | ہیں جوتی ہوں ہاتھ بس اب یہ ہیں نہ للہ
ہے شرم کی کیا وجہ ہیں لونڈی وہ شہنشاہ | تو ایسے ہوں بیٹے تو نثار شہ ذیجاہ
ممتاز ہو فرزند یہ ہے جو زہرا کے پسر کا | شان اس کی بڑھے فخر ہو جو جد و پدر کا

باپ اُن کا اگر ہوتا تو وہ سر نہ کٹاتا
زہرا کے کلیجے کے عوض برچھیاں کھاتا
بیٹوں کو یوہیں میری طرح نذر کو لاتا
اپنے کوئی محسن کو نہیں دل سے بھلاتا
جو پاس ہے جس کے وہ عطائے شہِ دیں ہے
کہدے مرے ماں جائے کا حق کس پہ نہیں ہے

بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جُدائی
سر پر مرے دُنیا میں سلامت رہیں بھائی
اک دولتِ اولاد لُٹائی تو لُٹائی
کیا لُٹ گیا وہ کونسی ایسی تھی کمائی
کیوں روؤں ہرے دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں

یہ ذکر ابھی تھا کہ ستمگار پکارے
لو شاہ کی ہمشیر کے بیٹے گئے مارے
ٹکڑے کیا معصوموں کو تلوار کے مارے
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے
پامالی کو ان دونوں کی اسوار بڑھے ہیں
بچوں کے سر اب کٹ کے نشانوں پہ چڑھے ہیں

یہ سنتے ہی تھرّانے لگے حضرتِ عباس
گھبرا کے اُٹھے خاک سے شبیر بصد یاس
سر کھولے ہوئے بی بیاں ڈیوڑھی کے جو تھیں پاس
سب نے کہا لو شہ کی بہن ہو گئی بے آس
ٹوٹا ہے فلک بنتِ شہنشاہِ نجف پر
زینب کو چلو لیکے بس اب ماتمی صف پر

ہے ہے کا جو اک شور ہوا رانڈوں میں برپا
زینب بھی ہٹی چھوڑ کے دروازے کا پردا
چلّائی ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا
بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پُرسا
ہائے ہائے نہ کرو صاحبو گھبرائیں گے شبیر
پھر کون ہے زینب کا جو مر جائیں گے شبیر

تم روتے ہو کس واسطے میں تو نہیں روتی
دامانِ مژہ بھی نہیں اشکوں سے بھگوتی
دل ہوتا جو ایسا ہی تو کیوں بیٹوں کو کھوتی
دولت کوئی ماں جائے سے پیاری نہیں ہوتی
قایم رہے اقبال محمد کے خلف کا
بس نام بھرے گھر میں نہ لو ماتمی صف کا

سر اپنے نہ کھولو کہ مجھے آتا ہے وسواس
اک شب کی دلھن گھر میں ہے اُس کا بھی نہیں پاس
شبیر تو سر پر ہیں جو بیٹوں سے ہوئی یاس
اکبر مری اُمید ہے قاسم ہے مری آس
اب خلد میں دادی کے قریں جائینگے دونوں
کیا پیٹنے رونے سے پلٹ آئیں گے دونوں

باتیں یہ کہیں سینے پہ سنبھلا نہ دلِ زار
واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہونچے شہِ ابرار
کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
رُخ زرد تھے اور خاک میں آلودہ تھے گیسو
تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلّور سے بازو
پھکنا تھا جگر آنکھ نہ کھل سکتی تھی غش سے

ٹکڑے ہوا سینے میں دلِ سبطِ پیمبرؐ
چھوٹے سے بڑے نے یہ کہا ہوش میں آ کر
مشتاق تھے تم سیّدِ ذی جاہ کو دیکھو
سُن کے یہ صدا غش سے جو چونکا وہ دلِ افگار
اکبر سے یہ کی عرض کہ ای شاہ کے دلدار
ہم دونوں غلاموں کا نہ غم کھائیو بھائی

یہ کہہ کے لگے ہچکیاں لینے جو وہ پیارے
سر پیٹ لیے ہاتھوں سے یہ شبیرؑ بچارے
پھر کی نہ کوئی بات سفر کر گئے دونوں
حضرت کے جو رونے کی صدا خیمے میں آئی
زینب نے کہا ہائے غضب روتے ہیں بھائی
لو چاک گریبان کیئے آتے ہیں شبیرؑ

تڑپا یہ کلیجہ کہ گری خاک پہ اک بار
یہاں کوئی ساعت کے ملے وہ جگر افگار
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے
جھک آئے تھے کٹ کٹ کے مہِ نو سے وہ ابرو
مہتاب سی وہ چھاتیاں اور تیر سہ پہلو
ہونٹوں پہ زبانیں نکل آئیں تھیں عطش سے

ہی ہی کہا اور لاشوں سے لپٹے شہِ صفدر
بالیں پہ حضور آئے ہیں چونکو تو برادر
مرتے ہوئے دیدارِ شہنشاہ کو دیکھو
دونوں نے رکھا سر قدمِ شاہ پہ اک بار
دشمن ہیں بہت قبلۂ عالم سے خبردار
سر پیٹیں جو امّاں اُنھیں سمجھائیو بھائی

بس موت کے آثار نمایاں ہوئے سارے
ماموں سے بچھڑتے ہو میں قربان تمھارے
آنسو تھے رواں آنکھوں سے اور مر گئے دونوں
رانڈوں نے اُدھر ماتمی صف گھر میں بچھائی
فضّہ یہ پکاری کہ دوہائی ہے دوہائی!!
معصوموں کے لاشوں کو لیئے آتے ہیں شبیرؑ

بیٹھی صفِ ماتم پہ اِدھر شاہ کی خواہر
لاشوں کو لیئے آئے جو گھر میں شہِ صفدر
فرمایا کہ لو لختِ جگر آئے تمھارے
سیدانیوں نے اُٹھ کے اُدھر کھول دیئے سر
زینب کے قریں بیٹھ گئے سر کو جُھکا کر
لو دودھ انھیں بخشو پسر آئے تمھارے

شبّیر نے جب دونوں کا زینب سے لیا نام
ہرچند کیا ضبط پہ تھرّا گیا اندام
دل تھام کے کہنے لگی وہ بیکس و ناکام
آپ اُن سے خفا ہیں یا شاہِ خوش اندام
فرمایا دل اُن دونوں سے واللہ خوشی ہے
میں اُن سے خوشی ہوں مرا اللہ خوشی ہے

عاشق تھے مرے اور مرے غمخوار تھے دونوں
بچّے تھے مگر صادق الاقرار تھے دونوں
اُس وقت میں ماموں کے مددگار تھے دونوں
حیدر کی طرح صفدر و جرّار تھے دونوں
موت آئے کہ آغوش سے دل اب بھر گیا زینب
دونوں یہ نہیں مر گئے میں مر گیا زینب

افسوس کہ ان دونوں کی دیکھی نہ جوانی
میں کیا کہوں کیا صاحبِ ہمت تھے یہ جانی
ہوتی ہے بہت زخمیوں کو تشنہ دہانی
پر ہم سے دمِ مرگ بھی مانگا نہیں پانی
سمجھے کہ گرفتارِ ستم آج ہے ماموں
وہ جانتے تھے پانی کو محتاج ہے ماموں

ہمشیر سے یہ کہہ کے چلے روتے شہِ ابرار
بس آ گیا فرزندوں کی ہمت پہ اُسے پیار
تھرّائی ہوئی خاک سے اُٹھی وہ دل افگار
پاس آن کے لاشوں کی بلائیں لیں کئی بار
کانپے جو قدم گر کے سنبھلنے لگی زینب
منہ خون بھرے چہروں سے ملنے لگی زینب

دیکھا جو لہو بچّوں کا چھاتی اُمنڈ آئی
نزدیک تھا مر جائے ید اللہ کی جائی
پر فاطمہ کے صبر کی شان اُس نے دکھائی
سب سے یہ کہا نیک لگی میری کمائی
بچّے مرے قرباں ہوئے احسان خدا کا
ای بیبیو صدقہ ہے یہ شاہِ شہدا کا

رو کر شہِ والا نے کہا صدقے میں تم پر
دم بھر ابھی رو لو کہ یہ مہمان ہیں خواہر
بانو نے اشارا کیا ای سبطِ پیمبر
قربان گئی آپ بس اب جائیے باہر
گر ضبط اسی طرح سے فرمائیں گی زینب
یہ ماتمِ اولاد ہے مر جائیں گی زینب

روتے ہوئے خیمے سے جو ڈیوڑھی پہ گئے شاہ
فرزندوں کو چلّانے لگی زینبِ ذی جاہ
یہ نیند ہے کیسی کہ خبر تم کو نہیں آہ
صدقے گئی جاؤ شہِ کونین کے ہمراہ
زخمی ہوئے شبیر تو جان اپنی میں دوں گی
اچھا میں بھی دونوں سے ماں جائے کو لوں گی

لو نیمچے کاندھوں پہ دھرو ای مرے پیارو
تھمتے ہوئے شبیر کے ہمراہ سدھارو
گو پیاسے ہو دو دو دن کے پہ ہمت کو نہ ہارو
یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے تو اُتارو
اُٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سوتے
اس طرح تو جاگے ہوئے دیکھا نہیں سوتے

سوتا ہے لڑائی کے دن ایسا کوئی غافل
بچّو تمھیں کیا سن کے کہیں گے شہِ عادل
دیکھو کہ تڑپتی ہے یہ ماں صورتِ بسمل
سُلجھاؤ یہ زُلفیں کہ اُلجھتا ہے مرا دل
کیا غش میں ہو یہ سونے کا نقشا نہیں ہوتا
ایسا تو کوئی نیند کا ماتا نہیں ہوتا

پھر دونوں کے سر زانو پہ رکھ کر یہ پکاری
لو اب ہوا معلوم کہ تم مر گئے واری
بے ہوشی میں کچھ مجھ کو خبر تھی نہ تمھاری
اب آنکھوں سے چھپ جائیں گی یہ صورتیں ساری
دُنیا کو نہ دیکھا کہ اجل آ گئی بچّو
ہے ہے یہ تمھیں کس کی نظر کھا گئی بچّو

بچّو تمھیں قسمت نے نہ پروان چڑھایا
حسرت رہی ماں نے تمھیں دولہا نہ بنایا
پیدا ہوئے جس دن سے کبھی چین نہ پایا
دیکھی نہ جوانی کہ پیامِ اجل آیا
ہے ہے چمنِ دہر میں پھولے نہ پھلے تم
جب فصلِ بہاری کے دن آئے تو چلے تم

میں روتی تھی در پر مجھے سمجھا نہ گئے تم
دروازے پہ دم بھر کے لیے آ نہ گئے تم
ہے ہے دو دلھنیں بھی مجھے دکھلا نہ گئے تم
پیاسے تھے مگر جانبِ دریا نہ گئے تم
جیتی ہے وہ ماں جس کے گزر جانے کے دن تھے
یہ بیاہ کی راتیں تھیں کہ مر جانے کے دن تھے

خاموش انیس اب کہ تڑپتا ہے دلِ زار
کافی ہے رُلانے کو تری درد کی گفتار
اس جنس کا گر آج نہیں کوئی خریدار
فیاض ہے لیکن شہِ مظلوم کی سرکار
افسردہ نہ ہو غنچۂ اُمید کھلے گا
کھل جائیں گی آنکھیں وہ صلہ تجھ کو ملے گا

مرثیہ (۹)

جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج
کمریں وغا پہ باندھے ہے مشکل کشا کی فوج
صف بستہ آگے پیچھے ہے سب پیشوا کی فوج
جنّت کا رُخ کیے ہے شہِ کربلا کی فوج
ڈیوڑھی پہ جن و انس و ملک کا ہجوم ہے
خیمے سے اب علم کے نکلنے کی دھوم ہے

حاضر ہیں صبح سے درِ دولت پہ جاں نثار
اک سو ٹہل رہے ہیں رفیقانِ ذی وقار
پیدل کھڑے ہیں سامنے باندھے ہوئے قطار
بیٹھے ہیں زین پوش بچھائے ہوئے سوار
شوقِ زیارتِ علمِ فوجِ شاہ ہے
ایک اک کی جانبِ درِ دولت نگاہ ہے

رُخ ہے کسی کا جوشِ شجاعت سے لالہ رنگ
کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاحِ جنگ
جھک جھک کے چست کستا ہے کوئی فرس کا تنگ
چلّے سے جوڑتا ہے کوئی فاقہ کش خدنگ
بھالا سنبھالتا ہے کوئی جھوم جھوم کے
تکتا ہے کوئی تیغ کے قبضے کو چوم کے

ملتا ہے ہنس کے ایک جواں ایک سے گلے
ساری خوشی یہ ہے کہ بس اب خلد میں چلے
چہرے وہ سرخ سرخ وہ جرأت کے ولولے
حق سے یہ التجا کہ نہ رن سے قدم ٹلے
مر کر بھی دل میں اُلفتِ حیدر کی بو رہے
پانی ہمیں ملے نہ ملے آبرو رہے

حاضر ہے ذوالجناحِ شہنشاہِ بحر و بر
کلغی ہے یا کہ خوشۂ پروین قریب سر
خادم چونر لیے ہیں کسی اِدھر اُدھر
پیچھے ہیں بادپائے عزیزانِ نامور
گھوڑے بلند سرورِ ذی شاں کے ساتھ ہیں
پریوں کے غول تختِ سلیماں کے ساتھ ہیں

ڈیوڑھی پہ خادمانِ محل کی ہے یہ پکار
آتے ہیں اب حضور خبردار! ہوشیار!
خلعت پہن رہے ہیں علمدارِ نامدار
نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا

یہ سُن کے شاد ہو گئی فوجِ حسین سب
بولے حبیب ابنِ مظاہر کہ شکرِ ربّ
سر دے کے لے بہشت کی جس کو تلاش ہو

کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں
بازوئے شاہِ دیں جسدِ مرتضےٰ کے جاں
باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں ہیں

اُلفت وہی حیا وہی مہر و وفا وہی
بخشش وہی کرم وہی جود و سخا وہی
گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے

بے مثل سب ہیں قبلۂ عالم کے رشتہ دار
جیسے نبی کی فوج میں تھے شیرِ کردگار
سب فوج سے بڑھا ہوا رتبہ اسی کا ہے

باہر تو اشتیاقِ علم میں ہے سب سپاہ
سب خویش و اقربا ہیں مسلّح قریبِ شاہ
رُتبے کو اوج نخلِ ترقی ہرا و بر

شیرِ خدا کا خودِ مبارک ہے زیبِ سر
مہتاب ہے کہ ابر سے نکلا ہوا قمر
ڈورے جو سُرخ سُرخ ہیں چشمِ سیاہ میں

اِس کی خوشی جو تھی کہ ملا رایتِ رسول
قد سروِ باغِ حسن نہ پستی فزوں نہ طول
یہ شور تھا نمک کا جہاں کے ورق میں

آئے رفیق سب درِ دولت پہ باادب
ہاں سرفروشو جنگ و جدل کا مزا ہے اب
دیکھیں علم کے سائے میں کس کس کے لاش ہو

قابل ہی کے دوشِ مبارک کے ہو نشاں
پیروں کا سرپرست جوانوں کا قدرداں
سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علی میں ہیں

طاعت وہی وقار وہی اتقا وہی
جرات وہی جدال وہی دبدبا وہی
خود تھا علیؑ کا قول کہ عباسؑ شیر ہے

لیکن خدا نے اس کو دیا ہے عجب وقار
ویسا ہی بے عدیل ہے یہ شہ کا جاں نثار
شیرِ خدا کے بعد یہ حصّہ اسی کا ہے

خیمے میں باندھتے ہیں کمر شاہِ دیں پناہ
ہیں سامنے علم لیئے عباسِ عرش جاہ
گویا علی کھڑے ہیں مہیّا جہاد پر

کلغی ہمائے اوجِ سعادت کے جس میں پر
ابرو ہیں ذوالفقارِ یداللہِ نامور
پھرتی ہیں خون بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں

رخسار تھے کھلے ہوئے دو ارغواں کے پھول
وہ لب کہ جس سے روح کو ہو تازگی حصول
حوریں بھی ہونٹ چاٹتی تھیں اشتیاق میں

دیتے تھے تہنیت جو عزیزانِ پُر جگر
عباس مسکرا کے جھکاتے تھے اپنا سر
فرطِ طرب سے چاند سا چہرہ تھا جلوہ گر
رُخ کی ضیا اِدھر تھی علم کی ضیا اُدھر
وہ آسمانِ حشم تو یہ کیواں جناب ہیں
غل تھا کہ ایک صبح میں دو آفتاب ہیں

زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھیں بار بار
منصب مبارک اے شہِ مرداں کے یادگار
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ ذی وقار
مجھ کو سمجھیے عون و محمدؐ کا جاں نثار
ان کی طرف سے مہتمِ بند و بست ہوں
مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیش دست ہوں

فرماتی تھیں یہ دخترِ خاتونِ کائنات
تم دونو کے بزرگ ہو یہ کونسی ہے بات
اُس وقت ہے خوشی جو اس آفت سے ہو نجات
سمجھوں کہ بیکسوں کو دوبارہ ملی حیات
گھیرا ہے بے گناہ شہِ مشرقین کو
تم سب شریک ہو کے بچا لو حسین کو

سب خوش تھے خیمۂ شہِ ذی جاہ میں مگر
چیں بر جبیں تھے زینبِ ناشاد کے پسر
نہ جانبِ علم تھی نہ ماں کی طرف نظر
آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
اِس طرح تھا عرق رُخِ پُر آب و تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

پھر کر اُدھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر
سمجھیں علم نہ ملنے سے بیدل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر
آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس تھے
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اُداس تھے

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہِ حق شناس
تم نے نہ زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس
دولھا سے بن کے جاؤ امامِ اُمم کے پاس
کچھ ملگجے ہیں آؤ میں کپڑے اُتار دوں
سُرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

شب سے تو صبح تک یہ دعا تھی ہر ایک پل
تیغوں میں پہلے ہم کو کرے سرخرو اجل
اب کیا ہوا یہ کونسا غصّہ کا ہے محل
آنکھوں میں اشک رُخ پہ عرق ابروؤں پہ بل
وہ خوش مزاجیاں نہ وہ باتوں کے طور ہیں
اس وقت دیکھتی ہوں کہ تیور ہی اور ہیں

ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم و جور
پیارو ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور
نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور
اب مشورے ہیں اور تصوّر ہیں اور اور
وہ دل نہیں وہ آنکھ نہیں وہ نظر نہیں
اوروں کا ذکر کیا تمھیں میری خبر نہیں

اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں
ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں
مجھ سے سوا ہے کون تمھارا مزاج داں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصّہ کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں

پروا ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال
دونوں نے عرض کی کہ نہیں کچھ نہیں ملال
ہاں ہم کو آج بھول گئے شاہِ خوش خصال
اوروں کی پرورش ہے ہمارا نہیں خیال
کیا ورثہ دارِ جعفرِ طیار ہم نہ تھے
اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا
اب اُس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا
دیکھو سنیں نہ زوجۂ عباس باوفا
اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلے کی جا
غبطہ نہ اس میں چاہیئے جو امرِ خیر ہو
واری وہ کون غیر ہے تم کون غیر ہو

اک دو پہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال
تم ہو گے تا بہ عصر نہ عباس خوش خصال
اس دن کی دے گئے ہیں خبر شبیرِ ذوالجلال
مجھ کو نہیں یقین کہ بچے فاطمہ کا لال
بیٹا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے
رہ جاؤں گی میں قید میں جانے کے واسطے

لو اپنے دودھ کی تمھیں دیتی ہوں میں قسم
اب کچھ کہو گے منہ سے تو ہوگا مجھے بھی غم
سنتے تھے تم جو کہتے تھے عباسِ ذی حشم
دو جا کے اُن کو تہنیتِ عہدۂ علم
صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

کہنے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال
کہتی ہوں صاف میں مجھے ہوگا بہت ملال
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال
ہم باوفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
دیجے ہمیں سزا جو بل ابرو پہ پھر پڑیں
کہیئے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں

زینبؑ بلائیں لیکے یہ بولیں کہ میں نثار
دے ایسے بیٹے سب کو زمانے میں کردگار
لازم خوشی ہے جو جسے عہدہ سپرد ہو
پہنائے پیار سے اُنھیں پھر فاخرہ لباس
جب اُن کو لیکے آئیں امامِ اُمم کے پاس
دو چاند ہیں یہ خانۂ شیرِ الٰہ میں

نکلے نہیں ہیں گھر سے ابھی تک یہ گلبدن
فوجوں سے گو بجا ہے یہ سب کربلا کا بن
لشکر سے تیر کیں مری جانب جو آئیں گے
بنتِ علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر
اِک جان ہے بس اور یہ دو پارۂ جگر
پالا ہو جس نے اُس کو نہ کچھ حق ادا کروں

پھر عرض کی کہ اے خلفِ شاہِ قلعہ گیر
دونوں نے بنتِ شیرِ خدا کا پیا ہے شیر
تلواریں چمکیں خون کے دریا چڑھے رہیں
حضرت کے آگے بات کی ان کو نہیں مجال
دادا کا رُعب و دبدبہ و شوکت و جلال
کیجے نظر سِنوں پہ تو بے شک صغیر ہیں

روتی تھی ہیں جو آج کی شب کو بدردو یاس
آکر کہا کہ آپ کو اتنا ہے کیوں ہراس
کل شیر سب ہیں اور یہ دشتِ مصاف ہے
دونو ہو تم سعید و رشید و وفا شعار
ذی قدر و ذی شعور و سخن فہم و ذی وقار
چھوٹوں کے تم بزرگ بزرگوں کے خرد ہو

ہتھیار جب لگائے تو روئیں بدردو یاس
بولے گلے لگا کے اُنھیں شاہِ حق شناس
زینب انھیں بھی بھیجو گی کیا قتل گاہ میں
تلوار اگر چلی تو پڑے گا غضب کا رن
طالب ہیں ایک جان کے دو لاکھ تیغ زن
میں کس طرح جیوں گا جو یہ زخم کھائیں گے

رکھتی نہیں کچھ اور میں یا شاہِ بحر و بر
مایہ مری یہی یہی دولت یہی ہے زر
ان کو بچاؤں گر تو کسے پھر فدا کروں
اس کا نہ کیجے دھیان کہ یہ سن میں ہیں صغیر
سینہ سپر کریں گے جس دم چلیں گے تیر
اُمید ہے کہ سب سے یہ آگے بڑھے رہیں

مخفی حضور پر ہے ارادوں کا ان کے حال
تیغ و سپر میں ہے شہِ مرداں کی چال ڈھال
ہمّت میں نوجواں ہیں متانت میں پیر ہیں
دونوں دلاسا دینے کو آ بیٹھے میرے پاس
آسان کچھ ہے قتلِ شہنشاہِ حق شناس
سُن لیجیے گا آپ کہ میدان صاف ہے

حضرت کے ساتھ فضل خدا سے ہیں وہ دلیر
تھرا کے بھاگ جاتا ہے نعروں سے جن کے شیر
تا کوفہ کیا عجب ہے جو ہوں زخمیوں کے ڈھیر
کر دیں گے رستموں کو زبردستیوں سے زیر
بچے ہیں شیر کے جنھیں بچہ سمجھتی ہیں
کیا آپ ماموں جان کو تنہا سمجھتی ہیں

بیکا ہو دشمنوں کا شہِ دیں کے بال اگر
پھر کاٹ ڈالیئے گا تنوں سے ہمارے سر
حضرت تک آسکے کوئی کیا جان کیا جگر
آنکھیں نکال لیں جو کرے غیظ سے نظر
پوتے شجاع کے ہیں نواسے دلیر کے
ساعد ہیں یہ علی کے یہ بازو ہیں شیر کے

لاکھوں ہیں وہ سحاب نہیں اس آن بان کے
حافظ ہیں سب یہ مصحفِ ناطق کی جان کے
حملے کریں گے رن میں جو سینوں کو تان کے
مل جائیں گے زمیں سے طبق آسمان کے
سو سو کی جان لیں گے ہر اک جان کھوئے گا
ہم سب کے بعد ہوگا جو قسمت میں ہوئے گا

خالی نہ جائیں گے یہ شجاعت کے ولولے
رکھ دینگے دوڑ دوڑ کے تیغوں پہ خود گلے
ہم بھی ہیں بنتِ فاطمہ کے شیر کے پلے
مرتے ہیں شوق میں کہیں تلوار تو چلے
چمکا کے پنجوں کو جو کھیلیں گے جان پر
لاشے زمیں پہ ہوں گے لہو آسمان پر

دونوں نے اس طرح یہ فصاحت کیا بیاں
مجھ کو یقینِ فتح ہوا یا شہِ زماں
گویا دوبارہ آگئی میرے بدن میں جاں
خوش ہو کے بولی میں کہ تصدق ہو تم پہ ماں
محسن ہو آج جو میرے بھائی کی پچ کرے
اس منہ کے میں نثار خدا اس کو سچ کرے

ہر بار دیکھتی ہوں میں ان کی طرف بغور
دو تین دن سے اور ہیں کچھ تیوروں کے طور
کہتے ہیں ناگوار ہیں اعدا کے ظلم و جور
جب چین ہو مٹے جو یزیدِ لعیں کا دور
سکہ پڑے حسین علیہ السلام کا
خطبہ ہو منبروں پہ شہیدوں کے نام کا

نو دس برس کے ہیں ابھی بچوں کے کیا ہیں سن
راتیں غفلتوں کی ہیں اور کھیلنے کے دن
یہ تو وہ معرکہ ہے کہ ہیں مضطرب مُسن
لیکن کنیز ان کی طرف سے ہے مطمئن
گھوڑے اڑا اڑا کے جو فوجوں پہ جائیں گے
اتنا میں جانتی ہوں کہ جیتے نہ آئیں گے

پھر رو کے حسین چھوٹے کی باتیں سنیں حضور
کہتا ہے بچے کو ہٹا کر وہ ذی شعور
نامرد ہے جو آج کرے جنگ میں قصور
اس کو نہ قصرِ خلد ملے اور نہ وصلِ حور
بس چند روز رہ چکے دنیائے زشت میں
کل پہلے داخلہ ہے ہمارا بہشت میں

ہر بار اُلٹ کے کرتے کی ننھی سی آستیں
کہتا ہے کیا لڑیں گے دلیروں سے اہلِ کیں
ہیں مرتضیٰ علی کے پسر شیرِ خشمگیں
جانیں ہزار ہوں تو نثارِ امامِ دیں
کل بچے ہیں اور عدو کی سپاہ ہے
روتی ہیں والدہ ہمیں دُنیا سیاہ ہے

ہنس ہنس کے مجھ سے کرتے تھے دونوں ابھی بیاں
ہم کو حضور نے نہ دیا فوج کا نشاں
میں نے کہا قوی ہوئے کچھ دستِ ناتواں
بولے کہ خیر آئے تو ہوگا یہ امتحاں
اب تو غلام قبلۂ عالم کے ساتھ ہیں
کوفے کا ڈر ہے اور یہ کمزور ہاتھ ہیں

فرمایا شہ نے ان کی شجاعت میں فرق کیا
ہیں ورثہ دارِ شیرِ الٰہی یہ باوفا
اچھا ہمارے ساتھ چلے ایک دلرُبا
زینب تمہارے پاس رہے ایک مہ لقا
تم کس طرح جیو گی جو دونوں سے یاس ہو
گھر لُٹتے وقت ایک تو فرزند پاس ہو

زینب نے عرض کی کہ مجھے ہے یہ آرزو
دونوں نثار آپ پہ ہوں میرے ماہرو
بچ جائے جان آپ کی یا شاہِ نیکخو
میں طالبِ ثواب یہ خواہانِ آبرو
بہتر ہے دونوں بیٹوں کی گر سوگوار ہوں
میں بھی جنابِ فاطمہ کی ورثہ دار ہوں

طفلی سے آج تک نہ ہوئے یہ کبھی جُدا
کھیلے تو ایک گھر میں پلے ہیں تو ایک جا
چرچا ہے سارے کنبے میں دونوں کے پیار کا
بیشک ہیں ایک جان دو قالب یہ لقا
تڑپے ملاپ کو جو خفا ہو کے بھائی سے
وہ کس طرح جیئے گا جدا ہو کے بھائی سے

دم بھر مفارقت ہو تو آنسو بہاتے ہیں
روتے ہیں اس طرح کہ مجھے بھی رلاتے ہیں
دونوں جب ایک جا ہوں تو کھانے کو کھاتے ہیں
مکتب میں ساتھ جاتے ہیں اور ساتھ آتے ہیں
بھائی جو زخمِ نیزہ و شمشیر کھائے گا
انصاف آپ کیجیے یہ مر نہ جائے گا

چھوٹا تنک مزاج ہے یا شاہِ بحر و بر
نو دس برس جہان میں ہوئے جس طرح بسر
ہر جا بڑے کے ہاتھ میں چھوٹے کا ہاتھ ہو

باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہِ نامدار
ایک اُن کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہو نثار
اِن پر ہمارا حق ہے تو ہم پر حق آپ کا

کرتے تھے مجھ سے وقتِ سفر رو کے یہ بیاں
بچوں کا ساتھ اور سفر خوف الاماں
وقت آپڑے تو پاس ہمارا نہ کیجیو

گردن جھکا کے کہنے لگے شاہِ خاص و عام
مٹتی ہے نسلِ جعفرِ طیارِ نیک نام
للّٰلہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجیے

چُپ ہو گئے بہن سے بہت خوب کہکے شاہ
بڑھ آئی ہے اُدھر سے بہت شام کی سپاہ
حملوں سے فوجِ شام کے جی چھوٹ جائیں گے

زینب کے نورِ عین بڑھے جب بصد حشم
ماں کا اشارا تھا کہ زہے شفقت و کرم
کچھ حد ہے اس بزرگی و جاہ و جلال کی

لیکر بلائیں بھائی کی بولی وہ سوگوار
پہلے پہل نکلتے ہیں گھر سے یہ گلعذار
صدمے سے جان اب نہیں نے ہرا کی جاتی ہیں

سُن لے تو جان دیدے گلا اپنا کاٹ کر
باہم یونہیں جہان سے کریں آخری سفر
میں چاہتی ہوں دونوں کا مرنا بھی ساتھ ہو

کرتا قدم پہ سر کو تصدق یہ افتخار
میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جان نثار
یہ بھی تو کچھ ادا کریں حق اپنے باپ کا

محروم اس شرف سے ہوں میں زار و ناتواں
مجبور دشمنوں میں چلے ہیں شہِ زماں
بیٹوں کو تم حسین سے پیارا نہ کیجیو

تم کو جہان میں پھر نہ ملیں گے یہ تشنہ کام
چھاتی سے سر لگا کے وہ بولی کہ یا امام
ہدیہ فقیر کا ہے اسے رد نہ کیجیے

قاسم نے کی یہ عرض کہ یا شاہِ دیں پناہ
فرمایا آپ نے کہ نگہبان ہے اِلٰہ
جب ہم بڑھے تو مورچے سب ٹوٹ جائیں گے

کھولا سروں پہ حضرتِ عباس نے علم
ہاتھوں کو جوڑ جلد جھکو چومنے قدم
دیکھیں نوازشیں شہِ مرداں کے لال کی

اپنے غلام سمجھو انھیں تم پہ ہیں نثار
ان کی مدد ضرور ہے ہنگامِ کارزار
دھڑکا یہ ہے کہ دیکھیے کیا ہو لڑائی میں

سیراب اُدھر ہیں سب انھیں سولہ پہر کی پیاس
کیا ہو جو نہر دیکھ کے ہو جائیں بے حواس
پستی پہ جب ہو شیر تو بیجا ہے پھر ہراس
رہنا نہ دور ان سے اگر ہے بہن کا پاس
بچّے کہاں یہ اور وہ دَل فوجِ شام کا
بھیّا مجھے ہے دھیان بزرگوں کے نام کا

زندوں میں آویں ہیں جو یہ مقتل سے مر کے آئیں
کیسے ہیں سرخرو ہوں اگر خوں میں بھر کے آئیں
اُلٹیں بہادروں کی صفیں نام کر کے آئیں
خیمے میں آئیں تب تو جہاں سے گزر کے آئیں
بھیّا مجھے قسم ہے جنابِ امیر کی
پانی پیا تو بوند نہ بخشوں گی شیر کی

عبّاس نے کہا یہ نہ فرمائیے حضور
ایسے یہ شیر ہیں کہ کریں جنگ میں قصور
بچّے کسی نے دیکھے ہیں اِس طرح کے غیور
کوفے کو شام پر جو اُلٹ دیں تو کیا ہے دور
بچپن میں کافروں سے خدا کے ولی لڑے
یہ یوں لڑیں گے جیسے اُحد میں علی لڑے

ہے سب عرب میں لیث سے غالب انھیں کا جد
مثلِ علی وغا میں کریں گے یہ جدّ و کد
جس دم رجز پڑھینگے یہ صفدرِ رشید و مد
غل ہوگا گو بچّے ہیں ترائی میں دو اسد
یہ پارۂ جگر ہیں علی سے دلیر کے
سب خصلتیں ہیں شیر کی بچے ہیں شیر کے

کچھ فکر کی جگہ نہ تردّد کا ہے مقام
سُن لیجیے گا آج یہ جیسے کرینگے کام
ان سے کبھی جدا نہیں رہنے کا یہ غلام
میں عبدِ سرفروش ہوں ای خواہرِ امام
بندے کا حفظ خالقِ عالم کے ہاتھ ہے
روتی ہیں آپ کیوں مری جاں ان کے ساتھ ہے

یہ سُن کے مضطرب جو پھری وہ جگر فگار
دیکھا بڑھے ہیں جانبِ در شاہِ نامدار
پھیلا کے ہاتھ کہنے لگے شاہِ ذی وقار
زینب گلے سے بھائی کے لپٹو پھر ایک بار
جو حالِ دل ہے کہہ نہیں سکتا زباں سے میں
چھٹتی نہیں تم آج بچھڑتا ہوں ماں سے میں

بھائی بہن کے درد کی باتیں لکھوں اگر
بہہ جائے آب ہو کے جو پتھر کا ہو جگر
چھاتی سے سر لگائے ہوئے تھی وہ نوحہ گر
رکھے ہوئے تھے دوش پہ سر شاہِ بحر و بر
غم سے جگر لہو تھا شہِ مشرقین کا
سیدانیوں میں شور تھا ہائے حسین کا

بنتِ علی کے پیچھے تھی سیدانیوں کی صف — غل تھا مدد کو آئیے اب یا شہِ نجف
لڑیاں بھیں چار ایک سی اشکوں کی دو طرف — شہ کہتے تھے بہن نہ کرو جان کو تلف
غربت میں اور کوئی نہ یاور نہ عون ہے — تم مر گئیں تو پھر مرے بچوں کا کون ہے

فرما کے یہ بڑھا پسرِ ختمِ مرسلیں — ماتم کی صف پہ بیبیاں زینب کو لے گئیں
مشکل تھا ضبط غش ہوئی وہ بیکس و حزیں — خیمے سے نکلے روتے ہوئے بادشاہِ دیں
دامن علم کا کھول کے عباس رک گئے — صف باندھ کر سلام کو مجرائی جھک گئے

دیکھا جو نورِ چہرۂ سردارِ خاص و عام — پڑھنے لگے درود جوانانِ تشنہ کام
سر کو جھکا جھکا کے جھکے جب پئے سلام — جو ہمسر تھا سر جھکانے میں وہ پا گئے امام
یعنی غلام منکسر و خاکسار ہیں — اس پائے عرش قدر پہ یہ سر نثار ہیں

سب فوج کو سلام کا جب دے چکے جواب — بس جانبِ فرس متوجہ ہوئے جناب
روح امیں نے دی یہ صدا تھام کر رکاب — بسم اللہ اے خدیوِ زماں مالکِ رقاب
نورِ محمدی رخِ انور کی ضو میں ہے — شوکت تری رکاب میں نصرت جلو میں ہے

اس شان سے فرس پہ شہِ انس و جن چڑھے — جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے
بہرِ جہادِ راہِ خدا مطمئن چڑھے — گھوڑوں پہ نوجوانوں سے پہلے مسن چڑھے
سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں — پیدل مگر تھے ابنِ مظاہر رکاب میں

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دم بدم — گردن میں کچھ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
ہر نوجواں سے تھا یہ اشارا بصد حشم — یعنی جہاں سے جائیں گے سیدھے جناں میں ہم
بر میں زرہ کمان کیانی تھی دوش پر — قبضے پہ ایک ہاتھ تھا اک زین پوش پر

ابرو جھکے جو پڑتے تھے پلکوں پہ بار بار — رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار
آنکھوں سے شیرِ نر کے جلالت تھی آشکار — گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار
جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے — رعشہ وداع ہو گیا ہاتوں کو چوم کے

اک شور تھا کہ عود کیا پھر شباب نے — یا کی دُعا حبیب کے حق میں جناب نے
ریش سفید رُخ پہ سیہ کی خضاب نے — پائی یہ آب و تاب کہاں آفتاب نے
لبریز نور سینۂ بے کینہ ہو گیا — یوں جھریاں مٹیں کہ تن آئینہ ہو گیا

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہِ نامدار — یہ کس لیئے پیادہ روی اے نحیف و زار
میں بھی اُتر پڑوں گا نہ ہو گے اگر سوار — کرتے تھے عرض یہ کہ توانا ہے جاں نثار
ہر چند پیرِ خستہ دل و ناتواں شدم — ہر گہ نظر بروے تو کردم جواں شدم

فرمایا تم کو دیتا ہوں اُس سر کی میں قسم — جو بعدِ عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم
میں بھی نکالتا ہوں رکابوں سے اب قدم — اچھا تمھارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم
پہونچو جناں میں بحرِ مصیبت کو جھیل کے — ہم تم تو ایک گھر میں پلے ساتھ کھیل کے

وہ لوٹنا بھی خاک کا اب تک ہے یادگار — تم پر بھی گرد تھی مری زلفوں پہ بھی غبار
اُس روز تم پہ مجھ سے سوا تھا نبی کا پیار — فرماتے تھے یہ ہے مرے پیارے کا دوستدار
شبیر کے حبیب کو پہچانتا ہوں میں — لوٹے گا یہ لہو میں یونہیں جانتا ہوں میں

رو کر کہا حبیب نے آخر ہوا وہ دور — اب اُن کا دَور ہے کہ جو ہیں حاکمانِ جور
یہ وقت اور کچھ ہے وہ ہنگام تھا کچھ اور — مولا کبھی رہا نہیں دُنیا کا ایک طور
گردش نئی فلک کی نئے انقلاب ہیں — کوثر ہے جن کا آج وہ محتاجِ آب ہیں

یہ عرض کر کے روئے حبیبِ وفا شعار — جُھک کر کہا یہ پیرِ غلام آپ پر نثار
جب تک سمند پر وہ دلاور ہوا سوار — روکے رہے لگامِ فرس شاہِ نامدار
ہر دوست پر پدر سے زیادہ شفیق تھے — کیا قدرداں وہ شاہ تھا اور کیا رفیق تھے

بس چھیڑ کر فرس کو امامِ زماں بڑھے — آگے جو تھے رُکے ہوئے وہ سب جواں بڑھے
کاندھوں پہ رکھ کے نیزوں کو شیر ژیاں بڑھے — مشتاقِ تیغ و خنجر و تیر و سناں بڑھے
یوں طے کیا دلیروں نے اُس راہِ خیر کو — جاتا ہے جس طرح کوئی گلشن میں سیر کو

بشاش قتل گاہ میں پہونچے جو وہ دلیر
نیزوں کو گاڑ گاڑ کے گونجے مثال شیر
دعویٰ یہ تھا کہ کھینچیو ان سرکشوں کو زیر
عرصہ نہ جنگ میں ہو نہ فتح و ظفر میں دیر
تیغوں سے روم و شام کی بستی اُجاڑ دیں
کوفے کے در پہ جا کے نشانوں کو گاڑ دیں

حد سے سوا تھی کثرتِ فوجِ ستم شعار
لکھی ہے راویوں نے چھ لاکھ اور دس ہزار
پیدل تھے بے حساب تو تھے لاتعد سوار
فوجوں کا دستِ چپ کی بھی ممکن نہیں شمار
پیکِ خیال جا کے پھر آتا تھا راہ سے
پنہاں تھی کربلا کی زمیں سب نگاہ سے

اکناف بحر و بر میں جو لشکر کا تھا مقام
شہر و جبل بھرے ہوئے تھے فوج سے تمام
ناکوں پہ چوکیاں تھیں جزیروں میں اہتمام
مسدود ہو گئی تھی سبیلِ خط و پیام
آیا کبوتر اُڑ کے جدھر صید ہو گیا
قاصد جہاں ملا وہ وہیں قید ہو گیا

ظاہر ہوئی سیاہیِ لشکر سے دن کو رات
وہ کشمکش کہ موت کے طالب تھے ذی حیات
دُنیا پرست دُشمنِ ساداتِ نیک ذات
مقتل سے کوفے تک ہے قشونِ زبوں صفات
دریا کے صرفِ آب سے لب خشک ہو گئے
جتنے کنوئیں تھے راہ میں سب خشک ہو گئے

دُنیا میں نیک کم ہیں بہت اور بد ہزار
لکھا ہے فوجِ شہ کا کتابوں میں یہ شمار
چالیس کل پیادے تھے بتیس سب سوار
طفل اُن میں تھے کئی سمن اندام و گلعذار
بوڑھے سے قد تھے ایک بھی اُن میں جواں نہ تھا
سبزہ بھی جن کے گورے رُخوں پر عیاں نہ تھا

بچوں میں سبزہ رنگ کوئی تھا کوئی صبیح
شیریں سخن لبوں میں نمک رنگتیں ملیح
چاٹیں لبوں کو اُن کے جو باتیں سنیں فصیح
مُردوں کو دم میں زندہ کریں صورتِ مسیح
جد و پدر کی طرح جری تھے دلیر تھے
بچے تھے یوں پہ غیض جو آئے تو شیر تھے

وہ نیمچے ہلال کے دم خم پہ جن کو فوق
جرات کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق
ہنس ہنس کے زخم کھائیں زبانوں کو اس کا ذوق
گیسو رُخوں پہ کانوں میں بُندے گلوں میں طوق
آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں
نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

ایک ایک خوش بیاں تو ہر اک نکتہ سنج ہے
کچھ پیاس کا نہ غم ہے نہ فاقوں کا رنج ہے
لشکر وہ ہے کہ حسن کے دریا کا گنج ہے
چہرہ ہر اک کا ماہ چہار و دو پنج ہے
انگڑائیاں جو لیتے ہیں سینوں کو تان کے
کہتا ہے حسن خود کہ نثار ان کی شان کے

کم گو کوئی حسین کوئی شیریں سخن کوئی
بچپن میں سرو قد کوئی رشکِ چمن کوئی
نازک مزاج کوئی تو گل پیرہن کوئی
تصویرِ جد کوئی تو شبیہِ حسن کوئی
دولت ہی حسین کے حصہ میں آئی تھی
مایہ تھی فاطمہ کا علی کی کمائی تھی

شیرانِ دشت کو جگر ایسے نہیں ملے
غوّاص کو کبھی گہر ایسے نہیں ملے
حمزہ کو جنگ کے ہنر ایسے نہیں ملے
جعفر نے پائے بال و پر ایسے نہیں ملے
جو تھا نبی کے بعد خدا کے ولی کا تھا
حضرت کو وہ ملا کہ جو حصہ علی کا تھا

پہلے پہل جو نکلے تھے گھر سے وہ گلعذار
تیغیں چمکتی دیکھ کے بڑھتے تھے بار بار
فرماتے تھے یہ روک کے عباس نامدار
شیرو ابھی نہیں ہے تمھیں حکم کارزار
حجت تمام کی نہیں شاہِ غیور نے
سبقت نہ کرنا منع کیا ہے حضور نے

عجلت کو جانتے ہیں سبک جو ہیں بردبار [?]
بے وقت دوڑتے نہیں ذی قدر و وقار
دیکھو تماشہ فوج کی کثرت ہے بے شمار
باجے بجا کے کھولینگے رایت ستم شعار
جلدی نہ کیجو گو کہ لڑائی میں دیر ہو
تم تو خدا کے شیر کے شیروں کے شیر ہو

دستِ ادب کو جوڑ کے بولے وہ تشنہ کام
کر دیجئے ہمیں علی اکبر کے پا نیام [?]
بیٹے سے مسکرا کے یہ کہنے لگے امام
عاشق تمھارے نام کے ہیں یہ فلک مقام
بیٹا یہ سن میں چھوٹے ہیں سب میں بڑے ہو تم
اچھا صف ان کے باندھ کے آگے کھڑے ہو تم

بپھرے ہوئے ہیں شیر خبردار ہوشیار
کوئی بڑھانے پائے نہ اس صف سے راہوار
عجلت ہر ایک امر میں بچوں کا ہے شعار
بہلا کے روکے رہنا انھیں تم پہ میں نثار
جان اپنی سب دیتے ہیں بزرگوں کے نام پر
گھوڑے اُڑا کے جا نہ پڑیں فوجِ شام پر

تسلیم کرکے شہ کو مرتب جو کی وہ صف — سب اُس پرے میں تھے گہر قلزم شرف
فرقت میں جن کی چاک رہا سینۂ صدف — زہرا کے رشتہ دار یداللہ کے خلف
اُن سے کسے جہان میں عشقِ ولی نہیں — اب تک وہ آبرو تو کسی کو ملی نہیں

شرمندہ جس سے چاند ہو چہرے وہ تابناک — دل بلبلوں کے خون تو گریباں گلوں کے چاک
خود وادیٔ السلام جو چھانے نجف کی خاک — ایسے کبھی ملیں نہ گہر ہائے صاف و پاک
تسبیح ہاتھ آئے یہ کس نیک نام کو — دُرِّ نجف تھے وہ جو ملے تھے امام کو

شبیرِ خدا کے ساتھ جگر بندِ نامدار — دونوں نواسے حضرتِ زہرا کے یادگار
پوتے پھپھوں و حیدرِ زماں فخرِ روزگار — یکتائے دہر پانچ بھتیجے فلک وقار
خود جس کی فرع و اصل علی و بتول تھے — یہ سب اسی درخت کی شاخوں کے پھول تھے

یوسف تھے ایک مصر میں اور مشتری ہزار — کیف و کم ثمن ہے کتابوں سے آشکار
یوسف سے کربلا میں تھے اٹھارہ گلعذار — عالم کی جان فخرِ حسینانِ روزگار
یاں منزلت بھی قدر بھی قیمت بھی فوت تھی — زہرا کے یوسفوں کی خریدار موت تھی

تیغ و ترنج اگر ہوں ہلال اور آفتاب — سرکائے چہرۂ علی اکبر سے پھر نقاب
گر دیکھ لیں وہ حُسنِ ملیح اور وہ شباب — حوریں گلوں کو کاٹ کے تڑپیں رہے نہ تاب
پریاں تو اُن کے سایہ کا پیچھا نہ چھوڑتیں — دامن کبھی جنابِ زلیخا نہ چھوڑتیں

لاریب فیہ حُسن میں یوسف تھے بے مثال — گستاخیاں معاف ادب کا بھی ہے خیال
مثلِ نبی ملیح تھے یہ سب انکو خصال — وہ چاشنیٔ سخن کی وہ شیرینیٔ مقال
شور آج تک ہے خوبیٔ یوسف میں شک نہیں — پھیکا ہے پر وہ حسن کہ جس میں نمک نہیں

ناگہ نشاں بڑھائے اُدھر کی سپاہ نے — کھولا اِدھر علَم کو علمدارِ شاہ نے
چوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے — طوبیٰ لکم کہا شہِ عالم پناہ نے
رفعت بڑھی زمینِ سعادت سرشت کی — ٹھنڈی ہوا پھریرے سے آئی بہشت کی

رایت وہ سبز لشکرِ سادات کا نشاں
دامانِ پاک کشتیِ اُمّت کا بادباں
پنجہ مثالِ پنجۂ خورشید زرفشاں
پرچم تھا بال کھولے تھی یا حورِ جناں
مشک و عبیر و عود کا بازار سرد تھا
مٹی کا عطر خاک کی خوشبو سے گرد تھا

نقارۂ وغا پہ لگی چوب ناگہاں
گردونِ دوں سے پار ہوئی طبل کی فغاں
شہپور کے غریو سے ہلتا تھا آسماں
قرنا کی وہ مہیب صدا تھی کہ الاماں
نیزوں کو ہر سوار اُدھر تولنے لگا
گونجے ادھر بھی شیر کہ رن بولنے لگا

شہنا کا شور سُن کے لرزتا تھا بند بند
برچھی ہلی رسالوں میں نیزے ہوئے بلند
صحرائے ہولناک کی وحشت ہوئی دوچند
ڈر کر کنوتیوں کو بدلنے لگے سمند
سُن کر دہل کا شور کلیجے دہل گئے
صحرا سے دب کے شیرِ نیستاں نکل گئے

پیاسوں پہ جب اُدھر سے چلے تیر بے شمار
مولا نے غازیوں کو دیا حکم کارزار
نکلے وغا کو قبلۂ عالم کے جاں نثار
جن کی شجاعتیں ہیں زمانے میں یادگار
ہونگی نہ ہیں نہ ایسے کبھی باوفا ہوئے
سب جاں نثار حقِ نمک سے ادا ہوئے

حُر و بریر و وہب و عمیرِ فلک مقام
وہ مسلم ابن عوسجۂ عرش احتشام
سعد و زہیر قین و حبیبِ خجستہ کام
وہ شیر جس کا بو عمرِ نہشلی تھا نام
جس غول پر جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا
ایک ایک مرتے مرتے پروں کو اُلٹ گیا

نکلے وغا کو ایلچیِ شاہ کے پسر
ماتم میں تھے کہ تھا ابھی تازہ غمِ پدر
فوجوں پہ حملہ ور ہوئے جس دم وہ شیر نر
دم میں تنوں سے کٹ کے گرے کوفیوں کے سر
رن پر چڑھے جو سوگ کے کپڑے اُتار کے
مارے گئے وہ شیر ہزاروں کو مار کے

لاشوں کو قتل گاہ سے لے آئے جب حسینؑ
نکلے پرے سے حضرتِ زینب کے نورِ عین
کی عرض یا امامِ زماں شاہِ مشرقین
رانڈوں میں ہو یتیموں کے ماتم کا شور و شین
پھر وقت کونسا ہو جواب ہم فدا نہ ہوں
دل تھرتھرا رہے ہیں کہ اماں خفا نہ ہوں

فرمایا کیا نہ جاؤ گے رخصت کو ماں کے پاس — دونوں نے ہاتھ جوڑ کے تب کی یہ التماس
اکبر سے آپ پوچھ لیں یا شاہ حق شناس — فرما رہی ہیں والدۂ آسماں اساس
اب گھر میں آئیو تو وغا کر کے آئیو — سر لیکے ابن سعد کا یا مر کے آئیو

فرمایا خیر فوج سے جنگ و جدل کرو — جو ماں نے کہہ دیا ہے اُسی پر عمل کرو
ہاں خواہشِ وصالِ عروسِ اجل کرو — بچپن میں اس بقا کو فنا سے بدل کرو
راحت نے اس طرف نہ کیا رخ نہ چین نے — دیکھے نہ ماں نے بیاہ نہ سہرے حسین نے

تسلیم کر کے گھوڑوں پہ وہ نازنیں چڑھے — غل پڑ گیا جہاد کو دو مہ جبیں چڑھے
یوں اشہبوں پہ دلبرِ ضرغامِ دیں چڑھے — نظروں سے سب اُتر گئے گھوڑے زمیں چڑھے
پریاں نکل کے قاف کی راہوں سے چھپ گئیں — دو بجلیاں چمک کے نگاہوں سے چھپ گئیں

پہونچے جو رن میں برج شرف کے دو آفتاب — نیزے زمیں پہ گاڑ دیئے مثلِ بوتراب
نعرہ کیا کہ او پسرِ سعدِ بے حجاب — ہمراہ لیکے شمر کو آ سامنے شتاب
گو سیکڑوں سوار ہزاروں پیادے ہیں — تلوار پہلے تجھ سے چلے یہ ارادے ہیں

ہم نے سُنا ہے یہ کہ قریشی نسب ہے تو — نیکوں میں بد ہوئے ہیں بدوں میں خجستہ خو
ہم تو کہتے ہیں او سگِ ناپاک کینہ جو — شیروں سے آ وغا کو جو ہے پاس آبرو
فاقوں میں نور دیکھ جدال و قتال دیکھ — دعویٰ ہے کچھ تو ہاشمیوں کا جلال دیکھ

ماں بنتِ فاطمہ ہے بنی فاطمہ ہیں ہم — دادا ہیں ابنِ عمِّ رسولِ فلک حشم
ہیں اس طرح حسب میں نبی و علی بہم — دو نام کو ہیں ایک ہیں پر کعبہ و حرم
بھائی جدا ہے خویش جدا ہے وصی جدا — اُن سے علی جدا نہ خدا سے نبی جدا

بے فصل ہے وصیِ نبی مالک الرقاب — ضرغامِ دین مدینۂ علمِ نبی کا باب
دریائے فیضِ رحمتِ معبود کا سحاب — نورِ خدا سپہرِ جلالت کا آفتاب
جو اُن سے منحرف ہوا وہ دوزخی ہوا — ایسا کوئی شجاع نہ ایسا سخی ہوا

کہف الوریٰ سراجِ ہدیٰ حجتِ خدا
جس سے فزوں کسی نے نہ کی طاعتِ خدا
ہر ضرب جس کے ہاتھ کی تھی ضربتِ خدا
خاکی بنا وہ آئنۂ قدرتِ خدا
حق ساتھ ہے حسینؑ کے ہم اُن کے ساتھ ہیں
پہنچا علی کا زور جنھیں یہ وہ ہاتھ ہیں

چھوٹے نے کی یہ عرض کہ بڑھیے بس اب حضور
مخفی ہوا ہے خیمے میں ڈر کر وہ بے شعور
ہوتا ہے اور دھوپ سے اب پیاس کا وفور
مرنا ہے ہر طرح یہ تامل ہے کیا ضرور
دو ہاتھ میں بھگا کے سواروں کو گھاٹ کے
خیمہ گرا دو اس پہ طنابوں کو کاٹ کے

کھینچے یہ کہہ کے تیغ دونوں نے یک بیک
پہونچی زمیں سے آئنۂ چرخ تک چمک
گاوِ زمیں ادھر تھی ہراساں اُدھر سمک
ڈر کر پروں پہ نادِ علی پڑھتے تھے ملک
غل تھا چمک دمک وہی سب آشکار ہے
اک جا ہیں دو یہ تیغیں یا ذوالفقار ہے

دو بجلیاں سیاہ میں کوندیں فرس بڑھے
جس طرح قافلہ سے صدائے جرس بڑھے
اب کون روکے شیر بڑھے جب تو بس بڑھے
مقتل میں بیس ہو کے گرے جو کہ دس بڑھے
بچوں نے زورِ حق کے ولی کا دکھا دیا
سب تگ ڈھنگ ضربِ علی کا دکھا دیا

وہ دونوں شاہیوں کی رو وار ادھر اُدھر
کاووں میں پس کے مر گئے سو سو ادھر اُدھر
تابندہ تھے جو آٹھ مہ نو ادھر اُدھر
پھیلی ہوئی زمین پہ تھی ضَو ادھر اُدھر
کیلوں سے آشکار تھے جلوے نجوم کے
پریاں تھیں وہ کہ پھرتی تھیں جھوم جھوم کے

آئے جدھر خدا کا غضب آ گیا اُدھر
پلٹے جدھر یہ رعبِ علی چھا گیا اُدھر
جھپٹے جدھر شکست عدو کھا گیا اُدھر
ٹھہرے جہاں کسی سے نہ دیکھا گیا اُدھر
انساں تو کیا کہ شیروں کے زہرے بھی آب تھے
آنکھیں ملائے کون کہ دو آفتاب تھے

کیا دونوں تازیوں کی سبک تازیاں لکھوں
کیونکر رواروی میں خوش اندازیاں لکھوں
کس طرح نیچوں کی سرافرازیاں لکھوں
کیا دونوں شاہزادوں کی جانبازیاں لکھوں
پوتے ہیں کس جری کے خلف کس ولی کے ہیں
اعلیٰ یہ مدح ہے کہ نواسے علی کے ہیں

جو شیرِ حق میں تھی وہ شجاعت انھیں میں ہے
جعفر کی شان و شوکت و صولت انھیں میں ہے
شبیر سے کریم کی ہمت انھیں میں ہے
کونین بخش دیں یہ سخاوت انھیں میں ہے
گو ان کے مدح خوانوں کے لب بے سوال ہیں
منہ بھر دیں موتیوں سے کہ زینب کے لال ہیں

وہ چھوٹے چھوٹے خود وہ پیشانیوں کی شان
وہ دبدبہ وہ رعب وہ عمرانیوں کی شان
دینداریوں کا نور خدادانیوں کی شان
وہ دونوں پنجوں کی سرافشانیوں کی شان
باہم چلے نہ زور گیا کچھ نہ کس گیا
جب چمکے مینہ سروں کا سراسر برس گیا

جس صف پہ دوڑے وہ جلالت قریں بڑھے
غل پڑ گیا کہ دلیرِ ضرغامِ دیں بڑھے
وہ کیا بڑھے کہ دو اسدِ خشمگیں بڑھے
شیروں کا وہ شکار ہوئے جو لعیں بڑھے
زندہ بھی کشتۂ خطر و بیم ہو گئے
دو حصّے ہو گئے موت کے تقسیم ہو گئے

چلّہ سے جس کا تیر ملا تن پہ سر نہ تھا
جز گوشۂ فرار کسی جا مفر نہ تھا
زندہ جو بھاگے چین اُدھر تھا ادھر نہ تھا
کشتوں کے پشتے تھے کہ نظر کا گزر نہ تھا
دریا تھا یا سپاہ صفیں تھیں کہ موج تھی
دو بجلیوں کے بیچ میں اعدا کی فوج تھی

نیزوں میں جس طرف وہ گئے بے دھڑک گئے
شیروں کی بو جو آگئی گھوڑے بھڑک گئے
زندوں کے خوفِ جاں سے کلیجے دھڑک گئے
زخموں سے کیا مزا تھا کہ بسمل پھڑک گئے
یکسر قدم سپاہ کے دریا سے اُٹھ گئے
ہونٹوں کو چاٹتے ہوئے دنیا سے اُٹھ گئے

وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں
وہ بازوؤں کا زور وہ تیغ آزمائیاں
وہ پنجوں میں تیغِ علی کی صفائیاں
وہ ولولے وہ پہلے پہل کی لڑائیاں
جس غول پر وہ صاحبِ شمشیر آپڑے
ثابت ہوا کہ فوج پہ دو شیر آپڑے

جس پہلوان پہ عون کی تلوار پڑ گئی
چہرہ تو کیا ہے زیست کی صورت بگڑ گئی
چھوٹے کی آنکھ جس سے لڑائی میں لڑ گئی
سر تیزیٔ سناں تھی کہ پتلی میں گڑ گئی
آنکھوں کو روکے صف سے وہ مردک نکل گیا
گویا قفا کو توڑ کے ناوک نکل گیا

اک شور تھا کہ چشم نمائی غضب کی ہے
آفت کا معرکہ ہے لڑائی غضب کی ہے
یہ گھاٹ قہر کا یہ ترائی غضب کی ہے
چھوٹے سے نیمچوں کی صفائی غضب کی ہے
بڑھتا تھا آپ سے نہ کوئی جنگ کے لیے
لاتی تھی موت گھیر کے چورنگ کے لیے

جس پر اُڑا کے رخش وہ جانباز جا پڑا
ثابت ہوا کہ صید پہ شہباز جا پڑا
دو ہو گئے تیغ پر وہ فسوں ساز جا پڑا
خود منہ کے بل سمندِ سبکتاز جا پڑا
دونوں ہیں نورِ عین علی سے غیور کے
آنکھیں نکال لیں کوئی دیکھے جو گھور کے

اللہ کا غضب اُدھر آیا جدھر بڑھے
پہونچا سروں پہ تیغ کا سایہ جدھر بڑھے
جلوہ عروسِ فتح نے پایا جدھر بڑھے
گھونگٹ سپاہِ شام نے کھایا جدھر بڑھے
گرتی تھی برق لشکرِ ابنِ زیاد پر
گویا چڑھے تھے دو نئے دولھا جہاد پر

ماتھے وہ اور وہ پیچ عمامہ کے لٹ پٹے
گیسو جو بنتِ فاطمہؑ نے ہاتھ سے بٹے
وہ ابرووں کے بل کہ ہلالِ فلک کٹے
آنکھیں وہ نرگسی تھیں کہ جس سے نظر ہٹے
چہرے کسی نے دیکھے ہیں ان آب و تاب کے
رخسار چار پھول کھلے ہیں گلاب کے

وہ برگِ گل سے لب وہ دہن اُن کے تنگ تنگ
وہ بھینی بھینی بو کسی غنچہ میں وہ نہ رنگ
لعل و گہر ہیں ان درِ دنداں کے آگے دنگ
اک منجمد وہ قطرۂ نیساں ہے اور یہ سنگ
تشبیہ بھی جو اُن سے نہ دی نا اُمید ہیں
اس غم سے موتیوں کے کلیجوں میں چھید ہیں

گورے گلے کہ جن سے نمایاں ہے نورِ حق
سُرخی نہیں یہ چہرۂ منوّر پہ ہے شفق
وہ پہنچے وہ ہاتھ دلِ کفر جس سے شق
سینے میں ایک مصحفِ ناطق کے دو ورق
خالی ہیں گو شکم پہ یہ جرّار سیر ہیں
فاقہ تو ارث ہے کہ یہ شیروں کے شیر ہیں

اُن دونوں اشہبوں کی وہ چھل بل وہ تنگ جائے
جو اُن کی چال دیکھنے آئے وہ دنگ جائے
صورت کا نہ بیان نہ وہ سرعت کا ڈھنگ جائے
اڑتے تھے یوں کہ جیسے ہوا پر خدنگ جائے
پریاں تھیں وہ وہ اسپ سعادت اثر نہ تھے
سب مختی ہما کی تیز پری اور پر نہ تھے

اسوار آفتاب تو گھوڑے تھے ماہرو
جاندار و خوش رکاب و سعید و خجستہ خو
ڈھالا تھا جوڑ بند کو سانچے میں نور کے
دونو کنوتیاں کہ دو پیکانِ تیر ہیں
آنکھوں پہ کیجیے جو نظر بے نظیر ہیں
سُرعت ہیں اُن سے طیر کو نسبت نہ تیر کو
آئے اُدھر سے گر تو ادھر سے نکل گئے
مانندِ برق لشکرِ شر سے نکل گئے

یوں پھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے
غنچے تھے دو ملے ہوئے اک جا کہ اُن کے گوش
سرعت کو دیکھ لیں تو اُڑیں طائروں کے ہوش
پریاں اُڑا سکیں نہ روش اُن کی چال کی
وہ سُم وہ نعل اور وہ سینے وہ ترکِ تاز
زیور تھا ایک شب کی دُلھن کا کہ اُن کے ساز
بن کر گہر پسینے کے قطرے ٹپکتے ہیں
گو چھوٹے چھوٹے پاؤں نہ جاتے تھے تا رکاب
یوں مرکبوں کے باندھے تھے سرِ وہ فلک جناب
غل تھا ہٹے رہو کہ مزاج ان کا آگ ہے
گھوڑوں نے کس پرے میں قیامت بپا نہ کی
وہ کونسی گرہ تھی کہ جنھوں نے وا نہ کی
نیزوں کے بند قطع کمانوں کے ساتھ تھے

سرعت یہ تھی کہ دوڑتا تھا جسم میں لہو
صاف آتی تھی پسینے سے جن کے وفا کی بو
نازک کلائیاں تھیں کہ پہونچے بلور کے
چاروں سم اُن کے غیرتِ ماہِ منیر ہیں
یال ایسی جس کے پیچ میں پریاں اسیر ہیں
نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو
پہونچے کنارِ بحر تو بر سے نکل گئے
دو تیر آگے تیز نظر سے نکل گئے

جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے
برگستواں میں جسم کہ رستم تھا درعہ پوش
گرتا تھا منہ سے کف تو شجاعت کا تھا یہ جوش
بالکل مزاج شیر کا آنکھیں غزال کی
بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہباز
وہ کلغیاں کہ طرّۂ لیلیٰ سے سرفراز
ہیکل کی تختیاں کہ ستارے چمکتے ہیں
پر ابر باراں جمی ہوئی تھیں مثلِ بوتراب
بیجا قدم رکھیں یہ سمندوں کو تھی نہ تاب
حیدر سے شہسوار کی یہ ران باگ ہے
فاقہ تھا پر کمی تگ و دو میں ذرا نہ کی
کن سرکشوں کے جسم سے گردن جدا نہ کی
حلّالِ مشکلات کے بچوں کے ہاتھ تھے

بچوں کے نیچے بھی غضب آبدار تھے — سیلِ فنا تھے صاعقۂ شعلہ بار تھے
دونوں ہم جو ہو کے اُٹھے ذوالفقار تھے — سائے کو بھی شریک جو کیجے تو چار تھے
دو کرتے تھے یہ اکیب و مرکب کو زین کو — دو ہاتھ کاٹ دیتا تھا سایہ زمین کو

قبضے وہ تکیہ گاہ ظفر جن کا نام ہے — پھل وہ کہ جس کو کھاتے ہی قصہ تمام ہے
پانی وہ جس کو کہیے کہ زہر التیام ہے — کاٹ ایسا سنگِ سخت جہاں مومِ خام ہے
جوہر وہ دم نکلتے ہیں جس کی مثال پر — افشاں چنی ہوئی ہے جبینِ ہلال پر

فولاد پوش پھینک کے ہتھیار چھپ گئے — گوشوں میں سر جھکا کے کماندار چھپ گئے
چار آٹھ میں جو قتل ہوئے چار چھپ گئے — زخموں کے گل بہت جو کھلے خار چھپ گئے
مشکل وہاں تمیز بد و نیک ہو گئی — غل تھا کہ لو بہار و خزاں ایک ہو گئی

جن کے جمے تھے رنگ وہ بے رنگ ہو گئے — لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تنگ ہو گئے
چار آئینہ جو پہنے تھے چور رنگ ہو گئے — بچوں نے وہ کیا کہ جواں دنگ ہو گئے
دھومیں وغا کی قاف سے تا قاف ہو گئیں — اللہ رے مصاف صفیں صاف ہو گئیں

کوئی بچے نہ رومی و رازی جدھر پھرے — جھک جھک گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے
غازہ لگایا فتح نے غازی جدھر پھرے — پسپا تھے یکہ تاز وہ تازی جدھر پھرے
مہلت نہ سر اُٹھانے کی تھی فوجِ شام کو — دونا بلند کر گئے جعفر کے نام کو

جا پہونچے تھے مقامِ بنِ سعد کے قریں — بھاگا غضب سے چیر کے خیمے کو وہ لعیں
کتنی طنابیں کاٹ چکے تھے یہ مہ جبیں — ہاں ہاں کا شور کر کے بڑھے سب عدوئے دیں
بھاگا اُدھر تو جوش میں وہ اضطراب کے — یہ دونوں بھائی رہ گئے ہونٹوں کو چاب کے

چھوٹے نے عرض کی یہ سراپا ہیں مکر و کید — دیکھا حضور چھٹ گیا پنجے میں آ کے صید
چھٹنے کی شرم ہے نہ انھیں بھاگنے کی قید — فرمایا عون نے یہ ہے استادِ زرق و شید
بھاگا طنابیں کٹتے ہی کیا حیلہ ساز ہے — سچ ہے حرام زادے کی رسی دراز ہے

بڑھ کر پکارے حضرتِ عباسِ عرش جاہ
ذلّت اُٹھا کے بھاگ گیا افسرِ سپاہ
سرسبز ہوتے ہیں ہمیں جب کھیت پڑتے ہیں
ہاں مرد اگر ہو سامنے بچوں کے آ تو جائے
مخنی کدھر ہے شیروں کو صورت دکھا تو جائے
بپھرے ہیں شیر ہاتھ میں تیغ و سپر تو لے

بھاگا رئیس خود یہ خبر چار سو گئی
آخر شغال تھا نہ دبکنے کی خو گئی
جب کچھ کڑی پڑی تو جفا جو نکل گیا
مرتا ہے بے حیا زر و جاگیر و مال پہ
آنکھیں چرائیں شیر جب آئے جلال پہ
پائے نہ گر شکار تو جانباز کیا کرے

باتوں میں اتنا تھم جو گئے وہ فلک پناہ
دریا کی فوج اُدھر سے ہوئی بڑھ کے سدِّ راہ
پتھر بھی تیرِ ظلم بھی نیزے بھی چل گئے
یوں تیر کھا کے فوج پہ جاتے تھے وہ دلیر
لشکر کو کر دیا تھا زبردستیوں سے زیر
دیکھا غضب سے جس کی طرف زرد ہو گیا

تیغیں قریب سے جو لگاتے تھے اہلِ شر
عباس بڑھ کے دیتے تھے حضرت کو یہ خبر
نامی جوان بھاگ گئے شام و روم کے
کس سمت ابنِ سعد ہے اور شمرِ روسیاہ
روکے گئے نہ ایک سے دو طفل واہ واہ
یوں لشکروں سے شیر کے فرزند لڑتے ہیں

بھاگے گا پھر تو خیر کوئی زخم کھا تو جائے
بگڑی ہوئی لڑائی کو ظالم بنا تو جائے
گرتا ہے وہ جھکا ہوا خیمہ خبر تو لے
عزّت سبھوں کی آج گئی آبرو گئی
خلعت پہن کے بھی نہ رذالت کی بو گئی
ضیغم جلال میں ہیں کہ آہو نکل گیا

اک ہیچ کا وار بھی روکا نہ ڈھال پر
سردار ہو کے چھپ گیا تُف اس جدال پہ
کنجشک جب نہاں ہو تو شہباز کیا کرے
خیمے کو لے کے پشت پہ سب جم گئی سپاہ
چاروں طرف سے گھر گئے زینب کے رشکِ ماہ
سینوں کو توڑ توڑ کے ناوک نکل گئے

غصّے میں جس طرح کہ جھپٹتا ہے زخمی شیر
انبار ادھر سروں کے اُدھر زخمیوں کے ڈھیر
تلوار جس پہ سن سے چلی سرد ہو گیا
اک بھائی بڑھ کے ہوتا تھا اک بھائی کی سپر
کیا کیا لڑے ہیں آپ کی ہمشیر کے پسر
خیمے پہ جا پڑے پسرِ سعد شوم کے

پر اب خدا بچائے کہ فوجیں کثیر ہیں
تیغیں ہیں برچھیاں ہیں سناں ہیں ہیں تیر ہیں
رو کر امامِ دیں نے کہا اب اخیر ہیں
کب تک لڑیں کہ تشنہ دہن ہیں صغیر ہیں
نو دس برس میں ماں سے بچھڑنے کے دن نہ تھے
یہ کھیلنے کی فصل تھی لڑنے کے دن نہ تھے

زینبؑ کھڑی تھی پردے کے پیچھے جو بے قرار
فضہ خبر یہ دیتی تھی جا جا کے بار بار
کیا کیا لڑے ہیں حیدر و جعفر کے یادگار
حضرت سے مدح کرتے ہیں عباسِ نامدار
جس وقت ذکرِ معرکہ آرائی ہوتے ہیں
رومال رکھ کے آنکھوں پہ حضرت بھی روتے ہیں

رو کر کہا کہ روتے ہیں کس واسطے امام
میں اُن کی اک کنیز یہ دونوں پسر غلام
مجکو دکھا تو دے کہ کدھر ہیں وہ لالہ فام
اُس نے کہا کہ چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام
لاکھوں سے معرکہ ہے مگر با حواس ہیں
بی بی وہ ابنِ سعد کے خیمہ کے پاس ہیں

تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں کی بدلیوں میں چھپے ہیں وہ رشکِ ماہ
کثرت ہے اس قدر کہ پہونچتی نہیں نگاہ
وہ بھاگتی ہے اور پلٹتی ہے سب سپاہ
آوازِ دار و گیر تو گردوں پہ جاتی ہے
دونوں کے نیمچوں کی چمک یاں تک آتی ہے

طبلِ ظفر پہ چوب لگی یک بیک اُدھر
ڈیوڑھی سے آئیں خیمہ میں زینبؑ جھکائے سر
عباسؑ نے کہا شہِ والا سے دوڑ کر
چلئے حضور لٹ گیا بنتِ علی کا گھر
گھبرا کے کشمکش میں دم اُن کے نکل نہ جائیں
لاکھوں سوار ہیں کہیں بچے کچل نہ جائیں

تلوار لے کے قاسمِ شیریں سخن بڑھے
عباس کیا بڑھے شہِ خیبر شکن بڑھے
مانندِ شیر اکبرِ گل پیرہن بڑھے
فرزند سے یہ کہہ کے امامِ زمن بڑھے
پردے میں اہلِ بیتِ نبی کے نکل آئے
ڈیوڑھی پہ تم رہو کہیں زینب نکل نہ آئے

پہونچے یہ تین شبیر جو مقتل میں ایک بار
کیا پیدلوں کا ذکر فراری ہوئے سوار
ریتی پہ شہ کو یوں نظر آئے وہ گلعذار
بند آنکھیں منہ کھلے ہوئے ہونٹوں پہ جانِ زار
دنیا سے وقتِ کوچ بھی دونوں کا ساتھ ہے
گردن میں ایک بھائی کے بھائی کا ہاتھ ہے

بچّوں کو جاں کنی میں جو پایا حسین نے
آنکھوں سے خوں جگر کا بہایا حسین نے
آغوش میں بڑے کو شہنشاہ لے چلے

پہونچے قریبِ خیمہ جو شاہِ فلک سریر
پردہ اُلٹ کے خیمہ کا با حالتِ تغیر
دوڑو حسین خیمہ میں لاشوں کو لاتے ہیں

دوڑے اُدھر سے چھاتیوں کو پیٹتے حرم
رابعت کے نیچے بچّوں کے تھیں میّتیں. بہم
لاشوں کے آگے اکبرِ یوسف جمال تھے

ماتم کی صف سے اُٹھ گئیں زینب یہ کہہ کے بات
لاشوں کو رکھ کے غش ہوئے سلطانِ کائنات
لڑکے بھی چھاتیوں کو بہم پیٹنے لگے

بیٹھی تھیں ایک گوشہ میں زینب جو ننگے سر
پُرسے کو لوگ جمع ہیں چلیئے ذرا اُدھر
آنچ آئے ممتا کی دل کو جلائے تو کیا کروں

بس سن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اُجڑ چکے
اب اُن کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیئے

بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کر کروں میں بین
گر مر گئے تو مر گئے وہ دونوں نورِ عین
روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے

بوسے لیئے گلے سے لگایا حسین نے
ہاتھوں سے بچّوں کو چھوڑا یا حسین نے
چھوٹے کی لاش قاسمِ نوشاہ لے چلے

تھا غیر حال مر گئے رستے ہیں وہ صغیر
فضّہ پکاری اے حرمِ شاہِ قلعہ گیر
دولھا بنے ہوئے مرے شہزادے آتے ہیں

ڈیوڑھی سے پہلے آیا لچکتا ہوا علم
آپہونچے لڑکھڑاتے ہوئے سرورِ امم
کپڑے ہر اک کے خوں سے بچّوں کے لال تھے

لوگو بتاؤ کون سے دولھا کی ہے برات
دوڑیں لٹا کے بچے کو بانوئے خوش صفات
لاشوں کے گرد آکے حرم پیٹنے لگے

واں جا کے بولیں بانوئے ناشاد نوحہ گر
فرمایا میں نہ جاؤں گی بچوں کی لاش پہ
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

لاشوں پہ لائیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے
گودی میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیئے

بے صبر ہو یہ دل میں کہیں گے مجھے حسین
کیوں کر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہِ مشرقین
صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئیں گے

بھائی کا حق ادا ہوا احسان کردگار
لاشوں کو دیکھ کر مرا دل ہوگا بے قرار
چلیے نہ ضبط کیجیے فریاد و آہ کو

لاشوں پہ لائیں بی بیاں زینب کو تھام کر
بولیں بڑھا کے دستِ مبارک ادھر ادھر
کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
ماں صدقے جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو
لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو
دیکھو نہ آنچ آئے شہِ خوش خصال پر

کیسی یہ نیند آج ہے پیارو اُٹھو اُٹھو
کپڑے لہو بھرے یہ اُتارو اُٹھو اُٹھو
ان پیاری پیاری آنکھوں پہ امّاں نثار ہو
سینوں سے تو زمیں پہ رکھو ہاتھ اُتار کے
امّاں نثار گیسوؤں کے تار تار کے
نخلِ مراد میں نہ ثمر ہے نہ برگ ہے

لاکھوں سے معرکہ میں وغا کر کے آئے ہو
دولھا بنے ہو خون میں سب بھر کے آئے ہو
مجھ سے بچھڑ کے تم اسی منزل میں رہ گئے
کیونکر ملے گا ماں کو تمہارا سراغ ہائے
یوں بجھ گئے ہماری لحد کے چراغ ہائے
ہے ہے یہ گھر بھرا ہوا ویران کر گئے

رونا ہے واں بھی میں تمہیں روؤں گی زار زار
کی عرض آپ صاحبِ ماتم ہیں میں نثار
لاشوں پہ بھانجوں کی غش آیا ہے شاہ کو

ماتم کی صف پہ گر پڑیں وہ سوختہ جگر
بچے کدھر ہیں کچھ مجھے آتا نہیں نظر
لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں
اس بیکسی میں ماں کی بھی جانب نظر رکھو
آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو
فوجوں کی پھر چڑھائی ہے زہرا کے لال پر

ماموں کے ساتھ رن میں سدھارو اُٹھو اُٹھو
اُلجھے ہیں گیسوؤں کو سنوارو اُٹھو اُٹھو
انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو
باندھو کھلے ہوئے یہ عمامے سنوار کے
چونکو اُٹھو کلام کرو ماں سے پیار کے
اب سمجھی میں یہ نیند نہیں خوابِ مرگ ہے

بچپن کی غفلتیں یہ نہیں مر کے آئے ہو
صدقے گئی رُلانے کو مادر کے آئے ہو
ارمان شادیوں کے مرے دل میں رہ گئے
لوٹا اجل نے حیدر و جعفر کا باغ ہائے
میرا بڑھاپا اور یہ بچّوں کے داغ ہائے
امّاں کی قبر بننے نہ پائی کہ مر گئے

کس طرح دیکھوں خاک میں چہرے اٹے ہوئے
اُلجھے ہیں میرے ہاتھ کے گیسو بٹے ہوئے
سینے فگار چاند سے بازو کٹے ہوئے
ہے ہے کفن بنے یہی کپڑے پھٹے ہوئے
نہ کچھ تزک نہ تخت شہیدوں کو چاہیئے
مرنا یوہیں جہان میں سعیدوں کو چاہیئے

تابوت اُٹھائی دھوم سے مُرتے وطن میں گر
ہوتا پدر بھی ساتھ جنازے کے نوحہ گر
قبریں بنائی ماں کی لحد کے ادھر اُدھر
کیا حشر ہوگا پہونچے گی یثرب میں جب خبر
ام البنین پیٹتی روضے پہ جائیں گی
صغرا کے پاس بی بیاں پُرسے کو آئیں گی

بچو تمھیں بتاؤں میں غربت میں کیا کروں
گھر ہے نہ یہ وطن ہے مصیبت میں کیا کروں
بھائی گھرا ہوا ہے اس آفت میں کیا کروں
فاقوں میں تشنگی میں صعوبت میں کیا کروں
راحت نہ روح کو نہ کسی دل کو صبر ہے
پانی نہ غسل کو نہ کفن ہے نہ قبر ہے

مجبور تم بھی ماں بھی ہے ناچار میں نثار
تنہائی میں خدا ہے مددگار میں نثار
رستہ بُرا ہے باندھ لو ہتھیار میں نثار
چھوٹے مرے پسر سے خبردار میں نثار
اللہ اس سفر کی بلاؤں کو رد کرے
کھٹکا جہاں ہو بھائی کی بھائی مدد کرے

سُنتی ہوں اس سفر میں خطر بے شمار ہیں
جائیں وہی اسے جو میانِ مزار ہیں
پرسش ہے روک ٹوک ہے جنگل ہے خار ہیں
وہ بھی ڈرے ہوئے ہیں جو طاعت گزار ہیں
منزل کا شب کی ماں کو پتہ دے کے جائیو
قربان جاؤں ساتھ مجھے لے کے جائیو

دن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو
کس بن میں شب کو ہوگا مقام اے مسافرو
کچھ تو کرو زباں سے کلام اے مسافرو
بھیجو گے کب پیام و سلام اے مسافرو
پیٹوں گی جنگلوں میں جو تم کو نہ پاؤں گی
میں شب کو ڈھونڈتی ہوئی مقتل میں آؤنگی

کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے نکلنے پائیں
بھولے ہیں راستہ نہ کہیں گھر کا بھول جائیں
دربار میں بھی ہوں تو سویرے سے گھر میں آئیں
ہے ہے یہ دشتِ ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں
پہونچوں گی کس طرح میں جو ڈر کے روؤگے
واری اندھیری رات میں کس طرح سوؤگے

شب کو خوشامدیں مری کرتے تھے بار بار
ان بھولی بھولی باتوں کے ماں ہوگئی نثار
اب واری سرخرو ہوئے تم رب کے سامنے
تا دودھ ہم کو بخش دے مادر جگر فگار
باتیں وہ رات کی مجھے بھولیں گی نہ وہ پیار
لو دودھ میں نے بخش دیا سب کے سامنے

یہ بین کرکے لاشوں سے لپٹی وہ نوحہ گر
اک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر
بچوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے
غش آیا سانس اُلٹ گئی ٹکڑے ہوا جگر
بانو پکاری سوئے علمدار دیکھ کر
لاشے اُٹھاؤ شاہ کی ہمشیر مر نہ جائے

بس اے انیس طول سے بہتر ہے اختصار
خالق سے ہاتھ اُٹھا کے دُعا کر بہ انکسار
ہر دم زیادہ حشمت و اقبال و جاہ ہو
ہاں ختم کرکے مرثیۂ شاہِ نامدار
قایم رہے جہاں میں یہ شاہِ فلک وقار
حامی جنابِ فاطمہ زہرا کا ماہ ہو

رُباعی

خوں بھائی کا شہ کے روبرو بہتا تھا
پیاسے کا لہو کنار جو بہتا تھا
تھا بیچ میں سقائے حرم کا لاشہ
دریا تو اُدھر اِدھر لہو بہتا تھا

مرثیہ (۱۰)

جاتا ہے شبیرِ بیشۂ حیدر فرات پر
طاری ہے خوفِ مرگ ہر اک ذی حیات پر
صدمہ عجب ہے بادشہِ کائنات پر
آنکھوں سے اشک بہہ رہے ہیں بات بات پر
بجھتا ہے وہ جو قبرِ علی کا چراغ ہے
جو حال ہو بجا ہے کہ بھائی کا داغ ہے

صابر کا ہے یہ حال کہ مشکل ہے ضبطِ آہ
فرماتے ہیں کہ تھام لے بندے کو یا الٰہ
کیا مرحلہ ہے سخت یہ کیونکر کٹے گی راہ
بھائی مرا یہی ہے یہی لشکر یہی سپاہ
آخر بشر ہوں میں جو نہ روؤں تو کیا کروں
تیغِ علی کو ہاتھ سے کھوؤں تو کیا کروں

دوری کا غم ہے کیوں نہ بہیں اشک متصل
پالا ہے ہم نے آہ تھمے کس طرح سے دل
اعضا کو توڑے دیتا ہے دردِ جاں گسل
اے موت آ کہ روحِ علی سے نہ ہوں خجل
رخصت کا حرف لب پہ بھی لایا نہ جائے گا
مجھ سے تو یہ پہاڑ اُٹھایا نہ جائے گا

یہ نوجواں بضاعتِ حیدر ہے یا کریم
حمزہ یہی مرا ہے یہی جعفر ہے یا کریم
پیارا پسر سے بھی یہ برادر ہے یا کریم
یوں سب ہیں پر اسی سے مرا گھر ہے یا کریم
بازو یہی ہے ہاتھ مرے اس کے ہاتھ ہیں
میں جانتا ہوں شبیر خدا میرے ساتھ ہیں

زینب کے لال مر گئے لشکر بچھڑ گیا
سہرا دکھا کے قاسمِ بے پر بچھڑ گیا
وہ کیا شہید ہو گئے سب گھر بچھڑ گیا
پھر میں نہیں اگر یہ برادر بچھڑ گیا
اس معرکہ میں ذبح ہوں پہلے تو عید ہو
سبطِ نبی کے بعد یہ بھائی شہید ہو

حضرت اِدھر تڑپتے ہیں تھامے ہوئے کمر
عباس بی بیوں سے ہیں رخصت طلب اُدھر
لائی ہے سوکھی مشک سکینہ بچشمِ تر
فرماتے ہیں بھتیجی کا مُنہ چوم چوم کر
پہلے تھا ذکر آپ تسلّی کے واسطے
اب جا کے پانی لاتے ہیں بی بی کے واسطے

کہتی ہے خشک ہونٹ دکھا کر وہ لالہ فام
اصغر کو لیکے ہاتھوں پہ بانوئے نیک نام
دکھلاؤ اس کا حال شہِ نامدار کو

کرتے ہیں عرض حضرتِ عباسِ نامدار
پر کیا کروں رضا جو نہ دیں شاہِ ذی وقار
رخصت میں سعی کیجے کہ ہو نام آپ کا

کچھ سوچ کر یہ کہنے لگی وہ شکستہ حال
جیتا ہے تم کو دیکھ کے خیرالنسا کا لال
بانو نے مرتضےٰ کی کمائی کو کھو دیا

زینب یہ بولیں آپ کا وسواس ہے بجا
پانی بھی مل رہے گا صغیروں کا ہے خدا
موقع نہ سعی کا ہے نہ مشکل کشائی کا

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش صفات
مشکیزہ لیکے گر یہ نہ جائیں سوئے فرات
ہر وقت کربلا سے طلبگار یہ خبر ہوں

جس جا حسین بیٹھے تھے عریان سر کیے
کی عرض تا کجا کوئی خونِ جگر پیے
ہچکی لگی ہے اصغرِ ناشاد کام کو

فرمایا میری مرگ گوارا کرو تو جاؤ
اچھا سکینہ جس میں خوشی تم ہمیں لے لاؤ
ثابت ہوا کہ ہاتھ سے عمو کو کھوؤ گی

اب عمو جان مجھ میں نہیں طاقتِ کلام
فرماتی ہیں کہ مرتا ہے ہے ہے یہ تشنہ کام
ہچکی لگی ہوئی ہے مرے شیرخوار کو

بچوں پہ جان دینے کو حاضر ہے جاں نثار
چلیے پسر کو لیکے وہاں پھیر کرو گار
وہ کام ہے غلام کا یہ کام آپ کا

کیا کہتے ہو نہ بھائی یہ میری نہیں مجال
نیکی بدی ہو کچھ تو کہیں شاہِ خوش خصال
بچوں کے واسطے مرے بھائی کو کھو دیا

کیونکر دلاوے بھائی سے ان کو کوئی رضا
تنہا نہ ہوں جہاں میں شہنشاہِ کربلا
یہ چل بسے تو کون ہے پھر میرے بھائی کا

بی بی بھلا یہ کون سے وسواس کی ہے بات
پھر ننھے ننھے بچوں کی کس طرح ہو حیات
آگے جو کچھ سبھوں کی رضا ہیں تو غیر ہوں

واں خود گئے بھتیجی کو آغوش میں لیے
پانی کہیں سے آئے تو یہ جاں بلب جیے
مولا بس اب نہ روکیے اپنے غلام کو

مشکیزہ بھر کے چاند سی چھاتی پہ زخم کھاؤ
یہ کیا سکھا کے لائی ہے بی بی ادھر تو آؤ
پانی کو اب تو روتی ہو پھر ان کو روؤ گی

انجام کی خبر نہیں کچھ تم کو ہائے ہائے
یہ اودے اودے ہونٹ بھی تم نے کیوں دکھائے
خیر اب دعا کرو کہ یہ اعدا پہ فتح پائے
دولت ولیِ حق کی مرے ہاتھ سے نہ جائے
جب مشک بھر کے دوش پہ یہ نیک خو رکھے
دریا کا معرکہ ہے خدا آبرو رکھے

گردن جھکا کے شرم سے بولی وہ مہ جبیں
پوچھیں حضور میں نے کچھ ان سے کہا نہیں
اصغر کو لائیں گود میں جب بانوئے حزیں
ہاں مشک دی قصور یہ ہے یا امامِ دیں
مجرم ہوں لب پہ حرفِ شکایت بھی آئے ہوں
لیجے قسم زباں کے جو کانٹے دکھائے ہوں

یہ سن کے گود میں لیا اس تشنہ کام کو
عباس خم ہوئے شہِ دیں کے سلام کو
باقی رہی نہ ضبط کی طاقت امام کو
لپٹا لیا برادرِ عالی مقام کو
حالت جو غیر ہو گئی زہرا کے جائے کی
قبرِ علی سے آئی صدا ہائے ہائے کی

بوسہ قدم پہ دے کے وہ شیرِ ژیاں چلا
غل پڑ گیا کہ وارثِ شاہِ زماں چلا
چلائے اہلِ بیت کہ راحت رساں چلا
لو فاطمہؓ کے گھر سے علی کا نشاں چلا
سادات کس بلا میں گرفتار ہو گئے
ہے ہے حسین بیکس و بے یار ہو گئے

اللہ رے رعبِ آمدِ عباسِ عرش قدر
سینوں میں دل چھپے ہوئے تھے جوشنوں میں صدر
غل ہے قریب تر ہے سپہرِ وغا کا بدر
زہرے ہیں آب گھاٹ سے بھاگے ہیں اہلِ غدر
آتا ہے ابنِ ضیغمِ یزداں لڑائی کو
شیروں نے ڈر کے چھوڑ دیا ہے ترائی کو

لشکر میں ایک ایک کو ہے زندگی سے یاس
ڈر سے کسی کے ہوش ٹھکانے ہیں نہ حواس
وہ دور دور سب ہیں صفیں تھیں جو پاس پاس
آمد میں شیر کی بھی یہ ہوتا نہیں ہراس
غل چار سو یہ ہے کہ قدم سر کے جاتے ہیں
گھوڑے بھگاؤ حضرتِ عباس آتے ہیں

وہ عازمِ وغا ہے جو شیروں کا شیر ہے
روتا ہے دل کے بھائی سے بھائی یہ دیر ہے
زور آوری سے اس کی تہمتن بھی زیر ہے
جرار ہے شجاعِ جہاں ہے دلیر ہے
لرزہ ہے ان کے تن میں جو مردِ نبرد ہیں
شیروں کے ہاتھ پاؤں ترائی میں سرد ہیں

رن سے قدم اُٹھائے ہوئے ہیں سرانِ فوج
مانندِ بید کانپ رہے ہیں جوانِ فوج
دہشت سے منہ چھپائے ہیں تیغیں میانِ فوج
دامن لپیٹتے ہیں کمر سے نشانِ فوج
رایت تمام خوف سے تھرّائے جاتے ہیں
لشکر کے بھاگنے کے نشاں پائے جاتے ہیں

نکلا حرم سرا سے جو وہ آسماں حشم
نصرت نے گرد پھر کے لیے بوسۂ قدم
شوکت وہ اُس جناب کی وہ رفعتِ علَم
پنجے کی ضو سے برق چمکتی تھی دم بدم
ذرّوں سے شرمگیں تھے گہر لعل سنگ سے
صحرا زمرّدی تھا پھریرے کے رنگ سے

وہ ضوِ علَم کی وہ رُخِ عباس نامور
رکھے تھا ہاتھ پھریرے پہ خورشیدِ خیرہ سر
پنجہ اُدھر علَم کا رُخِ پُر ضیا ادھر
دو نورِ سرمدی تہ و بالا تھے جلوہ گر
یکتا وہ زرق برق میں یہ آب و تاب میں
تھا فرق ایک نیزے کا دو آفتاب میں

پنجے سے نورِ پنجتنی آشکار رہی
پرچم پہ طرّۂ سرِ حور انتشار ہی
دامن بھی ابرِ رحمتِ پروردگار ہی
پہونچا جو اُس کے سایہ میں وہ رستگار ہی
کشتی کا بادبان ہو تو کوثر پہ جا لگے
طوبیٰ نہال ہو اگر اُس کی ہوا لگے

ناگاہ غل ہوا فرسِ تیز گام لاؤ
آیا علی کا سروِ رواں خوش خرام لاؤ
ہاں رخشِ تیز رو کو بصد اہتمام لاؤ
اسپِ گراں رکاب و مرصع لجام لاؤ
ہے انتظار ابرشِ آہو شکار کا
بیٹا سوار ہوئے گا دُلدل سوار کا

آیا فرس سجا ہوا کس ترک و تاز سے
سرعت کا قافلہ نکل آیا حجاز سے
رکھتا تھا پاؤں خاک پہ اس امتیاز سے
جیسے پری چمن میں خراماں ہو ناز سے
فوق اُس کو تھا ہلالِ سعادت نشان پر
سم تھے زمین پر تو دماغ آسمان پر

وہ تھوتنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جن کو دیکھ کر
کیلیں نجوم نعل ہلال اور سُم قمر
باریک جلد سینہ کشادہ بلند سر
کھاتی تھی ہر پری بھی قسم اُس کی جان کی
غصہ یہ تھا کہ تنگ ہو وسعت جہان کی

دلدل نژاد و برقِ تجلّی براق سیر
اسوار دم دلاسے سے گر پھیر لے تو خیر
سرعت غضب ہے گو کہ وہ بے آب و دانہ ہے
سایہ کا اُس کے دھوپ میں سرعت سے تھا یہ حال
گہہ بر میں گاہ بحر میں گاہے سوئے جبال
سایہ نہ تھا ہمائے سعادت پناہ تھا
وہ شوخیاں فرس کی وہ سرعت وہ آؤ جاؤ
جب چاہو سیر عالمِ امکاں کی دیکھ آؤ
رفعت میں پست حوصلہ کبکِ دری کا تھا
لو اب سوار ہوتے ہیں عباسِ نامور
لو ہٹ کے ہاتھ آپ نے رکھا ایال پر
برچھا لیا سمند کو زانو میں داب کے
بڑھنے میں صرف ہاں جو دہن سے نکل گیا
لشکر گلوں کی بو کا چمن سے نکل گیا
طاؤس کیا کہ برق بھی شرما کے رہ گئی
گھوڑا اُڑا کہ ہو گئی سرعت ہوا کی گرد
جا پہونچی تا بہ فرقِ ثریا ثرے کی گرد
خورشید کی ضیا تھی سموں کے نشان پر
شوکت وہ اُس فرس کی وہ عباس کی نمود
غل تھا کہ ہر ثنا ہے پئے واجب الوجود
سب کے گلوں میں اُن کی غلامی کا طوق ہے

دریا میں موج دشت میں آہو ہوا میں طیر
گر سانس لے تو دم بھی نہ لے پھر فلک کا پھیر
اُس کو تو وقت کی حرکت تازیانہ ہے
وحشت میں جس طرح سے بھرے چوکڑی غزال
گم کردہ آشیاں تھا عقابِ کشادہ بال
گویا ہوا کے زور میں شاہیں تباہ تھا
توسن تھا فقط جسے ہیکل کا اک بناؤ
تازی ہو فرح پاؤ قدم میں وہ لطف چاؤ
چھل بل ہرن کی تیزی تو جھگڑا پری کا تھا
لو دامنِ قبا نے لیا بوسہ کمر
لو آفتابِ خانۂ زیں پر ہے جلوہ گر
لو دو ہلال بن گئے حلقے رکاب کے
وحشی غزالِ دشتِ ختن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا تھا کہ سن سے نکل گیا
پیچھے سموں کی گرد نظر آکے رہ گئی
بوئے چمن تھی یا قدمِ بادپا کی گرد
اُڑ کر سرِ فلک پہ گئی کربلا کی گرد
نخوت سے تھا زمیں کا دماغ آسمان پر
پڑھتا تھا کوئی شخص تبارک کوئی درود
کیا ان کے سامنے کسی انساں کی ہست و بود
یہ وہ بشر ہیں جن کو ملایک پہ فوق ہے

پیدا مثالِ حیدرِ کرّار رعبِ حق
چمکا جو نورِ عرش بنا خاک کا طبق
رخسار تھے کہ سورۂ والشمس کے ورق
ازبر تھا خط کو آیۂ واللیل کا سبق
موتی کی آگے دانتوں کی کچھ آبرو نہ تھی
سورہ تھا نور کا وہ بیاضِ گلو نہ تھی

وہ ہاتھ کارِ خیر رہا جن سے روز و شب
ساعد تھے صاف ساعدِ پُرنورِ شیرِ رب
بازو وہ جن میں قوتِ دستِ خدا تھی سب
شانے وہ جن میں شانِ نشانِ شہِ عرب
پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ کھرا رہا
سینہ وہ صدر تھا جو وفا سے بھرا رہا

شان و شکوہ و صولت و عدل و نہیب و داد
اسلام و دین و ملّت و ایمان و اعتقاد
اشفاق و رحم و دوستی و خلّت و وداد
خوف و رجا و آرزو و مطلب و مراد
اندوہ و درد و رنج مطیعانِ نو میں تھے
سب غاشیہ[1] بدوش فرس کی جلو میں تھے

شوکت کا قول تھا کہ مطیعِ جناب ہوں
کہتی تھی فتح خاکِ درِ بوتراب ہوں
نصرت کا ادّعا تھا کہ میں کامیاب ہوں
دعویٰ تھا قہر کو کہ علی کا عتاب ہوں
فاقے سے تھے پہ صبر بھی منہ موڑتا نہ تھا
ہر گام پر ثبات قدم چھوڑتا نہ تھا

تلوار وہ ہلال کٹے جس کو دیکھ کر
تھی کہکشاں کمندِ عدو بندِ شیرِ نر
مہتابِ آسمانِ ظفر آہنی سپر
خود آفتاب تھا تو جبینِ مبیں قمر
رُخ کے عرق سے نور کے قطرے ٹپکتے تھے
حلقے نہ تھے زرہ میں ستارے چمکتے تھے

نیزے کی نوک سے جگرِ آفتاب خوں
سینہ ہے آسماں کا اسی دن سے نیلگوں
ابروئے حور فتح و ظفر تھا کماں کا نوں
تھا ماہِ نو بھی جس کے چم و خم سے سرنگوں
دہشت سے گوشہ گیر رئیسانِ شام تھے
ترکش کے سارے تیر اجل کے پیام تھے

نیزہ زمیں میں گاڑ کے گونجا جو شیرِ نر
چہروں سے رنگ اُڑ گئے تھرّا گئے جگر
نکلے رجز میں خشک زباں سے وہ شعرِ تر
جس کے جواب میں فصحا نے جھکائے سر
قفل تھا زبانِ ناطقہ اَلکن ہے لال ہے
لاریب فیہ مصحفِ ناطق کا لال ہے

[1] گھوڑے کا زین پوش

نعرہ یہ تھا کہ گوہرِ برجِ شرف ہوں میں
فرزندِ صاحبِ شرفِ مَن عرف ہوں میں
فخرِ سلف جو شاہ ہے اُس کا خلف ہوں میں
اللہ و پنجتن ہیں جدھر اُس طرف ہوں میں
رایت سے پیشِ رو ہوں خدا کی سپاہ کا
پیرو ہوں بادشاہِ ہدایت پناہ کا

حیدر کی ذوالفقار سے لاکھوں کے سر کٹے
جوشن میں سینے سینوں کے اندر جگر کٹے
خیبر میں جبرئیل کے بھی تین پر کٹے
پر یوں کٹے کہ تیغ سے جیسے سپر کٹے
ضربت کا حال عمرِ دلاور سے پوچھیے
حیدر کا زور مرحب و عنتر سے پوچھیے

بچوں کا ایلچی بھی ہوں اور تشنہ کام ہوں
سقّائے اہلِ بیتِ رسولِ انام ہوں
شبیر کی سپر ہوں علی کی حسام ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں شہِ دیں کا غلام ہوں
سینے پہ تیر کھاؤں گا تلواریں کھاؤں گا
یہ مشک آبِ نہر سے میں لے کے جاؤں گا

یوں تو ہیں تین روز سے بے آب و دانہ سب
لیکن قریبِ مرگ ہیں دو طفلِ تشنہ لب
کیوں آل کو ستاتے ہو بے جرم و بے سبب
کچھ مصطفےٰ کا پاس نہیں تم کو ہے غضب
دو دن تو بیکسوں پہ عطش میں گزر گئے
کس پر یہ خون ہوگا جو معصوم مر گئے

ہم اپنا سر کٹانے کو حاضر ہیں ظالمو
تینوں میں بھوک پیاس میں صابر ہیں ظالمو
بچے بھی میہماں کے مسافر ہیں ظالمو
آثارِ مرگ چہروں پہ ظاہر ہیں ظالمو
گر ہم تمہارے زعم میں تقصیر وار ہیں
پر اُن کا کیا قصور ہے جو شیر خوار ہیں

یہ دھوپ یہ خیام کا تپنا یہ گرم بن
مرجھا گیا ہے احمدِ مختار کا چمن
مانندِ غنچہ پیاس سے کھولے ہیں سب دہن
پانی بغیر اب نہ جئیں گے وہ گلبدن
گرمی سے ہاتھ پاؤں غریبوں کے سرد ہیں
نیلے ہیں ہونٹھ پھول سے رخسار زرد ہیں

چلّایا شمر تب کہ عبث ہے سوالِ آب
دیں گے زبانِ تیغ سے ہم آپ کو جواب
بچوں کی پیاس سے ہے جو حضرت کو اضطراب
پھر کس لیے ہے بیعتِ حاکم سے اجتناب
خیمے سے گھٹنیوں اگر اصغر بھی آئے گا
جز آبِ تیر پانی کا قطرہ نہ پائے گا

ایسا سخن کبھی جو سنا تھا نہ کان سے ۔۔۔ برچھی لگی مگر نہ کہا کچھ زبان سے
جھومے فرس پہ جب شہِ مرداں کی شان سے ۔۔۔ بس خود بخود اُگلنے لگی تیغ میان سے
نعرہ کیا کہ او سگِ ناپاک دور ہو ۔۔۔ یہ کیا سخن ہے منہ میں ترے خاک دور ہو

حجت تمام کرنے کی خاطر تھے یہ کلام ۔۔۔ ظالم شراب خوار کی بیعت کرے امام
سوکھی ہوئی زباں جو ہلا دے وہ تشنہ کام ۔۔۔ حاضر ابھی ہوں چشمۂ کوثر کے لاکھ جام
قدرت ہے سب طرح کی امامِ جلیل کو ۔۔۔ چاہیں تو وہ سبیل کریں سلسبیل کو

کیا جانے مرتبہ پسرِ فاطمہ کا تو ۔۔۔ عزت بہشت کی ہیں تو کوثر کی آبرو
سردار بُردبار نکوکار نیک خو ۔۔۔ اُن کا عدو خدا و پیمبر کا ہے عدو
جاری ہے فیض فاطمہ کے نورِ عین کا ۔۔۔ غاصب ہے تو یہ نہر بھی ہے حق حسین کا

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغِ شرر فشاں ۔۔۔ آواز دی زمیں نے کہ یا حافظِ زماں
شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں ۔۔۔ دہشت سے تھرتھرا گیا مریخِ آسماں
ثابت ہوا کہ چہرۂ خورشید کٹ گیا ۔۔۔ غل تھا کہ فوجِ شام کا دفتر اُلٹ گیا

بجلی چمک کے ہوتی تھی جب آسماں کے پار ۔۔۔ پڑھتا تھا عرش آیۂ کرسی کو بار بار
زیرِ زمیں تو گاوِ زمیں کو نہ تھا قرار ۔۔۔ تھرّا رہا تھا ثورِ فلک وقتِ گیرودار
غل تھا علی کی تیغ کا سب انگ ڈھنگ ہے ۔۔۔ جبریل کانپتے تھے کہ خیبر کی جنگ ہے

اقبال و تندرستی و آسایش و قرار ۔۔۔ امن و امان و صبر و توانائی و وقار
حلم و سکون و راحت و آرام و اختیار ۔۔۔ رعب و ثبات و سرکشی و قدر و اقتدار
آثارِ قہرِ حق انھیں معلوم ہو گئے ۔۔۔ سب تیغ کے چمکتے ہی معدوم ہو گئے

غل تھا چمکتی آتی ہے تیغِ اجل چلو ۔۔۔ ڈر کر کہا اماں نے کہ قبل از جدل چلو
دب کر صدا غرور نے دی سر کے بل چلو ۔۔۔ بولی سلامتی کہ سلامت نکل چلو
دریا بہے گا خوں کا کنارے فرات کے ۔۔۔ دم بھر میں بند ہوئیں گے کوچے نجات کے

ڈھالوں سے شامیوں کی اُدھر چھا گئی گھٹا
دریا پہ جھوم جھوم کے سب آ گئی گھٹا

ایسا بڑھا یا ابر کہ شرما گئی گھٹا
بارانِ تیر دشت میں برسا گئی گھٹا

کشتوں کو اپنے فوجِ عدو روندنے لگی
جنگل میں برقِ قہرِ خدا کوندنے لگی

چمکی جو تیغ آمدِ قہرِ خدا ہوئی
سر پر جو آ گئی تو قیامت بپا ہوئی

سینے سے روح جسم سے گردن جدا ہوئی
خوں میں ڈبو چکی تو نہ پھر آشنا ہوئی

بارھا اس غضب کی وار وہ اس زور شور کا
دُشمن کو اُس کا گھاٹ کنارا تھا گور کا

ہر دم تھی معرکے میں اجل اُس کے دم کے ساتھ
گرتا تھا خود کٹ کے برابر جھلم کے ساتھ

رہتی تھی اس طرح ظفر و فتح خم کے ساتھ
جیسے ہمیشہ رہتا ہے سکہ درم کے ساتھ

ہر دل پہ اُس کی شان و جلالت کا نقش تھا
تمغہ نہ کہیے آیۂ نصرت کا نقش تھا

بسم اللہ صحیفۂ نصرت تھی اُس کی ناب
مانندِ ذوالفقار گراں قدر و انتخاب

جوہر میں آبرو میں اصالت میں لاجواب
وہ قد وہ خم وہ منہ کی صفائی وہ آب و تاب

اُترے جگر سے جس کے اُسی کو خبر نہ ہو
کاٹے گلے ہزار کے اور خوں میں تر نہ ہو

پایا تھا باغیوں نے ثمر یہ دمِ جدل
ڈھالوں سے پھول اُڑ گئے تھے برچھیوں سے پھل

شاخیں کماں کی توڑتا تھا پنجۂ اجل
گرتے تھے سہم کر قدر انداز منہ کے بل

گوشوں کو ڈھونڈھتے تھے کماں کش ہٹے ہوئے
رہتی پہ نخلِ تیر پڑے تھے کٹے ہوئے

گو پالی و تیغ و خنجر و گرز و سنان و تیر
دو دو تھے پیش آئینۂ تیغ بے نظیر

دم میں یہ صف تمام اُدھر کا پرا اخیر
آفت کا معرکہ تھا قیامت کی دار و گیر

اُٹھ کر بھی مرغِ روح کا بچنا محال تھا
جوہر حسام میں تھے کہ لوہے کا جال تھا

یوں مورچوں کو چاٹ گئی تیغِ شعلہ رنگ
لوہے کو خاکِ شور میں کھا جائے جیسے زنگ

کمروں سے کھنچ نہ سکتے تھے خنجر میانِ جنگ
جوشن جو کٹ گئے تھے تو چار آئینے تھے دنگ

تلواریں منہ چھپائے تھیں ضربِ دشمن سے
ڈھالیں لپٹ گئی تھیں سواروں کی پشت سے

گرتی تھی کوند کر جو وہ تیغِ شرارہ ریز
چلنے میں تیغ تیز فرس تیز ہاتھ تیز
کشتہ تھے ایک ضرب میں دو ہوں کہ چار ہوں
کاٹی سپر تو کاسۂ سر تک پہونچ گئی
برسے مثالِ برق جگر تک پہونچ گئی
بڑھ کر کمر سے زین پر آئی سرنگ کے

اُن کے قدم بھی اٹھ گئے جو سرگزار تھے
بھڑکی تھی آگ نعل در آتش سوار تھے
جاتا تھا یوں غضب میں صفِ اہلِ کید پر
تیغ دو دم سروں سے گزرتی تھی دم بدم
بڑھتی تھی دم بدم تو ٹھہرتی تھی دم بدم
ڈر سے جگر بھی آب تھے زہرے بھی آب تھے

نکلا اُدھر سے جو وہ اجل کا شکار تھا
کوسوں لہو سے دشتِ ستم لالہ زار تھا
کیا ہو زرہ سے ضرب جب ایسی کڑی لگے
رہوار نے وغا میں کہاں رستمی نہ کی
مالک سے بیکسی میں کہاں ہمدمی نہ کی
دم سے تھا بحرِ خوں کا کنارا لگا ہوا

جس سمت گر کے تیغ کا سایہ گزر گیا
خالی ہوئی یہ صف وہ پرا خوں میں بھر گیا
گرتا تھا خود جری پہ جری ماجرا یہ تھا

دوزخ کھلا تھا بند تھے سب کوچہ گریز
رہ رہ کے گرم ہوتا تھا ہنگامۂ ستیز
آشفتہ سر تھے سب کہ موت سے کیونکہ دوچار ہوں
سر پہ پڑی تو پیر کے بر تک پہونچ گئی
پی کر لہو جگر کا کمر تک پہونچ گئی
ٹکڑے گرے نہ تھے کہ یہ نیچے تھی تنگ کے

ممکن نہ تھا قرار کہ دل بے قرار تھے
ٹاپیں فرس کی تھیں کہ سر وہی کٹے ہوئے تھے
شیرِ ژیاں جھپٹتا ہے جس طرح صید پر
دوزخ میں فوجِ شام کی بھرتی تھی دم بدم
ندی لہو کی چڑھ کے اترتی تھی دم بدم
موجیں تھیں دست و پا کی سروں کے حباب تھے

پیدل ہو یا سوار وہ دو تھا یہ چار تھا
بجلی چمک رہی تھی فرس بے قرار تھا
سر یوں برس رہے تھے کہ جیسے جھڑی لگے
شمشیرِ جاں ستاں نے کہاں برہمی نہ کی
سو مرتبہ چلی پہ بُرش نے کمی نہ کی
جانوں کا گھاٹ پر تھا اُتارا لگا ہوا

پہونچوں سے دونوں ہاتھ اُڑے تن سے سر گیا
گھوڑے سمیت گر کے یہ تڑپا وہ مر گیا
بسمل بھی لوٹتے تھے برابر مزا یہ تھا

فتح و ظفر تھی غاشیہ گیرِ وہ کامدار
جوہر تھے یا کہ سلسلۂ زلفِ تابدار
اک شور تھا کہ زیست کا عرصہ قلیل ہے
دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوئے تھے جاں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہیں منہ چھپانے کو

سر ہر قدم پہ تھے تنِ کفّار سے جدا
چلّے تھے بس کہ لبِ سوفار سے جدا
زہگیر کیا کرے جو نہ ترکش میں تیر ہوں
یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک پہلواں کے پاؤں
اُٹھ اُٹھ گئے سپاہِ ضلالت نشاں کے پاؤں
ہٹتا بھی ہے جہاد میں حق کا ولی کہیں

جب شیر سے ترائی کی جانب جھپٹ گئے
اب کیا بڑھیں کہ ڈر سے لہو تن کے گھٹ گئے
حملوں کے بعد تنتے تھے یوں نعرے مار کے
ہر شے تھی خوفِ ضربتِ شمشیر سے جدا
پیرِ حزیں جواں سے جواں پیر سے جدا
سارے عقابِ تیرِ غم بے پری میں تھے

دکھلا رہی تھی راہِ عدم تیغِ تابدار
تلوار بھی ملی تو بہشتی کو آبدار
پیاسو پیو کہ تیغ کا پانی سبیل ہے
سر اُڑ گئے تنوں سے جدا اُٹھے عناں سے ہاتھ
جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
ہاں پاؤں رہ گئے ہیں فقط بھاگ جانے کو

قبضہ کماں کا دستِ کماندار سے جدا
ڈر سے جدا ہلاک تھے تلوار سے جدا
چلّاتے تھے کہ چل کے کہیں گوشہ گیر ہوں
چلنے میں جیسے کانپتے ہیں ناتواں کے پاؤں
رن میں جمے رہے تو اسی نوجواں کے پاؤں
عباس بھی ہٹیں جو ہٹے ہوں علی کہیں

صف آئی صف پہ گھوڑے پہ گھوڑے اُلٹ گئے
جن کے قدم جمے رہے سر اُن کے کٹ گئے
انگڑائی شیر لیتا ہے جیسے ڈکار کے
ناوک کماں سے دور کماں تیر سے جدا
چلّے سمٹ کے ہٹتے تھے زہگیر سے جدا
پیکاں میں سر کی تھی نہ پیکاں سری میں تھے

دریا کے نہر حق طرفِ پر دغل بڑھا
تلوار سر پہ آئی کہ دستِ اجل بڑھا
غل تھا کہ معنیِ ید طولےٰ عیاں ہوئے
نیزے کو تولتا ہوا گر کوئی یل بڑھا
کچھ ہاتھ کچھ حسامِ دو دستی کا پھل بڑھا
دو دو ٹکڑے طول میں جو دمِ امتحاں ہوئے

رکتی تھی خود پہ نہ جھلم پر نہ ڈھال پر
حیرت تھی فوجِ شام کو اس چال ڈھال پر
بالا تھا راستی میں قد اس کا ہلال پر
جوہر فروتنی کے بھی تھے اس کمال پر
چشمک یہ دمبدم تھی کہ سرکش ذلیل ہیں
چلتے ہیں جھک کے وہ جو نجیب و اصیل ہیں

گھوڑوں کے دوڑنے سے اڑی دشت میں جو گرد
مقتل بھی زرد تھا فلکِ نیلگوں بھی زرد
جتنے جواں تھے دفترِ مردانگی میں فرد
چہرے کٹے ہوئے تھے انھیں کے دمِ نبرد
تفضیحہ کیسا ہوش میں اک خود غلط نہ تھا
زخمی تھے منہ کہیں اثرِ خال و خط نہ تھا

ہر سمت تھا مقدمہ جانوں کا روبکار
آتی تھی موت جائزہ لینے کو بار بار
اسوار ہر طرف تو ندار و رسالہ دار
طبلق لیے تھے منشی فوجِ ستم شعار
کیا ابتری سپاہِ ضلالت اثر میں ہے
غل تھا چلو کہ فوج کی بھرتی سقر میں ہے

تسلیم کو جھکے ہوئے تھے باادب نشاں
لشکر میں بڑھی تھی سلامت تھے سب نشاں
اٹھتا تھا شور ہاتھ سے گرتے تھے جب نشاں
نوبت یہ ہے تو فوج کا مٹتا ہے اب نشاں
آفت بپا ہے پاؤں تھمے کیا سپاہ کا
سکہ پڑا ہے ضربِ علمدارِ شاہ کا

جب اٹھ کے تیغِ صفدرِ قدسی شرف گری
گویا کہ برقِ سطوتِ شاہِ نجف گری
آیا ادھر خدا کا غضب جس طرف گری
کٹ کر گرا پرے پہ پرا صف پہ صف گری
سیفی چلی کہ سیف صفِ کارزار پر
گھوڑے گرے پیادہ پہ پیدل سوار پر

آئے جو سوئے نہر صفیں موڑ موڑ کے
بھاگے کماں میں تیر عدو جوڑ جوڑ کے
تلواریں ٹیکیں خاک پہ دم توڑ توڑ کے
بھاگے دغا میں گھاٹ کو سب چھوڑ چھوڑ کے
وہ برچھیاں نہ پھر نہ وہ شورِ مصاف تھا
جس مورچے پہ تیغ اٹھائی وہ صاف تھا

وہ رہ گئے کہ زخموں سے جو چور چور تھے
جو تھے قریبِ نہر وہ سب دور دور تھے
غازی تھے صف شکن تھے جری تھے غیور تھے
دریا پہ اور کوئی نہ تھا بس حضور تھے
غل تھا کہ اب بچیں گے نہ ہم اس لڑائی میں
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

لڑتا کنارِ نہر جو پہونچا وہ شہسوار
خوں پونچھ کر رکھی تہِ ران تیغِ آبدار
آئی صدائے حضرتِ الیاسِ باوقار
ای نورِ عینِ ساقیِ کوثر ترے نثار
سر بر ہو کون تیغ پکڑ کر جو تو بڑھے
دھو ہاتھ منہ کہ نہر کی بھی آبرو بڑھے

سقائے اہلِ بیت پکارا بچشمِ تر
میں ہاتھ دھو کے جان سے آیا ہوں نہر پر
پیاسا ہے تین روز کا مختارِ خشک و تر
بچے تڑپ رہے ہیں لہو ہے مرا جگر
طوفاں کا دھیان صاحبِ کشتی کو چاہیے
بچوں کی پہلے فکر بہشتی کو چاہیے

ڈالا میانِ نہر جو اسپِ صبا شتاب
آنکھیں قدم سے ملنے لگے ڈر کر حباب
موجیں بڑھیں برائے قدم بوسیِ جناب
اچھلیں علم کے چومنے کو ماہیانِ آب
لہروں کی بجلیاں جو برابر چمکتی تھیں
کھلتی تھیں اور حبابوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں

پانی سے منہ اٹھائے جو تھا اسپِ سربلند
ڈھیلا کیا دلیر نے خود جھک کے زیربند
بولا ہلا کے سر کو سمندِ وفا پسند
پیاسا ہے ذوالجناحِ شہنشاہِ ارجمند
حیواں تو ہوں حضور پہ خوش اعتقاد ہوں
میں بھی تو ابنِ فاطمہ کا خانہ زاد ہوں

فرمایا آپ نے مرے غمخوار مرحبا
ڈگتا نہیں کبھی قدمِ صاحبِ وفا
تو اپنی خانہ زادی کا حق کر چکا ادا
پیشِ خدا بزرگ ہے صابر کا مرتبا
پانی سے ای فرس تجھے جب اجتناب ہو
سیراب کس طرح پسرِ بوتراب ہو

دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ تشنہ کام
پھر گھاٹ پر گھٹا کی طرح آئی فوجِ شام
تنہا پہ بے وطن پہ ہوا پھر ہجومِ عام
پھر ہر طرف سے چلنے لگے نیزہ و حسام
اک شور تھا کہ بڑھنے نہ دو اس دلیر کو
کشتہ کرو ترائی میں حیدر کے شیر کو

گھوڑا کہیں گھرا کہیں اڑ کر نکل گیا
جو ڈر کے گر پڑا وہ سموں سے کچل گیا
نعروں سے مر گیا کوئی کوئی دہل گیا
صف بچھ گئی ادھر کی جدھر وہ اچھل گیا
شمشیر زن اکیلے لاکھوں سے کب تک وغا کریں
کیوں ای بہادرو کہو عباس کیا کریں

برسے جو دس ہزار کمانوں سے تیر کیں — غربال ہو گیا تنِ عباسِ مہ جبیں
وار اپنا کر گیا جو برابر سے اک لعیں — بالائے خاک کٹ کے گرا بازوئے یمیں
مڑ کر نگاہ کی کہ الٰہی یہ کیا ہوا — اک ہاتھ رہ گیا تھا سو وہ بھی جدا ہوا

ٹھنڈا جو ہو گیا علمِ شاہِ دیں پناہ — عباسِ نامور نے بھری دل سے ایک آہ
دانتوں سے پکڑی مشک کہ محنت نہ ہو تباہ — مشکیزے پر بھی تیر لگا وامصیبتاہ
گھوڑے سے ڈگمگا کے بصد یاس گر پڑے — پانی کے ساتھ حضرتِ عباس گر پڑے

اٹھ بیٹھے گر کے حضرتِ عباسِ ذی حشم — گھٹنے کے نیچے مشک تھی زانو پہ تھا علم
جھک کر زمیں پہ غش میں جو سنبھلا وہ باکرم — گرزِ گراں عقب سے پڑا سر پہ ہے ستم
ٹکڑے ہوا جگر اسدِ ذوالجلال کا — سر پاش پاش ہو گیا حیدر کے لال کا

مڑ کر جو فرطِ غیظ سے قاتل پہ کی نظر — مارا کسی نے تیر دلاور کی چشم پر
جھپکی نہ آنکھ واہ رے دل واہ رے جگر — تیور جو آئے جھوم کے سنبھلا وہ شیرِ نر
جوشِ غضب میں خاک پہ بیٹھے تھے شیر سے — گویا لہو ٹپکتا تھا چشمِ دلیر سے

شانوں سے سارے جسم کا جب بہہ گیا لہو — ریتی پہ تھرتھرا کے جھکے آپ قبلہ رو
آواز دی کہ آئیے یا شاہِ نیک خو — سر تن سے کاٹ لینے کے درپے ہیں کینہ جو
خوں میں تڑپ تڑپ کے یہ غم خوار رہ نہ جائے — صدمہ یہ ہے کہ حسرتِ دیدار رہ نہ جائے

نکلا حرم سرا سے علمدار کا پسر — گوئے گلے میں ہنسلیاں تھیں کان میں گہر
چہرے کا رنگ اڑا ہوا کرتا عرق میں تر — کی عرض شہ سے ننھے سے ہاتھوں کو جوڑ کر
شاید خبر نہیں ہے امامِ غیور کو — آقا پدر پکار رہے ہیں حضور کو

ڈیوڑھی سے بلبلا کے سکینہ نے یہ کہا — ہاں ہاں سنی تھی میں نے بھی عباس کی صدا
جلدی کسی کو بھیجئے یا شاہِ کربلا — اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے مرے چچا
مر جاؤں گی اگر انھیں جیتا نہ پاؤں گی — کیونکر چچی کو ہائے یہ صورت دکھاؤں گی

حضرت نے آہ کی کہ لرزنے لگی زمیں
اب جلد سر کٹانے کو آئیں امامِ دیں
بڑھنے دیا نہ گھاٹ سے آگے دلیر کو
تیروں سے جسم چھن گیا بازو ہوئے قلم
آئے ہیں یاں بھر بھر کے پُرزے اُڑا کے ہم
دنیا سے آج اُٹھ گیا حامل نشان کا

سُنتے ہی اس صدا کے شکستہ ہوئی کمر
کانپے جو پاؤں تھام لیا بازوئے پسر
خورشید کیوں چھپا ہے یہ کیا واردات ہے
عباس کے پسر سے تو کہدو کہ گھر میں جائے
فضہ ابھی خبر نہ کسی رانڈ کو سُنائے
پُرسا تو دوں نجف کی طرف مجھ کو موڑ دو

یہ روزِ قتل حمزہ و جعفر ہے ای پسر
یہ ماتمِ شہادتِ حیدر ہے ای پسر
میرا الم بتول کی جائی سے پوچھیے
غربت میں لُٹ گیا مرا گھر ہائے ہائے
تازہ ہے آج داغ پہ رہائے ہائے ہائے
عباس کیا جہاں سے گئے ہم گزر گئے

کرتا تھا عرض باپ کو تھامے ہوئے پسر
زندہ ابھی ہیں حضرتِ عباسِ نامور
خادم اُٹھائے گا جسدِ پاش پاش کو
ناگاہ اُس سے بڑھ کے پکارے کئی لعیں
کہدے کوئی کہ مر گئے عباسِ مہ جبیں
کیا گھیر کر کچھار میں مارا ہے شیر کو

اُفتادہ ہے وہ خاک پہ ٹوٹا ہوا علم
پانی نہ مشک میں ہے نہ عباس میں ہے دم
کٹتا ہے سر ترائی میں کڑیل جوان کا
تڑپے اُٹھے گرے نہ سنبھالا گیا جگر
چلّاتے تھے کہو علی اکبر چلیں کدھر
کچھ سوجھتا نہیں ہمیں دن ہے کہ رات ہے

دیکھو حرم سرا سے سکینہ نکل نہ آئے
اکبر اُجڑ گیا مرا گھر ہائے ہائے
سر پیٹتا چلوں گا مرے ہاتھ چھوڑ دو
یومِ وفاتِ حضرتِ شبّر ہے ای پسر
صبر اب کہاں یہ داغِ برادر ہے ای پسر
صدمہ جوان بھائی کا بھائی سے پوچھیے

سیدھی نہ ہوگی اب یہ کمر ہائے ہائے
کاٹا گیا چھری سے جگر ہائے ہائے
محسن ہوا شہید حسن آج مر گئے
دل کو ذرا سنبھالیے یا شاہِ بحر و بر
گھبرائیے نہ اب ہے ترائی قریب تر
چلیے حرم میں لیکے بہشتی کی لاش کو

جس دم قریب لاش کے لائے حسین کو
عباس جاں بلب نظر آئے حسین کو
تڑپا وہ شیر سن کے صدائے حسین کو
اکبر نے ہاتھ اٹھا کے دکھائے حسین کو
دو کوہ غم کے دل پہ جو اک بار گر پڑے
پہلو میں لاش کے شہِ ابرار گر پڑے

بھائی کی لاش بھائی نے دیکھی جو خوں میں تر
اُڑا یہ دل کہ منہ کے قریب آگیا جگر
بولے یہ آنکھیں کھول کے عباسِ نامور
اکبر سنبھالو قبلۂ عالم کو بیٹھ کر
صدقے ہزار جان امامِ غیور کے
مجھ کو اٹھا کے گرد پھراؤ حضور کے

منہ مَل کے منہ پہ کہنے لگے شاہِ خوش خصال
عباس تم کو نزع میں بھی ہے مرا خیال
اے میرے بھائی جان کہو اپنے دل کا حال
صفدر نے مسکرا کے کہا شکر ذوالجلال
آرام آگیا تپشِ روح و دل گئی
آپ آئے کیا کہ دولتِ کونین مل گئی

مولا نزولِ رحمتِ پروردگار ہے
اب آمد آمدِ شہِ دُلدل سوار ہے
شبّر کھڑے ہیں راہ میں چشم اشکبار ہے
شاید جنابِ فاطمہؑ کا انتظار ہے
قدسی قطار باندھے ہیں ناقوں پہ نور کے
آتے ہیں باغِ خلد سے نانا حضور کے

کیا بندہ پروری ہے زہے عز و افتخار
لاکھوں برس کی زیست ہے اس موت کے نثار
تھم تھم کے جسم سے جو نکلتی ہے جانِ زار
دشوار ہے مفارقتِ شاہِ نامدار
کیونکر نہ ایسی مرگ پہ نازاں غلام ہو
ہنگامِ نزع جس کے سرہانے امام ہو

رونے لگے یہ کہہ کے جو عباسِ ذی وقار
فرمایا شہ نے روتے ہو کیوں تم پہ میں نثار
کی عرض اب بدن سے نکلتی ہے جانِ زار
غم ہے کہ آپ اکیلے ہیں یا شاہِ نامدار
تلواریں کھینچ کھینچ کے لشکر جو آئے گا
اب کون ہے جو قبلۂ دیں کو بچائے گا

کیا بے بسی ہے موت سے اے قبلۂ انام
باتیں تو تھیں بہت پہ نہیں طاقتِ کلام
بگڑا ہے دم کی آمد و شد کا بھی انتظام
کچھ ایسی آ بنی ہے کہ مجبور ہے غلام
جی چاہتا ہے یہ کہ نہ چھوڑوں حضور کو
پاؤں گا اب کہاں میں امامِ غیور کو

گھبرا کے نزع میں علی اکبر سے یہ کہا — اے شاہزادۂ دو جہاں میں ترے فدا
میرا تو کوچ ہے طرفِ گلشن بقا — فرزندِ فاطمہ سے خبردار اک ذرا
گر منع بھی کریں تو اکیلا نہ چھوڑیو
عمو نثار باپ کو تنہا نہ چھوڑیو

یہ کہہ کے پائے شاہ کی جانب بڑھا بسر — کانپے لہو بھری ہوئی آنکھوں کو کھول کر
ٹپکے مژہ سے خون کے قطرے ادھر ادھر — کس یاس سے حسین پہ کی آخری نظر
من کا جری کا ڈھل گیا بھائی کی گود میں
بھائی کا دم نکل گیا بھائی کی گود میں

چلائے سر کو پیٹ کے سلطانِ بحر و بر — فریاد ہے کہ مر گئے عباسِ نامور
بیکس ہوا حسین لٹی دولتِ پدر — آئی صدا علی کی کہ شبیر صبر کر
فرزند تھا مرا یہ تمہارا غلام تھا
جو حال ہو چکا ہے کہ پیارا غلام تھا

یہ سب شرف ہے تیری غلامی کا اے پسر — زہرا سرہانے لاش کے روتی ہے ننگے سر
جعفر بھی ہیں عقیل و حسن بھی ہیں نوحہ گر — نانا تمہارے روتے ہیں تھامے ہوئے جگر
پرسا تمہیں شہید کا دینے کو آئے ہیں
یہ سب تمہارے بھائی کے لینے کو آئے ہیں

اٹھ کر پکارے حضرتِ شبیرِ نامدار — ہیں لٹ گیا دہائی ہے یا شبیر کردگار
ہے ہے مرا شفیق مرا یار و غمگسار — خدمت گزار عاشقِ صادق وفا شعار
بھائی کا کیا سفر ہوا میں آپ مر گیا
بچے مرے یتیم ہوئے باپ مر گیا

بازو شکستہ ہو گیا ٹوٹی کمر مری — آنکھیں ادھر تھیں ان کی جدھر تھی نظر مری
اب بے خبر ہیں کون رکھے گا خبر مری — وا حسرتا زرہ مری ہے ہے سپر مری
کیوں مجھ سے منہ پھرا لیا تقصیر کیا ہوئی
سب جس سے کانپتے تھے وہ شمشیر کیا ہوئی

یہ کہہ کے گر پڑے شہ والا برے خاک — تر ہو گئی شہید کے خوں سے قبائے پاک
بیٹا تڑپ گیا کہ پدر ہو گئے ہلاک — کر ڈالا دستِ غم سے گریباں چاک چاک
تیور جو آئے گر کے شہ مشرقین کو
چلائی فاطمہ کہ سنبھالو حسین کو

جلدی عبا اٹھا کے دلاور کی لاش پہ
اکبر نے عرض شاہ سے کی ہاتھ جوڑ کر
خیمے سے نکلی آتی ہیں رانڈیں برہنہ سر
تنہا کھڑا ہے راہ میں عباس کا پسر
آیا وہ گر تو ساتھ سکینہ بھی آئے گی
دیکھی چچا کی لاش تو جیتی نہ جائے گی

فرمایا شہ نے آپ کا مطلب ہے اس سے کیا
رہنے نہ پیارے بھائی کو مظلوم کربلا
مجھ سے ابھی تو بچھڑے ہیں عباس باوفا
راحت ہو تم آ کے جو کاٹے مرا گلا
ہے ہے ابھی سے رشتۂ الفت کو توڑ دوں
کس پر میں ان کی لاش کو جنگل میں چھوڑ دوں

آواز پھر علی کی یہ آئی کہ اے پسر
تو جا کہ میں تو ہوں ترے بھائی کی لاش پر
ڈیوڑھی پہ غش ہے زوجۂ عباس نامور
دونوں غلام زادے کھڑے ہیں نوحہ گر
صدمے جہاں میں بے پدری کے عظیم ہیں
اک سوگوار رانڈ ہے اور دو یتیم ہیں

ناچار لاش چھوڑ کے اُٹھے امام دیں
مشک و علم کو لیکے چلے اکبر حزیں
کوتل تھا ساتھ اسپ علمدار مہ جبیں
باگیں کٹی تھیں تیغوں سے ڈھلکا ہوا تھا زیں
لٹکی ہوئی تھی تیغ و سپر بھی دلیر کی
پرخوں زرہ سمند پہ رکھی تھی شیر کی

ماتھا لہو سے ڈوبا ہوا تھوتھنی فگار
سینہ بھی سب چھنا ہوا گردن بھی زخمدار
گردن پھرا کے تکتا تھا دریا کو بار بار
یعنی پڑا ہے دشت میں تنہا مرا سوار
خادم برہنہ سر لیے آتا ہے اس طرح
دُلدل کو لوگ لاتے ہیں مجلس میں جس طرح

صدمے سے تھی علم کی بھی ٹوٹی ہوئی کمر
چھینٹیں تھیں خوں کی سبز پھریرے پہ سر بسر
پرچم پہ یوں جھکا ہوا پنجہ تھا خوں میں تر
جس طرح پیٹتا ہے کوئی سوگوار سر
پیدا تھی ہر قدم پہ علامت نشان سے
پیٹو کہ اُٹھ گیا مرا حامی جہان سے

پہونچے حسین خیمۂ اقدس کے جب قریں
آگے بڑھے جھکا کے علم اکبر حزیں
دوڑا تڑپ کے دلبر عباس مہ جبیں
چلایا کیا غضب ہے ہوا یا امام دیں
کوتل ہے کیوں فرس مرے بابا کدھر گئے
سر پیٹ کر حسین پکارے کہ مر گئے

یہ سُن کے ننگے پاؤں پھرا وہ جگر فگار
مادر پکاری خیر تو ہے تم پہ میں نثار
پانی کو جو سدھارے تھے وہ خوں میں تر ہوئے
پردا اُلٹ کے خیمے کا فضّہ نے دی صدا
لاتے ہیں گھر میں مشک و علم شاہِ کربلا
موت آئی ان کو پیاسوں کی تقدیر سو گئی
خیمے میں حشر ہو گیا سُنتے ہی یہ خبر
ماتم کی صف پہ بیٹھ گئی کوئی نوحہ گر
ہے ہے کا غل ہوا کہ سکینہ اُچھل پڑی
اکبر نے آکے گاڑ دیا صحن میں علم
حضرت پکارے پیٹ کے زانو پدر و غم
جیتے رہے تھے اس الم و یاس کے لیئے
برپا ہوا یہ حشر کہ ہے ہے علی کے لال
پیٹی پچھاڑیں کھا کے جو بانوے خوش خصال
فق ہو گیا سکینہ کا مُنہ سانس اُلٹ گئی
مُنہ دامنِ علم سے چھپائے بصد بکا
اس خوں بھرے علم کے میں قربان ہیں فدا
بابا اکیلے ہو گئے آفت گزر گئی
اللہ رے دلخراش علی کی بہو کے بین
چادر پڑی تھی منہ پہ کہ تھے سامنے حسین
ٹکڑے تھے تیغِ غم سے دلِ سوگوار کے

آیا حرم میں مضطر و نالان و بے قرار
چلایا چاک کر کے گریباں وہ سوگوار
امّاں اُڑاؤ خاک کہ ہم بے پدر ہوئے
اے پردے والو ڈیوڑھی سے ہٹ جاؤ اک ذرا
مارے گئے جہاد میں عباسِ باوفا
ہائے ہائے علی کی چھوٹی بہو رانڈ ہو گئی
رانڈوں کے دل الٹ گئے تھرا گئے جگر
غش کھا کے گر پڑی کوئی کھولا کسی نے سر
حجلے سے بال کھولے دُلھن بھی نکل پڑی
کھولے سروں کو زیرِ علم آئے سب حرم
لو زینب اپنے بھائی کو رو آئے رن میں ہم
رنڈ سالہ لاؤ زوجۂ عباس کے لیئے
بکھرا دیئے حسین کی بہنوں نے سر کے بال
مٹی پہ لوٹنے لگے اطفالِ خرد سال
پھیلا کے ننھے ہاتھ علم سے لپٹ گئی
چلّاتی تھی کدھر گئے ہے ہے مرے چچا
مشکیزہ کیوں دیا تھا یہ سب ہے مری خطا
ہے ہے یہ پانی مانگنے والی نہ مر گئی
سُکّانِ آسمان و زمیں کو بھی تھا نہ چین
تھامے تھی ہاتھ خواہرِ سلطانِ مشرقین
حکمِ حیا یہ تھا کہ نہ رونا پکار کے

کچھ سوچ کر جو ہٹ گئے واں سے امامِ دیں
اس وقت ہاتھ اٹھا کے علم کی بلائیں لیں
منہ کر کے سوئے نہر کاری وہ دل حزیں
صاحب حسین روتے ہیں تم کو خبر نہیں
جنگل بسا دیا شہِ والا کو چھوڑ کے
صاحب کدھر چلے گئے آقا کو چھوڑ کے

صاحب سکینہ جان بلکتی ہیں آئیے
کانٹے زباں کے دیکھ کے آنسو بہائیے
صدقے گئی بھتیجی کو پانی پلائیے
قربان جاؤں مشک بھری ہو تو لائیے
الفت کے دلدہی کے منافی نہ چاہیئے
صادق ہیں آپ وعدہ خلافی نہ چاہیئے

کل تھی سہاگن آج تو میں سوگوار ہوں
بیوہ ہوں جاں بلب ہوں غریب الدیار ہوں
جانِ علی ہیں آپ تو میں جاں نثار ہوں
ہاں ناز ہے تو یہ ہے کہ خدمت گزار ہوں
جنگل میں چھوڑیئے نہ مجھے ہاتھ تھام کے
بیٹے ہیں آپ امام کے بھائی امام کے

والی کہاں یہ رانڈ یتیموں کو لیکے جائے
اس کربلا نے لوٹ لیا مجھ کو ہائے ہائے
اب گھر سے کام کیا جو رضا سوگوار پائے
سر پیٹتی ہوئی لبِ دریا کنیز آئے
کیا اس کی زندگی جسے وارث سے یاس ہو
میری بھی قبر آپ کی تربت کے پاس ہو

ہے ہے علم کے ملنے کی شادی کہوں ہیں کیا
خضر ان کو مل گئے علمِ سبز کیا ملا
باہر سے پہلے آ کے مرے پاس یہ کہا
تھی جس کی آرزو ہمیں عہدہ وہی ملا
صدقے سے شہ کے جعفرِ طیار ہم ہوئے
صاحب تمھیں خبر ہے علمدار ہم ہوئے

میں نے بلائیں لیکے پس از تہنیت کہا
آقا کو اور تم کو سلامت رکھے خدا
سردار فیض بخش علمدار باوفا
بولے یہ سب حسین کی ہے شفقت و عطا
کیا کیا نوازشیں ہیں امامِ غیور کی
لے آؤ تم بھی جا کے بلائیں حضور کی

کہتے تھے شب کو بھر کے دمِ سرد دم بدم
تم ہم کو چاہتی ہو تمھیں چاہتے ہیں ہم
سو سر خدا جو دے تو نثار شہِ امم
گر ہے تو بس تمھاری جدائی کا ہے الم
کل ہم ہیں اور خنجر و شمشیر و تیر ہیں
اس کا بھی غم بڑا ہے کہ بچے صغیر ہیں

کیسی غفلت آج ہے ای شیرِ حق کے لال
بچوں کی اب نہ فکر نہ لونڈی کا ہے خیال
بھاتی تھی جس کے بالوں کی بو آپ کو کمال
اُس نے تمھارے سوگ میں کھولے ہیں سر کے بال
اب وصل کے نہ دن نہ شبیں اشتیاق کی
کیونکر کٹیں گی دشت میں راتیں فراق کی

صاحب تمھیں تو سونے کو ہاتھ آئی خوب جا
دریا کا قرب سرد ترائی خنک ہوا
میں اور آپ آج کی شب تک نہ تھے جدا
بستر کو خالی دیکھ کے گزرے گی مجھ پہ کیا
تڑپوں نہ کس طرح کہ نئی واردات ہے
صدقے گئی فراق کی یہ پہلی رات ہے

ہے ہے مرے نصیب کہ تم سے بچھڑ گئی
غم ہے کہ کیوں نہ میں دمِ رخصت بگڑ گئی
کن راحتوں میں تھی کہ مصیبت یہ پڑ گئی
والی مجھے بلاؤ کہ دنیا اجڑ گئی
کیا راہ و رسم ہے یہی دنیائے زشت میں
لونڈی تو قید خانہ میں صاحب بہشت میں

کیونکر کہوں کہ آپ میں مہر و وفا نہ تھی
میری ہی خاک قابلِ خاکِ شفا نہ تھی
اتنا گلہ ہے بس کہ یہ غفلت روا نہ تھی
کیا پائنتی بھی اک مری تربت کی جا نہ تھی
بے وجہ خیر خواہ سے مونھ موڑتے نہیں
ساتھی بُرا بھی ہو تو اُسے چھوڑتے نہیں

یوں مونھ کو موڑنا تو طریقِ وفا نہیں
صدقے گئی مرا تو کوئی آسرا نہیں
کیونکر سکھے جہاز موافق ہوا نہیں
منجدھار میں تو ناؤ ہے اور ناخدا نہیں
دیتی ہوں واسطہ میں شہِ مشرقین کا
والی مجھے نباہیے صدقہ حسین کا

صاحب تمھیں سکینۂ ناشاد کی قسم
صاحب تمھیں مصیبتِ سجّاد کی قسم
تم کو حسینِ کشتۂ بیداد کی قسم
تم کو ہمارے نالہ و فریاد کی قسم
جب تم نہ ہو تو خاک ہے دنیائے زشت میں
مجھ کو بھی اپنے پاس بُلا لو بہشت میں

یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی سر وہ سوگوار
ڈیوڑھی پہ آئے روتے ہوئے شاہِ نامدار
بھاوج کے ہاتھ تھام کے بولے بحالِ زار
بس بس خدا کو یاد کر اب اے جگر فگار
انجام کار سب کے لئے مرگ و گور ہے
بی بی خدا سے کیا کسی بندے کا زور ہے

بس اے انیسؔ طول کی آگے نہیں ہے تاب
طاری ہے ضعف دبتی ہے طاقت بھی بے جواب
بلواؤ خاکسار کو یا ابنِ بو تراب
ڈر ہے کہ ہند میں مری مٹی نہ ہو خراب
جلوہ رہے مزار پہ مولا کے نور کا
خاکِ شفا میں قبر ہو صدقہ حضور کا

رباعی

نافہم سے کب دادِ سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوئے بوستانِ یکرنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

رباعی

چل جلد اگر قصدِ سفر رکھتا ہے
تو کچھ بھی آل کی خبر رکھتا ہے
راحت دنیا میں کس نے پائی ہے
جو سر رکھتا ہے دردِ سر رکھتا ہے

مرثیہ (۱۱)

جس دم حسینؑ دلبرِ شبّرؑ کو رو چکے
پالا تھا جس کو اس مہِ انور کو رو چکے
دل پر ہجومِ حسرت و اندوہ و یاس تھا

رعشہ تنِ ضعیف میں لب خشک رنگ زرد
چھینٹیں قبا پہ خون کی بھٹیں گیسوؤں پہ گرد
غم تھا کہ ابنِ فاطمہ آفت میں کیا کرے

بھرتے تھے آہِ سرد کبھی تھام کر جگر
تکتے تھے مسکرا کے کبھی جانبِ پسر
وہ نونہال اور یہ بھولے پھلے ہوئے

ماتم ادھر تھا فوج کے باجوں کی دھوم ادھر
باہم تھے سرکشانِ رے و شام و روم ادھر
ہر شخص نعمتوں سے ادھر کامیاب تھا

عباس چاہتے تھے کہ پہلے ہوں ہم نثار
بھائی کے غم میں روئیں آقائے نامدار
جاتا ہی وقت ہاتھ سے گر اب فدا نہ ہوں

اٹھتا ہے اہلِ بیت سے جب شورِ العطش
کرتے ہیں عرض شہ سے علمدارِ باہوش
کس سے کہیں جو قلب پہ صدمے گزرتے ہیں

غربت میں یادگارِ برادر کو رو چکے
صفدر کو تشنہ لب کو دلاور کو رو چکے
ایک بھائی اور ایک پسر شہ کے پاس تھا

سینے میں گاہ ہوک اٹھی گاہ دل میں درد
خالی پروں کو دیکھ کے بھرتے تھے آہِ سرد
اب ہم سے دیکھیے کسے قسمت جدا کرے

روتے تھے گاہ زانوئے اقدس پہ رکھ کے سر
کرتے تھے یاس سے کبھی عباس پر نظر
حضرت کی ایک گود کے دونوں پلے ہوئے

یاں بے کسی تھی فوجِ عدو کا ہجوم ادھر
زر بانٹتا تھا خود پسرِ سعدِ شوم ادھر
گرمی میں تین روز سے یاں قحطِ آب تھا

اکبر کا عزم تھا کہ بس اب سر ہے تن پہ بار
عمو سے پہلے جائیں ہم بہرِ کارزار
حضرت یہ چاہتے ہیں کہ دونوں جدا نہ ہوں

شہ کہتے ہیں قریبِ ہلاکت ہیں فاقہ کش
شاید سکینہ جان کو پھر آگیا ہے غش
افسوس ہم تو جیتے ہیں معصوم مرتے ہیں

دیکھا ہے جب سے لاشۂ قاسم کو پائمال
چھریاں جگر پہ چلتی ہیں یا شاہِ خوش خصال
گر قبلۂ امم سے ملے رخصتِ جدال
دشتِ نبرد کو ابھی کر دیں لہو سے لال
روکے غلام کو یہ کسی کا جگر نہیں
دریا نہ چھین لیں تو علی کے پسر نہیں

جائیں جدھر لہو کی ادھر ندیاں بہائیں
ظالم کسی پرے میں سلامت نظر نہ آئیں
کاٹے سروں کے ٹھوکریں اک اک قدم پہ کھائیں
مشکیزہ بھر نہ لیں تو نہ منہ آپ کو دکھائیں
چھوٹے نہ تیغ ہاتھ سے جب تک کہ دم رہے
چھاتی پہ مرتے وقت بھی مشکِ علم رہے

شہ نے کہا کہ اس میں کسی کو ہے کیا کلام
تم غیظ میں جو آؤ تو ہل جائے روم و شام
بھائی مگر یہ غیظ و غضب کا نہیں مقام
میری تو یہ دعا ہے کہ ہو صابروں میں نام
پہلے مروں میں تم نہ اگر سدِ راہ ہو
مجھ کو نہیں قبول کہ امت تباہ ہو

بولے بہا کے اشک علمدارِ نامدار
ہل من مبارز کی ہے اس فوج میں پکار
ہاں ایک شاہزادہ ہے اور ایک جاں نثار
آخر حضور دیں گے کسے اذنِ کارزار
دیکھیں تو آپ ان کے نشانوں کے اوج کو
اتنا تو ہو کوئی کہ نہ بڑھنے دے فوج کو

شہ نے کہا انھیں بھی تو ہے شوقِ جنگ کا
غازی نے کی یہ عرض کہ یا شاہِ کربلا
اچھا بہادری علی اکبر کو دی رضا
انصاف کیجیے مجھے خلقت کہے گی کیا
کس منہ سے پاس جاؤں گا خیر الانام کے
جب شاہزادہ قتل ہو آگے غلام کے

بانو کی روح جسمِ شہِ بے وطن کی جان
دنیا کی زیب آلِ رسولِ زمن کی جان
چھوٹے بڑوں کی آنکھ کا تارا بہن کی جان
پامال ہو وہ گل جو ہے سارے چمن کی جان
اس زندگی پہ خاک اگر ایک دم جئیں
ہم شکلِ مصطفےٰ تو نہ ہو اور ہم جئیں

شہ نے کہا کہ پھر مجھے کھانے دو تیغ و تیر
تم سا جوان قتل ہو جیتا رہے یہ پیر
تم یادگارِ شیرِ خدا شاہِ قلعہ گیر
ہم صورتِ رسولِ خدا یہ مہِ منیر
سمجھے ہو سہل تم مجھے مشکل ہے کیا کروں
دو داغ اور ایک مرا دل ہے کیا کروں

تم ہو گئے تو تباہ نہ ہوگا ہمارا گھر
عابد کو بیڑیاں نہ پنھائیں گے اہلِ شر
عریاں نہ ہوں گے بلوے میں سیدانیوں کے سر
زینب کو شام میں نہ پھرائیں گے دربدر
بچ جائیں گے سبھوں کے گلے ریسمان سے
بُندے نہ پھر چھنیں گے سکینہ کے کان سے

کہنے لگے یہ رو کے علمدارِ ذی حشم
میرا ہے افتخار نگہبانیِ حرم
کرتے ہیں گر سپرد یہ عہدہ شہِ امم
بہتر ہے پھر کسی کو عنایت ہو یہ علم
نام و نشاں سے کام نہ دنیا سے کام ہے
مجھ کو رضائے سیدِ والا سے کام ہے

سمعاً و طاعۃً ہمیں کیا آبرو سے کام
کچھ عرض کی مجال نہ تکرار کا مقام
بہتر ہے بیڑیاں بھی پہن لے گا یہ غلام
کھولوں سلاحِ جنگ اجازت جو دیں امام
آقا کریں عتاب نہ گر جاں نثار پر
جا بیٹھوں منہ چھپا کے علی کے مزار پر

رونے لگے یہ سن کے شہنشاہِ بحر و بر
عباس آئے خیمہ کے اندر جھکائے سر
سیدانیاں یہ کہنے لگیں تھام کر جگر
کیا ہے جو روتے آئے ہیں عباسِ نامور
اکبر کی خیر ہو شہِ والا کی خیر ہو
یارب وطن میں فاطمہ صغرا کی خیر ہو

سب بی بیاں تھیں گردِ علمدارِ نامدار
جو پوچھتا تھا اور یہ روتے تھے زار زار
کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ ذی وقار
صاحب کہو تو کچھ کہ میرا دل ہے بے قرار
آنکھوں سے اشک بہتے ہیں چہرہ بھی لال ہے
مقتل میں کیا ہوا جو تمھارا یہ حال ہے

لیکر بلائیں کہتی تھی بانوے شاہِ دیں
بھیا بتاؤ خیر سے ہیں اکبرِ حزیں
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباس مہ جبیں
ہے خیریت حضور نہ گھبرائیں کچھ نہیں
کرتا نہیں مدد کوئی لاکھ التجا کریں
جو بدنصیب ہو وہ نہ روئیں تو کیا کریں

بنتِ علی کے پاس جو پہونچا وہ سیم بر
ماتم کی صف پہ رکھ دئیے ہتھیار کھول کر
گھبرا کے بولی زینبِ ناشاد و نوحہ گر
عباس کیا ہے کھولتے ہو کس لئے کمر
اب تو کوئی لڑے گا نہ بیکس امام سے
کیوں بھائی صلح ہو گئی کیا فوجِ شام سے

رونے کی وجہ کیا ہے سمجھتا ہے میرا دم — قاسم کے غم میں کیا ہوا کچھ اور تازہ غم
بہتے ہیں اشک نرگسی آنکھوں سے دم بدم — بولو تو کچھ حسین کے سر کی تمھیں قسم
آخر کھلے گا سب پہ کوئی واردات ہو — مجھ سے الگ کہو جو چھپانے کی بات ہو

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش خصال — وہ کونسی ہے بات کہ جس کا ہے یہ ملال
قسمیں جناب دیتی ہیں تم کو نہیں خیال — صاحب بڑی بہن سے کہو اپنے دل کا حال
صدقہ انھیں کا سب ہے کہ پھولے پھلے ہو تم — بیٹوں کی طرح گود میں ان کی پلے ہو تم

قدموں پہ سر جھکا کے یہ عباس نے کہا — کیونکر نہ روؤں قتل ہوئے خویش و اقربا
میرا کفیل کوئی نہیں آپ کے سوا — مجھ کو حسین مرنے کی دیتے نہیں رضا
میرا نہیں خیال شہِ خاص و عام کو — دیتے نجف میں جانے کی رخصت غلام کو

فرماتے ہیں کہ اکبرِ مہر و وفا کو جائیں — بچے ہوں کل میاں شہادت ہمیں نہ پائیں
دیکھیں کفن شہید یہ دل ہم کہاں سے لائیں — پردہ اسی میں اب ہے کہ عالم سے منہ چھپائیں
کب اُٹھ گئے جہاں سے کسی کو خبر نہ ہو — اُس بن میں جا رہیں کہ بشر کا گزر نہ ہو

زینب نے تب کہا کہ یہ آزردگی ہے لو — معلوم اب ہوا مجھے مطلب ہے ان کا جو
کیونکر کہوں کہ بھائی کو مرنے کا اذن دو — اچھا بلا کے کہتی ہوں آگے جو ہو سو ہو
رونا اِدھر اُدھر کو غریبی و یاس ہے — ان کا بھی درد ہے مجھے اُن کا بھی پاس ہے

مشکل مجھے ہے کس سے کہوں اپنا حالِ زار — وہ ماں کی جان روح یہ بابا کی یادگار
بیکس بہن سے پوچھے کوئی بھائیوں کا پیار — کیونکر جئیں گے ہائے شہنشاہِ نامدار
کہتے ہیں موت خلق میں سب بس جدائی کو — یارب مفارقت نہ ہو بھائی سے بھائی کو

زاری ادھر تھی اور پریشان تھا سب کا حال — آیا اُدھر حسین کو عباس کا خیال
ہمشکل مصطفےٰ سے یہ بولا علی کا لال — آزردہ ہو گئے ہیں علمدارِ خوش خصال
بیتاب دل ہے چھاتی سے لپٹائیں بھائی کو — آؤ حرم میں چل کے منا لائیں بھائی کو

اکبر کا ہاتھ تھام کے گھر میں حسین آئے
دیکھا کھڑے ہیں حضرت عباس سر جھکائے
پھیلا کے ہاتھ لب پہ شہِ دیں سخن یہ لائے
آؤ گلے لگو کہ دلِ زار چین پائے
تم تو عزیز ہو مجھے اس نورِ عین سے
کس بات پر خفا ہوئے بھائی حسین سے

عباس ہاتھ جوڑ کے بولے کہ کیا مجال
ہیں شبّرِ کبریا کی جگہ شاہِ خوش خصال
کیا ذکر ہو ملال کا ای فاطمہ کے لال
عاجز ہوں شکر میں جو زباں ہوں تن کے بال
حضرت غلام کہہ کے پکاریں تو شاد ہوں
مادر مری کنیز ہے میں خانہ زاد ہوں

حضرت کے منہ کو دیکھ کے زینب نے یہ کہا
آپ ان پہ شیفتہ ہیں یہ ہیں آپ پر فدا
صدقے بہن ہو بھائی انھیں دیجیے رضا
دنیا میں اور بھی ہے کوئی ایسا با وفا
مثلِ علی جہاں کے شجاعوں کے تاج ہیں
ظاہر ہے آپ پر کہ یہ نازک مزاج ہیں

واں ہے وفا طلب سپہِ خانماں خراب
ان کو کسی کی بات کے سننے کی کب ہے تاب
حضرت کے ڈر سے دے نہیں سکتے ہیں کچھ جواب
غصّہ بھی ہے اور ہے بھی ان کو پیچ و تاب
بگڑیں تو پھر بپا ہو قیامت جہان میں
رونا یہ ہے کہ آتا ہے فرق آن بان میں

اکبر کو آپ بھیج دیں گر سوئے فوجِ شام
ہو جائیں دشمن ان کے تڑپ کر ابھی تمام
مطلب یہ ہے کہ فوج پہ چمکے مری حسام
دنیا میں مجھ سے بڑھ کے نہ ہو پھر کسی کا نام
پہلے ہیں حسین پہ سر کو فدا کریں
پالا ہے دکھ سے اب انھیں کیونکر جدا کریں

نیّت سفر پہ باندھی ہے ہتھیار کھول کر
بہنوں کی بیکسی پہ بھی اب تو نہیں نظر
کیا آپ نے کہا تھا کہ اکبر کٹائے سر
مجھ کو بھی یقیں نہیں ہے یا شاہِ بحر و بر
پھرتے ہیں حواس ان کے تڑپنے نے کھوئے ہیں
روئی ہوں میں بھی ہاتھ یہ اس طرح دھوئے ہیں

کیونکر زباں سے میں کہوں میں جگر فگار
ضد ہے یہی کہ جلد ملے اذنِ کارزار
حضرت یہ ان کے دل کا تو مطلب ہے آشکار
خیر اب خوشی انھیں کی کریں شاہِ نامدار
صفدر ہیں جان دینے کو کچھ جانتے نہیں
غصّے میں یہ تو بات کوئی مانتے نہیں

شہ نے کہا کہ بس ہے اسی بات کا ملال
قسمت میں ہے کہ یہ بھی نہ ہوں وقتِ انتقال
قاتل ہو زخمی چھاتی پہ خنجر ہو پیاس ہو
ہم چاہتے ہیں ساتھ جئیں ساتھ ہی مریں
تلواریں کھا کے ایک جگہ خون میں بھریں
مشتاق ہیں بہشت کے حوروں کے قصر کے
سب اہل بیت رونے لگے سن کے یہ کلام
تقصیر بخشئے مری اے شاہِ تشنہ کام
بھائی سے دل بُرا کہیں ہوتا ہے بھائی کا
لائیں سلاح سامنے زینب بچشمِ تر
تسلیم کی ادب سے جری نے جھکا کے سر
غم چھا گیا اُمید چلی یاس رہ گئی
لیکن علم اُدھر سے بڑھا دو فلک جناب
گھوڑے پہ جلوہ گر جو ہوئے مثلِ آفتاب
اسوار بے نظیر فرس بے مثال تھا
مطلع
آمد علی کے شیر کی ہے رزم گاہ میں
ہر چند ابھی سواری صفدر ہے راہ میں
غل ہے وہ شیر قصد کیے ہے ترائی کا
یوں چھیڑتے فرس کو ہر اک بن میں آئے
اس دبدبے سے لشکرِ پیماں شکن ہیں نے
جنگل کے شیر صورتِ آہو دبک گئے

لیں اذنِ جنگ خیر سدھاریں پئے جدال
تنہا مسافرت میں مرے فاطمہ کا لال
کٹنے لگے جو حلق تو کوئی نہ پاس ہو
مرنے لگیں جو ہم تو یہ زانو پہ سر دھریں
خیران کی جو خوشی یہی پہلے سفر کریں
یہ قبلِ ظہر پہنچیں گے ہم بعد عصر کے
قدموں پہ شہ کے جھک کے یہ بولا وہ نیک نام
چھاتی سے سر لگا کے یہ کہنے لگے امام
یہ روٹھنا فقط تھا بہانہ جدائی کا
پٹکا اُٹھا کے شہ نے کہا باندھیے کمر
ہتھیار سج کے خیمے سے نکلا وہ نامور
بس سر جھکا کے زوجۂ عباس رہ گئی
خادم اُدھر سے لائے فرس کو بصد شتاب
نورِ قدم سے چاند بنے حلقۂ رکاب
جو نعل کا نشاں تھا زمیں پر ہلال تھا
دہشت سے تہلکہ ہے عدو کی سپاہ میں
بجلی چمک رہی ہے عدو کی نگاہ میں
پھر معرکہ ہے آج علی کی لڑائی کا
جیسے نسیمِ فصلِ بہاری چمن میں آئے
اک شور پڑ گیا اسد اللہ رن میں آئے
جتنے بڑھے ہوئے تھے پرے سب سرک گئے

اللہ رے رعب حضرت عباس عرش جاہ — صف پر گریں صفیں تہ و بالا ہوئی سپاہ
دیکھا جدھر شکار پہ کی شیر نے نگاہ — ہٹ ہٹ گئے جو نہر کو روکے تھے روسیاہ
کھایا نگہ کا تیر اگر آنکھ چار کی — دکھلادی ابروؤں نے برش ذوالفقار کی

کاندھے پہ ساتھ مشک و علم پشت پر سپر — وہ تیغ تیز دم میں جو سر کردے مہم کو سر
وہ تیر الحفیظ کماں وہ کہ الحذر — وہ ضرب گرز توڑ دے جو کوہ کی کمر
وہ ڈھال روک لے جو تہمتن کے وار کو — نیزہ وہ جو فرس سے اٹھا لے سوار کو

سر پر وہ خود گرد چھپے جس کے آفتاب — نور جبیں سے بدر فلک قدر کو حجاب
بیت ابروؤں کی حسن کے دیواں میں لاجواب — جو خال مشکبیز کا نقطہ وہ انتخاب
مر جائے شیر پر جو پڑے اس ولی کی آنکھ — آنکھوں کو دیکھیے تو بعینہ علی کی آنکھ

قرآن و رحل وسے مبین و خط سیاہ — ظلمت میں آفتاب ہے یا جوف شب میں ماہ
سوکھے لبوں پہ برگ گل تر کا اشتباہ — مدح دہن میں لب نہیں ملتی سخن کو راہ
ایسا دقیق اور معما کہیں نہیں — موجود اسم ہے پہ مسما کہیں نہیں

کیونکر کہیں کہ غنچۂ تصویر زرد ہے — یاں یاسمن بھی فرط خجالت سے زرد ہے
کس طرح منقسم ہو وہ جوہر جو فرد ہے — حیراں خیال فلسفی ہرزہ گرد ہے
میزان عقل میں حکما کے تلا نہیں — یہ وہ طلسم ہے جو کسی سے کھلا نہیں

دانتوں میں وہ چمک کہ نظر کو نہیں ہے تاب — خود جس کی برق و شرق سے آنکھ میں حجاب
کیا ان کے سامنے گہر بے بہا کی آب — دعویٰ ہو کچھ تو دوں بھی دنداں شکن جواب
گر منہ سے دُر کہوں تو فصاحت سے دور ہے — دانا کو آبرو کی حفاظت ضرور ہے

شانوں کو آفتاب اگر کیجیے رقم — ذرّے سے آفتاب جہاں تاب یاں ہے کم
لو کاٹتا ہے غیظ سے اپنی زباں قلم — یہ وہ ہے جس پہ فوج خدا کا رہا علم
کون ایسا نوجواں تھا خدا کے ولی کے بعد — بے شک علم انھیں کے لیے تھا علی کے بعد

شانے وہ گول گول وہ بازو بھرے بھرے
پہنچوں کے زور سے تہ و بالا ہوئے پرے
ضو ان ہتھیلیوں کی کہاں آفتاب میں
سینہ وہ آئنہ ہے کہ صدق و صفا کا گھر
سینے میں اس طرح ہے دلِ باوفا کا گھر
کعبہ ہے گو زمیں پہ مگر عرش قدر ہے
قرباں ہیں ثباتِ قدم پہ ہزار سر
اعدا جو لاکھ ہوں تو کریں ایک بار سر
نقش اس قدم کا خاک پہ رہتا ہے اس طرح
ناگہ صدا بلند ہوئی طبلِ جنگ کی
نکلے نقیب اور یہ صدا بے درنگ کی
نامی جوان وہ ہے جو لڑے اس دلیر سے
جنباں بڑھائے دل تو سواروں کے دل بڑھے
ہر صف سے یوں اولے ہوئے تیغوں کے پھل بڑھے
تنہا تھا وہ صفیں تھیں بہم جس کے واسطے
الٹی علی کے شیر نے بھی آستیں ادھر
ظاہر ہوا جلالِ جہاں آفریں ادھر
صف پر جو صف گری تو ہٹائے سوار پر
یوں تیغِ شعلہ زا نکل آئی نیام سے
جس طرح برق ابر سے معنی کلام سے
آئینہ ظفر تھا کہ نکلا غلاف سے

فرقت میں جن کی حور نہ تکیہ پہ سر دھرے
پنجہ وہ جس کو دیکھ کے شیرِ ژیاں ڈرے
وہ انگلیاں رسا ہیں جو خیبر کے باب میں
مسکن ادب کا علم کا ماخذ حیا کا گھر
جس طرح سب گھروں میں مقدس خدا کا گھر
دل صدر میں ہے صدرِ جہاں ہے وہ صدر ہے
رکھتا ہے فخر جس پہ بصد افتخار سر
سر کیں نہ اور کٹ کے گریں بے شمار سر
مٹتا نہیں کبھی خطِ تقدیر جس طرح
جو تھے بہادر اُن کے لہو نے اُمنگ کی
باگیں اُٹھا دو اسپِ کمیت و سرنگ کی
اب سامنا ہے شیرِ الٰہی کے شیر سے
گرز اپنے تول تول کے لشکر کے یل بڑھے
جس طرح قبضِ روح کو دستِ اجل بڑھے
یہ صبر کہ تھا اک متنفس کے واسطے
قبضے پہ ہاتھ اُدھر گیا کانپی زمیں ادھر
آیا جلال میں اسدِ خشمگیں ادھر
گویا علی نے ہاتھ رکھا ذوالفقار پر
نکلی بیاضِ صبح شبِ تیرہ فام سے
چہرہ دکھایا حور نے دارالسلام سے
کھینچا پری کو تیغِ سلیماں نے قاف سے

چمکی جو تیغ برقِ جہندہ بنا سمند
خود آگ تھا وہ رخش تو سیماب جوڑ بند
آہو جو خاک پر تو ہوا کی طرف پرند
اسوار کو چھپا لیے وغا میں وہ سربلند
ہر نعل و سم کو فوق تھا بدر و ہلال پر
طاؤس و کبک وجد میں تھے اُس کی چال پر

گھوڑا کہیں پرند کسی جا پری کہیں
تیروں نے اُس سے رَوِش کی ہمسری کہیں
آہو کہیں ہما کہیں کبکِ دری کہیں
نرمی کہیں شتاب کہیں صفدری کہیں
رکھتا تھا معرکہ میں قدم اس وقار سے
جیسے چمن میں پھول گرے شاخسار سے

کلک اُس کے ہاتھ پاؤں کو لکھے تو کیا لکھے
خوبے سعادتی ہے جو بالِ ہما لکھے
مردم ہوا پرست کہیں گرم ہوا لکھے
مشہور نارسا ہو جو ذہنِ رسا لکھے
ناقص کہیں جو طالبِ تشبیہ تام ہیں
یہ سب اُسی کے غاشیہ داروں کے نام ہیں

پریاں نثار ہوتی ہیں چال اُس کی دیکھیے
سرعت دمِ جدال و قتال اُس کی دیکھیے
حوروں کے بال دیکھیے یال اُس کی دیکھیے
کیا حسن ہے رکاب و دوال اس کی دیکھیے
روشن ہیں پتلیاں کہ قدم اس جری کے ہیں
آنکھیں یہ حور کی ہیں وہ گیسو پری کے ہیں

آغازِ جنگ میں وہ تگ و دو وہ آؤ جاؤ
جاتا تھا یوں اُتار ہو رستے میں یا چڑھاؤ
گھونگھٹ نیا تھا چال نئی تھی نیا بناؤ
جیسے ہوا میں جاتی ہے آبِ رواں پہ ناؤ
تھا صاحبِ علَم بھی جو جدل پر تُلا ہوا
کشتی کا بادبان تھا پھریرا کھُلا ہوا

ڈھالوں کو روکتے تھے جوانانِ پُر جگر
وہ اُڑ گئیں کلائیاں دھڑ سے گرا وہ سر
بجلی گری پڑے گی تو پھر کیا کرے سپر
بازو ہوا وہ قطع وہ دو ہو گئی کمر
وہ آتشِ فساد و غضب خاک ہو گئی
سینہ وہ کٹ گیا وہ زرہ چاک ہو گئی

جب سن سے وہ چلی تو گرے سر زمین پر
وہ تیغ دم نہ لے کہیں دم بھر زمین پر
سر تھے کسی جگہ کہیں پیکر زمین پر
جبریل بھی بچھائیں اگر پر زمین پر
فتح و ظفر حسامِ دو دستی کے ساتھ ہے
دستِ خدا کے جوشنِ بازو کا ہاتھ ہے

وہ برق جب اِدھر سے اُدھر جا کے پھر گئی
خوں پی کے سر گرا کے صفیں کھا کے پھر گئی
بے جان اسے کیا اُسے تڑپا کے پھر گئی
تھی اک چھری کہ حلق پہ اعدا کے پھر گئی
چڑھتے ہی رن پہ نشۂ جرأت اتر گئے
دیکھا نہ صاف منہ اسی حسرت میں مر گئے

یوں تھیں صفیں کہ موج کے پیچھے ہو جیسے موج
تھا دم بدم شناورِ دریائے خوں کو اوج
چکر میں تھی بصورتِ گرداب ساری فوج
تلوار فرد فرد کو کرتی تھی زوج زوج
بیدم ہیں وہ جو تیغ دودم سے دوچار ہیں
گر چار ہیں تو آٹھ جو دو ہیں تو چار ہیں

غصہ ستم تھا قہر غضب تھا جفا نئی
اُڑتے تھے سر تنوں سے چلی تھی ہوا نئی
مضموں نئے ہیں بندشِ مہر و وفا نئی
تیزی نئی ہے چال نئی ہے ادا نئی
جیسے ورق ہوا سے پرے یوں اُلٹتے ہیں
سو سو گلے اشارۂ ابرو میں کٹتے ہیں

فوجوں میں ابتری تھی علی کے طفیل سے
سیفی سے صاف تیز دعائے کمیل سے
جوہر کہیں فزوں تھے ضیا میں سہیل سے
ہاتھوں بڑھی ہوئی تھی روانی میں سیل سے
نازل تھا قہر منزلِ ہستی خراب تھی
گھر گر رہے تھے کفر کے بستی خراب تھی

اعدا کے حق میں ہو گیا آبِ حسام سم
کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم
نیزے تھے خوف سے صفتِ چوبِ خام خم
ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم
دشمن بھی معترف تھے وہ پیکار کر گئے
مقتل سے اُڑ کے تا سرِ کہسار سر گئے

اک آگ تھے کہ خاک میں سب کو ملا گئے
سم ہو گیا اُسے جسے پانی پلا گئے
آئے جدھر زمین کے طبقے ہلا گئے
زخموں کے پھول نخلِ بدن پر کھلا گئے
تیروں کو بلبلوں کا نشیمن بنا دیا
رن کی زمینِ شور کو گلشن بنا دیا

رہوار پھر رہا تھا طرارے اِدھر اُدھر
سب بھاگتے تھے خوف کے مارے اِدھر اُدھر
اُڑتے تھے اُس کے دم سے شرارے اِدھر اُدھر
دُنبالہ دار گرتے تھے تارے اِدھر اُدھر
دریا پہ ہاتھ دھوئے تھے سب اپنی جان سے
تلوار کیا برستی تھی آگ آسمان سے

شمشیر زن کے ہاتھ میں دستِ خدا کا زور
کس بل غضب کا قہر کی ضربت بلا کا زور
مرحب سا اتنی فوج میں اک نامور نہیں
حسرت رہی وغا کی دلِ حق پسند کو
پستی میں لاؤں اوج سے کس سربلند کو
دو ٹکڑے کر دوں رستمِ دستاں سے گبر کو
جم کر لڑو صفوں کی صفائی تو دیکھ لو
ابن علی کی قلعہ کشائی تو دیکھ لو
سرسبز ہوں میں تیغِ دو دم سرخرو رہے
ہر بار رن پہ رن پڑے ایسی نبرد ہو
تھرائے آسمان رخِ خورشید زرد ہو
بالائے دوش مشک ہے تلوار ہاتھ میں
یہ سن کے واں کی فوج سے اک پہلوان بڑھا
نیزہ بڑھا ادھر سے ادھر سے نشاں بڑھا
دیکھا جو نعرہ مار کے اس بدخصال کو
نیزہ ادھر ادھر سے بصد کر و فر تُلا
ہوتا ہے کیا ہزار کرے فوج غلغلہ
تھی چوٹ پر جو چوٹ تو کاں پر کماں تھی
جوڑا بچا کے سر کو ستمگر نے دو سے تیر
زخمی ہوا نہ صدر نہ گزرا زرہ سے تیر
سرزد خطا یہ کیا ہوئی ششدر شریر تھا

پہونچا تھا ہاتھوں ہاتھ جسے مرتضیٰ کا زور
نعرہ یہ تھا کہ مجھ میں ہے مشکل کشا کا زور
کیونکر کھلے یہ زور کہ خیبر کا در نہیں
کھولا نہ ایک نے مرے نیزہ کے بند کو
خندق میں عمر ہو تو اڑا دوں سمند کو
پٹکے سے باندھوں مثلِ علی ہاتھ دو کے
گردن کی اور سروں کی جدائی تو دیکھ لو
پیاسے مسافروں کی لڑائی تو دیکھ لو
تم کو ہوس رہے نہ مجھے آرزو رہے
ہنگامہ گرم ہو کہ نہ بازار سرد ہو
بڑھنے نہ دو مجھے تو یہ جانوں کہ مرد ہو
دریا کا گھاٹ لیتا ہوں دو چار ہاتھ میں
گویا کہ جھومتا ہوا پیلِ دماں بڑھا
پنجہ اٹھا کے صید پہ شیرِ ژیاں بڑھا
سمجھے یہ سب اسد نے دبوچا غزال کو
باندھا ادھر جو سب نے شقی نے ادھر کھلا
یہ موجِ بحرِ قہر وہ پانی کا بلبلہ
نیزہ میں نوک تھی نہ کلائی میں جان تھی
تھرا رہا تھا شورِ تکبیر دہ سے تیر
گوشے کماں کے کٹ گئے ٹوٹا گرہ سے تیر
اوچھے سے وار میں نہ کماں تھی نہ تیر تھا

ظالم پکارا تول کے پھر گرز گاؤسر — اس کی ہوا لگے تو بسلامت بچاؤ سر
ممکن نہیں کہ خاک پہ گر کر اٹھاؤ سر — ہاں نورِ چشمِ حیدرِ صفدر بچاؤ سر
رستم سا پہلوان ہو تو جی اس کا چھوٹ جائے — ایک اس کی ضرب میں کمرِ کوہ ٹوٹ جائے

عباس نے کہا کہ خموش اے زباں دراز — گو میں ضعیف ہوں پہ توانا ہے کارساز
اللہ خاکسار کو کرتا ہے سرفراز — کیا گرز گاؤسر کی حقیقت ہے او گراز
برہم اگر ہوں لالِ شہِ قلعہ گیر کے — پھینکیں زمیں پہ کلّۂ اژدر کو چیر کے

بے شرم راستبازوں سے یہ کج ادائیاں — کیا تجھ سے گاؤ زور سے زور آزمائیاں
نیکوں سے ہے بدی یہ بھلوں سے برائیاں — ہم توڑ ڈالتے ہیں اسد کی کلائیاں
ضیغم ونہنگ کے بیشۂ حیدر میں آتے ہیں — یاں کے غزال شیر کو آنکھیں دکھاتے ہیں

مارا جھپٹ کے گرزِ گراں روسیاہ نے — روکا سپر پہ ضرب کو اس دیں پناہ نے
پکڑی کلائی ہاتھ سے بازوئے شاہ نے — چھوٹی نہ لاکھ زور کیا روسیاہ نے
نقصانِ جاں بھی دست درازی کے ساتھ ہو — چھوٹے نہ گرز کو تو نہ بازو نہ ہاتھ ہو

جب چٹکے انگلیوں سے ٹپکنے لگا لہو — پہنچا سزا کو میں یہ پکارا وہ کینہ جو
بولے یہ ہاتھ چھوڑ کے عباسِ نیک خو — پھر کیجیو نہ لاف زنی میرے روبرو
تو ہاتھ جوڑتا ہے تو منہ موڑتا ہوں میں — صیدِ زبوں سمجھ کے تجھے چھوڑتا ہوں میں

یہ گھات چھین کر ہمیں بھرنی ہے مشکِ آب — تڑپا رہا ہے قلب کو بچوں کا اضطراب
تلوار جلد کھینچ لے او خانماں خراب — رکتا ہے کیوں لڑائی کا ہو فیصلہ شتاب
مشکل کشا کی تیغ کا یہ فیض عام ہے — جب چار ہاتھ چل گئی قصہ تمام ہے

جب اس طرح سے چل گئے تیغِ زباں کے وار — تیغِ دودم کو تول کے آیا وہ نابکار
رد کر کے چند وار صدا دی کہ ہوشیار — شمشیر سر پہ آئی کہ ہر حسب پہ ذوالفقار
سب غول چار آئنہ والوں کا دنگ تھا — سر تھا نہ صدر تھا نہ کمر تھی نہ تنگ تھا

دو ہو کے منہ کے بھل جو گرا وہ ستم شعار
بس سرنگوں گیا سوئے دوزخ وہ نابکار
گو آپ کی بھی تیغ میں آفت کی کاٹ ہے
غازی پکارا بڑھ کے ہمارے قدم ہٹیں
ممکن نہیں کہ صاحبِ سیف و قلم ہٹیں
مر کے نہیں قدم کبھی آگے بڑھے ہوئے

دریا یہ کیا ہے اور تمھاری بساط کیا
یہ گھاٹ کیا ہے قصر ہو تو کیا رباط کیا
اڑنے کو پر ملیں گے اگر تیر کھائیں گے
رکھیں گے تیغِ تیز کے قبضے پہ ہاتھ جب
دریا ہے جن کے جد کا وہ بچے ہیں تشنہ لب
ہتھیار کیا ہیں فوج کے جی چھوٹ جائیں گے

اعدا جمے سنبھال کے ہتھیار گھاٹ پر
آئی چمک کے برقِ شرربار گھاٹ پر
اعدا ہزار ڈھالوں میں منہ کو چھپاتے تھے
جھپٹے مثالِ شیر جدھر صف الٹ گئی
جو فوج مثلِ موج بڑھی تھی وہ ہٹ گئی

اللہ کا غضب تھا کہ تلوار ہاتھ میں
بجلی تھی یا کہ تیغ کا پرتو ادھر ادھر
چلتے تھے تھم کے وقت نگشتہ ادھر ادھر
عنصر بھی تھے شریکِ دمِ تیغ لاگ میں

عباس سوئے نہر بڑھے بہرِ کارزار
نیزے اٹھا اٹھا کے یہ کہنے لگے سوار
بڑھیے ذرا سنبھل کے یہ تیغوں کا گھاٹ ہے
تیغیں ہٹیں نشان ہوں سلامی قلم ہٹیں
دریا سے تم ہٹو یہ نہ ہوگا کہ ہم ہٹیں
اترے ہیں شبیر پیر کے دریا چڑھے ہوئے

ثابت قدم کو تیغوں کا ڈر کیا صراط کیا
جب جان دی تو جسم کی پھر احتیاط کیا
کوثر پہ اب تو ہم اسی دریا سے جائیں گے
کھل جائے گا اشارے میں بند و بست سب
سر لوٹتے پھریں گے جو ٹوکا کسی نے اب
یہ مورچے بندھے ہوئے سب ٹوٹ جائیں گے

ڈھالیں نہ تھیں گھٹا تھی دھواں دھار گھاٹ پر
چلنے لگی دلیر سے تلوار گھاٹ پر
کیا وار تھا کہ نار میں سر اڑ کے جاتے تھے
یہ ہاتھ تن سے اڑ گیا وہ ڈھال کٹ گئی
دیکھا جو گھاٹ تیغ کا جرأت بھی گھٹ گئی

دریا کا گھاٹ لے لیا دو چار ہاتھ میں
مر کر سوار گرتے تھے سو سو ادھر ادھر
ہل چل تھی بیچ میں تھے رواں رو ادھر ادھر
پھینکا ہوا نے خاک میں پانی نے آگ میں

پھر بار بار اُڑ کے جاتا تھا چاروں طرف سمند
تلوار نے گریز کے کوچے کیے تھے بند
گھوڑوں سے گر کے پست ہوئے کتنے سربلند
دریا میں گر کے مر گئے کتنے جفا پسند
صف پر گری تھی صف تو پرے بھی پرے پہ تھے
دو پاؤں تھے زمیں پہ اور دو سروں پہ تھے

اللہ ری سمند کی چھل بل لڑائی میں
تلوار چل رہی تھی مسلسل لڑائی میں
بجلی تھی یا چمکتی تھی ہیکل لڑائی میں
پھٹ پھٹ گئے تھے ڈھالوں کے بادل لڑائی میں
بھاگڑ میں شہسواروں کی رہوار چھٹ گئے
جی چھوٹے گھاٹ چھٹ گیا ہتھیار چھٹ گئے

جب اُس سے تیغِ تیز چلی سر پہ سر گرا
خوں ناریوں کا اُڑ کے مثالِ شرر گرا
بھائی پہ بھائی باپ پہ مر کر پسر گرا
چمکی جو دو طرف یہ اِدھر وہ اُدھر گرا
کشتوں کے پشتے ہو گئے ضربِ دلیر سے
عرصہ فرس پہ تنگ تھا لاشوں کے ڈھیر سے

بجلی تھی سر پہ یا چمک اُس شعلہ ریز کی
یارا نہ جنگ کا تھا نہ طاقت گریز کی
زہرے تھے آب آب کسے تھی ستیز کی
گھاٹ اُس طرف تھا بائیں ادھر تیغ تیز کی
ہٹ کر نہ شکلِ امن نہ بڑھ کر نجات تھی
آگے لہو کی نہر تھی پیچھے فرات تھی

ساحل پہ تیغ تول کے گونجا وہ شیرِ نر
جو ہم کو روکتی تھیں وہ فوجیں گئیں کدھر
توڑا ہے ایک ہاتھ سے خیبر کا ہم نے در
کرتے ہیں مرتضےٰ کے پسر یوں ہم کو سر
ہم سے مقابلہ تھا اسی کائنات پر
یہ مورچے تھے چیونٹیاں تھیں یا فرات پر

جن کو نہ وہ دو دن ہو بہم قوتِ لایموت
اُن کے جواب میں یہ تحیر ہے یہ سکوت
زرہیں تھیں یا کہ موم کچھ اب تک نہیں ثبوت
حلقے یہ تھے کمند کے یا تارِ عنکبوت
ثابت نہیں غبارے تھے یہ یا عمود تھے
پانی پہ یہ حباب تھے یا سر پہ خود تھے

تیغوں نے کچھ نہ کاٹ دکھایا نہ کس بل
نیزے وہ کیا ہوئے جو نکلے تھے ہم بدل
بُرّے کہاں ہیں اُن کے جو ڈھالیں تھیں بے بدل
کیا برچھیوں نے غیرِ مذلت دکھائے پھل
سر اُن کے کس طرف کو سنانیں کدھر گئیں
وہ تیر کیا ہوئے وہ کمانیں کدھر گئیں

تر تھے عرق میں ہاتھ میں تھی تیغ خوں چکاں
بولے یہ کانپ کانپ کے عباسِ نوجواں
بس اے صبا جہاں کی فضا ہے قفس ہمیں

ساحل سے نہر میں جو گیا وہ فلک حشم
پانی میں جلوہ گر تھا جو عکسِ رخِ علم
آئی صدا درود کی ہر نخل و سنگ سے

عباسِ نامور جو کیے تھے لبوں کو بند
گردن پہ ہاتھ پھیر کے بولا وہ ارجمند
یا آبرو عزا ہے سوئے خلد جانے میں

چھینٹیں جو منہ پہ پڑنے لگا وہ فلک وقار
پانی گیا جو منہ میں تو میں ہونگا شرمسار
آقا لہو جگر ہے سکینہ کے حال پر

مشکیزہ بھر کے رخش کو آواز دی کہ چل
آئے تھے گھاٹ تک کہ بڑھے برچھیوں کے پھل
گھیرے تھے لوگ جن کی راہیں بھی بند تھیں

اک شور تھا کہ شیرِ دلاور نہ جانے پائے
فرزندِ فاطمہ کا برادر نہ جانے پائے
پھر ہے ظفر یزید کی گر یہ شہید ہو

نعرہ کیا جری نے کہ ہم رکنے والے ہیں؟
ابتر کیا تھا جن کو وہی یہ رسالے ہیں
پستی کو ڈھونڈھتی ہے بلندی نشانوں کی

ٹھنڈی ہوا کچھار سے آئی جو ناگہاں
واحسرتا کہ دھوپ میں ہیں شاہ انس و جاں
پانی کی آرزو نہ ہوا کی ہوس ہمیں

دوڑے حباب بھر کہ آنکھوں پہ یہ قدم
تھے مہر و ماہ آئنۂ آب میں بہم
دریا نہ جاری تھا پھر پھر کے تنگ سے

پانی پہ ڈالتا تھا نہ منہ اسپ ارجمند
احسنت اے سمند رضا جو وفا پسند
تیری وفا کا شور رہے گا زمانے میں

گردن ہلائی اس نے کہ یہ بھی ہے ناگوار
پیاسا ہے ابن فاطمہ کا طفلِ شیرخوار
فاقہ یہ تیسرا ہے محمد کی آل پر

یاں منتظر تھی راہ کو روکے ہوئے اجل
تیغوں پہ تیغیں فوج پہ تھی فوج دل پہ دل
نیزے تلے ہوئے تھے کمانیں بلند تھیں

سقائے اہلِ بیتِ پیمبر نہ جانے پائے
ہاں نورِ عینِ ساقیِ کوثر نہ جانے پائے
عباس کے گلے کو جو کاٹیں تو عید ہو

یہ تیغے بھالے سب ہیں بھالے سنبھالے ہیں
ثابت ہوا کہ دن ابھی ڈھالوں پہ کالے ہیں
شاید ابھی کجی یہ ہے قسمت کمانوں کی

اس وقت سب جہاں مجھے مل کر تو روک لے
فوجیں تو آئیں سامنے لشکر تو روک لے
دیوار تیغ و نیزہ و خنجر تو روک لے
تم کیا ہو مجھ کو سدِّ سکندر تو روک لے
آیا ہوں جاں بلب کئی بچوں کو چھوڑ کر
حائل پہاڑ ہو تو نکل جاؤں توڑ کر

فرما کے یہ فرس کو بڑھایا دلیر نے
دریا لہو کا دم میں بہایا دلیر نے
شیر خدا کا زور دکھایا دلیر نے
پٹکا زمیں پہ جسے پایا دلیر نے
یوں توڑ ڈالیں نیزوں کی انڈیاں مروڑ کے
جس طرح پھینک دے کوئی تنکے کو توڑ کے

ہتھیار پھینک پھینک کے بھاگے شریر سب
چوٹیں پڑیں کہ بھول گئے دار و گیر سب
کٹ کٹ گئے ملے ہوئے چلّوں سے تیر سب
چھپتے تھے سہم سہم کے برنا و پیر سب
تھیں دھجیاں پھریروں کی ٹکڑے اڑی ہوئی
ڈھالوں میں منہ چھپاتی تھیں تیغیں مڑی ہوئی

جس دوش پر تھی مشک اسی ہاتھ میں علم
سینہ سپر تھی کوندتی تھی تیغ برق دم
برسا رہے تھے نیزوں کا مینہ بانیِ ستم
رکتے نہ تھے مگر کہیں عباسِ ذی حشم
کیا شیر دل سوار تھا کیا راہوار تھا
جب باگ اٹھائی فوج کی حلقوں کے پار تھا

لشکر یزید کا تھا کہ دریا سے کنار
پیدل جو گر پڑے تو بڑھے جنگ کو سوار
بھاگے جو وہ تو آ رہے کنارے پہ نیزہ دار
نیزے قلم کیے تو چلے برچھیوں کے وار
کیونکر مہم یہ سر ہو اک آفت نصیب سے
چلّے سے تیر چھٹتے تھے نیزے قریب سے

فوجوں سے اس ترائی میں لڑتے ہوئے جو آئے
مجبور ہائے بشر جو مہلت اجل سے پائے
تلواریں سر پہ لگ گئیں پہلو پہ تیر کھائے
غازی کے ہاتھ کٹ گئے شانوں سے ہائے ہائے
پانی بہا تو جان چلی زور گھٹ گیا
دانتوں سے مشک چھوٹ گئی دم الٹ گیا

غش سے فرس پہ جھک کے جو سنبھلا وہ بے پناہ
مارا کسی نے دیدۂ حق بیں پہ تیر آہ
سر پر لگا جو گرز تو حالت ہوئی تباہ
[illegible]
اٹھ بیٹھتے ہیں لوٹ کے یوں ارض پاک پہ
جس طرح زخمی شیر تڑپتا ہے خاک پہ

اک شورِ تہنیت کا ہوا فوج میں اُدھر
تلوار ٹیکتے ہوئے دوڑے جو ننگے سر
بے ہاتھ تھامے پاؤں بڑھانا محال تھا
بھائی کا داغ دردِ جگر تین دن کی پیاس
فرماتے تھے پسر سے ٹھہر کر بدرد و یاس
بتلاؤ اب کہ حال ہمارا تباہ ہے

دم چڑھ گیا ہے سانس اکھڑتی ہے دم بدم
دنیا سے کھو گئے ہیں عباسِ ذی حشم
سب گھٹ گیا ہے خوں جو مرا رنگ زرد ہے
دم توڑتا ہے نہر پہ شاید وہ مہ لقا
کس وقت میں بچھڑ گیا ہم سے وہ باوفا
ڈھونڈے گی اُن کو روح اگر مر بھی جاؤں گا

پہونچے ترائی میں جو شہِ دیں بصد تعب
بازو کٹے تھے خون میں ڈوبا تھا جسم سب
آنکھوں سے نزع میں بھی رواں تھے اشک تھی
سینے پہ منہ کو رکھ کے پکارے شہِ زمن
اے مرے شبیر اے مرے جرّار صف شکن
مرتے ہیں ہم جلا دو ہمیں منہ سے بول کے

غازی نے آنکھیں کھول کے دیکھا رُخِ امام
کروٹ جو لی کراہ کے کانپا بدن تمام
مانند بوئے گل دمِ آخر گزر گیا

ہاں بارِ غم سے ٹوٹ گئی شاہ کی کمر
تھاما پسر نے بازوئے شبیر نوحہ گر
جس طرح بے قرار ہو بسمل یہ حال تھا
ضعفِ بصر شکستہ کمر منتشر حواس
اکبر کدھر ہے لاشۂ عباسِ حق شناس
رستہ پہاڑ ہو گیا کیا سخت راہ ہے

صدمے سے بیٹھا جاتا ہے دل کیا اٹھیں قدم
سیدھا ہوں کس طرح یہ برادر کا ہے الم
دل میں کمر میں سینے میں پہلو میں درد ہے
یہ تھی کراہنے کی اُدھر شیر کی صدا
دو بھائیوں کو موت بھی آئی نہ ایک جا
پیدا نہ یا پیا ہوگا نہ بھائی کو پاؤں گا

سقائے اہلِ بیت نظر آئے جاں بلب
دم توڑتے تھے ہچکیاں لیتے تھے غضب
پرخوں علم پہ ہاتھ تھا چھاتی پہ مشک تھی
حاضر ہوا برادرِ مظلوم و بے وطن
آزردہ ہو کہ دیر میں پہونچا یہ خستہ تن
دیکھو تو حال بھائی کا آنکھوں کو کھول کے

اینٹھی تھی یہ زباں کہ نہ کچھ ہو سکے کلام
آنا تھا ہچکیوں کا کہ تھا موت کا پیام
منزل پہ بوجھ رکھ کے مسافر گزر گیا

بھائی جواں جو مر گیا بھائی کے سامنے
پٹکا زمیں پہ سر سے عمامہ امام نے
حضرت سے عرض کی پسرِ تشنہ کام نے
چلیئے اب اہلِ بیتِ محمد کو تھامنے
ماتم بپا نہ ہو جسدِ پاش پاش پر
نکلی سکینہ گر تو سب آئیں گی لاش پہ

فرمایا شاہ نے کہ برادر کو رو تو لوں
مظلوم کو شہید کو صفدر کو رو تو لوں
سقائے اہلِ بیتِ پیمبر کو رو تو لوں
عاشق کو بے وطن کو دلاور کو رو تو لوں
صبر آئے کس طرح ابھی تازہ جدائی ہے
اولاد باپ کی ہے برابر کا بھائی ہے

مرجائے بھائی اور نہ بھائی بکا کرے
غربت میں ہو یہ جس پہ مصیبت وہ کیا کرے
چھاتی پھٹے اگر نہ گریباں قبا کرے
میری بھی موت اب کہیں جلدی خدا کرے
مرنے ہی اس کے رشتۂ الفت کو توڑ دوں
گودی میں جو پلے اسے جنگل میں چھوڑ دوں

ناگاہ در سے خیمہ کے فضہ نے دی صدا
دریا سے کس طرف گئے عباسِ باوفا
کیسا یہ غل ہے نہر پہ اے شاہِ کربلا
گھر سے نکل پڑی ہے سکینہ برہنہ پا
تن کا پتا ہے ضعف سے ہاتھوں میں ہاتھ ہے
عباس کا پسر بھی سکینہ کے ساتھ ہے

یہ شور سن کے لاش سے اٹھے امامِ دیں
مشک و علم کو لے کے چلے اکبرِ حزیں
چلائی رو کے عاشقِ عباس مہ جبیں
ہے ہے علم تو آتا ہے میرے چچا نہیں
چھائی ہوئی ہے کیسی اداسی نشان پر
کیا بن گئی ارے مرے عمو کی جان پر

لائے علم جو خیمے میں سلطانِ بحر و بر
رایت کے ساتھ ساتھ تھے بچے برہنہ سر
دیکھا جو اس علم کا پھریرا لہو میں تر
سیدانیاں زمیں پہ گریں تھام کر جگر
سر پیٹتی تھی کوئی کوئی خاک اڑاتی تھی
ہے ہے کا شور تھا کہ زمیں تھرتھراتی تھی

چلاتے تھے حسین کہ غمخوار مر گیا
زینب ہمارا یاور و فادار مر گیا
قوت تھی جس سے ہائے وہ جرار مر گیا
سقائے آلِ احمدِ مختار مر گیا
اب کون آفتوں میں لے گا خبر مری
سیدھی نہ ہوگی قبر میں بھی اب کمر مری

غش جس جگہ تھی زوجۂ عباسِ نوجواں
سب مل کے اس کو زیرِ علم لائیں بی بیاں
بکھرا کے سر کے بال پکاری وہ خستہ جاں
لوگو بتاؤ لاش علمدار ہے کہاں
پوچھو بلائیں لیکے شہِ تشنہ کام کی
کیا وجہ ہے کہ لاش نہ لائے غلام کی

بولی یہ روکے بانوئے بیکس بدرد و غم
وہ کہہ گئے تھے آپ جمیت پہ تھے دم
چلائی سر کو پیٹ کے وہ کشتۂ الم
صاحب تمہیں بستے رہ گئے دیدار کو بھی ہم
مرتے ہوئے نہ چاند سی صورت دکھا گئے
کس بات پر کنیز سے صاحب خفا گئے

خاموش اب انیس کہ اک حشر ہے بپا
مجلس میں چار سمت ہے اک شور مرحبا
کر حق سے ہاتھ اٹھا کے بصد عجز یہ دعا
یارب دکھا دے روضۂ سلطانِ کربلا
اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے

رباعی

رعبِ شہِ ذی جاہ سے تھراتے ہیں
سب طرزِ غلامانہ بجا لاتے ہیں
آداب یہ ہے کہ تعزیہ خانے میں
آتے ہیں تو جھک جھک کے علم آتے ہیں

رباعی

شاہانِ جہاں سب ہیں گدائے حیدر
ہے ابرِ کرم دستِ سخائے حیدر
یعقوب و خلیل و یوسف و آدم و نوح
سب کی مشکل میں کام آئے حیدر

جب سپاہ لشکر خدا کا علم سرنگوں ہوا
اک شور تھا کہ خانۂ دیں بے ستوں ہوا
سقائے اہل بیت نبی غرق خوں ہوا
پیدا انہوں میں اور نیا ظلم فزوں ہوا
ڈوبا لہو میں چاند سپہر مشرقین کا
خالی کیا اجل نے بھرا گھر حسین کا

یارب کوئی جہاں میں اسیر محن نہ ہو
جنگل میں گھر لٹا کے کوئی بے وطن نہ ہو
ماں باپ سے جدا کوئی گل پیرہن نہ ہو
پھولا پھلا اجاڑ کسی کا چمن نہ ہو
بھائی بچھڑ چکا ہے شہ مشرقین سے
اب تیغ جوان پسر کی ہے رخصت حسین سے

طاقت تھی جس سے شہ کو سفر کر گیا وہ شیر
جس سے ہرا حیات کا تھا مر گیا وہ شیر
پیاسا جہان سے لب کوثر گیا وہ شیر
سقائی کر کے خون میں خود بھر گیا وہ شیر
خم آگیا کمر میں شہ خوش خصال کی
تصویر مٹ گئی اسد ذوالجلال کی

لشکر میں شادیاں تھیں اُدھر غم تھا اس طرف
سامان ہاں تھا جشن کا ماتم تھا اس طرف
امید اُدھر تھی یاس کا عالم تھا اس طرف
اعدا میں عید تھی تو محرم تھا اس طرف
کمریں کسے ہوئے تھا زمانہ جدال پر
کیا وقت پڑ گیا تھا محمد کے لال پر

مرنا جوان بھائی کا اور اس پہ یہ ستم
پرسا نہ دل دہی نہ تشفی نہ درد و غم
اعدا صفیں جمائے ہوئے جنگ پر بہم
ہنستے تھے سوگواروں کے رونے پہ دم بدم
رنجے میں ان کے سبط رسالت پناہ تھا
مشرب میں جن کے پانی کا دینا گناہ تھا

نہ پاس انہیں نبی کا نہ مطلق خدا کا ڈر
قرآں سے بے وقوف حدیثوں سے بے خبر
باتوں میں لے اور دل میں بدی طینتوں میں شر
بدکار و بدخصال و بدافعال و بدگہر
پیدا تھا کفر شرم و حیا ناپدید تھی
سادات ذبح ہوتے تھے اور ان کو عید تھی

کیسے وہ کلمہ گو ہیں تعجب کا ہے مقام
کافر بھی لیتے ہیں تو کراہت سے اُن کا نام

اسلام اگر یہی ہے تو اسلام کو سلام
کھل جائے گا کھنچے گی جو کل تیغِ انتقام

کس جا چھپیں گے روزِ عدالت ضرور ہے
ہم دور ہیں نہ وہ نہ قیامت ہی دور ہے

یا منتقم ظہورِ امامِ زماں دکھا
اب دم لبوں پہ ہے دورِ امن و اماں دکھا

آنکھیں ہیں منتظر رُخِ آرامِ جاں دکھا
پھر برقِ ذوالفقار کو آتش فشاں دکھا

دشمن نہیں ہے ایک شہِ مشرقین کا
اُس دن غلام سوگ منائیں حسین کا

اولاد والے دل میں کریں کچھ خیال
ہوتی ہے کیسی اُلفتِ فرزندِ خوش جمال

بیٹا وہ نوجواں جسے اٹھارھواں ہو سال
کیا ہوگا نورِ چشمِ رسولِ خدا کا حال

ماں باپ کے لیئے تو اجل کا پیام ہے
دشمن بھی رونے لگتے ہیں یہ وہ مقام ہے

بھائی وہ مرچکا ہے کہ تھا جس کے دم سے گھر
سیدھی ابھی ہوئی نہیں ٹوٹی ہوئی کمر

اب طالبِ رضائے وغا ہے جواں پسر
نوکوں میں برچھیوں کی ہے شبیر کا جگر

پیری میں اس جواں کو بھی کھوئیں تو کیا کریں
کیوں منصفو کہو جو نہ روئیں تو کیا کریں

قابو ہے اب جگر پہ نہ ہے دل پہ اختیار
یہ مرحلہ وہ ہے کہ ہیں صابر بھی بے قرار

ماں باپ سے پسر کو چھڑائے نہ کردگار
زخمِ سنان و تیغ گوارا پہ ناگوار

راحت ہے گر گلوئے پدر پر چھری چلے
جو ہو سو ہو مگر نہ جگر پر چھری چلے

بڑھتا ہے ہاتھ جوڑ کے جب شہ کا نورِ عین
خیمے کو تکنے لگتے ہیں منہ پھیر کر حسین

فرماتے ہیں کہ سنتے ہو سیدانیوں کے بین
عباس کے الم میں یہ برپا ہے شور و شین

بھائی جہاں سے جانبِ خلدِ بریں گئے
پرسے کو بھی چچی کے تم اب تک نہیں گئے

بیکس پھوپھی کو گھر میں تمھارا ہے انتظار
دھڑکے سے ماں کے دل کو نہیں ایک دم قرار

چھوٹی بہن پکارتی ہے تم کو بار بار
دیکھ آؤ اپنے چاہنے والوں کو میں نثار

ہم کوئی دم میں آپ بھی دم تیغ دیتے ہیں
یہ چند دم تمھارے بھروسے پہ جیتے ہیں

اصغر کو دیکھو تا پدرِ مضطر کی لو خبر
رانڈوں کے تم پسر ہو یتیموں کے تم پدر
کس کو یہ داغ پیرِ فلک نے دیا نہیں
تم سے بھی کم تھے عمر میں جب ہم ہوئے یتیم
ہم دونوں بھائیوں کے جگر غم سے تھے دو نیم
رانڈوں کو یہ الم ہے کہ منہ موڑے جاتے ہیں

کنبے کی جان باپ کا اقبال گھر کا نور
جرار و بردبار و دلاور سخی غیور
خرد و کلاں کو اجر زیارت حصول ہے
نعمت ہے زیست خلق میں ایسے سعید کی
تھی سب کو آرزو رخِ روشن کی دید کی
کیونکر جدا نگاہ سے بیٹا کریں تمھیں

راحت کے دن ہیں آمدِ فصلِ شباب ہے
۱۸
اٹھارھویں برس کا بھلا کیا حساب ہے
نقطے ہیں خال کے خطِ عنبر فشاں نہیں
اکبر تمھاری قدر نہیں ہے کسی کو آہ
ہوتے ہو لوگ احمدِ مرسل کے خیر خواہ
آنکھوں پہ رکھتے فخر سے نعلین پاک کو

جینے کی اب خوشی ہے نہ دنیا کی ہے ہوس
بچھڑیں گے تم سے گر ہے تو صدمہ یہی ہے بس
دولھا بنا کے شانِ شہانی بھی دیکھتے

سمجھاؤ بی بیوں کو کہ پیٹیں نہ اپنا سر
گھر تھامتے ہیں باپ کا ذی مرتبہ پسر
سر پہ کسی کے باپ ہمیشہ جیا نہیں
ماں بھی نہ تھی یہ اور تھی اک آفتِ عظیم
پھر پالا ہیں حافظ و حامی رہا کریم
ہم نوجواں ہیں تم سا پسر چھوڑے جاتے ہیں

یوسف جمال صاحبِ توقیر ذی شعور
آنکھوں کی روشنی جگر و قلب کا سرور
تم ہو تو اہلِ بیت میں گویا رسول ہیں
پیدا ہے نورِ رخ سے ضیا صبحِ عید کی
تصویر ہو رسولِ خدائے مجید کی
آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمھیں

پہلا ابھی کتابِ جوانی کا باب ہے
بے حاشیہ ابھی ورقِ آفتاب ہے
بابا نثار ہو ابھی پورے جواں نہیں
اس سن کا بشر نہیں کوئی خدا گواہ
تم کو سمجھتے ثانی پیغمبرِ اِلٰہ
اکسیر جانتے انھیں قدموں کی خاک کو

ہے دل کو شوقِ آبِ دمِ تیغ ہر نفس
جیتے تو کرتے بیاہ تمھارا اسی برس
طفلی تو دیکھی حسنِ جوانی بھی دیکھتے

پھولو پھلو کہ زینتِ باغِ جہاں ہو تم
آخر ہے عمر پیر ہیں ہم نوجواں ہو تم
شاداں رہے گی روح کہ راحت رساں ہو تم
مرنے کے بعد باپ کا نام و نشاں ہو تم
گر ہم نہیں تو خانۂ زہرا میں تم رہو
اب زندگی یہی ہے کہ دنیا میں تم رہو

اکبر کا رنگ اُڑ گیا سنتے ہی یہ کلام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے شرم سے کہ یا امام
فرزندِ ارجمند ہیں سجادِ نیک نام
اکبر تو ہے حضور کا ادنیٰ سا اک غلام
اس امر سے فزوں کوئی شرمندگی نہیں
آقا کے بعد موت ہے یہ زندگی نہیں

بندے ہزار ہم سے نثارِ سرِ حضور
دنیا ہو اور آپ ہوں اے کبریا کے نور
روشن جو ہے جہان اسی دم کا ہے ظہور
ذرّہ ہر اک ہے نورِ قدم سے چراغِ طور
ظلمت زدائے خلق شہِ دیں کی ذات ہے
دنیا میں آفتاب نہ ہو جب تو رات ہے

رونق زمیں کی ہے کہ امامِ زماں ہیں آپ
سایہ ہے جس کا عرش پہ وہ آسماں ہیں آپ
بحرِ جہاں ہیں باعثِ امن و اماں ہیں آپ
شیرازۂ صحیفۂ کون و مکاں ہیں آپ
فردوس کی ابتری ہے جو دفتر کشا نہ ہو
کیونکر بچے جہاز اگر ناخدا نہ ہو

افضل ہے کون سبطِ رسالت مآب سے
دنیا میں ہے تو یہ برکت ہے جناب سے
سرسبز ہے زراعتِ عالم سحاب سے
ذرّوں کی زندگی ہے فقط آفتاب سے
چھٹ کر پدر سے باپ کے پیارے کہاں رہیں
جب آسماں نہ ہو تو ستارے کہاں رہیں

دم سے حضور کے ہے غلاموں کی ہست و بود
مولا ہیں اس جہاں میں پئے رحمتِ ودود
اے چشمۂ عطا و کرم بحرِ فیض و جود
دریا اگر نہ ہو تو حبابوں کی کیا نمود
سب خلق شاہِ دیں سے طلبگارِ عون ہے
جب نوح غرقِ خوں ہو تو کشتی کا کون ہے

پھر زیست کیا کرے وہ جو بعد آپ کے جیئے
کھائے غم اور خونِ جگر عمر بھر پیئے
غیروں نے آج پائے مبارک پہ سر دیئے
بچپن سے ہم نے باندھی ہے تلوار کس لیئے
اب پنجتن کا خاتمہ ہے کوئی آن میں
پھر بھی یہ معرکہ کبھی ہوگا جہاں میں

سب بھائی بن قتل ہوئے رن میں تشنہ لب
حضرت مجھے بچاتے ہیں کیوں اس کا کیا سبب
خادم کو بھی سعادتِ عقبیٰ کی ہی طلب
دیجیے رضا جہاد کی بہرِ رسولِ رب
کہیے نہ یہ کہ ساتھ نہ دو تشنہ کام کا
مُنہ سے نکل پڑے گا کلیجہ غلام کا

سینے میں دل لرزتا ہی جینے کے نام سے
زندہ وہی ہی پہلے مرے جو امام سے
سیراب ہونے دیجیے شہادت کے جام سے
آقا یہ بوجھ اُٹھ نہ سکے گا غلام سے
دیکھے گا کون لوٹتے فوجیں جو آئیں گی
خادم سے بیڑیاں کبھی پہنی نہ جائیں گی

عابد خدا کے فضل سے ہیں صابروں میں فرد
مظلوم بُردبار غم انگیز اہلِ درد
لیں گے وہ تیغ و غربت میں گرم و سرد
ہم اور کام کے نہیں لایق بجز نبرد
وہ آلِ مصطفےٰ کا مدار المہام ہو
جو ہو پسر امام کا خود بھی امام ہو

خوں میں نہائے گر نہ ہوا آج سرخرو
پھر کس کو منہ دکھاؤں گا یا شاہِ نیک خو
چمکا رہے ہیں برچھیاں میداں میں جنگجو
غصے سے جوش کھاتا ہی اب جسم کا لہو
کس سے کہوں اگر نہ کروں عرض آپ سے
بیٹے کی آبرو متعلق ہی باپ سے

طی ہو یہ مرحلہ جو کریں پرورش حضور
خلدِ بریں بعید نہ باغِ ارم ہی دور
کوشش میں اس طرف سے تو مطلق نہیں قصور
اے آفتاب ذرہ نوازی ہی اب ضرور
نہ زندگی نہ جاہ و حشم چاہتا ہوں میں
آقا کی اک نگاہِ کرم چاہتا ہوں میں

ماں کا پھوپھی کا پیار ہی اب حق میں میرے زہر
امداد کا مقام ہی اب یا امامِ دہر
آبِ فرات کی نہیں اب تشنگی میں نہر
جنت میں شہد و شیر کی خالق دکھائے نہر
مٹی ملے تو سبطِ پیمبر کے ہاتھ سے
پانی پیوں تو ساقیِ کوثر کے ہاتھ سے

دیجیے رضائے حرب کہ مرتا ہی اب غلام
خیمے میں چلنے لیکے مجھے یا شہِ انام
چپ ہو رہیں گی سن کے پھوپھی آپ کا کلام
بن جائے گا زباں کے ہلانے میں میرا کام
مانے گا وہ ادب سے جو صابر ہی اہل ہی
مشکل کشا کے لال کو ہر امر سہل ہی

بولے بہاکے اشک شہنشاہِ نامور
سچ ہے بھلا تمھیں مرے دل کی ہے کیا خبر
اس معرکے سے جو نہیں افسردہ آپ ہیں
کھوتا ہے اس کو کوئی بڑھاپے کی ہو جو آس
صابر وہ ہر بلا میں ہیں جو ہیں خدا شناس
مشہور خلق بیٹے کا اور ماں کا پیار ہے

بولا یہ ہاتھ جوڑ کے فرزندِ نیک نام
تنہا یہاں نہ چھوڑیے گا حضرت کو یہ غلام
کرتے ہو رحم حال پہ مظلوم باپ کے
فرما کے یہ چلے طرفِ خیمہ شاہِ دیں
پہونچا قریبِ در جو محمد کا نازنیں
لوگو بلاؤ اکبرِ یوسف جمال کو

بنتِ علی کے پاس ہے بانو بھی بے حواس
زینب سے عرض کرتی ہے رو رو وہ حق شناس
کہتی ہیں چین اب مجھے دم بھر نہ آئے گا
فضہ نکل کے خیمے سے باہر خبر تو لا
سنتی ہوں میں کہ شاہ سے ہیں طالبِ رضا
بیٹے سے مڑ کے کہتے گئے شاہِ بحر و بر

چلیے ابھی پھوپھی کو نہ پھر پاییے گا آپ
نازک ہے عورتوں کا دل اے غیرتِ قمر
ان کو ہے اور تم کو نہیں کچھ خیال ہے
مرنے کی تم کو ماں سے دلائیے رضا پدر
پوچھو یہ اس سے جس کا جواں ہو کوئی پسر
بیٹا ہمارے حق بطرف ہو کہ باپ ہیں

ہم ہیں تو بات کرنے کے مطلق نہیں حواس
اچھا یہی خوشی ہو تو جاؤ پھوپھی کے پاس
طے ہو یہ مرحلہ بھی تو پھر اختیار ہے
خیمے میں چلیے ساتھ مرے یا شہِ انام
آنسو بہاکے کہنے لگے شاہِ تشنہ کام
پھر کون ساتھ دے گا مرا بعد آپ کے

گردن جھکائے ساتھ تھا فرزندِ مہ جبیں
تھم کر سنا تو کہتی ہیں یہ زینبِ حزیں
کیوں رن میں اتنی دیر لگی میرے لال کو
بیٹے ہیں جان ہیاں ہے لبِ خشک جی ڈریں
کڑھیے نہ ہوں گے اکبرِ مہرو پدر کے پاس
نکلوں گی خود اگر علی اکبر نہ آئے گا

آنے میں دیر کیوں ہوئی یہ ماجرا ہے کیا
پوچھیں تو کہیو نزع میں ہے بنتِ مرتضا
جب دم نکل چکے تو چلے جائیے گا آپ
کیوں گفتگو پھوپھی کی سنی تم نے اے پسر
ماں کی ابھی رضا نہیں ورثہ پیٹتی ہیں سر
رخصت وہ دیں گی مرنے کی جن کا یہ حال ہے

آساں اسے سمجھتے ہو تم اے پدر کی جاں
اظہار ماں سے مرنے کی رخصت کا الاماں
بتلائیے گرے گا جو یہ غم کا آسماں
کیونکر جیئے گی زینبِ ناشاد و ناتواں
تم زندگی ہو دخترِ شبیرِ الٰہ کی
کیسی رضا وہاں تو دعائیں ہیں بیاہ کی

ہم کو نہ ساتھ لیکے چلو بہرِ کردگار
اچھا ہمیں نظر نہیں آتا مآلِ کار
پردہ اٹھا کے شہ سے یہ بولا وہ ذی وقار
چلیے تو آپ خیمے میں یا شاہِ نامدار
دامانِ ابنِ فاطمہ پہ ہاتھ چاہیے
مشکل ہو جب تو عقدہ کشا ساتھ چاہیے

زینب جو بیچ اس گھڑی تھیں قریبِ در
اکبر کا روئے پاک انھیں آگیا نظر
جلدی بلائیں لیکے پکاری وہ نوحہ گر
صدقے پھوپھی اس آنے کے اے غیرتِ قمر
خوشبو مہک رہی ہے رسالت مآب کی
ڈیوڑھی میں روشنی ہے مرے آفتاب کی

اکبر نے کی یہ عرض کہ حاضر ہوا غلام
حضرت کو لیکے آیا ہوں اے آسماں مقام
مژدہ سنا جو یہ تو پکاری وہ تشنہ کام
آنکھوں پہ فرق پر قدمِ قبلۂ انام
رونا مرا سنا تھا تو گھبرا کے آئے ہو
صدقے تو ہوں کہ تم مرے بھائی کو لائے ہو

ڈیوڑھی میں آئے روتے ہوئے بادشاہِ دیں
تھامے تھا ہاتھ باپ کا فرزندِ مہ جبیں
شوقِ لقائے شہ میں بڑھی زینبِ حزیں
بھائی کے گرد پھر کے پسر کی بلائیں لیں
سوزش نہ وہ رہی جگر و دل کے داغ میں
گویا بہار آگئی پژمردہ باغ میں

بیت الشرف میں آئے جو شبیرِ خوش خصال
رانڈوں کو روتے دیکھ کے صدمہ ہوا کمال
بڑھ کر پھوپھی سے بولے یہ اکبر بصد ملال
چلیے ذرا الگ تو کہوں کچھ پدر کا حال
سب گھر نثارِ حضرتِ شبیر کیجیے
لٹنے کا طور ہے کوئی تدبیر کیجیے

بڑھ کر کہا پھوپھی نے کہو جلد میری جاں
گھبرا کے دیکھنے لگی بیٹے کے منہ کو ماں
آہستہ ان سے رو کے یہ بولا وہ نوجواں
رن میں چلے تھے مرنے کو شاہنشہِ زماں
میں پاؤں پر گرا ہوں جو تشریف لائے ہیں
گھر میں حسین آخری رخصت کو آئے ہیں

غربت میں جو مریں گے شہنشاہِ بحر و بر
اس وقت کس سے ہیں گے ہمدردِ دل و جگر
اُٹھ جاؤں میں جہان سے باباکے سامنے

امّاں قیامت آتی ہے جاتی ہے آبرو
هَلْ مِنْ مُبَارِز کا اُدھر غل ہے چارسو
کفّار لوٹ لینگے محمّد کی آل کو

دیتے نہیں رضا جو مجھے شاہِ حق شناس
کہیئے اُمید کس سے رکھیں اور کس سے آس
حق بھی ادا ہوئے نہ شہِ خوش خصال کے

حضرت کے پیار کی ہے بدولت یہ رنج و غم
ہے اب نفس کی آمد و شد خنجرِ دو دم
کیا لطفِ زیست وقت جو رخصت کا ٹل گیا

مرتے جو سر کٹا کے تو ہوتا ہمارا نام
جو دونوں صاحبوں کی رضا کیا کرے غلام
آساں ہے جبر دل پہ اگر اختیار ہو

مہماں ہیں کوئی دم کے شہنشاہِ بحر و بر
صدقے کیئے پھوپی نے تو حضرت پہ دو پسر
بیٹوں میں کس کو سبطِ نبی پر فدا کیا

ہوتا ہے معرکے میں محبّت کا امتحاں
بے جاں ہوئے جو دشمنِ سر دادہ نیش جاں
گھر اپنا فاطمہ کی بہو نے ڈبو دیا

پھر کون سر پرست ہے کس سے تھمے گا گھر
مانگو دعا کہ باپ سے پہلے مرے پسر
میرا گلا کٹے شہِ والا کے سامنے

اک جان بابا جان کی اور سیکڑوں عدو
دیکھو نہ اب رکیں گے شہنشاہِ نیک خو
روکو خدا کے واسطے زہرا کے لال کو

کہتا ہوں صاف میں کہ فقط آپکا ہے پاس
ہم کو تو اب حصولِ سعادت سے کبھی ہے یاس
خوب آبرو حضور نے دی ہم کو پال کے

گھر بھی چھٹا پدر بھی کہیں کے رہے نہ ہم
مر جاؤں گا ابھی قدمِ پاک کی قسم
بابا اُدھر گئے کہ ادھر دم نکل گیا

خیر اب تڑپ کے خاک پہ ہو جائینگے تمام
لیکن جگہ ہے صبر کی ہمت کا ہے مقام
وہ کیجیئے کہ فاطمہ سے آنکھ چار ہو

رخصت کو گھر میں آئے ہیں باندھے ہوئے کمر
امّاں جگہ حجاب کی ہے سوچیئے اگر
بتلایئے کہ آپ نے زہرا سے کیا کیا

اب گھر میں کس کے پاس ہے فرزندِ نوجواں
چرچا یہی کریں گی وفاداریِ بیاں
فرزند کو بچا لیا وارث کو کھو دیا

ہے کوئی لڑنے والا

چھاتی پہ رکھیے صبر کی سل بہر کردگار
لے چلیے مجھ کو پیشِ شہنشاہِ نامدار
کہیے کہ آپ کرتے ہیں کیوں عزمِ کارزار
حاضر ہو صدقے ہونے کو آقا یہ جاں نثار
کام اس سے کیا زباں کو جو باتیں رکیک ہوں
لیکن یہ شرط ہے کہ پھوپھی بھی شریک ہوں

زہرا کے بعد قافلہ سالار ہیں یہی
ہاں رتبہ دانِ سیدِ ابرار ہیں یہی
کہنے کو سب ہیں پر مری مختار ہیں یہی
ماں ہیں یہی پھوپھی ہیں یہی غمخوار ہیں یہی
ارشاد یہ کریں تو فدا یہ امام ہوں
بیٹا ہوں آپ کا مگر ان کا غلام ہوں

کانپا یہ سن کے بانوئے ناشاد کا جگر
کی بنتِ فاطمہ کی طرف یاس سے نظر
ٹپکا کے اشک آنکھوں سے بولی وہ نوحہ گر
ہے آج یہ کیا کریں کہ مصیبت میں ہے پدر
بیجا ہلاک کوئی بھی کرتا ہے آپ کو
کس طرح چھوڑ دے نرغۂ اعدا میں باپ کو

یہ ذکر تھا ادھر کہ پکارے امامِ دیں
لو الوداع اے حرمِ ختمِ مرسلیں
آپہونچے متصل درِ خیمہ کے اہلِ کیں
لے آؤ جامۂ کہن اے زینبِ حزیں
رخصت کو آئیں جو مرے نازوں کے پالے ہیں
اکبر کو دو کہو یہ تمھارے حوالے ہیں

اکبر پھوپی کو دیکھ کے بولے کہ ہے غضب
لو آفت آئی گھر پہ چلے شاہِ تشنہ لب
دوڑے سروں کو کھولے ہوئے اہلِ بیت سب
بانو گری تڑپ کے قدم پر بصد تعب
بیٹے نے تھامے ہاتھ شہِ کربلائی کے
زینب نے سر جھکا دیا سینہ پہ بھائی کے

شانے پہ منہ کو رکھ کے پکارے شہِ زمن
اماں کی تم سے بو مجھے آتی ہے اے بہن
بولی یہ ہاتھ جوڑ کے بانوئے خستہ تن
آقا ابھی تو زندہ ہے اکبر سا صف شکن
دکھ درد میں پدر کے پسر کام آتے ہیں
آپ ان کے ہوتے کس لیے میداں میں جاتے ہیں

شہ نے کہا بہن مجھے اس کا نہیں خیال
ہے تم کو صابروں کی طرح صبر میں کمال
اپنے چمن کو دیکھ کے ہوتے ہیں سب نہال
خود چاہتا ہوں میں کہ یہ گل ہو نہ پائمال
شادی کے دن ہیں اس غریب الوطن کی ہے
صدمہ مجھے یہ ہے کہ ریاضت بہن کی ہے

بولی وہ عندلیبِ چمن پرورِ بتول
طرّہ یہی ہے سب پہ جو سر چڑھے جو پھول
اے نخلِ باغِ فضل و گلِ گلشنِ رسول
داغِ گلِ ریاضِ تمنّا بدل قبول
شادی سدا نہیں چمنِ روزگار میں
روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں

کیجے کنیز کی نہ ریاضت کا کچھ خیال
صدقے گلِ ریاضِ نبی پر ہزار لال
بھائی پہ آ بنی تو بھتیجے کا کیا ملال
اُن کو بھی صدقہ ہونے کی ہے آرزو کمال
ہاں دل تو چاہتا ہے کہ دم بھر جدا نہ ہوں
کام آئیں غیر جب تو یہ کیونکر فدا نہ ہوں

گر کر قدم پہ شہ کے یہ بولا وہ نوجوان
بس اب رضا جہاد کی دیں قبلۂ زماں
صدمہ ہوا پھوپھی کے جگر پر کہ الاماں
کانپے جو پاؤں گرنے لگی تھرتھرا کے ماں
خوں گھٹ گیا امامِ زماں زرد ہو گئے
اچھا کہا مگر ہمہ تن درد ہو گئے

اکبر پھرے جو گردِ قدم سے اُٹھا کے سر
بولے گلے لگا کے شہنشاہِ بحر و بر
اے نورِ عین اے سببِ قوتِ جگر
کیا اپنا زورِ خیمۂ جہاں سے کرو سفر
بس قطع ہو گئی جو توقع تھی آپ سے
اٹھارھویں برس میں بچھڑتے ہو باپ سے

نقصان کو نسا تھا جو مرتے پدر کے ساتھ
ہوتا سناں پہ چاند سا سر میرے سر کے ساتھ
افسوس زخمی ہو گیا دل بھی جگر کے ساتھ
زینب ہماری جان چلی اس پسر کے ساتھ
کنبے کی جان آنکھوں کا تارا یہی تو تھا
بابا کی زندگی کا سہارا یہی تو تھا

تم سے بھی رُک سکا نہ یہ دلبر ہزار حیف
کچھ کر سکی نہ بانوئے بے پر ہزار حیف
خالی ہوا بس آج بھرا گھر ہزار حیف
لو صاحبو چلے علی اکبر ہزار حیف
یہ آفتاب اب کوئی دم میں غروب ہے
دولھا بنا کے مرنے کو بھیجو تو خوب ہے

خلعت پنھایا ماں نے وہ کپڑے اُتار کے
رکھا عمامہ فرق پہ زلفیں سنوار کے
زینب پکاریں ہاتھوں کو چھاتی پہ مار کے
سہرا بھی باندھو سر پہ مرے گلعذار کے
بولا پسر کہ عزم ہے اب رزم گاہ کا
امّاں کفن پنھا دو یہ خلعت ہے بیاہ کا

سجنے لگا یہ کہہ کے وہ صفدر سلاحِ جنگ — رکھا جو خود سُرخ ہوا اور رُخ کا رنگ
پہنی زرہ تو دل کو وغا کی ہوئی اُمنگ — تن کر چلے لپٹ گئی بر سے قبائے تنگ
بڑھ کر چلے جو قبلۂ دیں کے سلام کو — تڑپا دل اس طرح کہ غش آیا امام کو
غل پڑ گیا کہ خلق سے اکبر کا کوچ ہے — نور و روشنی چلی مہِ انور کا کوچ ہے
لُٹتا ہے گھر شبیہ پیمبر کا کوچ ہے — گلزارِ مرتضےٰ کے گلِ تر کا کوچ ہے
اِس کربلا میں کونسی کرب و بلا نہیں — کٹتا ہے وہ نہال جو پھولا پھلا نہیں

حلقے سے بی بیوں کے جو نکلا وہ آفتاب — ہمراہ تھے پسر کے امامِ فلک جناب
چڑھنے لگا فرس پہ تو دل کو رہی نہ تاب — گھبرا کے شہ نے ہاتھ بڑھایا سوئے رکاب
تڑپا جو دل تو ہاتھوں کو حضرت کے تھام کے — سر رکھ دیا پسر نے قدم پر امام کے
تھرا کے عرض کی خلفِ مرتضیٰ ہیں آپ — کعبہ ہیں آپ یا شہِ دیں رہنما ہیں آپ
شہ نے کہا مسافرِ ملکِ بقا ہیں آپ — ہم صورتِ جنابِ رسولِ خدا ہیں آپ
الفت نہیں یہ پاسِ رسالت مآب ہے — ایسے سعید لال کی خدمت ثواب ہے

صدقے میں اس لحاظ کے اے رتبہ داں مرے — عاشق مرے شفیق مرے مہرباں مرے
مہرو مرے حسین مرے شیرِ ژیاں مرے — پیری میں باپ کیا کرے اے نوجواں مرے
طاقت تھی جس سے دل کو وہ دولت بچھڑ گئی — میں تو یہ جانتا ہوں کہ دُنیا اُجڑ گئی
آتے ہیں ہم بھی خیر سدھارو سفر کرو — اچھا بساؤ دشت کو ویران گھر کرو
تینوں میں آفتاب عبا سینہ سپر کرو — پھر دیکھ لے یہ باپ ذرا منہ ادھر کرو
اک جا ہے پہ غنچۂ خاطر کھلے نہیں — مدّت گزر گئی کہ گلے سے ملے نہیں

کیونکر دھواں اُٹھے نہ جگر سے ہزار حیف — خدمت بھی کچھ ہوئی نہ پدر سے ہزار حیف
پانی کو اس شباب میں ترسے ہزار حیف — پیاسے چلے حسین کے گھر سے ہزار حیف
گو نہر تھی قریب مگر دسترس نہ تھا — تم خوب جانتے ہو کہ بابا کا بس نہ تھا

کوثر پہ جاکے کہیو علی سے ہمارا حال
کٹ جائے میرا حلق کہ لاشا ہو پائمال
ان کے قدم تھمیں جو کوئی دستگیر ہو
یہ کہہ کے خود سوار کیا نورِ عین کو
رہوار اس آفتاب نے چھوڑا حسین کو
قدسی درود پڑھتے تھے چہرے کے نور پر

وہ شعلہ خیاں سمندِ فلک سیر کی وہ چال
مرکب ہے عدیل تو راکب بھی بے مثال
بجلی کی زرق برق تھی ساز و یراق پر
پھیلی ہوئی تھی دشت میں لطفِ سا کی بو
غل تھا یہ بو ہے سلسلۂ مصطفیٰ کی بو
حلقے نہیں یہ گیسوئے عنبر سرشت کے

صدقے ہے عود عنبر سارا نثار ہے
طبلہ ہے جو وہ نافۂ مشکِ تتار ہے
ہمسر نہیں جو گیسوؤں کے پیچ و تاب سے
پیدا ہے زلف و رخ سے منوّر سے شانِ رب
یہ لطف روزِ عید و شبِ قدر میں ہے کب
رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں

معراج مصطفیٰ کی یہ شب ہے تو وہ سحر
ہے طلعتِ رخ مفسّرِ والیل والقمر
دن جس کا ہے سپید مبارک وہ رات ہے

لال آپ کا بلا میں ہے یا شیرِ ذوالجلال
حضرت کو اپنی بیبیوں کا چاہیئے خیال
ایسا نہ ہو کہ دخترِ زہرا اسیر ہو
کس صبر سے ادا کیا خالق کے دین کو
روشن ضیائے رخ نے کیا مشرقین کو
گھوڑے پہ آپ تھے کہ تجلی تھی طور پر

پیلِ دماں کہیں کہیں ضیغم کہیں غزال
رعب و ہیبت و دبدبہ و سطوت و جلال
غل تھا چڑھے ہیں احمدِ مرسل براق پر
کچھ بو تھی گیسوؤں کی تو کچھ کربلا کی بو
مٹی ہے اس کے سامنے مشکِ خطا کی بو
دیکھو کھلے ہوئے ہیں دریچے بہشت کے

جنگل ہے مشک بیز ہوا مشکبار ہے
سنبل کا اس کے سامنے کیا اقتدار ہے
مخفی ہے آج تک شبِ قدر اس حجاب سے
نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب
ہے دو طرف ختن و خطا بیچ میں حلب
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

زیبا ہے اس کو کہیئے اندھیرے کا چاند اگر
ہے خضر ہاں ظفر کا وسیلہ ہے یہ سفر
ظلمت کو طے کیا تو پھر آبِ حیات ہے

پہلو میں دن کے رات زہے شانِ کارساز
یوسف جو دیکھ لے تو جھکائے سرِ نیاز
افزوں ہے سب سے رونقِ دینِ شہِ حجاز
زیبا ہے گورے رُخ پہ غضب گیسوئے دراز
اب تو نظر پہ یہ شبِ معراج چڑھ گئی
حیرت ہے دن تو کم نہ ہوا رات بڑھ گئی

کیوں زلف کی ثنا میں اُلجھتے ہیں موشگاف
سلجھا ہوا بیاں ہو تو مضمون ہو صاف
تعقید سر بسر ہے فصاحت کے برخلاف
باریک سخن کی ہیں راہیں خطا معاف
فکریں رسا ہیں جن کی یہاں وہ بھی ہیچ ہیں
رستہ تو بال بھر کا ہے اور لاکھ پیچ ہیں

وہ خود فرقِ پاک پہ وہ چاند سی جبیں
پرتو سے جس کے غیرتِ مہتاب شب ہیں
قرآں کی لوح۔ مطلعِ نو آفتابِ دیں
آئینۂ حلب۔ یدِ بیضا۔ مہِ مبیں
اس کو جو اس جبیں کے برابر نہ دیکھتا
پھر اپنے آئینہ کو سکندر نہ دیکھتا

ابرو ہے یا کھنچی ہوئی شمشیرِ تیز دم
صانع نے ایک لوح پہ رکھے ہیں دو قلم
پایا بھلا کمانِ کیانی نے کب یہ خم
کیا متصل ہے گوشہ سے گوشہ زہے حشم
مدت کھنچے تو پھر کشش ان کی بیان ہو
قرباں ہو لاکھ بار تو خاطر نشاں نہ ہو

خمدار وہ بھویں وہ جبینِ قمر مثال
تابندہ ایک چاند کے پیچھے ہیں دو ہلال
مطلع ہے صاف غور سے بینا کریں خیال
نقطہ ہے نورِ حسن کا ابرو پہ ہے جو خال
خوبی میں وہ تو یہ ہمہ تن لاجواب ہے
دیوانِ حسن میں یہی بیت انتخاب ہے

ہے آسمانِ حسن و شرف یہ فلک جناب
ابرو ہیں دو ہلال تو پیشانی آفتاب
منظور شمسی و قمری کا ہو گر حساب
ہاں دیکھ لیں رُخِ خلفِ ابنِ بوتراب
باریک بیں سمجھ گئے مطلب انیس کا
اُنتیس کا وہ چاند ہے یہ چاند تیس کا

مانندِ شانہ گر ہمہ تن ہو کوئی زباں
تو بھی مژہ کا وصف سرِ مو نہ ہو بیاں
قربانِ حسنِ صنعتِ خلاقِ انس و جاں
پردا ہے بہرِ چشم کبھی گاہ سائباں
موئے نگینِ دُرِ یتیمِ نجف یہ ہے
آنکھوں پہ اس کو رکھتے ہیں مردم شرف یہ ہے

اس چشم کو وہی کہے نرگس جو ہو بصیر — پیش نظر یہ دیدۂ حق بیں ہیں بے نظیر
کیوں ہر نہ گروہ ہوکے نگاہوں میں ہوں حقیر — یہ عین مردمی ہے کہ مردم ہیں گوشہ گیر
اس نور کے مکاں سے نکلنا فضول ہے — گھر بیٹھے ان کو سیر دو عالم حصول ہے

دکھلاتی ہے بیاضِ سواد ان کی شانِ رب — دن کے قریب صبح سحر کے قریب شب
پائی کسی ہرن نے یہ چشم سیاہ کب — پیدا ہے ان سے عینِ علی کا جلال سب
دیکھیں جو رعب شیرِ نیستاں غزال ہوں — دنیا ہو غرقِ خوں جو یہ غصہ سے لال ہوں

بیمار کہتے ہیں شعرا چشم کو جو سب — صحت میں اس کی شک ہے غلط ہو تو کیا عجب
دار الشفا یہ خود ہیں پئے بندگانِ رب — دیدان کی ہر مریض کی صحت کا ہے سبب
چشمک ہے ان کو عیسیٰ گردوں پناہ سے — مُردے جلا دیئے ہیں کرم کی نگاہ سے

آنکھیں وہ نرگسی جنھیں دیکھے سے ہو سرور — روشن میانِ کعبہ ہیں یا دو چراغِ طور
یا صاف دو ستاروں کا ہے ایک جا ظہور — کوثر سے یا بھرے ہوئے ہیں ساغرِ بلور
حق بیں ہیں حق شناس ہیں یزداں پرست ہیں — ہشیار کیوں نہ ہوں مئے عرفاں سے مست ہیں

ضیغم نظر ہیں صاحبِ رعب و جلال ہیں — ہاں شیر ان کے غیظ کے آگے غزال ہیں
یہ نشۂ رحیقِ جوانی سے لال ہیں — ساحر بھی ہیں تو ساحرِ سحرِ حلال ہیں
پتلی نہیں یہ چشم سیہ کے حجاب میں — پنہاں ہے روئے حضرت یوسف نقاب میں

جاگے ہیں رات کے تو نقاہت ہے آشکار — ڈورے جو سرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
مستانہ ہے یہ طور کہ جھکتے ہیں بار بار — آنسو ہیں یہ صدف میں ہیں یا دُرِ شاہوار
روتے ہیں فرقتِ شہ عالی جناب میں — نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

رخسار کو قمر جو کہوں اس میں داغ ہے — خورشید ہے تو کیا ہے وہ دن کا چراغ ہے
ذرّوں کو سر چڑھائے یہ کس کا دماغ ہے — وہ گل ہیں جن کے ذکر سے دل باغ باغ ہے
دنیا میں کوئی شے نہیں اس آب و تاب کی — رنگت ہے سیوتی کی تو خوشبو گلاب کی

گل سرخ رو ہوا نہ کبھو ان کے سامنے
مخفی چمن کا روئے نکو ان کے سامنے
بے رنگ ہے گلاب کی بو ان کے سامنے
باغِ بہشت ساختہ رو ان کے سامنے
خوشبو سے عطر بیز ہیں پردے دماغ کے
تازہ یہ دونوں پھول ہیں زہرا کے باغ کے

آیا لبوں کا ذکر بس اب ناطقہ ہے بند
ہے بے نمک یہ بات کہوں گر نبات و قند
کیا لطف گر مزہ نہ اٹھائیں سخن پسند
خود بہرِ سخن سے ان کے فصاحت ہے بہرہ مند
اعجاز ہے زبانِ بلاغت نظام میں
قرآں کی ساری مشکل ہے ان کے کلام میں

مشکل ہے وصفِ گوہرِ دندانِ بے مثال
غواصِ بحرِ حسن دکھا اپنا کچھ کمال
اس مدح میں صلہ کے جو ملنے کا ہے خیال
بھر دے گا موتیوں سے دہن فاطمہ کا لال
قبضے میں آسماں کے خزانے ہیں کے گنج
ہنس ہنس کے یہ لٹاتے ہیں دُرِ ثمیں کے گنج

اعجاز دونوں ہاتھوں میں مشکل کشا کا ہے
زور ان کلائیوں میں شہِ لافتیٰ کا ہے
گھر بازوؤں میں قوتِ خیبرالولیٰ کا ہے
سینہ نہ جانیو یہ خزانہ خدا کا ہے
کیوں شور ہو نہ ان کے قدم کے ثبات کا
جس سے بندھا ہوا ہے سفینہ نجات کا

پڑتا ہے ماہِ رخ کا جو پرتو ادھر ادھر
پھرتی ہے چاندنی کی طرح ضو ادھر ادھر
گرتے ہیں کانپ کانپ کے سو سو ادھر ادھر
لشکر میں بے وغا ہے پوارو ادھر ادھر
غل تھا عمر کا سر ابھی لائیں جو زور ہو
اس کو نگاہ بھر کے جو دیکھیں تو کور ہو

دیکھو تو منصفو یہ ملک ہے بشر نہیں
چہرے پہ ضو یہ ہے کہ مجالِ نظر نہیں
سب محو ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں
پھر کون ہے یہ ہمسرِ برق اگر نہیں
وقتِ ادب ہے ہاتھ سے تیغ و تبر رکھو
آئے رسول دوڑ کے قدموں پہ سر رکھو

نکلا لگائے چترِ زری ابنِ سعد شوم
بولا یہ کیا ہراس ہے شیرو یہ کیا ہے دھوم
تنہا وہ اک جواں ہے ادھر فوج کا ہجوم
کھوتے ہو آبروئے دلیرانِ شام و روم
پیارا ابھی پسر ہے وہ شہ مشرقین کا
خوش ہو کہ خاتمہ ہوا فوجِ حسین کا

تلواریں تو نیاموں سے جلدی پرے جاؤ
نیزے ہلا ہلا کے سوارو ادھر کو آؤ
ہاں اے کمان کشو قدراندازیاں دکھاؤ
فرزند فاطمہ کے پسر کا لہو بہاؤ
گر نور احمدی کی جہاں میں ضیا نہ ہو
انعام پھر وہ دوں جو کسی نے دیا نہ ہو

لالچ میں آئے سن کے یہ باتیں وہ زیردست
سمجھے کہ اس طرف ہے ظفر اس طرف شکست
دریا پہ کچھ سوا ہوا پہلے سے بندوبست
جھومے بلائے فوج ستم مثل پیل مست
جنگل تھا سب سیاہ ہجوم سپاہ سے
کوسوں چھپی ہوئی تھی ترائی نگاہ سے

اس طرح بڑھ کے ہٹتے تھے وہ بانیٔ حسد
اٹھتا ہے جس طرح کہ سمندر سے جزر و مد
پیاسے پہ آئے تیر ادھر سے جو لاتعد
قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے کہا یا علی مدد
دیکھا نگاہ قہر سے ہر نابکار کو
گویا خدا کا شیر بڑھا کارزار کو

اللہ رے نہیب رجز خوانیٔ ہژبر
جھنجلا کے گونجتا ہو نیستاں میں جیسے ببر
چھائی ہوئی تھی فوج ضلالت مثال ابر
جو منچلے تھے فوج میں گھٹتا تھا ان پہ جبر
غل تھا کہ سب علی کا جلال آشکار ہے
فقرہ ہر اک رجز کا نہیں ذوالفقار ہے

نعرہ کیا جو مثل علی آسماں ہلے
تھرائی یہ زمیں کہ کڑک کر مکاں ہلے
سینوں میں دل ہلے تو صفوں میں نشاں ہلے
کیا منہ کسی کا تھا کہ دہن میں زباں ہلے
گردن نہ ان کی اٹھتی تھی جو سربلند تھے
اللہ رے رعب نطق فصیحوں کے بند تھے

بعد ستائش اب و جد شیر نر بڑھا
ہٹتی ہوئی گھٹا کی طرف جوں قمر بڑھا
لاکھوں تھے پر نہ ایک ادھر سے ادھر بڑھا
جرار تیغ تولے ہوئے لے سپر بڑھا
یوں خندہ رو گیا وہ جری رزمگاہ میں
جاتا ہے جس طرح کوئی اپنی سپاہ میں

نیزوں سے روکنے لگے ڈر ڈر کے سب سوار
صفدر نے بڑھ کے میان سے لی تیغ آبدار
سب کی نظر میں کوند گئی برق ذوالفقار
ٹوٹے علم گرے جو الف ہو کے راہوار
غل تھا کہ سربلند ہے جو وہ بھی پست ہے
اکبر نے دی صدا یہ نشان شکست ہے

فرما کے یہ کمر میں رکھی اسپ کی لجام
پھرنے لگا نظر کے اشارے میں خوش خرام
سرعت وہ خِنگ کی وہ درخشانیِ حسام
اک برق کوندتی تھی میانِ سپاہِ شام
دلدل کی چال جو وہ چلن بادپا کا تھا
بجلی کی تھی جو تیغ تو گھوڑا ہوا کا تھا

کہنی تک آپ نے جو اُلٹ لی تھی آستیں
اک زلزلہ تھا کانپتی تھی دشت کی زمیں
رکے تھے منہ پہ خوف سے ڈھالوں کو اہلِ کیں
ہنس ہنس کے دیکھتے تھے علی اکبرِ حسین
افزوں تھی انگلیوں کی ضیا شمعِ طور سے
جنگل میں روشنی تھی کلائی کے نور سے

ناگہ چلی میانِ دو صف تیغِ شعلہ ریز
دم بھر میں گرم ہو گیا ہنگامۂ ستیز
آئی چمک چمک کے سروں پر جو تیغِ تیز
ان میں سے ایک کو نہ ملی مہلتِ گریز
سالم تھے نخل قد پہ نشانِ ثمر نہ تھا
دونوں صفوں میں ایک کی گردن پہ سر نہ تھا

بڑھتے تھے یوں کہ شیر جھپٹتا ہے جس طرح
ہٹتے تھے دل کہ ابر سمٹتا ہے جس طرح
ہاتھ اُڑتے تھے شجر کوئی چھٹتا ہے جس طرح
یا نرم خامہ تیغ سے کٹتا ہے جس طرح
جو اوپچی دوچار ہوا صاف چار تھا
فولاد مومِ خام سکیلہ غبار تھا

تھی استخوانِ شانہ سپر اُس کے سامنے
دامِ زرہ تھا سنبلِ تر اس کے سامنے
مو وار سب تھے کاسۂ سر اُس کے سامنے
ڈھیلی گرہ تھا بندِ کمر اُس کے سامنے
آفت کا کاٹ قہر کا خم منہ بلا کا تھا
سب ناگ ڈھنگ ضربتِ مشکل کشا کا تھا

آئی جوشن سے سینہ کی جانب اُڑا کے سر
دھڑ سے گرا سمند کی ٹاپوں پہ آ کے سر
مرکب نے کی نظر سوئے راکب ہلا کے سر
نکلی وہ تیغِ تیز بغل سے جھکا کے سر
ظالم نئی طرح سوئے دوزخ روانہ تھا
سر تھا نہ صدر تھا نہ کمر تھی نہ شانہ تھا

برسا رہی تھی دشت میں وہ شعلہ رو لہو
حیدر کا لال بیچ میں تھا چار سو لہو
تا سینہ اُس طرف تو اِدھر تا گلو لہو
کوسوں تھا سرزمینِ عرب میں لہو لہو
بہتا تھا خوں زمیں پہ جو اہلِ خلاف کا
فرطِ خوشی سے سرخ تھا چہرہ مصاف کا

جب آئی سن سے کاٹ کے جوشن نکل گئی اڑ کر صفوں کے بیچ سے ناگن نکل گئی
یوں چاک کر کے سینۂ دشمن نکل گئی شہرگ سے جان صدر سے گردن نکل گئی
سالم رگیں نہ جسم کی نہ استخواں رہے ٹوٹے قفس میں طائر وحشی کہاں رہے

اللہ ری تیزی دم شمشیر سر شگاف قبضہ میں جس کے حکم قضا تھا بسان قاف
دریائے خوں میں پیر کے نکلی دم مصاف پھر منہ لہو پئے پہ جو دیکھا تو پاک صاف
نسبت تھی ذوالفقار سے اس بے عدیل کو دھبا کہیں لگا نہ نجیب و اصیل کو

تھا نہر علقمہ کے قریب بحر خوں کا اوج تھے آگے پیچھے دست بریدہ بسان موج
ہر صورت حباب نمایاں تھے فرد و زوج طوفان آب تیغ میں ڈوبی ہوئی تھی فوج
بھاگیں تو گھاٹ تیغ کا مانع راہ تھا خشکی میں فوج شام کا بیڑا تباہ تھا

پھول اڑ گئے پھل اس کا جو چمکا سپر کے پاس نکلی ادھر سپر سے کہ آ پہونچی سر کے پاس
سر سے اتر گئی دل بیداد گر کے پاس دل سے جگر کے پاس جگر سے کمر کے پاس
کھولا کمر کا بند تو در آئی زین میں زیں سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں

اب دم نہ کیجے بڑھ کے قضا اس سے کہہ گئی ندی لہو کی دشت پر آفت میں بہہ گئی
کاٹی زرہ کڑی بھی پڑی جو وہ سہہ گئی بھاگا کوئی شقی تو لہو پی کے رہ گئی
غصہ میں مثل برق قرار اس نے کم لیا لاکھوں میں ڈھونڈھ کر اسے مارا تو دم لیا

پھل اس کا نہ سپر پہ نہ جوشن پہ رہ گیا جس پر پڑی تڑپ کے وہ توسن پہ رہ گیا
دو ٹکڑے ہو کے سر نہ فقط تن پہ رہ گیا خوں بھی اجل گرفتہ کی گردن پہ رہ گیا
دم میں نہ وہ غرور نہ وہ خودسری رہی مجرم وہی رہا یہ خطا سے بری رہی

جنگل میں چار سمت لہو کے چمن بنے جو خیرہ سر تھے نقش فنا ان کے تن بنے
مردے شکست پا کے وہ پیماں شکن بنے چار آئینے جو قبر تو جوشن کفن بنے
کشتوں پہ پشتے لاشوں پہ لاشوں کا بار تھا عصیاں کا اس پہ بوجھ غضب کا فشار تھا

بل کھا کے اُس طرف سے کوئی پل بڑھا اگر
پہونچا سمند اُڑ کے برابر وہ شیر نر
چمکی جو تیغ برق سی کوندی اِدھر اُدھر
آئی لہو میں پیر کے وہ ماہیِ ظفر
چھوڑا سوار کو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

قبضوں میں تیغیں چھپتی تھیں دہشت تھی اس قدر
گرد اپنے آپ کرتی تھی گرد اوری سپر
یہ خوف تھا کہ زہ سے نکلتے نہ تھے تیر
سہمے تھے تیر یوں کہ اُٹھا سکتے تھے نہ سر
ہر اک کمند دام بلا میں اسیر تھی
واں خود اماں کی طرح کماں گوشہ گیر تھی

نصرت جلو میں گھوڑے کے پھرتی تھی مثلِ باد
کہتی تھی فتح آج بر آئی مری مراد
تھی یہ ظفر کی عرض کہ یا خالقِ عباد
جلدی شکست پائیں یہ سب بانیِ فساد
پامال کر کے یوں اُنھیں یہ مہ لقا پھرے
جس طرح جنگ بدر سے شیرِ خدا پھرے

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب
آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کی شکم پر کہ اس کی تاب
تیزی زباں میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اُس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خونِ فوج کی اور آبدار بھی
غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابرِ تر بھی خزاں بھی بہار بھی
تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی
پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

کرتی تھی پائمال صفوں کو وہ برق سیر
دہشت سے تھا سپاہِ شقاوت کا حال غیر
نہ خود کو پناہ نہ اُس سے سپر کی خیر
چار آئنہ سے لاگ تھی اُس کو سپر سے بیر
سکّے پڑے تھے اکبرِ غازی کی حرب کے
لوہا بھی دب گیا تھا یہ معنی ہیں ضرب کے

تیر افگنانِ کوفہ و شام و عراق و ری
چلاتے تھے رہے گی کشاکش یہ تا بکے
قادر ہو مثلِ حکمِ قضا پہ خجستہ پے
سر کاٹے اُس نے تیر چلے اس طرف جی
پچھتائے علمِ تیر میں برسوں گزار کے
بس پھینک دو چڑھے ہوئے چلے اُتار کے

نیزوں کے بند بند قلم برچھیاں دو نیم — مثلِ قلم زبانِ درازِ سناں دو نیم
چار آئنہ کٹے ہوئے گرزِ گراں دو نیم — مغفر سے تا کمر جسدِ پہلواں دو نیم
سالم تھا پیشِ آئینہ تیغ جو نہ تھا — لشکر میں کونسا تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صفِ کفار ہٹ گئی — چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو اُلٹ کر پلٹ گئی — رن کی زمیں لہو کے ڈریڑوں سے کٹ گئی
دریا بھی آبِ تیغ سے بے آبرو ہوا — غل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

گیتی ہلا دی نعرۂ ضرغامِ دہر نے — گھیرا ہر اک کو حضرتِ باری کے قہر نے
مانگی پناہ چھوڑ کے ساحل کو بحر نے — گرداب کو سپر کیا سینے پہ نہر نے
گھر امن کا جو بحر میں نایاب ہو گیا — کانپیں یہ مچھلیاں کہ جگر آب ہو گیا

بولے نہنگ خوب ہٹیں یہ اگر مگر — اب تم نکل کے بحر سے بر میں بناؤ گھر
برپا ہو شامیوں کے ستم سے یہ شور و شر — لڑتے ہیں اپنے حق پہ یداللہ کے پسر
چشمہ ہو یا محیط ہو شطّ[1] ہو کہ نہر ہو — اس کے گواہ ہم ہیں کہ زہرا کا مہر ہو

ہل چل ہوئی غضب کی صفِ کارزار میں — دیکھے نکل کے شیرِ نیستاں کچھار میں
پوشیدہ مارے خوف کے اژدر تھے غار میں — جنگل سمٹ کے چھپنے لگا کوہسار میں
اک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں — رہتی یہ مچھلیاں تھیں سمندر[2] فرات میں

جب کوند کر سمند یہاں سے وہاں گیا — ثابت نہ کچھ ہوا کدھر آیا کہاں گیا
جھاڑیں جو پُتلیاں تو نظر سے نہاں گیا — گھوڑا براق بن کے سوئے آسماں گیا
غل تھا وہ آکے دیکھ لے اس با وفا کے پاؤں — دیکھے نہ ہوں زمانہ میں جس نے ہوا کے پاؤں

سرعت سے شرمسار نسیمِ سحر ہوئی — آنکھوں میں پھر گیا نہ مژہ کو خبر ہوئی
تن سے عرق کی بوند جو ٹپکی گہر ہوئی — جب خاک اُڑی اِدھر تو دُم اُس کی اُدھر ہوئی
گھوڑا نہ کہیے تختِ سلیماں روانہ تھا — اُس کے لیے تو جنبشِ رگ تازیانہ تھا

[1] رود و کنارہ دریا ۱۲
[2] ایک جانور، پتلی شکل، موش، زیادہ تر آگ میں پیدا ہوتا ہے ۱۲

باریک جلد وہ کہ خجل قاقم و حریر ۔ مشکیں پر نار آہوے رم خوردہ شیر گیر
حلقے سے یوں نکل گیا جیسے کماں سے تیر ۔ آتش مزاج بادیہ پیما فلک مسیر
یوں فتح ساتھ ساتھ تھی اس راہوار کے ۔ جیسے پیادہ چلتا ہے آگے سوار کے

تلوار تھی جو ابر تو گھوڑا بھی برق تھا ۔ مثلِ عروس زیور خوبی میں غرق تھا
کچھ اس میں اور ابر میں مطلق نہ فرق تھا ۔ دو گام اس کو فاصلۂ غرب و شرق تھا
پاکھر تھی موتیوں کی عرق جسمِ پاک پر ۔ آئی تھی بادِ تند فرس بن کے خاک پر

تھا اس گروہ میں یہ تلاطم یہ انتشار ۔ ناگہ اٹھا جو شام کی جانب سے اک غبار
بولا یہ فوج سے عمرِ سعد نابکار ۔ بھیجی کمک یزید نے لو شکرِ کردگار
یہ اکبرِ جری کی اجل کا بہانہ ہے ۔ آیا وہ پہلواں جو وحیدِ زمانہ ہے

یہ سن کے فوج سب متوجہ ہوئی ادھر ۔ دیکھا کہ اک جواں ہے فرس پہ بہ کر و فر
نیزے پہ آگے آگے ہیں رہزنوں کے سر ۔ پیچھے ہیں دو ہزار جوانانِ پر جگر
قامت سے شانِ عمر شقی آشکار ہے ۔ سمجھے یہ سب کہ رخش پہ رستم سوار ہے

وہ خو جس کو دیکھ کے مرحب ہو سرنگوں ۔ کیفِ شرابِ غیظ سے آنکھیں دو جامِ خوں
قتال بدمزاج و مہیب و سیہ دروں ۔ یکتاش و خیلتاش سے بھی توش میں فزوں
تیغ و سناں میں شانِ نریمان و گیو تھا ۔ کہنے کو آدمی یہ حقیقت میں دیو تھا

بعد از سلام بڑھ کے عمر نے کیا بیاں ۔ آپ آئے کیا کہ آگئی مرتے ہوؤں میں جاں
نیزہ زمیں پہ گاڑ کے بولا وہ پہلواں ۔ سرگرم کارزار ہے یہ کون سا جواں
عباس ہے کہ فاطمہ کا نورِ عین ہے ۔ کی عرض اس شقی نے کہ ابن الحسین ہے

کاٹے ہیں جب سے دستِ علمدارِ نامور ۔ سرگرم کارزار ہے یہ شاہ کا پسر
پوچھا شقی نے ہوئے گا سن اس کا کس قدر ۔ اس نے کہا جواں نہیں پورا یہ پر جگر
اٹھارہواں یہ سال ہے سن کے حساب میں ۔ سبزہ ابھی نمود ہے باغِ شباب میں

بولا شقی کہ فوج کا لڑکے سے ہے یہ حال — ڈٹے ہیں مورچے صفِ لشکر ہے پائمال

تب شمر نے کہا کہ یہ ہیں شبیرِ حق کے لال — طفل و جوان و پیر ہیں اس گھر کے بے مثال

سر بر ہو کون قہرِ خدا ہے وغا نہیں — اس پر کہ تین روز سے پانی ملا نہیں

ناری کے آگ لگ گئی سُن کر علی کا نام — بولا بگڑ کے وہ کہ مرے منہ پہ یہ کلام

پھر کیا اگر علی کا خلف ہے یہ تشنہ کام — کرتی ہے شق پہاڑ کا سینہ مری حسام

پیدا کیا ہے نام ہزاروں کو مار کے — اُتروں گا اب فرس سے سر اس کا اتار کے

یہ کہہ کے پھر کیا کمر آہنی کو چُست — آلاتِ حرب تن پہ کیے سر بسر درست

سارے قویٰ قوی تھے مگر عقل سخت سُست — سر میں وہی غرور وہی غرۂ نخست

کوڑا کیا فرس کو جو باگ اس نے پھیر کے — ہر صف میں غل ہوا کہ چلا منہ میں شیر کے

آیا اُڑا کے رخش وہ جس دم قریبِ زد — ہمشکلِ مصطفےٰ نے کہا یا علی مدد

پُشتی پہ ہوئے شیرِ الٰہی سا جس کا جد — ہونا ہے کیا حریف کرے لاکھ جد و کد

دریائے موج خیز یہ تھے وہ حباب تھا — زہرہ شقی کا آنکھ ملاتے ہی آب تھا

بڑھ کر ہٹا لرز کے جو سنبھلا وہ پُر غرور — بولے یہ مسکرا کے علی اکبرِ غیور

آمد میں وہ شکوہ وہ تعلّی وہ مکر و زور — گرجا تھا اس قدر تو برسنا بھی تھا ضرور

سرکش زمیں پہ گر کے سنبھلتا نہیں کبھی — نخلِ غرور پھولتا پھلتا نہیں کبھی

مقدور پر بھی کرتے ہیں عاقل فروتنی — عاجز ہیں سب خدا کی مگر ذات ہے غنی

ہم سے زیادہ کون ہے تلوار کا دھنی — چلتے ہیں جھک کے صورتِ شمشیرِ آہنی

دیکھا نہ راستی کا مزہ کج ادائی میں — سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں

سب جانتے ہیں شستِ علی کی صفائیاں — سرکیں نبی کے سامنے کیا کیا لڑائیاں

عالم کے سرکشوں نے شکستیں اٹھائیاں — بدر و احد میں خون کی نہریں بہائیاں

مدحِ علی رسولِ خدا کی زباں پہ ہے — لاسیف و لافتیٰ کی صدا آسماں پہ ہے

غرّہ ہمیں نہیں تجھے دعویٰ ہو گر تو آ
تیری طرف یزید ہماری طرف خدا
آمادہ تو دیکھی جنگ کا بھی کچھ ہنر دکھا
مالک تجھے سقر میں بلاتا ہے جلد جا
ساتوں جہنم آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

تولا شقی نے سنتے ہی یہ گرزِ گاؤسر
اکبر نے دوشِ پاک سے لی ہاتھ میں سپر
آیا ادھر سے گرز ادھر سے چلا تبر
دو ہو گیا عمود مثالِ خیارِ تر
گرز اس طرح نکل گیا پنجے سے چھوٹ کے
سمجھے یہ سب کہ میں یہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے

بھالا سنبھالا دشمنِ ایماں نے مل کے ہاتھ
نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
پہلے ہی پک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ
بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ
کم تھے نہ یہ بھی زور میں گر وہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑ ان کو یاد تھا

رکھ کر تبر نیام سے لی تیغ شعلہ ور
تھرا کے خود اماں نے صدا دی کہ الحذر
بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر
یہ بھی ادھر تھے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر
جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے تو سناں کی زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خودپسند
کھولے تمام نیزۂ بیدادگر کے بند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجلا کے پھر کمند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند
گردش بھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ گھٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اثنائے میں کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر
تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر
سرکش خدنگِ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر
چلہ کٹا کماں کا زہے تیغِ بے نظیر
قربان زور و ضربتِ نصرت نشان کے
کھل کر قفا سے بندھ گئے بازو کمان کے

خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کماں
نیزہ اٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
سپر ادھر اٹھی تھی کہ چمکی ادھر سناں
بھالے کی نوک جھونک نئی تھی نئی سناں
بیٹھا یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر
ناوک زمیں پہ تھا تو کماں آسمان پر

مطلع

ہاں اے محیطِ طبع روانی دکھا مجھے — پیری میں زورِ شورِ جوانی دکھا مجھے
ہاں اے زبان سیف زبانی دکھا مجھے — اے نطق آج سحر بیانی دکھا مجھے
تلواریں کھنچ گئیں دم تیغ آزمائی ہے — آفت کا معرکہ ہے غضب کی لڑائی ہے

اے تیغِ بادشاہِ نجف شعلہ بار ہو — اے شہسوارِ مستعدِ کارزار ہو
اے برقِ طبع کوند کے گردوں کے پار ہو — اے سیفِ خامہ دو زباں شعلہ بار ہو
ہاں معرکہ ہے بن کے لڑائی بگڑ نہ جائے — چوٹیں نئی ہوں سب کوئی مضموں لٹ نہ جائے

ہاں غازیو دکھاتا ہوں تصویرِ حرب گاہ — غل ہے ورود کا عوضِ شورِ واہ واہ
تولے ہے تیغ ادھر پسرِ شاہِ دیں پناہ — آمادۂ نبرد اُدھر ہے وہ روسیاہ
دونوں کو معرکہ میں تمنا ہے جنگ کی — باگیں اُٹھی ہوئی ہیں کمیت و شبرنگ کی

دوزخ اُدھر ہے خلدِ بریں کا چمن اِدھر — کانٹے اُدھر ہیں لالہ رخ و گلبدن اِدھر
کافر اُدھر شبیہِ رسولِ زمن اِدھر — مرحب ہے اُس طرف شہِ خیبر شکن اِدھر
باطل چلا جہاں سے کہ حق کا ظہور ہے — جو نار ہے وہ نار ہے پھر نور نور ہے

عاری ہیں تیغ زن شہِ مرداں کے سامنے — گل ہیں چراغ مہرِ درخشاں کے سامنے
کیا سحرِ سامری بنِ عمراں کے سامنے — کیا مور کی بساط سلیماں کے سامنے
آہو کا اور شیر کا انداز اور ہے — حقا کہ سحر اور ہے اعجاز اور ہے

وہ بجلیاں سی کوند کے گرتی ہیں بار بار — ڈھالوں کے پرزے اڑتے ہیں دھوئیں ہیں وار
طاؤس ہیں ہرن ہیں چھلاوہ ہیں راہوار — لشکر ہے اک زباں کہ یہ جرأت ہے یادگار
غالب یہی ہیں گو وہ قوی تر ہے دیو سے — غل ہے کہ لڑ رہے ہیں یداللہ دیو سے

بڑھتا ہے مثلِ تیغ ادھر سے وہ نامور — دب دب کے پیچھے ہٹتا ہے وہ صورتِ سپر
یوں نعرہ زن ہے غیظ میں شبیر کا پسر — یہ اضطراب جنگ میں ظالم ٹھہر ٹھہر
حملے تو دیکھ رخ سے جھلم کو اُتار کر — او روسیاہ آنکھ تو شیروں سے چار کر

کٹ کٹ کے وار کرتا ہی پیہم وہ روسیاہ
پر ان کی تیغ سے کہیں ملتی نہیں پناہ
روباہ وہ یہ بختِ دلِ ضیغم الٰہ
جن کے غلام ملکِ شجاعت کے بادشاہ
زیبا ہی برقِ شعلہ فشاں میغ کے لیئے
تیغ ان کے واسطے ہی یہ ہیں تیغ کے لیئے

اس دوپہر کی دھوپ میں تیغوں کی وہ چمک
دو بجلیاں سی کوندتی تھیں تہہِ فلک
حیرت میں تھے زمیں پہ بشر چرخ پر ملک
مثلِ علی جھپکتی نہ تھی شیر کی پلک
رُخ پر ہراس کچھ دمِ جنگ و جدل نہ تھا
تلوار چل رہی تھی پہ ابرو پہ بل نہ تھا

گھاتیں ہزار کرتا تھا وہ لاکھ مکر و زور
لیکن کہاں چراغ کہاں مہرِ دیں کا نور
اوچھا سپر کی ہی جو اُٹھائے سر غرور
بولے تو موت کا بھی طمانچہ نہیں ہی دور
سچ کہتے ہیں ہراس میں کیا زور چل سکے
پنجہ میں شیر کے ہو تو کیونکر نکل سکے

شانہ کٹا سپر سے بچایا جو اُس نے سر
ٹکڑے اُڑے جھلم کے ہٹی منہ سے جب سپر
چار آینہ میں جسم تو محفوظ تھا مگر
سارا چھنا ہوا تھا زرہ کی طرح جگر
تاب و تواں کو حرب میں ہارا ہوا تھا وہ
تیغِ زباں کے زخم کا مارا ہوا تھا وہ

خالی گئیں منجھی ہوئی چوٹیں جو اُس کی سب
منہ کو پھرا پھرا کے شقی کاٹتا تھا لب
تلوار کو اُٹھا کے پکارا وہ شیر تب
ہشیار او لعین اجل آتی ہی سر پہ اب
مہلت ابھی ہی تیغ و سپر کو سنبھال لے
باقی ہو کچھ ہوس تو اُسے بھی نکال لے

بولا سپر کو فرق پہ رکھکر وہ پُر غرور
پھنکتا ہی تن یہ دھوپ سے ہی پیاس کا وفور
میداں کرہ ہی نار کا ای کبریا کے نور
بھڑکی ہی آگ سینے میں اک صورتِ تنور
ہر چند ہاتھ دھوئے ہوں اپنی حیات سے
مہلت ملے تو پی لوں میں پانی فرات سے

تلوار روک کر یہ پکارا وہ لالہ فام
تو نے سُنا تو ہوگا کہ ہم بھی ہیں تشنہ کام
تلوار روکنے کا نہیں گرچہ یہ مقام
پر خیر پی لے نہر سے پانی کا بھر کے جام
فیاض ہیں کریم ہیں ابنِ کریم ہیں
دشمن پہ رحم کرتے ہیں ہم وہ رحیم ہیں

خنداں ہوئے شقی پہ لبِ تیغِ جاں گداز
بڑھ کر زبانِ طعن سناں نے بھی کی دراز
آواز دی کماں نے نہیں شانِ بے نیاز
سوفار نے صدا دی کہ سرکش ہے حیلہ ساز
ہے خوفِ ضربِ تیغ سے طالب پناہ کا
بولی سپر کہ پھر گیا رُخ روسیاہ کا

لے آیا آب سامنے خادم بصد شتاب
پانی پہ گر پڑا وہ کہ تھی ضبط کی نہ تاب
ظالم نے سامنے جو پیا ڈگڈگا کے آب
پیاسے تھے تین دن کے ہوا دل کو اضطراب
تڑپا جو قلب چشم کے ساغر چھلک پڑے
اُٹھا دھواں جگر سے کہ آنسو ٹپک پڑے

سیراب ہو چکا جو وہ سفاک و بدگہر
کی عرض کیجیے آپ بھی پانی سے حلق تر
فرمایا تشنہ لب ہے شہنشاہِ بحر و بر
آبِ حیات ہو تو پئیں ہم نہ بے پدر
ڈوبے ہوئے ہیں چشمۂ کوثر کی چاہ میں
یہ آبِ نہر خاک ہے اپنی نگاہ میں

شبیر نے جو دور سے دیکھا یہ ماجرا
دو چار گام بڑھ کے یہ بیٹے کو دی صدا
اے مرحبا رسول کے ہم شکل مرحبا
سیراب سلسبیل سے تم کو کرے خدا
کیونکر نہ صبر و شکر میں ایسا کمال ہو
کیونکر نہ ہو کہ ساقیٔ کوثر کے لال ہو

تسلیم کر کے شہ کو بصد عجز و انکسار
مثلِ اسد شکار پہ آیا وہ شہسوار
نعرہ کیا کہ او سگِ بزدل ستم شعار
ہاں اب تو تازہ دم ہے اُٹھا تیغِ آبدار
ہنستا ہے کیوں عرب کی حمیت کو تو نہ کھو
پانی تو پی چکا ہے بس اب آبرو نہ کھو

سُن کر برس پڑا وہ جفاکار و بدگہر
رد کر کے سارے وار بڑھا شاہ کا پسر
لہرا رہی تھی فرق پہ وہ ماہیٔ ظفر
مارا جو ہاتھ برق سی کوندی قریبِ سر
چھوڑا سوار کو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

دو ہو کے گر پڑا جو برابر وہ پہلواں
جبریل پر اُٹھا کے پکارے کہ الاماں
نکلی زمیں میں ڈوب کے شمشیرِ خوں چکاں
تکبیر کہہ کے جوش میں جھوما وہ نوجواں
افلاک سے گزر گئی سادات کی صدا
آئی خدا کے عرش سے حسنین کی صدا

منہ پھیر کر حسین کی جانب جو کی نظر
فریاد کی کہ اے خلفِ سیدِ البشر
موت آ گئی اب تو روح کو راحت نصیب ہو
فرمایا شہ نے اے علی اکبر ترے نثار
کوثر پہ شیرِ حق کو تمہارا ہے انتظار
لائے کہاں سے دل کہ یہ صدمہ اٹھا سکے
ڈیوڑھی پہ روئی بنتِ علی سن کے یہ کلام
راندوں کے روکنے کو بڑھے اس طرف امام
سب طور تھا وغائے جنابِ امیر کا
قلب و جناح کے جو دلاور ہوئے تلف
یہ غول اس طرف تو وہ مجمع تھا اس طرف
یوں حملہ ور تھے تیغ زنوں کی قطار پر
آ گئے جو بیچ سے لشکر کے بار بار
اب اس طرف ہیں آپ اُدھر فوجِ نابکار
نیزے ملا دو سینوں سے گھوڑوں کو چھیڑ کے
روکی تمام فوج نے اک تشنہ لب کی راہ
ڈھالوں سے دشت چھا گیا کوسوں تک سیاہ
لاکھوں سے معرکہ میں کوئی یوں لڑا نہیں
گرزوں پہ تھی صدائے چکا چاکِ تیغ و تبر
فرماتے تھے جو رکتا تھا اسپِ فلک سریر
زخموں سے تو بھی چور ہے اور ہم بھی چور ہیں

دیکھا زمیں پہ سجدے میں ہیں شاہِ بحر و بر
نزدیک ہے کہ پیاس سے شق ہو دل و جگر
کیجیے دعا کہ جلد شہادت نصیب ہو
ہیں کیا کروں نہیں مرا پانی پہ اختیار
مظلوم باپ تم سے نہایت ہے شرمسار
تم مانگو اور حسین نہ پانی پلا سکے
روتی ہوئی نکل پڑیں سیدانیاں تمام
گھوڑا اڑا کے فوج میں ڈوبا وہ تشنہ کام
حملے نہ تھے غضب تھا خدائے قدیر کا
گھبرا کے میمنہ پہ گری میسرہ کی صف
گویا کہ لڑ رہے تھے غضب میں شہِ نجف
جاتا ہے شیر جیسے غزالوں کی ڈار پر
مابینِ راہ تیغوں سے تن ہو گیا فگار
غل ہے ادھر اب آنے نہ پائے یہ نامدار
کشتہ کرو وہیں علی اکبر کو گھیر کے
گھوڑا اڑا کے بیچ میں آیا وہ رشکِ ماہ
تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ
غل تھا عرب میں رن کبھی ایسا پڑا نہیں
ڈوبا تھا خوں میں سب شہِ دیں کا مہِ منیر
اب ہم بھی ہیں تمام لڑائی بھی ہے اخیر
افسوس بس یہی ہے کہ بابا سے دور ہیں

نکلا پرے سے شیث ربعی جفا شعار — ہمراہ تھے شقی کے کماں دار دس ہزار
تیروں کا مینہ برس گیا پیاسے پہ ایک بار — راکب کا جسم گھوڑے کے پہلو ہوئے فگار
اُڑ اُڑ کے طے جو کرتا تھا راہِ ثواب کو — غل تھا کہ پر خدا نے دیئے ہیں عقاب کو

نکلے کماں کشوں کے جو حلقے سے وہ جناب — تھی پھر تو برچھیوں کی کرن گرد آفتاب
ڈوبے لہو میں کٹنے لگا گلشنِ شباب — روتے تھے خون کے آنسوؤں سے دیدۂ رکاب
مجروح شیر بیچ میں تھا اس ہجوم کے — نیزے پہ نیزے کھاتے تھے جھوم جھوم کے

طے کرکے معرکہ یہ پھرے تھے کہ ناگہاں — چھاتی پہ سامنے سے لگی ظلم کی سناں
دِل توڑ کر انی جو ہوئی پشت سے عیاں — نیزہ جگر سے کھینچ کے تڑپا وہ نوجواں
ٹکڑے کبد کے خوں کے تریڑوں میں بہہ گئے — گھوڑے پہ یا علی ولی کہہ کے رہ گئے

سینہ دھرے تھے زین پہ یالِ فرس پہ سر — چھوٹی تھی لٹکے ہاتھوں سے نہ تیغ نہ سپر
اٹکا ہوا تھا پسلیوں کے بیچ میں جگر — تختے جمے ہوئے تھے لہو کے اِدھر اُدھر
تڑپاتا تھا جو گھوڑے پہ صدمہ تکان کا — غل تھا کہ دم نکلتا ہے کڑیل جوان کا

چلا رہا تھا یوں پسرِ سعد رو سیاہ — ابن نمیر کیا تیرا نیزہ چلا ہے واہ
ہم میں کسی سے قتل نہ ہوتا یہ رشکِ ماہ — بیکس حسین ہو گئے دُنیا ہوئی تباہ
کر دے خبر کوئی علی اکبر گزر گئے — دیکھو تڑپ رہے ہیں کہ شبیر مر گئے

بڑھ کر پکارا شمر ستمگار و بدخصال — اے ابنِ فاطمہ خلفِ شیرِ ذوالجلال
جلد آکے دیکھیے پسرِ نوجواں کا حال — لاشہ سموں سے گھوڑوں کے ہوئے گا پائمال
جو حملہ ور تھا تیغ دو دم تول تول کے — دم توڑتا ہے اب وہی منہ کھول کھول کے

پہونچی یہ جاں گزا جو صدا گوشِ شاہ میں — دُنیا سیاہ ہو گئی شہ کی نگاہ میں
دوڑے گرے اُٹھے کئی جا اثنائے راہ میں — آئے جگر کو تھامے ہوئے قتل گاہ میں
چاروں طرف جلال میں جاتے تھے ہر طرح — بچے کو کھو کے شیر تڑپتا ہے جس طرح

دوڑے گئے اِدھر کبھی جھپٹے اُدھر کبھی
بن میں کبھی تھے رن میں کبھی نہر پہ کبھی
تھامی کمر کبھی تو سنبھالا جگر کبھی
کی مُڑ کے خیمہ گاہ کی جانب نظر کبھی
تشویش تھی کہ مادرِ اکبر نکل نہ آئے
خیمہ سے بنتِ فاطمہ باہر نکل نہ آئے

چلاتے تھے کہ ای علی اکبر کدھر ہو تو
مرتا ہو باپ ای مرے دلبر کدھر ہو تو
کچھ سوجھتا نہیں مرے یاور کدھر ہو تو
دن ہو کہ رات ای مہِ انور کدھر ہو تو
آباد گھر حسین کا تاراج ہو گیا
خورشید دوپہر سے غروب آج ہو گیا

بیٹا ضعیف باپ کدھر ڈھونڈھنے کو جائے
بچھڑے پدر سے عینِ جوانی میں ہائے ہائے
دشمن کو بھی خدا نہ فراقِ پسر کھائے
پھر بابا جان کہکے پکارو تو چین آئے
مرنے کی جس کی فصل تھی اُس نے قضا نہ کی
واحسرتا کہ عمر نے تم سے وفا نہ کی

ناگہ صدا یہ آئی کہ بابا اِدھر ہوں میں
ای نخلِ باغِ فاطمہ زیرِ شجر ہوں میں
خالق سے لو لگی ہو چراغِ سحر ہوں میں
جلد آئیے کہ آپ کا پیارا پسر ہوں میں
دردِ جگر کہیں نہ اجل کا بہانہ ہو
دیدار دیکھ لے تو مسافر روانہ ہو

دوڑے حسین سن کے یہ آوازِ دردناک
دامن تھا ست قمیصِ تنِ یوسفی کا چاک
فرزند لوٹتا نظر آیا بروئے خاک
بس گر پڑے پسر کی برابر امامِ پاک
تڑپا جو دل تو لختِ جگر سے لپٹ گئے
روحی فداک کہہ کے پسر سے لپٹ گئے

دیکھا کہ جسم سرد ہو جیسی ہیں دست و پا
دم ہو مگر حباب میں ہو جس طرح ہوا
منہ رکھ کے منہ پہ کہنے لگے شاہِ کربلا
کیوں بابا جان کہدو گزرتی ہو دل پہ کیا
بولو تو منہ سے کچھ کہ میں بیکس امام ہوں
سوکھی زباں دکھا کے کہا تشنہ کام ہوں

سر پیٹ کر امام پکارے کہ ہائے ہائے
بیٹا حسین ڈھونڈھ کے پانی کہاں سے لائے
جاں بخش دے کے لوں اگر اک جام ہاتھ آئے
ای نورِ عین پیاس تمہاری خدا بجھائے
سینے سے نعش ہو سپہ بدصفات کو
گھیرے ہوئے ہیں خون کے پیاسے فرات کو

آنسو نہ تھے یہ سنتے ہی اُس رشکِ ماہ کے ۔ چاہا کہ مل لے آنکھوں کو قدموں تک شاہ کے
کروٹ امامِ دیں کی طرف لی کراہ کے ۔ کھولا جو منہ نکل گیا دم ساتھ آہ کے
اینٹھی زباں تو ہونٹ بھی تھرّا کے رہ گئے ۔ گیسو زمینِ گرم پہ بل کھا کے رہ گئے

جھک کر پکارے شاہ کہ بیٹا کدھر گئے ۔ غش آگیا ہے دردِ جگر سے کہ مر گئے
باتیں بھی کچھ نہ کیں کہ جہاں سے گزر گئے ۔ چلنے تھے ہم بھی اور نہ دم بھر ٹھہر گئے
یوں قافلے سے چھوٹ کے شبیر رہ گیا ۔ سب نوجواں چلے گئے یہ پیر رہ گیا

سمجھے تھے ہم نبھے گا نہ پیر و جواں کا ساتھ ۔ پیر و جواں کا ساتھ ہے تیر و کماں کا ساتھ
غربت میں کون دے پدرِ ناتواں کا ساتھ ۔ واحسرتا کہ چھوٹ گیا کارواں کا ساتھ
خیر آگے آگے جاتے ہو تم آسرا تو ہے ۔ گو ہم شکستہ پا ہیں پہ سر پر خدا تو ہے

آگے تمھارے مر نہ گئے ہم ہزار حیف ۔ نکلا نہ اب بھی تن سے مرا دم ہزار حیف
تم نے کیا نہ باپ کا ماتم ہزار حیف ۔ یہ عمر اور یہ الم و غم ہزار حیف
گھر جس کے دم سے ہو وہ سعادت نشاں مرے ۔ قدرت خدا کی پیر جیئے نوجواں مرے

تڑپے یہ کہہ کے شاہ جو بیٹے کی لاش پر ۔ اس سانحہ کی ہوگئی رانڈوں کو بھی خبر
اک غل اُٹھا حرم سے کہ ہے ہے مرے پسر ۔ بچوں کو لیکے بی بیاں دوڑیں برہنہ سر
آفت میں ایک کو خبرِ دست و پا نہ تھی ۔ سر پر کسی کے تھی تو کسی کے ردا نہ تھی

سب بی بیوں میں اک ضعیفہ کا تھا یہ حال ۔ خم تھا کمر میں دوش پہ بکھرے ہوئے تھے بال
پیدا تھی زخمیوں کی تڑپ پسلیوں کی چال ۔ چلّاتی تھی کدھر ہے ارے میرے نونہال
دیتی ہوں واسطہ میں رسالت پناہ کا ۔ رستہ مجھے بتادے کوئی قتل گاہ کا

کچھ سوجھتا نہیں مجھے مقتل ہے کس طرف ۔ زخمی ہے جس میں شیر وہ جنگل ہے کس طرف
جس میں چھپا ہے چاند وہ بادل ہے کس طرف ۔ لوگو شبیہِ احمدِ مرسل ہے کس طرف
ماں کا پیام کچھ اُسے دینے کو آئی ہوں ۔ اپنے مرادوں والے کے لینے کو آئی ہوں

ہی ہی کدھر ہی گیسوؤں والا پسر مرا
جنگل میں بے چراغ کیا کس نے گھر مرا
کس خاک پہ تڑپتا ہی لختِ جگر مرا
کس نخل کے تلے ہی وہ نورس ثمر مرا
پیٹوں گی بین کر کے تنِ پاش پاش پر
بٹھلا دو ہاتھ تھام کے اکبر کی لاش پر

لوٹا اجل نے میرے بھرے گھر کو ہی غضب
خوں میں ڈبو دیا مہِ انور کو ہی غضب
پرزے کیا شبیہ پیمبر کو ہی غضب
برچھی لگی مرے علی اکبر کو ہی غضب
اس عمر میں یہ نخلِ جوانی کا پھل ملا
بستی مری لٹی تجھے کیا ای اجل ملا

ای میرے خوش بیاں مجھے اپنی صدا سنا
ای میرے نوجواں مجھے اپنی صدا سنا
ای میرے تن کی جان مجھے اپنی صدا سنا
ای میرے قدرداں مجھے اپنی صدا سنا
عاشق کے دل کو صبر کہاں ہی فراق میں
گھر سے نکل پڑی ہوں ترے اشتیاق میں

ای پیچدار گیسوؤں والے ترے نثار
ای یادگار گیسوؤں والے ترے نثار
ای مشکبار گیسوؤں والے ترے نثار
ای میرے چار گیسوؤں والے ترے نثار
دنیا سیاہ ہو گئی رستہ پہاڑ ہی
جنگل بسا ہوا ہی مرا گھر اجاڑ ہی

ای میرے گلبدن مرے ابرو کماں جواں
ای میرے کم سخن مرے شیریں بیاں جواں
ای میرے صف شکن مرے حیدر نشاں جواں
ای میرے تیغ زن مرے شیرِ ژیاں جواں
لاکھوں سے معرکہ طپشِ آفتاب میں
دو دن کی پیاس نے تجھے مارا شباب میں

وہ بھینی بھینی تن کی مجھے بو سنگھاؤ پھر
ماں صدقے جائے تشنہ ہوئے گھر میں جاؤ پھر
کھل جائے ماں کا غنچۂ دل مسکراؤ پھر
جی بھر کے میں گلے سے لگا لوں تو جاؤ پھر
غربت میں شوق سے شہِ والا کا ساتھ دو
مجکو بٹھا کے پردے میں بابا کا ساتھ دو

گھبرا کے ایک شخص نے راوی سے یوں کہا
بی بی یہ کونسی ہی جو نکلی ہی بے ردا
مریم ہی یا خدیجہ ہی یا بنتِ مصطفےٰ
بولا وہ کانپ کر کہ قیامت ہوئی بپا
خواہر حسین کی ہی نواسی نبی کی ہی
منہ پھیر لے ارے یہی بیٹی علی کی ہی

لکھتا ہے ایک راوی غمگین و دل کباب
تھی دشتِ نینوا میں وہ بی بی جو بے نقاب
چہرے پہ آفتاب کے تھا دامنِ سحاب
گیتی کو زلزلہ تھا زمانہ کو اضطراب
گر گر کے آشیانوں سے طائر پھڑکتے تھے
چنگھاڑتے تھے شیر ہرن سر پٹکتے تھے

اس حشر میں جو شہ نے بہن کی سنی صدا
جلدی اٹھا کے لاش چلے شاہِ کربلا
دیکھا کہ دوڑی آتی ہے زینب برہنہ پا
رو کر پکارے واعجبا وا مصیبتا
سر ڈھانپ لو ردا سے قیامت بپا نہ ہو
گھر میں چلو بہن علی اکبر خفا نہ ہو

اب روک لے کمیتِ قلم کی عناں انیس
بزم عزا میں سب ہیں ترے قدرداں انیس
پیری ہے یہ سفر کا رہے دھیان ہاں انیس
کیا جانیے روانہ ہو کب کارواں انیس
خیمے مسافرانِ عدم نے نکالے ہیں
جس قافلہ میں تم ہو وہ سب چلنے والے ہیں

رباعی

دم الفتِ حیدر کا جو بھرتا ہوں میں
حال آتا ہے دل کو وجد کرتا ہوں میں
ممکن ہے کہاں صفاتِ ہمنامِ خدا
کیا آگے کہوں خدا سے ڈرتا ہوں میں

رباعی

سینے میں یہ دم مثلِ سحرگاہی ہے
جو ہے اس کارواں میں وہ راہی ہے
پیچھے کبھی قافلہ سے رہتا نہ انیس
اے عمرِ دراز تیری کوتاہی ہے

مرثیہ (۱۳۷)

جب غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے
لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے
اُمّت کی مغفرت کا سرانجام کر گئے
فیض اپنا مثلِ ابرِ کرم عام کر گئے
پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر اُن کے ہوتے ہیں
ایسے بشر وہ تھے کہ ملک جن کو روتے ہیں

دیندار و سرفروش و شجاع و خوش اعتقاد
ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد
زخموں کو نخل قد پہ وہ سمجھے گُلِ مراد
مردانگی یہ پیاس میں فاقوں میں یہ جہاد
تیغوں سے بند کونسا اُن کا کٹا نہ تھا
پر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا

برسوں رہے گا چرخ میں گر آسمانِ پیر
لیکن نظر نہ آئے گا اُن کا کہیں نظیر
گورے نہ اُن کے پاؤں نہ روئے مہِ منیر
خورشید جن کے سامنے اک ذرۂ حقیر
پُرخوں قبائیں جسم میں سینے تنے ہوئے
پہونچے ریاضِ خلد میں دولہا بنے ہوئے

رستم اُٹھا نہ سکتا تھا سر اُن کے سامنے
شیروں کے کانپتے تھے جگر اُن کے سامنے
پھیکی تھی روشنیِ قمر اُن کے سامنے
اُڑتا تھا رنگِ روئے سحر اُن کے سامنے
بخشا تھا نورِ حق نے ہر اک خوش صفات کو
ہوتا تھا دن جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

پیشانیوں پہ جلوہ نما اخترِ سجود
دیکھیں جو اُن کا نور تو قدسی پڑھیں درود
رُخ سے عیاں جلالِ جوانمردی و نمود
شیدائے آل شیفتۂ واجب الوجود
جینے کی شاہِ دیں کو دعا دے کے مر گئے
ایماں کے آئینہ کو جلا دے کے مر گئے

تاثیر کر گئی تھی اُنھیں صحبتِ امام
تھا نزع میں بھی خشک لبوں پر خدا کا نام
لبریز تھے محبتِ حیدر سے دل کے جام
ذی قدر، ذی شعور، دلاور، خجستہ کام
لشکر جو اُن پہ ٹوٹ پڑے شام و روم کے
تلواریں کھائیں سینوں پہ کیا جھوم جھوم کے

لاکھوں میں انتخاب ہزاروں میں لاجواب
تھا خشک و تر پہ جن کا کرم صورتِ سحاب
وہ نور وہ جلال وہ رونق وہ آب و تاب
زہرا کے گھر کے چاند زمانے کے آفتاب
بس یک بیک جہاں میں اندھیرا سا چھا گیا
دن بھی ڈھلا نہ تھا کہ زوال اُن پہ آ گیا

گل ہو گئے عقیل کی تربت کے جب چراغ
جعفر کے لاڈلوں نے دیئے شہ کے دل کو داغ
ماتم سے بھانجوں کے ہوا تھا نہ انفراغ
پامال ہو گیا حسنِ مجتبیٰ کا باغ
لاشے اُٹھائے جنگ کرے یا بُکا کرے
جس پر گرے یہ کوہِ مصیبت وہ کیا کرے

صدمہ یہ تھا کہ لٹنے لگی دولتِ پدر
نکلے نبرد کو اسد اللہ کے پسر
مارے گئے جہاد میں جس دم وہ شیر نر
رخصت ہوئے حسین سے عباسِ نامور
دریا بہے لہو کے بڑا کشت و خوں ہوا
ڈھلتے تھے دوپہر کہ علم سرنگوں ہوا

پیری میں قہر ہے خبرِ مرگِ نوجواں
ریتی پہ تھرتھرا کے گرے شاہِ انس و جاں
نکلیں سروں کو پیٹتی خیمے سے بی بیاں
تھا خانۂ علی میں تلاطم کہ الاماں
یوں گھر اُلٹ پلٹ تھا امامِ حجاز کا
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے لنگر جہاز کا

غل تھا کہ خوں میں بھر گیا سقائے اہلِ بیت
دنیا سے کوچ کر گیا سقائے اہلِ بیت
ہم لُٹ گئے گزر گیا سقائے اہلِ بیت
فریاد ہے کہ مر گیا سقائے اہلِ بیت
ہے ہے کہاں سے اپنے بہشتی کو لائیں گے
سوکھی زبان اب کسے بچے دکھائیں گے

ہلتا تھا خیمہ روتے تھے یوں اہلِ بیتِ شاہ
صدمے سے حال زوجۂ عباس تھا تباہ
چلاتی تھی کہ نہر کی مجھ کو بتاؤ راہ
ہے ہے میں لٹ گئی مرے بچے ہوئے تباہ
خم تھے گرا تھا کوہِ مصیبت حسین پر
ماتم تھا بی بیوں میں سکینہ کے بین پر

ماتم ادھر تھا جشن میں تھے اہلِ شر اُدھر
بجتے تھے شادیانۂ فتح و ظفر اُدھر
انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر اُدھر
روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت ادھر اُدھر
غل تھا کہ بس حسین بہت روئے بھائی کو
کوئی جواں ہو اور تو بھیجو لڑائی کو

باقی نہیں کوئی تو وغا کو خود آئیے
حیدر کی ذوالفقار کے جوہر دکھائیے
زخم سناں و خنجر و شمشیر کھائیے
گرمی بڑی ہے آج لہو میں نہائیے
آمادہ ہم تو دیر سے بہرِ ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں پی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

کاٹے ہیں جس نے بازوئے بختِ دلِ امیر
ہے خوب آبدار وہ شمشیرِ بے نظیر
چھیدا ہے جس سے مشک کو موجود ہے وہ تیر
یہ گرز وہ ہے ضرب سے جس کی ہوئے اخیر
تڑپے تھے جس سے مشک کو دانتوں سے چھوڑکر
برچھی وہ ہے جو نکلی تھی پہلو کو توڑ کر

صابر بڑے ہیں آپ تو یا شاہِ انس و جاں
اک بھائی کے فراق میں یہ نالہ و فغاں
رونے سے جی اٹھیں گے نہ عباسِ نوجواں
حضرت پکارتے ہیں کسے بھائی اب کہاں
ملتا ہے کب جہاں میں بھلا جو گزر گیا
اب فکر اپنی کیجیے وہ شیر مر گیا

اکبر نے کی غضب کی نظر سوئے فوجِ شام
کانپے یہ غیظ سے کہ اگلنے لگی حسام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے قبلۂ انام
سنتے ہیں آپ لشکرِ اعدا کے یہ کلام
خوں تن میں جوش کھاتا ہے ہنگامِ جنگ ہے
مولا بس اب تو حوصلۂ صبر تنگ ہے

ان کے کلام سننے کی کس کے جگر میں تاب
خادم زبانِ تیغ سے دے گا انھیں جواب
کیا اپنے دل میں سمجھے ہیں یہ خانماں خراب
نعرہ کروں تو شیر کا زہرہ ہو آب آب
آداب شاہ سے نہیں ہم بول سکتے ہیں
زخم جگر پہ اتنے نمک یہ چھڑکتے ہیں

عمرو کو قتل کرکے بہت ہو گئے ہیں شیر
ان ظالموں کے زعم میں اب ہم نہیں دلیر
معلوم ہوگا لاشوں کے جب بن میں ہوں گے ڈھیر
دیکھیں تو کون اب ہے زبردست کون زیر
مجمع جو ہے ادھر ہمیں تنہا سمجھتے ہیں
اچھا یوہیں سہی ہم انھیں کیا سمجھتے ہیں

جوہر دکھائیں ہم کو بہادر جو ہیں بڑے
تب جانیں ایک ایک نکل کر اگر لڑے
کیا لطف ہے جو ایک پہ دو مل کے گر پڑے
چاہیں جو ہم تو نہر کو لے لیں کھڑے کھڑے
ڈرتے ہیں سرکشوں سے کوئی جو دلیر ہیں
فاقہ ہو یا کہ پیاس ہو پھر شیر شیر ہیں

ہم کو یہ طعن و طنز کی باتیں نہیں پسند
ہونٹوں پہ غم سے اب ہے یہاں جانِ دردمند
ہنس ہنس کے جسم پر تبر و تیر کھائیں گے

گھبرا کے دیکھنے لگے بیٹے کے منہ کو شاہ
کیوں کانپتے ہو غیظ سے اے میرے شابِ ماہ
غصہ اسی طرح اگر آئے گا آپ کو

برہم نہ ہو تمھیں سرِ شبیر کی قسم
دیکھو ہمیں کہ بھائی کے بازو ہوئے قلم
سب جل کے خاک ہوں جو ابھی بد دعا کروں

سن کے زرد ہو گئے ہمشکلِ مصطفےٰ
وہ وقت وہ گھڑی نہ دکھائے ہمیں خدا
آمادۂ فنا ہیں خوشی دل سے وقت ہے

کیا پہلے سر کٹائیے گا یا شہِ زماں
آگے جو کچھ رضائے خدا اے پدر کی جاں
دیکھو کہ چھوٹے بھائی کے ماتم میں روتے ہیں

یہ کہہ کے اُٹھ کھڑے ہوئے سلطانِ بحر و بر
قدموں پہ گر پڑے علی اکبر بچشمِ تر
آگے مرے جو ہوگی شہادت امام کی

چھوٹے تھے جو کہ سن میں بڑے کر گئے وہ کام
عمو کے خوں کا لیں گے لعینوں سے انتقام
عزت ملی ہے خلق میں صدقے سے آپ کے

کوفے میں لینگے دم جو اُٹھائیں گے پھر سمند
کاٹیں تبر سے تیغ سے خنجر سے بند بند
تیغِ زباں کے زخم اُٹھائے نہ جائیں گے

فرمایا خیر کہہ لیں جو کہتے ہیں روسیاہ
لازم ہے صبر و شکر کہ راضی رہے الٰہ
خنجر کے نیچے دیکھو گے کس طرح باپ کو

لو گھر میں جاؤ خیر سمجھ لیں گے ان سے ہم
تلوار دل پہ چل گئی مارا نہ ہم نے دم
پر اُمّتِ نبی ہے بجز صبر کیا کروں

رو کر کہا یہ کرتے ہیں ارشاد آپ کیا
بابا نہ ہو تو بیٹے کے جینے کا کیا مزا
پھر خضر کی حیات ملی گر تو موت ہے

کس اشتیاق سے شہِ دیں نے کہا کہ ہاں
جیتے ہیں پر سامنے مرتے ہیں نوجواں
پالا تھا جن کو ہم نے وہ دریا پہ سوتے ہیں

پٹکے سے باندھنے لگے ٹوٹی ہوئی کمر
کی عرض رحم کیجیے مر جائے گا پسر
دنیا میں آبرو نہ رہے گی غلام کی

یا شاہ کب لڑائی کے قابل نہیں غلام
ہم نے بھی تیغ باندھی ہے بچپن سے یا امام
بیٹا وہی جو رنج میں کام آئے باپ کے

انصاف آپ کیجیے یا سرورِ عرب
بیٹا تو گھر میں بیٹھے رہے باپ تشنہ لب
مارا گیا نہ آج تو کل یہ کہیں گے سب
کیسا لہو سفید ہے دنیا کا ہے غضب
سر کو کٹا کے باپ جہاں سے گزر گیا
بیٹا جوان باپ کے آگے نہ مر گیا

بہرِ رسولِ رن کی رضا دیجیے مجھے
صدقہ علی کا اذنِ وغا دیجیے مجھے
مرتا ہوں یا امام جِلا دیجیے مجھے
یادِ خدا میں دل سے بھلا دیجیے مجھے
کھولیں کمر حضور تو دل کو قرار ہو
کہہ دیجیے کہ جا علی اکبر نثار ہو

شہ نے کہا تمھیں مرے دل کی نہیں خبر
پیارے کہاں سے لاؤں میں اس طرح کا جگر
ہے باپ کا عصائے ضعیفی جواں پسر
جب تم نہ ہوگے پاس تو مر جائے گا پدر
ایسے ہنسے نہ تھے کہ ہمیں تم رلاتے ہو
شادی کے دن جو آئے تو مرنے کو جاتے ہو

راتیں یہ عیش کی ہیں مرادوں کے ہیں یہ دن
پورے جواں نہیں ابھی کیا ہے تمہارا سن
اکبر تری جوانی پہ روئیں گے انس و جن
کیونکر قرار آئے گا ماں کو تمہارے بن
کیسی ہوا چلی ہے حسین روزگار میں
سیّد کا باغ لٹتا ہے فصلِ بہار میں

دیتا اگر تمھیں کوئی فرزند ذوالجلال
ہوتی پدر کی قدر سمجھتے ہمارا حال
رخصت کا آپ سے یوں ہی کرتا وہ جب سوال
تب جانتے کہ دیتے اسے رخصتِ جدال
کیا جانے وہ مزہ جسے اس کا ملا نہیں
اچھا سدھارو تم سے ہمیں کچھ گلا نہیں

تسلیم کر کے بولے علی اکبرِ غیور
لاکھوں برس جہاں میں سلامت رہیں حضور
فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دور
برچھی لگا کے دل پہ خوش آمد یہ کیا ضرور
تقریر میں پدر کو نہ اب بند کیجیے
خیمے میں جا کے ماں کو رضامند کیجیے

ہیں مبتلائے رنج بھلا کیا ہمارا پیار
تم سے جو سو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار
ہر دم خدا سے خیر کا ہوں میں امیدوار
ہاں ماں نہ جانے دے تو مرا کیا ہے اختیار
سینے میں دل ہلے گا بدن تھرتھرائے گا
رخصت کا نام سنتے ہی غش اس کو آئے گا

سب جانتے ہیں جو ہے پھوپھی کو تمہاری چاہ ۔۔۔ معلوم ہوگا جاؤ گے جب سوئے خیمہ گاہ
باہیں گلے میں ڈالے گی زینب بااشک و آہ ۔۔۔ قدموں پہ گر کے آپ کے ماں ہوگی سدِّ راہ
پھر حلہ بھی کم نہیں زنجیر و طوق سے ۔۔۔ دونوں رضا جو دیں تو چلے جاؤ شوق سے

حسرت یہ ایک کو ہے کہ دولھا بنے پسر ۔۔۔ آئے دُلھن جو چاند سی آباد ہو یہ گھر
پوتے کی آرزو میں ہے اک سوختہ جگر ۔۔۔ نخلِ مراد کا یہی دنیا میں ہے ثمر
ہر دم یہی ہے ذکر جو فضلِ الٰہ ہو ۔۔۔ اُنیسویں برس علی اکبر کا بیاہ ہو

ماں کہتی تھی بناؤں گی دولہا اسی برس ۔۔۔ مرنے کی تم کو عین جوانی میں ہے ہوس
کچھ اس میں زور ہے نہ ہمارا نہ اُن کا بس ۔۔۔ ہم بھی مریں گے خیر نہیں اتنا پیش و پس
شکوہ نہ چرخ کا نہ شکایت ہے آپ کی ۔۔۔ پیری میں یہ بھی رنج تھا قسمت میں باپ کی

روتے ہوئے چلے علی اکبر سوئے خیام ۔۔۔ کانپا یہ دل کہ بیٹھ گئے خاک پر امام
روتا ہوا جو ڈیوڑھی سے آیا وہ نیک نام ۔۔۔ دوڑی پسر کو دیکھ کے بانوئے تشنہ کام
دامن سے آکے بالی سکینہ چمٹ گئی ۔۔۔ زینب بلائیں لے کے گلے سے لپٹ گئی

ماں گرد پھر کے بولی کہ اے میرے گلعذار ۔۔۔ تم صبح سے گئے تھے اب آئے یہ ماں نثار
در پر تڑپ تڑپ کے میں جاتی تھی بار بار ۔۔۔ کھولو بس اب کمر کہ مرا دل ہے بیقرار
گرمی یہ اور قحط کئی دن سے آب کا ۔۔۔ رُخ تمتما گیا ہے مرے آفتاب کا

تر ہے قبا پسینے میں پنکھا کوئی ہلاؤ ۔۔۔ سنولا گئے ہو دھوپ میں واری ہوا میں آؤ
جھاڑوں ردا سے گرد میں لفظوں کی بیٹھ جاؤ ۔۔۔ گھٹ جائے گا لہو مرا آنسو نہ تم بہاؤ
صدمہ جو دل پہ ہو اُسے کچھ منہ سے کہتے ہیں ۔۔۔ کیا ہے جو اشک نرگسی آنکھوں سے بہتے ہیں

صغرا کی تو وطن سے کچھ آئی نہیں خبر ۔۔۔ جلدی کہو کہ منہ سے نکلتا ہے اب جگر
اکبر نے عرض کی کہ ہیں سب خیر سے مگر ۔۔۔ لُٹتا ہے کوئی آن میں خیر النسا کا گھر
ملتی نہیں رضا ہمیں آنسو بہاتے ہیں ۔۔۔ بابا گلا کٹانے کو میداں میں جاتے ہیں

اس وقت کس سے درد دل اپنا کہوں میں آہ
تم بھی ہو سدِ راہ پھوپھی بھی ہیں سدِ راہ
چھائی ہو واں گھٹا کی طرح شام کی سپاہ
اماں مدد کرو کہ کمر باندھتے ہیں شاہ
اب زندگی ہے تلخ بہت شاق ہیں جان سے
الفت نے آپ کی ہمیں کھویا جہان سے

دیتے نہیں رضا جو امام فلک اساس
خاطر فقط یہ آپ کی ہے اور پھوپھی کا پاس
اب غیر یاس کوئی نہیں ان کے آس پاس
ناطاقتی ہے ضعف ہے فاقہ ہے اور پیاس
کیونکر لڑیں گے وہ کہ سراپا ضعیف ہیں
پیری میں دل ضعیف ہے اعضا ضعیف ہیں

عباس جب سے مر گئے روتے ہیں دم بدم
رخ زرد ہے کماں کی طرح ہو گئے ہیں خم
چلّوں میں تیر جوڑے ہیں واں بانیِ ستم
قرباں ہوں کس طرح پسرِ فاطمہ پہ ہم
سب تل گئے ہیں ان کی طرف جائیں کس طرح
ماں کو پھوپھی کو بہنوں کو سمجھائیں کس طرح

بابا کا حکم ہے کہ رضا جا کے ماں سے لاؤ
راضی پھوپھی ہوں جب تو لڑو اور زخم کھاؤ
مرضی ہے آپ کی کہ مرے پاس سے نہ جاؤ
یا فاطمہ تمھیں علی اکبر کے کام آؤ
چلنے لگیں نہ تیر شرِ مشرقین پر
نرغہ ہے ظالموں کا تمہارے حسین پر

دیکھی گئی نہ ماں سے یہ بیتابیِ پسر
وارث کی بے کسی پہ لگا کانپنے جگر
ہاتوں سے دل کو تھام کے بولی وہ نوحہ گر
دولت پہ فاطمہ کی تصدق تمام گھر
پہلے نہ مجھ کو یاد تھا اب روتی ہوں میں
روتے ہو کس لیے تمھیں کب روکتی ہوں میں

زہرا کے لال پر مرے مادر پدر نثار
عابد نثار اصغرِ تشنہ جگر نثار
جائیں ہزار ہوں تو فدا لاکھ سر نثار
قرباں گھر کنیز تصدق پسر نثار
گھبرا گئے کہ ہوں پہ بہو میں علی کی ہوں
مانگو گے جو وہ دوں گی کہ لونڈی سخی کی ہوں

مجھ پہ جو لطف کرتے ہیں گر شاہِ خوش خصال
رخصت نہ تم کو دوں یہ بھلا ہے مری مجال
صدقہ انھیں کا ہے کہ ملا تم سا نونہال
رخصت کا صدقے جاؤں پھوپھی سے ہے سوال
ہم سب کنیزیں بنتِ امیرِ عرب کی ہیں
اصغر ہو یا کہ تم وہی مختار سب کی ہیں

کہنے کو یوں ہیں چاہنے والے تمھارے سب
لیکن ہو اُن کے عشق سے نسبت کسی کو کب
دن کو انھوں نے دن کبھی جانا نہ شب کو شب
لیجے انھیں سے آپ کو جس شی کی ہو طلب
مجھ سے نہ کچھ نہ سیدِ عالی سے پوچھیے
گر پوچھیے تو پالنے والی سے پوچھیے

روتے ہوئے گئے علی اکبر پھوپھی کے پاس
دیکھا کہ غش پڑی ہے زمیں پر وہ حق شناس
زانو پہ سر لیے ہوئے کبرا ہے بے حواس
اس حال میں بھی لب پہ یہی ہے کلام یاس
اب تاب طاقت جسد روح و دل گئی
کیوں صاحبو رضا علی اکبر کو مل گئی

اکبر سے مجکو یہ نہ توقع تھی ہے غضب
اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جاں بلب
اس گل نے ہائے میری ریاضت بھلا دی سب
نامِ خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب
ہیں محو رن کے شوق میں خدمت کے دھیان میں
سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں

پالے ہمارے چین نہ آتا تھا کوئی دم
مالک اب اور ہو گئے کوئی ہوئے نہ ہم
کیا دخل تھا جو ڈیوڑھی سے باہر رکھیں قدم
ہی ہے وہ میرا درد مصیبت وہ رنج و غم
جاگی ہوں میں جو چونک کے راتوں کو روئے ہیں
پوچھو تو کس کی چھاتی پہ بچپن میں سوئے ہیں

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی
بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
بے اُن کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی
روئیں پسر پہ اُن کو رُلاتی نہ تھی کبھی
میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی ان کو تو پہچانتے نہ تھے

ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خورد سال
پران کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال
راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال
ہیں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہے میرا لال
وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں ہوتے تھے
پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

چھوٹا تو ضد بھی کرتا تھا راتوں کو بارہا
پر عون کیا عقیل تھا بخشے اُسے خدا
دن رات تھی خوشامدِ ہم شکلِ مصطفٰے
سینے پہ جب یہ سوئے تو اُس نے یہی کہا
آقا کے نورِ عین ہیں عالی مقام ہیں
اماں یہ شاہزادے ہیں اور ہم غلام ہیں

رہتے تھے پاس باپ کے وہ غیرتِ قمر
الفت میں ان کی مجکو سمجھ اُن کی نہ تھی خبر
قرآن پڑھنے بیٹھتی تھی جب دمِ سحر
صوت پہ تھی انھیں کی تلاوت میں بھی نظر
غافل نہ ان کے پیار سے میں ایک آن تھی
قرآن تو رحل پر تھا حمائل میں جان تھی

میں نے انھیں پہ صدقے کیے اپنے دونوں لال
تسکین تھی کہ باقی ہے اکبر سا نونہال
مانگے تو آکے مجھ سے بھلا رخصتِ جدال
نکلوں گی ساتھ خیمے سے بکھرا کے سر کے بال
کیا خوب جیتے جی مرے جائیں گے مرنے کو
تلوار باندھلی ہے ہمیں ذبح کرنے کو

بچپن میں تھا نہ ہم سے زیادہ کسی کا پیار
اب کیا غرض گزر گئی وہ فصل وہ بہار
بھیگیں مسیں نمود ہوا سبزۂ عذار
مالک ہیں خود بھلا مرا اب کیا ہے اختیار
ثابت ہوا اُدھر ہی اُدھر مرنے جائیں گے
میں مر بھی جاؤنگی تو وہ یاں تک نہ آئینگے

باہر سدھارے یا ابھی ہیں ماں سے کچھ کلام
بھابی نے کیوں لیا تھا ابھی رو کے میرا نام
سینے پہ منہ کو رکھ کے یہ بولا وہ لالہ فام
آنکھیں تو آپ کھولیئے حاضر ہے یہ غلام
خادم جدا نہ تھا شہِ گردوں سریر سے
کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے

کیا ہے قصور جس پہ یہ غصہ ہے یہ عتاب
کرتا ہوں بات میں کوئی بے مرضیِ جناب
روتا ہوں اب کہ صبر کی مجکو نہیں ہے تاب
شکوہ یہ خاکسار کا اے بنتِ بوتراب
ہر دکھ میں ہر بلا میں مددگار آپ ہیں
پالا ہے مجکو مالک و مختار آپ ہیں

پیدا ہوا تو آپ کی صحبت مجھے ملی
کرتی ہے روح شکر وہ راحت مجھے ملی
یوسف کو کب ملی تھی جو دولت مجھے ملی
رکھا عزیز آپ نے عزت مجھے ملی
صدقہ ہے اس قدم کا جو سر تا فلک گیا
کی مہر آفتاب نے ذرّہ چمک گیا

مرضی نہ ہو تو رن کو بھی جائے نہ یہ غلام
بندے ہیں ہم اطاعتِ مالک سے ہم کو کام
تکرار کی مجال نہ اصرار کا مقام
مرتے اگر تو اس میں بھی تھا آپ ہی کا نام
روتی ہیں آپ کس لیے اچھا نہ جائیں گے
پر یاد رکھیئے منہ نہ کسی کو دکھائیں گے

یہ کہہ کے جھک گیا جو قدم پر وہ ذی وقار
بس ہو گئیں محبتِ قلبی سے بے قرار
پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو اُٹھیں بحالِ زار
شکوے کے بدلے منہ سے یہ نکلا کہ میں نثار
اُمڈا یہ دل کہ چشم کے ساغر چھلک پڑے
دیکھا جو آفتاب کو آنسو ٹپک پڑے

لیکر بلائیں بولیں کہ واری خفا نہ ہو
صدقے ہی تم پہ جان ہماری خفا نہ ہو
باتیں تھیں یہ تو پیار کی ساری خفا نہ ہو
روتے ہو کیوں منگاؤ سواری خفا نہ ہو
آئے بلا حسین پہ جو اُس کو رد کرو
اچھا سدھارو دُکھ میں پدر کی مدد کرو

اُلفت کے جوش میں تو یہ منہ سے کہا مگر
اُٹھا یہ دل میں درد کہ تھرّا گیا جگر
کبریٰ کو روتے دیکھ کے بولی وہ نوحہ گر
کیا ماجرا ہوا مجھے مطلق نہیں خبر
میں روکنے نہ پائی کہ وار اُن کا چل گیا
کیا میں نے کہہ دیا کہ کلیجہ نکل گیا

کیا جا کے اب نہ آئے گا گھر میں یہ نونہال
ہے ہے مری کمائی پہ آ جائے گا زوال
جس وقت سے شہید ہوئے ہیں دونوں لال
بے ہوش ہوں حواس میں ہے میرے اختلال
ایسا ہی اضطراب کہ کچھ جس کی حد نہیں
جو آپ میں نہ ہو سخن اس کا سند نہیں

میں ہوش میں نہ تھی یہ قدم پر گرے تھے جب
میں بھی کہوں یہ پاؤں پہ گرنے کا کیا سبب
لو مجھ پہ اب کھلا کہ یہ رخصت کی تھی طلب
اکبر کو میں نے ہاتھ سے کھویا تھا ہے غضب
اصلا خبر نہیں مرے دلبر نے کیا کہا
میں نے جواب کیا دیا اکبر نے کیا کہا

کیا کہہ دیا تھا مرنے کو جائے یہ گلبدن
راضی ہوئی تھی میں کہ خزاں ہو مرا چمن
بیخود ہوں جب سے رن میں سدھارے شہِ زمن
کہتی ہوں کچھ زباں سے نکلتا ہے کچھ سخن
اتنی خبر نہیں علی اکبر کے پیار میں
قابو میں ہے نہ دل نہ زباں اختیار میں

زندوں میں ہوتی گر تو یہ کہتی کہ مرنے جائیں
اس پیاس میں شہید ہوں فاقوں میں زخم کھائیں
اٹھارھواں برس ہے دُلھن تو مجھے دکھائیں
پالا ہے منتوں سے مُرادیں مری بر آئیں
مرتی ہوں اشتیاق میں سہرا تو دیکھ لوں
سہرے کے نیچے چاند سا چہرہ تو دیکھ لوں

رخصت کے نام سے مرا پھٹتا ہے اب جگر — ایسا نہ ہو کہ بانوئے بیکس کو ہو خبر
گر سن لیا تو دل میں کہیں گی وہ نوحہ گر — پیارا ہوا نہ بنت علی کو مرا پسر
سمجھی تھیں کیا جو دی اُسے رخصت جدال کی — زینب نے ہائے قدر نہ کی میرے لال کی

سچ ہے کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں — ہوں لاکھ اُن کی چاہنے والی وہ پھر ہیں ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں — آنچ آتما کی ہو وہ قیامت کہ الاماں
کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خبر ہے — ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

ماں کی نہ کم توجہی اور نہ کسی کا پیار — غصہ ہو یا کہ سخت کہے دل میں ہے نثار
بلبل فدا ہے گل پہ شکایت کرے ہزار — دنیا میں عاشقوں کے دلوں کو کہاں قرار
دیں ماں کا ساتھ نام خدا اب جوان ہیں — میرا ہے جب یہ حال تو اُس کی تو جان ہیں

جس دم سنے یہ دور سے بانو نے سب کلام — آئی قریب حضرت زینب وہ نیک نام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے خواہر امام — میں ہوں کنیز آپ کی اور یہ پسر غلام
کس کی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا — بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

لونڈی ہے فاطمہ کی کنیزوں میں باوفا — ہو قطع وہ زباں جو کرے آپ کا گلا
حضرت کو ان کے سر سلامت رکھے خدا — مالک ہیں آپ اس میں کسی کو ہے دخل کیا
کچھ جائے گفتگو ہے نہ ماں کو نہ باپ کو — ہے دخل اذن دینے نہ دینے کا آپ کو

غم کھایئے نہ خون جگر آپ پیجیے — عابد کو بھیجیے یہ بھیجیے اصغر کو لیجیے
ہے اختیار روکیے رخصت نہ دیجیے — قربان جاؤں جو ہو مناسب وہ کیجیے
شادی ہو یا کہ غم ہو شریک ثواب ہوں — ہر طرح سے ہیں تابع حکم جناب ہوں

گھر میرا جب سے لٹ گیا اس گھر میں آئی ہوں — شکوے کا کوئی حرف کبھی لب پہ لائی ہوں
کسریٰ کی گو کہ پوتی ہوں سلطاں کی جائی ہوں — لونڈی ہوں آپ کی علی اکبر کی دائی ہوں
صدقہ یہ آپ کا ہے جو شہ کو عزیز ہوں — بھاوج نہ جانیے مجھے ادنیٰ کنیز ہوں

آپ اس کی ماں ہیں آپ کا فرزند ہے یہ لال
یہ عازمِ جدال ہے اور آپ کا یہ حال
آپ اس کو چاہتی ہیں یہ صدقے ہے آپ پر
قسمت بُری ہے اس میں کسی کا قصور کیا
پروا ہماری ہے نہ خیال ان کو آپ کا
عابد ہوں یا کہ یہ سبھی آنکھوں کے تارے ہیں

یہ سن کے کانپنے لگی زینب جگر فگار
اللہ یہ محبتِ فرزند اور یہ پیار
رخصت نہ دے گی تو اگر اس نورِ عین کو
آواز سن کے کانپ گئی بنتِ مرتضیٰ
واری سدھارو خیر جو کچھ مرضیِ خدا
یاں والدہ بہشت سے تشریف لائی ہیں

تسلیم کرکے خیمے سے وہ سیمبر چلا
بانو پکارتی تھی کہ پیارا پسر چلا
(عمر [illegible] حسین کا نورِ نظر چلا)
لٹتے ہیں اہل بیت دوہائی امام کی
بھائی کے غم سے عابدِ بیکس تھے بےقرار
بہنیں پکارتی تھیں کہ بھیا ترے نثار
اک حشر تھا جدا علی اکبر جو ہوتے تھے

ہلتا تھا خیمہ رانڈوں میں تھی یہ دھڑادھڑی
کوئی ادھر کو غش تھی کوئی اُدھر پڑی
ماتم تھا یہ حسین کے تازہ جوان کا

دخل اس معاملہ میں کوئی دے یہ کیا مجال
قدموں کو چھوڑتا نہ کبھی یہ نکو خصال
پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہے باپ پر
اچھا رہیں کہ جائیں ہمارا ابھی ہے خدا
تابع ہم آپ کے بھی ہیں ان پر بھی ہیں فدا
پر اب تو یہ نہ آپ کے ہیں نہ ہمارے ہیں

آئی صدائے فاطمہ بیٹی یہ ماں نثار
تنہا ستم کی فوج میں ہے میرا گلعذار
کون اب بچائے گا مرے بیکس حسین کو
بانو کے منہ کو دیکھ کے اکبر نے یہ کہا
ترکِ ادب ہے تم کو اگر اب نہ دوں رضا
بنتِ نبی تمہاری سفارش کو آئی ہیں

پیچھے حرم کا قافلہ سب ننگے سر چلا
چلاتی تھی پھوپھی مرا لختِ جگر چلا
تصویر گھر سے جاتی ہے خیر الانام کی
اُٹھتے تھے اور زمیں پہ گرتے تھے بار بار
سینوں کو پیٹتی تھیں خواتین بحالِ زار
جھولے میں پھوٹ پھوٹ کے اصغر بھی روتے تھے

آہوں کی بجلیاں تھیں تو اشکوں کی تھی جھڑی
آفت کا وقت تھا تو قیامت کی تھی گھڑی
جاتا ہے گھر سے جیسے جنازہ جوان کا

نکلا حرم سرا سے جو وہ نورِ حق کا نور
خادم نے دی صدا کہ برآمد ہوئے حضور
حضرت کھڑے تھے خیمہ کی ڈیوڑھی سے کچھ جو دور
دستِ ادب کو جوڑ کے بولا وہ ذی شعور
رخصت ہوں اب جو حکمِ شہِ نامدار ہو
رو کر کہا حسین نے اچھا سوار ہو

گھوڑے پہ شاہزادۂ عالم ہوا سوار
گویا چلے جہاد کو محبوبِ کردگار
تھا ثانیِ براق فلک سیر راہوار
صرصر سے تند و تیز تو بجلی سے بے قرار
یوں سامنے سے وہ دمِ جولاں نکل گیا
گویا ہوا پہ تختِ سلیماں نکل گیا

حضرت تو یاں زمیں پہ گرے تھام کر جگر
جاسوس نے یہ لشکرِ اعدا کو دی خبر
آتا ہے اک جوانِ حسیں غیرتِ قمر
چہرے پہ جس کے نورِ محمد ہے جلوہ گر
شان و شکوہ سب اسدِ کبریا کی ہے
کہتے ہیں سب بشر نہیں قدرت خدا کی ہے

ہے دھوم ذرہ ذرہ میں اس آفتاب کی
خوشبو ہے زلف و جسم میں مشک و گلاب کی
سر تا قدم ہے شان رسالت مآب کی
تصویر ہے رسولِ خدا کے شباب کی
گھوڑے کے گرد جن و ملک کا ہجوم ہے
صلوا علی النبی کی بیاباں میں دھوم ہے

روشن کیا ہے روئے منور نے راہ کو
رخ پر نہیں ٹھہرنے کا یارا نگاہ کو
حیراں ہے عقل دیکھ کے زلفِ سیاہ کو
آغوش میں لیے ہے شبِ قدر ماہ کو
چہرے کے نور سے شبِ مہتاب ماند ہے
خالق گواہ ہے کہ اندھیرے کا چاند ہے

یہ ذکر تھا کہ نورِ خدا جلوہ گر ہوا
گویا رسولِ پاک کا رن میں گزر ہوا
چلائے اہلِ شام کہ طالع قمر ہوا
ہنگامِ ظہر تھا پہ گمانِ سحر ہوا
جلوہ دکھایا برقِ تجلیِ طور نے
خورشید کو چھپا دیا چہرے کے نور نے

غش ہو گیا کوئی کوئی گر کر سنبھل گیا
صلِ علیٰ کسی کی زباں سے نکل گیا
خجلت سے آفتاب کا نقشہ بدل گیا
چمکا جو نور دھوپ کا جوبن بھی ڈھل گیا
دریائے نورِ حق کا عجب اوج موج تھا
سب پست تھے زمیں کے ستارے کا اوج تھا

صحرا کو شمعِ حسن نے تابندہ کر دیا
جو مردہ دل تھے دم میں انہیں زندہ کر دیا
ذرّوں کو آفتابِ درخشندہ کر دیا
گردوں کو اس زمیں نے شرمندہ کر دیا
پایہ زمیں کا عرش کے ہمدست ہو گیا
جلوے سے اوجِ کاہکشاں پست ہو گیا

اللہ رے نبیرۂ مشکل کشا کی شان
تھی جس کے عضو عضو سے پیدا خدا کی شان
حیراں تھے لوگ دیکھ کے اس مہ لقا کی شان
حمزہ کا رعب اور علی مصطفیٰ کی شان
پاکیزگی نسب میں بزرگی صفات میں
شیرینیِ کلامِ حسن بات بات میں

کچھ حسن بچپنے کا تو کچھ آمدِ شباب
وہ گل سا جسم اور وہ چہرے کی آب و تاب
اپنی جگہ پہ خال کے نقطے ہیں انتخاب
پتلی کا نور جن کی سیاہی سے بہرہ یاب
گردن کی ضو میں طورِ تجلّی طور کے
سب عضوِ تن ڈھلے ہوئے سانچے میں نور کے

دل پاک روح پاک نظر پاک جسم پاک
طینت میں آبِ خلد تھا اور کربلا کی خاک
غرفوں سے جس کے حسن کی حوروں کی جھانک تاک
یوسف جو دیکھ لے تو کہے روحنا فداک
نام اس کا لوح پر جو قلم نے رقم کیا
سو بار پڑھ کے سورۂ نور اس پہ دم کیا

کیا دخل چار ہو جو کسی بے ادب کی آنکھ
رکھتی تھی رعب یہ نہ عجم نہ عرب کی آنکھ
لاکھوں تھے اس طرف پہ جھپکتی تھی سب کی آنکھ
غصّہ ستم کا قہر کی چتون غضب کی آنکھ
پانی تھا خوفِ جاں سے جگر ہر دلیر کا
آہو شکار کرتے تھے میداں میں شیر کا

غل تھا رسولِ پاک کے ثانی کو دیکھنا
حسنِ بہارِ باغِ جوانی کو دیکھنا
کھلتے ہیں گل شگفتہ بیانی کو دیکھنا
یہ سب تو ہیں پہ غنچہ دہانی کو دیکھنا
نازک لب اس صفت کے دہن اس طریق کا
خاتم پہ جڑ دیا ہے نگینہ عقیق کا

کچھ عمر بھی نہیں ابھی اٹھارواں ہے سال
یہ باغ کس بہار میں ہوتا ہے پائمال
قامت ہے یہ کہ سروِ گلستانِ اعتدال
ماں باپ بچہ دیکھ کے کیونکر نہ ہوں نہال
آنکھوں کے سامنے جو یہ قامت نہ ہوئے گی
بتلاؤ ماں کے دل پہ قیامت نہ ہوئے گی

زخمی جو ہوگی تیر سے یہ چاند سی جبیں ٹپکے گی سر کو خاک پہ بانوے دل حزیں
تیغوں سے جب کٹینگے یہ رخسار نازنیں پیٹینگے دونوں ہاتھوں سے منہ پادشاہ دیں
سینہ چھدے پسر کا تو کیا دل کو کل پڑے ایوب بھی جو ہو تو کلیجا نکل پڑے

ناگاہ فوج کیں سے عمر نے کیا کلام یہ وقت کارزار ہے اے ساکنان شام
بس ہے یہی بساط شہنشاہ خاص و عام مارا گیا یہ شیر تو مرجائیں گے امام
لوٹو جناب فاطمہ زہرا کے باغ کو ٹھنڈا کرو حسین کے گھر کے چراغ کو

تصویر مصطفےٰ کی مٹائے گا آج جو کہتا ہوں میں کہ صاحب جاگیر ہوگا وہ
محبوب کبریا کے مشابہ ہے گر تو ہو اب مصلحت یہی ہے کہ مہلت اسے نہ دو
ہے اس سے کیا مراد حسین ہے کہ نیک ہے دو لاکھ اس طرف ہیں دلاور وہ ایک ہے

دنیا نہ جائے دین کا گر ہو تو ہو ضرر ٹکڑے کرو اسے کہ یہ دشمن کا ہے پسر
تم آبدیدہ ہو لب خشک اس کے دیکھ کر قطرہ نہ دو میں گھٹنیوں صغریٰ بھی آئے گر
غیر از یزید اور کوئی حکمراں نہ ہو اولاد مرتضےٰ میں کسی کا نشاں نہ ہو

ہاں غازیو نہ اس کی جوانی کا غم کرو نیزے پہ نیزے مارو ستم پر ستم کرو
برچھی اٹھاؤ ہاتھوں میں تیغیں علم کرو نخل مراد سبط نبی کو قلم کرو
بیٹا نہ جب رہا تو کدھر جائیں گے حسین گھوڑے سے یہ گرے گا تو مرجائیں گے حسین

چھد جائے گا سناں سے جو اس شیر کا جگر تڑپیں گے کیا زمیں پہ شہنشاہ بحر و بر
ڈیوڑھی سے ماں پکارے گی ہے ہے مرا پسر نکلے گی خیمہ گاہ سے زینب برہنہ سر
حضرت تو پیٹتے ہوئے لاشے پہ آئینگے ہم لوٹنے کو خیمۂ اقدس میں جائیں گے

یہ گلعذار دختر حیدر کی جان ہے بہنوں کی زندگی ہے برادر کی جان ہے
بابا کی روح ہے تن مادر کی جان ہے بے جان کر دو اسے کہ یہ سب کی جان ہے
جوشن یہی ہے بازوئے برنا و پیر کا بعد اس کے خاتمہ ہے صغیر و کبیر کا

یہ سن کے فوجِ کیں ہوئی آمادۂ نبرد
غل سن کے ہوگیا شہِ والا کا رنگ زرد
ماں گر پڑی زمیں پہ پھوپی بلبلا گئی

قرنا پھنکی سپاہ میں طبلِ وغا بجا
پیدل چلے نبرد کو باجے بجا بجا
حضرت پکارے لال پہ اعدا کے ریلے ہیں

لڑنے کو اس طرف سے عدو سب کے سب بڑھے
چومے قدم نہیب نے جھک کر یہ جب بڑھے
دہشت سے فوجِ شام کی بدلی سمٹ گئی

ڈھالوں کو رکھ کے چہروں پہ گر گر پڑے حسود
تھرّا گیا تمام جنودِ سقر ورود
عبرت سپاہِ شام پہ وہ چند ہوگئی

جرّار کی زرہ پہ لگے جب کئی خدنگ
چمکا اک آئنہ کہ ہوئی فوجِ شام دنگ
تھی کس کو تابِ صاعقۂ شعلہ بار کی

تھم تھم کے یوں گیا صفِ اعدا پہ وہ دلیر
غازی جو بھوک پیاس میں تھا زندگی سے سیر
اک سیل زور شور سے آئی گزر گئی

جب یہ بڑھے ہجومِ اعدا کا گھٹ گیا
لشکر میں فرد فرد کا چہرہ جو کٹ گیا
سر داخلِ خزانۂ سرکار ہوگئے

دردِ دلِ حسین کا تھا ایک گونہ درد
کانپے جو پاؤں بیٹھ گئے بھر کے آہِ سرد
بدلی ستم کی واں علی اکبر پہ چھا گئی

باندھے پرے سواروں نے بڑھ بڑھ کے جابجا
چلّائے اہلِ بیت کہ ہے ہے یہ کیا بجا
رانڈو دعا کرو علی اکبر اکیلے ہیں

تنہا ادھر سے اکبرِ عالی نسب بڑھے
گویا پئے جہاد امیرِ عرب بڑھے
قدرت خدا کی دن جو بڑھا رات گھٹ گئی

گو تھے کئی ہزار پہ کیا ان کی ہست و بود
نورِ خدا کے سامنے ظلمت کی کیا نمود
باجوں کی فوجِ کیں کے صدا بند ہوگئی

صفدر نے پڑھ کے فاتحہ لی تیغ شعلہ رنگ
دکھلائے تیغِ تیز نے بجلی کے رنگ ڈھنگ
یاد آگئی ہر اک کو چمک ذوالفقار کی

جاتا ہے داؤں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر
کشتوں کے پشتے ہوگئے دم میں دوں کے ڈھیر
ثابت نہ یہ ہوا صفِ اعدا کدھر گئی

باقی تھا جو حساب تو لاشوں سے پٹ گیا
بس فتحِ سپاہ کا دفتر الٹ گیا
پہلا ہی جائزہ تھا کہ بے کار ہوگئے

چہرے پہ ایک کے نہ بحالی نظر پڑی | جو صف بھری ہوئی تھی وہ خالی نظر پڑی
سر پر سبھوں کے تیغِ ہلالی نظر پڑی | سوئے جنوب فوجِ شمالی نظر پڑی
غل تھا کہ تیغِ تیز نہیں موت آتی ہے | کیونکر قدم تھمیں کہ زمیں سرکی جاتی ہے

ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ بھالے اِدھر اُدھر | چھپتے تھے ڈر کے برچھیوں والے اِدھر اُدھر
پیشِ نظر تھے خون کے نالے اِدھر اُدھر | ابتر تھے دشتِ کیں میں رسالے اِدھر اُدھر
ملتا تھا فصل کا نہ ٹھکانا نہ باب کا | شیرازہ کھل گیا تھا ستم کی کتاب کا

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی | چار آئنہ کٹا زرہِ خیبرہ سر کٹی
نیزے کی ہر گرہ صفتِ نے شکر کٹی | سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی
رہوار بھی دو نیم میانِ مصاف تھا | ان سب کے بعد مُنہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اُس کی چمک دمک | کانپی کبھی زمیں کبھی تھرّا گئے فلک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک | ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک
کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے | گاوِ زمیں سمٹی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

سیدھی چلی وہ جب صفِ دشمن اُلٹ گئی | باقی تھی جتنی عمر تہِ تیغ کٹ گئی
آکر زمیں پہ جب سوئے گردوں پلٹ گئی | بجلی سے رعد رعد سے بجلی لپٹ گئی
گرتے تھے جو زمیں پہ منہ ڈھانپ ڈھانپ کے | ہٹتے تھے جبرئیل امیں کانپ کانپ کے

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں | چلّے کہیں تھے شست کہیں اور کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں اور سناں کہیں | جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں
اِک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا | جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

چمکی گری اُٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی | خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی | ندّی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی
اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں | ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

سرِ خود سروں کے چنبرِ گردن سے کٹ گئے ہاتھ آستیں سے اُڑ گئے سر تن سے کٹ گئے
ڈر ڈر کے سب پرند نشیمن سے اُڑ گئے پائی جو راہ طائرِ جاں تن سے اُڑ گئے
تھے قتلِ عام پر عسلی اکبر تلے ہوئے رستے تھے بند زخموں کے کوچے کھلے ہوئے

اللہ رے دو آبۂ تیغِ دو دم کا کاٹ آفت تھی جس کی باڑھ قیامت تھا جس کا گھاٹ
مقتل سے تا بہ نہر تھا دریائے خوں کا پاٹ ہر دم تھی اس کو تازہ لہو چاٹنے کی چاٹ
سختی کو جوڑ بند کے کب مانتی تھی وہ ہر استخواں کو مغزِ قلم جانتی تھی وہ

آئی جدھر پلٹ کے صفوں کو بچھا گئی تن سے اُڑا دیا وہیں سر جس کو پا گئی
ہر اک کڑی کو نرم سمجھ کر چبا گئی فولاد کی زرہ کو نوالے سے ہیں کھا گئی
چار آئنہ کا کاٹ اسی پر حوالہ تھا ذکر اس کا کیا ہے خود تو منہ کا نوالہ تھا

یارا قرار کا تھا نہ صورت فرار کی پیدل کی موت تھی تو خرابی سوار کی
روئیں تنوں کو تاب نہ تھی ایک وار کی ٹکڑے تھے دو کے ہاتھ پہ کھائی تھی چار کی
آگے بڑھے تو منہ وہیں کٹ جائے گیو کا بجلی کی تھی کڑک کہ طمانچہ تھا دیو کا

اُتری زمیں پہ وہ سرِ دشمن پہ جب چڑھی دم بھر میں آب تیغ کی ندی نصف چڑھی
اک شور تھا صفوں میں کب اتری کب چڑھی سب کو بخارِ تیغ سے لرزے کی تپ چڑھی
مقتل سے بھاگنے پہ تنک ظرف تل گئے کانپے یہ نیزہ باز کہ سب بند کھل گئے

زندہ کسی کو تیغ دو دم چھوڑتی نہ تھی پیاسی یہ تھی کہ جسم میں دم چھوڑتی نہ تھی
بے دم لیے گلا کوئی دم چھوڑتی نہ تھی بھاگیں کہاں کہ موت قدم چھوڑتی نہ تھی
خود وہ دبے جو لڑتے تھے گھوڑوں کو داب کے بیڑی قدم میں بن گئے حلقے رکاب کے

قعرِ سقر میں کشتۂ ضربِ نخست تھے بے سر ہوئے بہت کہ لڑائی میں چست تھے
قبضہ میں تھا نہ زور نہ بازو درست تھے کھینچیں کسے کمانوں کے بازو بھی سست تھے
ہر کج نہاد تیرِ اجل کا نشانہ تھا شانے بھی تھے قلم یہ نیا شاخسانہ تھا

تیغوں کو ڈر کے عربدہ جو پھینکنے لگے
مغفر سروں کے مثل سبو پھینکنے لگے
حلقے کماں کے سب لبِ جو پھینکنے لگے
تنکا سمجھ کے تیر عدو پھینکنے لگے
ترکش بھی اہلِ ظلم کے آفت رسیدہ تھے
چلّے بھی کشمکش میں کماں سے کشیدہ تھے

کرتے تھے فتح جنگ کو جو ایک آن میں
رعشہ تھا اُن کے ہاتھ میں لکنت زبان میں
اُلجھاتے تھے کمند کمینے کمان میں
ترکش میں تیغیں رکھتے تھے تیروں کو میان میں
تلوار رکھ کے ہاتھ سے منہ ڈھانپ لیتے تھے
آتی تھی تیغ جب تو سپر پھینک دیتے تھے

بڑھتے تھے جو پرے سے بڑے بول بول کے
پہلے اُنھیں کو مار لیا رول رول کے
حملہ کیا جو تیغِ دو دم تول تول کے
ہتھیار سب نے پھینک دیئے کھول کھول کے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دو دن کی پیاس میں علی اکبر غضب لڑے

دہشت سے کتنے ڈوب گئے دریا میں مر گئے
اس گھاٹ پر جو آئے سر اُن کے اُتر گئے
رستہ تھا ایک اِدھر وہ گئے یا اُدھر گئے
پھر پھر کے ہر طرف سے میانِ سقر گئے
نار اُن کے اشتیاق میں اب اُن کی لاگ میں
پھینکا ہوائے آب میں پانی نے آگ میں

وہ حرب وہ شکوہ وہ شانِ پیمبری
نعرے وہ زور و شور کے وہ ضربِ حیدری
وہ تیغ خونچکاں وہ جلالِ غضنفری
راکب جو رشکِ حور تو رہوار بھی پری
چالاک آہوانِ ختن اس قدر نہ تھے
اُڑ جاتا تھا ہما کی طرح اور پر نہ تھے

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خوں
کنوٹے کو دیکھ کر مہِ نو ہوئے سرنگوں
رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں
غنچے بھی کچھ بڑے ہیں کنوتی کو کیا کہوں
قرباں ہزار جاں فرسِ بے نظیر پر
سوفار دو چڑھے ہوئے ہیں ایک تیر پر

کوتاہ و گرد و صاف کنوتی کمر کفل
کیا خوشنما کشادگیِ سینہ و بغل
سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل
پھرتا تھا اس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل
رکنے سانس لی کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تارِ نفس بھی اُس کے لیے تازیانہ تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند — سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند — نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند
گر مل گئی ہوا سے ذرا باگ اُڑ گیا — پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مُڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال — کبکِ دری خجل دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال — اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا — چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوا بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا — آیا عرق تو ابرِ گہربار بن گیا
گہہ قلب گاہ گنبدِ دوّار بن گیا — نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اُس کے گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے — تھوڑی ہی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

جب اس جری نے قتل کیے پانچسو جواں — ہر صف سے ہر پرے سے اُٹھا شورِ الاماں
چلّایا ابنِ سعد سیہ قلب و سخت جاں — کلیں وہ دس ہزار کماندار ہیں کہاں
برچھی کا اب ہے کام نہ تلوار چاہیے — اس نوجواں پہ تیروں کی بوچھار چاہیے

فاقہ ہے تین روز کا سولہ پہر کی پیاس — دیکھے نبیرہ اسد اللہ کے حواس
دریا سے تم قریب ہو اور اس قدر ہراس — برساؤ تیر دور سے جاؤ نہ اُس کے پاس
بپھرے ہوئے اسد کہیں تلوار کھاتے ہیں — جب اُڑ سکے نہ شیر تو نزدیک جاتے ہیں

یہ سُن کے تشنہ لب پہ چلے چار سو سے تیر — پتھر عقب سے پڑنے لگے روبرو سے تیر
آتے تھے فوج فوج سیاہ عدو سے تیر — سب سُرخ تھے شبیہ نبی کے لہو سے تیر
مقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورِ عین پر — پروانے گر رہے تھے چراغِ حسین پر

سینے پہ تیر کھا کے اُٹھایا جو راہوار — بجلی چمک کے ہوگئی گویا فلک کے پار
سر خاک پر گرانے لگی تیغِ آبدار — تیروں کو پھینک پھینک کے بھاگے خطا شعار
حملہ کیا تھا جن پہ رُخ اُن کے تو پھر گئے — پر پلٹ کے برچھیوں والوں میں گھر گئے

یوں آگیا سنانوں میں وہ آسماں جناب
ہو جس طرح خطوط شعاعی میں آفتاب
سوکھی زباں میں پڑ گئے کانٹے بغیر آب
طاقت بھی فرط ضعف سے دینے لگی جواب
آمد ہوئی جو غش کی سر پاک جھک گیا
واحسرتا کہ ہاتھ بھی لڑنے سے رک گیا

اس حال میں بھی تیغ سے کیں برچھیاں قلم
لیکن جگر پہ لگ گیا اک نیزۂ ستم
زخم جگر سے بہنے لگا خون دم بدم
نکلے ہوئے کابوں سے تھرّاتے تھے قدم
کھینچا جو اس نے سینے سے نیزہ کتاں کے ساتھ
دو پارۂ جگر نکل آئے سناں کے ساتھ

نیزہ لگا کے بھاگ چلا تھا وہ نابکار
قربان جرأت پسر شاہ نامدار
زخم سناں تھا سینۂ انور کے وار پار
ماری شقی کو دوڑ کے اک تیغ آبدار
پہونچوں سے اس کے ہاتھ قلم ہو کے گر پڑے
لیکن فرس سے آپ بھی خم ہو کے گر پڑے

گرنا تھا بس کہ سر پہ لگا گرز ہے ستم
یوں جھک گئے کہ ہوتے ہیں سجدے میں جیسے خم
رکھ دی گلے پہ شیث نے شمشیر تیز دم
تلوار اک پڑی کہ ہوئیں پسلیاں قلم
غل تھا کرو نہ رحم تن پاش پاش پہ
دوڑا دو گھوڑے اکبر مہرو کی لاش پہ

حضرت کھڑے تھے خیمے کی پکڑے ہوئے طناب
سن کر یہ غل رہی نہ دل ناتواں کو تاب
ناگاہ آئی رن سے صدائے فلک جناب
بیٹا جہاں سے جاتا ہے اب آئیے شتاب
لاشے پہ ظلم و جور بدافعال کرتے ہیں
گھوڑوں سے اہل کیں ہمیں پامال کرتے ہیں

سن کر یہ استغاثۂ فرزند خوش خصال
سجّاد نے آہ کی کہ ہلا عرش ذوالجلال
کھولے جناب فاطمہ کی بیٹیوں نے بال
بانو پکاری خیر تو ہے اے علی کے لال
ہے ہے پسر سے کونسی مادر بچھڑ گئی
صاحب بتاؤ کیا مری بستی اجڑ گئی

نیزے سے کس کے لال کا زخمی ہوا جگر
کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہل شر
کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر
اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے مرا پسر
پروا نہ مجھ سے کیجیے سب جانتی ہوں میں
آواز یہ اسی کی ہے پہچانتی ہوں میں

بانو کو قسمیں دے کے چلے شاہ نامدار
وہ پیاس اور وہ دھوپ کا صدمہ وہ اضطرار
دل تھا الٹ پلٹ تو کلیجہ تھا بے قرار
اٹھتے تھے اور زمیں پہ گرتے تھے بار بار
چلاتے تھے شبیہ پیمبر ہم آتے ہیں
گھبرائیو نہ اے علی اکبر ہم آتے ہیں

بیٹا پکارو پھر کہ بصارت میں فرق ہے
اے نور عین جسم کی طاقت میں فرق ہے
تم یہ نہ جانیو کہ محبت میں فرق ہے
زخمی ہے قلب روح کی راحت میں فرق ہے
داغ جگر ملا ہمیں گودی میں پال کے
کس کو دکھاؤں اپنا کلیجہ نکال کے

آؤں کدھر کو اے علی اکبر جواب دو
چلا رہی ہے ڈیوڑھی پہ مادر جواب دو
اکبر برائے خالق اکبر جواب دو
بیٹا جواب دو مرے دلبر جواب دو
گرتے ہیں ہم ثواب کا ہاتھوں سے کام لو
بیٹا ضعیف باپ کے بازو کو تھام لو

کچھ سوجھتا نہیں ہے کدھر جاؤں کیا کروں
اے نور چشم تجھ کو کہاں پاؤں کیا کروں
مضطر ہے جان و دل کسے سمجھاؤں کیا کروں
کیونکر پسر کو ڈھونڈ کے میں لاؤں کیا کروں
پایا تھا مدتوں میں جسے خاک چھان کے
وہ لعل ہم نے کھو دیا جنگل میں آن کے

بس اب خبر حسین کی لے جلد اے اجل
اے جسم زار زیست کا باقی نہیں محل
اے جان ناتواں تن مجروح سے نکل
ہاں اے نفس چھری کی طرح سے گلے پہ چل
چھوٹے نہ اس کا ہاتھ جو پیری کی آس ہو
لاشہ بھی لاشہ علی اکبر کے پاس ہو

جنگل سے بے حواس پھرے نہر پر گئے
واں بھی جو وہ گہر نہ ملا سوئے بر گئے
دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے
نالے ملے لہو کے برابر جدھر گئے
ٹپکا ہوا زمیں پہ جگر کا لہو ملا
لیکن کہیں نہ وہ پسر ماہرو ملا

جا کر صفوں کے پاس پکارے باشک و آہ
ہے کس طرف مرے علی اکبر کی قتل گاہ
اے ظالمو یہ شب ہے کہ دن ہو گیا سیاہ
کس ابر میں چھپا ہے مرا چودھویں کا ماہ
بتلاؤ جان ہے کہ نہیں جسم زار میں
زخمی پڑا ہے شیر مرا کس کچھار میں

لاشِ پسر کو ڈھونڈھتے تھے شاہِ بحر و بر
سر پیٹنے کی جا ہے کہ ہنستے تھے اہلِ شر
کہتا تھا شمر ای پسرِ سیّد البشر
کس کو حضور ڈھونڈھتے ہیں مر گیا پسر
خود ڈھونڈھ لیجیے جسدِ پاش پاش کو
بتلائیں گے نہ ہم علی اکبر کی لاش کو

یہ سُن کے کھینچ لی شہِ والا نے ذوالفقار
چمکی جو برقِ تیغ تو بھاگے ستم شعار
شہ کو نظر پڑا علی اکبر کا راہوار
چلّائے ای عقاب کدھر ہے ترا سوار
دکھلا دے مجکو لاش مرے نورِ عین کی
کس دشت میں پڑی ہے بضاعت حسین کی

ملنے دے ان رکابوں کے حلقوں سے چشمِ نم
ہے ہو اسی میں تھے مرے فرزند کے قدم
بوسے تری لگام کے لوں میں اسیرِ غم
اکبر کے ہاتھ میں تھی یہی باگ ہے ستم
ہے ہے وہ ہاتھ پاؤں مرے آفتاب کے
قرباں تری لگام کے صدقے رکاب کے

گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر
یعنی کہ لاش آپ کے پیارے کی ہے ادھر
جاتا تھا آگے آگے وہ تازی بچشمِ تر
گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھے سلطانِ بحر و بر
جنگل میں لاشۂ پسرِ نوجواں ملا
وہ مہ لقا ملا تو مگر نیم جاں ملا

دیکھی عجیب حالتِ فرزندِ نوجواں
ہچکیاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں
تن پہ جراحتِ تبر و خنجر و سناں
گردن تھی کج پھری ہوئی آنکھوں کی پتلیاں
ٹاپوں سے مرکبوں کی جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید خاک میں گیسو اٹے ہوئے

ہچکی کے ساتھ کہتے ہیں واکر کے چشمِ تر
ای جانِ جسمِ زار ہیں اور ایک دم ٹھہر
ای موت بے وطن کی جوانی پہ رحم کر
ای درد تھم ذرا کہ پھٹا جاتا ہے جگر
پھر ایک بار سیدِ والا کو دیکھ لوں
مہلت بس اتنی دے کہ میں بابا کو دیکھ لوں

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ خدا دکھائے
حضرت زمیں پہ گر کے پکارے کہ ہائے ہائے
زندہ رہے یہ پیر جواں یوں جہاں سے جائے
ای لال تین روز کے فاقہ میں زخم کھائے
شاید جگر کے زخم سے تم بے قرار ہو
زخمی تمھاری چھاتی پہ بابا نثار ہو

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو اے میرے گلعذار | کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے پٹکتے ہو بار بار
آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بے قرار | بیٹا تمہاری ماں کو تمہارا ہے انتظار
بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق ہیں | اکبر تمہاری ماں نہ جیے گی فراق ہیں

غش میں سنا جو ہیں علی اکبر نے ماں کا نام | کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوئے خیام
سوکھی زباں دکھا کے یہ بولا وہ تشنہ کام | شدت یہ پیاس کی ہے کہ دشوار ہے کلام
اب اور کوئی دم کا پسر میہمان ہے | امداد یا حسین کہ پانی میں جان ہے

فرمایا شہ نے اے علی اکبر میں کیا کروں | پانی نہیں ہے مجھکو میسر میں کیا کروں
گھیرے ہیں نہر کو یہ ستمگر میں کیا کروں | کچھ بس نہیں مرا مرے دلبر میں کیا کروں
اعدا نہ دیں گے بوند اگر لاکھ کد کریں | بیٹا تمہاری ساقی کوثر مدد کریں

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر | اتنی زباں ہلی کہ خدا حافظ اے پدر
ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھ سے جگر | انگڑائی لیکے رکھدیا شہ کے قدم پہ سر
آباد گھر لٹا شہ والا کے سامنے | بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

لکھتا ہے ایک راوی غمگین و پرملال | یعنی ادھر ہوا علی اکبر کا انتقال
نکلی حرم سے ایک زن فاطمہ جمال | گویا جناب سیدہ کھولے ہوئے تھیں بال
تھی اس طرح سے رخ پہ ضیا اس جناب کے | حلقہ ہو جیسے نور کا گرد آفتاب کے

چلاتی تھی اسے مرا پیارا ہے کس طرف | اے آسماں وہ عرش کا تارا ہے کس طرف
اے ابر شام چاند ہمارا ہے کس طرف | اے ارض کربلا وہ سدھارا ہے کس طرف
ہے ہے سناں سے جان گئی میہمان کی | میت کدھر کو ہے مرے کڑیل جوان کی

اے میرے لمبے گیسوؤں والے کدھر ہے تو | ہے ہے مرے غریبی کے پالے کدھر ہے تو
واری کہاں لگے تجھے بھالے کدھر ہے تو | کیونکر چھوپی جگر کو سنبھالے کدھر ہے تو
اٹھارھواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے | اے نور عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

ہی ہی مرے سعید و رشید و متین جواں
خوش رو جواں غریب جواں مہ جبیں جواں
صفدر جواں شکیل جواں نازنیں جواں
کس نے تجھے مروڑ لیا اے حسیں جواں
آغاز تھیں مسیں ابھی ایسے مسن نہ تھے
بچے مرے ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے

یہ بین کرتی جاتی تھی وہ سوختہ جگر
سیدانیوں کا غول تھا پیچھے برہنہ سر
جاتی تھی بے حواس ادھر سے وہ نوحہ گر
آئے ادھر سے لاش لیے شاہ بحر و بر
دیکھا لہو رواں جو تنِ پاش پاش سے
سب بی بیاں لپٹ گئیں اکبر کی لاش سے

ہاں شاہِ دیں کے تعزیہ دارو بکا کرو
ہاں اے خدا کے دوست کے پیارو بکا کرو
ماتم ہیں ہاتھ سینہ پہ مارو بکا کرو
اکبر جہاں سے اٹھ گئے یارو بکا کرو
سمجھو شریکِ بزمِ شہِ مشرقین کو
دے لو جواں بیٹے کا پُرسا حسین کو

اولاد والو درد کرو شہ کے دل کا یاد
نہ آج کی خبر ہے نہ ہے کل کا اعتماد
کیسا تڑپتے ہوئیں گے شبیرِ خوش نہاد
بیٹا جہاں سے اٹھ گیا ناشاد و نامراد
خوش رو تھے خوش مزاج تھے شیریں بیان تھے
پیٹو جوانو اکبرِ مہرو جوان تھے

ہی ہی حسین آپ کا دلبر بچھڑ گیا
فریاد ہے شبیہِ پیمبر بچھڑ گیا
واحیف وادریغ دلاور بچھڑ گیا
دردا و حسرتا علی اکبر بچھڑ گیا
مظلومیت پہ تشنہ دہانی پہ روئیں گے
جب تک جئیں گے اس کی جوانی پہ روئیں گے

آقا انیس ہند میں کب تک پھرے تباہ
گھٹتی ہے عمر بڑھتے چلے جاتے ہیں گناہ
ضعف اس برس بہت ہے اجل آ نہ جائے آہ
بلوائیے غلام کو اے میرے بادشاہ
قربِ مزارِ شاہِ دوعالم نصیب ہو
بس کربلا میں اب کی محرم نصیب ہو

طے کر چکے حسین جو راہِ ثواب کو
مقتل نظر پڑا شہِ گردوں رکاب کو
اُلفت جو واں کی خاک سے تھی اُن جناب کو
اِک عید ہو گئی خلفِ بو تراب کو
دل مثلِ غنچہ واں کی ہوا کھا کے کھل گیا
رستہ ریاضِ خلد میں جانے کا مل گیا

صحرا پہ ہر طرف شہِ دیں نے نگاہ کی
سب تھم گئی سپاہ شہِ کم سپاہ کی
فرمایا آج چھٹ گئے ایذا سے راہ کی
ہاں اب کرو پسند جگہ خیمہ گاہ کی
آگے کہیں نہ جائیں گے اس ارضِ پاک سے
اُلفت ہماری خاک کو ہے یاں کی خاک سے

مشتاق اس نواح کا تھا فاطمہ کا لال
رہتا تھا خواب میں بھی اسی دشت کا خیال
آفاق میں یہ ارضِ مقدس ہے بے مثال
سبزہ یہاں کا رحمتِ خالق سے ہے نہال
اب تک کسی صدف کو نہ ایسے گہر ملے
گردوں کو ایک اس کو بہتّر قمر ملے

شکر خدا کہ رنجِ سفر سے ہوا فراغ
غربت کے اشتیاق میں بھولا وطن کا داغ
خاطر شگفتہ ہو گئی اور دل ہے باغ باغ
طیبہ یہ حشر تک نہیں ہونے کا بے چراغ
حاصل ملے گا حشر میں اس کاروکشت کا
روئے زمیں پہ ہے یہی ٹکڑا بہشت کا

عالم میں قدر و منزلت اس کی سوا ہوئی
گرد اس کی بہرِ چشمِ ملک توتیا ہوئی
ہر درد کی خدا کے کرم سے دوا ہوئی
یہ خاکِ پاک آج سے خاکِ شفا ہوئی
تیغِ عذابِ حق سے لحد میں پناہ ہو
طوفاں میں پاس ہو تو نہ کشتی تباہ ہو

کی سروِ بوستانِ حسن نے یہ گفتگو
آتی ہے اس زمیں کے گلوں سے دلہن کی بو
اکبر یہ بولے تھی ہمیں صحرا کی آرزو
عباس سے یہ کہنے لگے شاہِ نیک خو
ہاں کونسی جگہ تمھیں بھائی پسند ہے
اُس شیر نے کہا کہ ترائی پسند ہے

دریا کو دیکھ دیکھ کے لہرا رہا ہے دل — پانی بھی خوش گوار ہوا بھی ہے معتدل
مولا قدم پکڑتی ہے کچھ یاں کی آب و گل — بہتر ہے گر خیام ہوں ساحل کے متصل
پانی سے ہاتھ منہ کو نہ زنہار دھوئیں گے — جاگے بہت ہیں پاؤں کو پھیلا کے سوئیں گے

فرمایا شہ نے خیر جو اللہ کی رضا — موقع ہو جس جگہ وہیں خیمہ کرو بپا
آرام سے غریب مسافر کو کام کیا — رہتے ہیں دھوپ میں بھی بہت بندۂ خدا
دو چار دن میں عمر کی مدت تمام ہے — میداں سے پھر غرض ہے نہ دریا سے کام ہے

زینب نے جب یہ سرورِ دیں سے سنا کلام — محمل سے یوں پکاری کلیجے کو تھام تھام
کیوں چلتے چلتے آپ نے یاں روک لی لگام — بھیّا ادھر تو آؤ یہ ہے کونسا مقام
بستی بھی ہے کوئی کہ یہی ایک نہر ہے — اس دشت پر خطر میں اترنا تو قہر ہے

جنگل میں ہے بشر کے لیئے سو طرح کا ڈر — اٹھتے ہیں بار بار بگولے ادھر ادھر
دن کٹ گیا تو ہوئے گی شب کس طرح بسر — لشکر میں غل رہے گا درندوں کا رات بھر
بچے بھی مارے ہول کے تر ہیں پسینے میں — میرا تو دل ابھی سے اچھلتا ہے سینے میں

اس سرزمیں کے گل نظر آتے ہیں مجکو خار — نشتر سے کم نہیں رگِ جاں کو یہ سبزہ زار
یہ بادِ تند تیر سی ہوتی ہے دل کے پار — اس بن کی خاک سے مری خاطر پہ ہے غبار
کیا رنگ آگے دیکھیئے قسمت دکھائی ہے — یاں کی زمیں سے خون کی بو مجکو آتی ہے

لوگو مجھے بتاؤ یہ دریا ہے یا سراب — کاسے سروں کے ہیں کہ یہ ہیں ساغرِ حباب
موجوں کو دیکھ دیکھ کے ہے دل کو پیچ و تاب — ڈوبا ہے کون شور ہے کیسا میانِ آب
دھاریں لہو کی مل گئیں دریا کی موج میں — لہریں یہ ہیں کہ چلتی ہیں تلواریں فوج میں

پوچھو کسی سے مسلمِ مظلوم کی خبر — تربت مرے غریب مسافر کی ہے جدھر
بچوں کے اس کے کیا کہیں کاٹے گئے ہیں سر — لاشے بہا دیئے اسی دریا میں کھینچ کر
رنج و غم و الم کی گھٹا دل پہ چھائی ہے — اماں کے پیٹنے کی صدا مجکو آئی ہے

عباس کو یہ بڑھ کے پکارے شہِ اُمم
کھینچو نہ تیغ روحِ علی کی تمھیں قسم
اچھا کنارِ نہر رہیں بانیِ ستم
خیمہ کریں گے اور کہیں یاں سے جاکے ہم
پہلے کرو وہ کام کہ جو فرضِ عین ہو
بے چین ہوں تو ہم ہوں پہ اُمت کو چین ہو

غصہ یہ کس پہ میری طرف تم کرو نظر
تم کو ہٹا سکے کوئی کس کا ہے یہ جگر
پہچانتے نہیں تمھیں بھائی یہ اہلِ شر
جانے دو آؤ دور کرو دھیان ہے کدھر
منظور ناریوں کو ہے پانی کا آسرا
کوثر ہے اپنی تشنہ دہانی کا آسرا

بیکس ہیں ہم کو تیغ پکڑنا نہ چاہیئے
غربت میں قافلے سے بچھڑنا نہ چاہیئے
گر جان پر بنے تو بگڑنا نہ چاہیئے
اُمت سے نانا جان کی لڑنا نہ چاہیئے
شکل حباب خلق ہیں آخر فنا تو ہے
دریا اگر قریب نہ ہوگا خدا تو ہے

کیوں کانپتے ہو غیظ سے ابرو پہ کیوں ہے بل
مالک ہو تم تمھارا ہی دریا پہ ہے عمل
ہمت میں فرق کچھ نہ شجاعت میں ہے خلل
غصہ کو تھام لو یہ نہیں جنگ کا محل
مانو مرا کہا میں تمھارا امام ہوں
غازی نے سر جھکا کے کہا میں غلام ہوں

سمعاً و طاعتاً نہیں طاقت کہ دوں جواب
ذرے کو تاب کیا ہے بھلا پیشِ آفتاب
بخشی ہے عزت آپ نے اے آسماں جناب
ہٹتا نہ اس زمیں سے کبھی ابنِ بوتراب
ارشاد ہو جو کچھ مرے حق میں قبول ہے
حکمِ حضور حکمِ خدا و رسول ہے

بندہ ہوں جاں نثار ہوں یا شاہِ بحر و بر
مولا عدول حکمی کی کیا تاب کیا جگر
دیدیں گر اُن کو آپ مرے ہاتھ باندھ کر
ہمراہ ہوں غلام کی صورت جھکا کے سر
گر یہ بدی کریں نہ شہِ کائنات سے
سر اپنا کاٹ دوں میں ابھی اپنے ہات سے

فرمایا شہ نے میں ترے ہاتھوں کے ہوں نثار
سر میرا تیرے سر پہ تصدق ہزار بار
ہے ابنِ فاطمہ کی کمر تجھ سے استوار
بولا وہ باوفا کہ غلامی ہے افتخار
ہاں یہ ملال ہے کہ سر اُن کے کٹے نہیں
تینوں کے سامنے سے کبھی ہم ہٹے نہیں

حضرت کے حکم سے تو یہاں میں نے ہاتھ تھام
ہٹ جائیں پہلے یہ تو ہٹے آپ کا غلام
حضرت نے ہاتھ اٹھا کے کہا ای سپاہِ شام
ہٹ جاؤ ورنہ سب ابھی ہو جاؤ گے تمام
لاکھوں ہو گر تو ہوا سے ٹوکا نہ جائے گا
بگڑے گا پھر یہ شیر تو روکا نہ جائے گا

جس وقت یہ سنے شہِ ذی جاہ کے کلام
پسپا ہوئی سمجھ کے غنیمت سپاہِ شام
بھائی کو ساتھ لیکے پھرے سید الانام
سر کو جھکا کے رہ گئے عباسِ نیک نام
کہتے تھے راہ میں کہ نہ وار اپنا چل گیا
افسوس ہو کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

وقت ایسا اب نہ آئے گا یا سیدِ اُمم
گرمی میں پیاس لگتی ہے بچوں کو دم بدم
پانی بھی چھاگلوں میں بہت رہ گیا ہے کم
فرمایا شہ نے چاہیے اللہ کا کرم
پانی کے بند کرنے پہ وہ ہیں تُلے ہوئے
جنت کے در ہماری طرف ہیں کھلے ہوئے

یہ کہہ کے آیا دھوپ میں زہرا کا آفتاب
برپا ہوئے خیامِ امامِ فلک جناب
حقا تھی موجِ رحمتِ حق جس کی ہر طناب
بے چوبہ فلک نظر آنے لگا حباب
صحن اس کا سبطِ بتول کے پیاروں سے بھر گیا
اک آسمان تھا کہ ستاروں سے بھر گیا

خیمہ میں اُترے یاں تو شہِ عرش بارگاہ
آ آ کے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ
کوسوں علم کھلے تھے جدھر کیجیے نگاہ
یاں تک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ
فوجوں سے تا بہ صبح زمیں رن کی بھر گئی
اک رات میں چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی

اس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم
آ پہنچا شام سے پسرِ سعدِ نحس و شوم
جس کی جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم
اکثر ہیں یکہ تاز جوانانِ شام و روم
بس کھل گیا نہ طور صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بندوبست لڑائی کا ہوئے گا

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں
اُمڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثلِ بادباں
ہلتا تھا دشت کیں دہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل
خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہلِ نار و دغاباز و پر دغل
شکلیں مہیب پوست قد ابرووں پہ بل
بدخواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار
غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دم بدم تھی صدا آسماں کے پار
آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

اترا قریبِ خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر
سر پر لگایا دوڑ کے خادم نے چترِ زر
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر
بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر
خیمہ ہے کس طرف کو شہِ خوش خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر
آئے تھے یاں اترنے کی خاطر امامِ دہر
فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر
ہم نے اٹھا دیا انھیں لیکن بہ جبر و قہر
عباس مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبیر پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہے خیمۂ زنگاریِ حسین
راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین
پہروں علی کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بین
آفت میں مبتلا ہے محمد کا نورِ عین
بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سایہ میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوجِ شہِ امم
سنتے تھے اس سپاہِ حسینی کی دھوم ہم
اس نے کہا حسین کے یاور بہت ہیں کم
فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم
ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے اکیاسی جوان ہیں

ہے ایک علم یہ قلتِ لشکر کا ہے نشاں
یہ حال ہے لٹا ہوا جیسے ہو کارواں
اردو میں جنسِ غم کے سوا جنس ہے گراں
غلہ کی یہ کمی ہے کہ ہے قحطِ آب و ناں
اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل سترہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

مطبخ ہے سرد آگ کا اُس میں نہیں ہے نام
خاک آبدار خانے میں اُڑتی ہے صبح و شام
یاں سیکڑوں کمانیں ہیں فوجِ امیر میں

یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکرِ کثیر
ہیں اُن میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر
کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائینگے

کیا جانے دل میں سمجھے تھے کیا شاہِ کربلا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا
کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ مُسن نہیں

ہم شکلِ مصطفےٰ کو تو اٹھارھواں ہے سال
نو دس برس کے ہونگے زینب کے دونوں لال
چھوٹے ہیں وہ سب کئی ان میں جواں نہیں

سُنتا ہوں میں ہیں دو پسرِ شاہِ نامدار
زینب کے دو ہیں تین حسن کے ہیں گلعذار
زہرا کے جان و دل ہیں محمد کے پیارے ہیں

۳۲
بتیس سب سوار شہِ دیں کے پاس ہیں
آفت میں مبتلا ہیں مگر با حواس ہیں
کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے

بولا وہ تب کہ ہوں گے جواں یاں کئی ہزار
ہیں تین چار کوس کے گھیرے میں سب سوار
کیا کوئی لڑ سکے گا قیامت کی فوج ہے

بچے ہوائے گرم سے بے تاب ہیں تمام
کیونکر لڑیں گے بیکس و مظلوم و تشنہ کام
دو دو گریں گے خاک پہ ایک ایک تیر میں

کچھ نوجوان ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر
پس جائیں گے وہ ٹاپوں سے ہنگامِ دار و گیر
اُن سے تو نیچے بھی سنبھالے نہ جائیں گے

مقتل میں کھینچکر انھیں لے آئی ہے قضا
عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑیں گے کیا
اُن کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

تیرہ برس کا ہے ابھی شبّر کا نونہال
ہاں اک جواں ہیں حضرتِ عباسِ خوش خصال
خط اک طرف مسیں بھی کسی کی عیاں نہیں

بیمار اُن میں ایک ہے اور ایک شیر خوار
دس ہیں عقیل و مسلم و حیدر کے یادگار
یہ سترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

اب رہ گئے پیادے سو دو کم پچاس ہیں
غازی ہیں سرفروش ہیں اور حق شناس ہیں
سجدے ہیں اور دعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے

خولی نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار
ایک ایک جواں ہے رستمِ میدانِ کارزار
لشکر کی ہیں صفیں کہ سمندر کی موج ہے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف
جانباز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف
سب لوگ فکرِ قتلِ شہنشاہِ دیں میں ہیں
ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرزِ گاؤ سر
ہر جا کھچی ہوئی ہیں کمندیں اِدھر اُدھر
سب لوگ جا بجا پئے قتل و ستیز ہیں

خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف
اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں
ضربت سے جن کی ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پہ
تیغیں بھی ہیں ڈوبی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

بھالا ہلا کے کوئی یہ کہتا ہے بار بار
کہتا ہے کس غرور سے اک شام کا سوار
اب کوئی دم میں گھر کی حسن کے صفائی ہے
تیغا اُٹھا کے کوئی یہ کہتا ہے بدمزاج
دریا پہ اُن کو لائے تو پانی کی احتیاج
جب دولتِ علی کو تھا لوٹ جائے گی

نوک اس کی سینۂ علی اکبر کے ہوگی پار
آئے تو رن میں حضرتِ شبیر کا یادگار
تلوار آج زہر میں میں نے بجھائی ہے
قیمت ہے اُس کی شام کا اور روم کا خراج
عباس نامدار کے کاٹوں گا ہاتھ آج
فرزندِ فاطمہ کی کمر ٹوٹ جائے گی

کہتا ہے کوئی تیر کو چلّے میں جوڑ کے
سوئیں گے جب ہمیں پہ جھولے کو چھوڑ کے
اصغر کا طوق اپنے پسر کو پنہاؤں گا
سنتا تھا میں کہ کہتا تھا اک شخص برملا
جو فاطمہ کے دودھ کی دھاروں سے ہے پلا
وارث نہ کوئی ہوئے گا سید کی لاش کا

گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے
دونوں کڑے اُتاروں گا پہنچے مروڑ کے
سوغات کربلا سے یہی لیکے جاؤں گا
گھوڑے سے جب گریں گے شہنشاہِ کربلا
چھاتی پہ چڑھ کے کاٹوں گا اُس شاہ کا گلا
لوٹوں گا سب لباس تنِ پاش پاش کا

کوفے کے لوگ کرتے ہیں آپس میں یہ سخن
سر پر ردا نہ ہوگی کہ بھائی کو دے کفن
ہے آرزو کہ دولتِ آلِ عبا ملے

اب بعدِ فتح بازوئے زینب ہے اور رسن
خیمہ جلا کے لوٹیں گے اسبابِ پنجتن
دیکھیں کسے علی کی بہو کی ردا ملے

بولا خبر یہ سُن کے وہ بانیٔ ظلم و جور
کل تک ابھی تو شام سے آئے گی فوج اور
حاکم ہیں آج زیرِ فلک ہے ہمارا دور
سر کاٹ لیں گے صلح کا ہوگا اگر نہ طور
فرصت اب ایک شام کی نہ ہاں دو حسین کو
بیعت اگر کریں تو اماں دو حسین کو

بولا کوئی کہ ہے اُنھیں بیعت سے اجتناب
مرنے کو راہِ حق میں سمجھتے ہیں وہ ثواب
کہنے لگا وہ تیرہ دروں کھا کے پیچ و تاب
ہاں اب خیامِ شہ میں پہنچنے نہ پائے آب
پیاسوں پہ تیر یاں سے بھی پڑتے ہیں کس طرح
دیکھیں حسین لاکھوں سے لڑتے ہیں کس طرح

یہ کہہ کے اپنے خیمہ میں آیا وہ خیرہ سر
یاں غازیوں نے رات عبادت میں کی بسر
ظاہر ہوئی جو رن میں شبِ قتل کی سحر
پڑھ کر نماز شہ نے کسی جنگ پر کمر
گردوں نشیں سروں کو بہم پیٹنے لگے
بکھرا کے بال اہلِ حرم پیٹنے لگے

زینب تھی بے حواس پریشاں تھے سر کے بال
چلّاتی تھی دُہائی ہے یا شیرِ ذوالجلال
روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت بہن کا حال
غل تھا کہ مرنے جاتا ہے خیر النسا کا لال
فرما کے الوداع ہر اک سوگوار سے
خیمے سے نکلے شاہ پیمبر مزار سے

جب صدرِ زیں پہ وارثِ نبی کا مکیں چڑھا
خاتم پہ جیسے دُرِّ نجف کا نگیں چڑھا
گویا کہ آسمان پہ خورشیدِ زمیں چڑھا
غل پڑ گیا جہاد پہ ضرغامِ دیں چڑھا
ایک ایک رُخ پہ قدرتِ حق کا ظہور تھا
لشکر نہ تھا حسین کا دریائے نور تھا

مجرے کو جھک گئے رفقا باندھ کر پرا
حضرت نے سر پہ ہاتھ عجب پیار سے دھرا
ہنس کر نظر عزیزوں کی جانب جو کی ذرا
سب باغِ فاطمہ نظر آیا ہرا بھرا
تھے اس طرح جوانوں میں لڑکے ملے ہوئے
ہوں جس طرح سے پھول چمن میں کھلے ہوئے

ہنگامِ صبح تھی عجب اس باغ پر بہار
جوں غنچہ مسکراتا تھا ایک ایک گلعذار
لٹکے ہوئے تھے چہروں پہ گیسوئے پیچدار
گھوڑے ہوا تو نکہتِ گل تھے وہ شہسوار
شملے چھٹے جہاد پہ کمریں کسے ہوئے
خوشبو سے تن کی عطر میں کپڑے بسے ہوئے

قد چھوٹے چھوٹے سروِ گلستانِ اعتدال
چہرے برنگ لالہ شجاعت سے لال لال
کیا دخل نورِ حسن میں خالِ سیاہ کو
گلدستۂ حسین میں اکبر سا گل بدن
سنبل کو لائے پیچ میں وہ زلفِ پُرشکن
مطلب کھلا ہوا ہے خطِ سبزہ رنگ کا

تھی گرچہ پیاس سے دلِ نازک کو بے کلی
یوں مسکرائے بات شجاعت کی جب چلی
خوشبو مہک گئی چمنِ کائنات میں
کیا رو ہلالِ عید کا ابرو کے سامنے
آئینہ ونگ آئینہ رو کے سامنے
مضمون صفاتِ قد کا قیامت سے لڑ گیا

عباسِ نامدار جوانوں میں لاجواب
حمزہ کا زور جعفرِ طیار کا شباب
لڑنے کو فوجِ کیں سے بہادر تُلا ہوا
چڑھ چڑھ کے مرکبوں پہ بڑھے جب وہ گلعذار
ہمشیر کی مگر نہ بڑھا واں سے راہوار
کوہِ الم گرا تھا دلِ دردناک پر

آزردہ ہو کے اُس سے یہ بولے شہِ اُمم
بولا یہ کانپ کانپ کے وہ اسپ خوش قدم
میری طرف حضور نہ رُک رُک کے دیکھیے

شمشاد جن کے سایۂ قامت سے پائمال
رُخ صاف صاف جن پہ نمایاں نہ خط نہ خال
نقطے کی احتیاج نہیں مہر و ماہ کو
قربان جس کے تن کی نزاکت پہ یاسمن
غل تھا کہ تنگ تر کہیں غنچے سے ہے دہن
یہ حاشیہ لکھا ہے اسی متنِ تنگ کا

لیکن شگفتہ تھا وہ گلِ گلشنِ علی
جیسے کھلی ہوئی ہے گلِ سرخ کی کلی
بولے تو پھول جھڑنے لگے بات بات میں
بیجا ہے ذکر مشک کا گیسو کے سامنے
پانی گلاب جسم کی خوشبو کے سامنے
قامت کے آگے سروِ خجالت سے گڑ گیا

قد سروِ باغِ حسن تو رخ مثلِ آفتاب
شبّر کا خلق شان و شکوہِ ابوتراب
سر پر نشانِ دیں کا پھریرا کھلا ہوا
اُس دم فرس پہ قبلۂ عالم ہوئے سوار
حضرت کے مُنہ کو تکتا تھا پھر پھر کے بار بار
آنکھوں سے اُس کی اشک ٹپکتے تھے خاک پر

تو ساتھ گر نہ دے تو پیادے ہی جائیں ہم
قدموں کو میں چھوڑوں گا جب تک ہے دم میں دم
مولا مرے قدم کی طرف جھک کے دیکھیے

جھک کر جو پشتِ زیں سے شہِ دیں نے کی نظر
دیکھا سموں سے لپٹی ہے زینب برہنہ سر
کہتی ہے آنکھیں مل کے قدم پر وہ نوحہ گر
اے ذوالجناح دخترِ زہرا پہ رحم کر
پاؤں گی پھر نہ فاطمہ کے نورِ عین کو
لے جا نہ تو بہن سے چھڑا کر حسین کو

پچھلے سموں پہ رکھے ہے سر دوسری بہن
پکڑے ہے نشکار بند کو ہے بیوۂ حسن
روکے ہے راہ زوجۂ عباسِ صف شکن
گھونگھٹ دھرے ہے یال پہ اک رات کی دلھن
صدمے سے تھرتھری ہے تنِ خوش خرام میں
ڈالے ہے ننھے ہاتھ سکینہ لگام میں

گردن سے لپٹی کہتی ہے بانوئے نامدار
صدقے میں تیرے اے مرے آقا کے راہوار
کرتا ہے مجھ کو رانڈ محمد کا یادگار
کام آ کے ہوں علی کی بہو میں جگر فگار
مرجاؤں گی میں ساتھ جو وارث کا چھٹ گیا
آگے قدم بڑھا تو مرا راج لٹ گیا

اترے قدم رکابوں سے حضرت نکال کر
ہاتھوں سے خود بہن کو اٹھایا سنبھال کر
رو کر کہا ابھی سے نہ زینب یہ حال کر
بولی وہ ہاتھ شاہ کی گردن میں ڈال کر
کچھ زور بے قراریِ دل سے نہ چل سکا
بھائی میں کیا کروں نہ کلیجہ سنبھل سکا

فرمایا تم کو فاطمہ کی روح کی قسم
جاؤ ابھی تو آئیں گے مقتل سے پھر کے ہم
بچوں کو ساتھ لے کے چلے پیٹتے حرم
رستے سے پھر کے بولی یہ زینب بچشمِ نم
تسکیں نہیں مرے دلِ پُر اضطراب کو
گھوڑے پہ تم چڑھو میں سنبھالوں رکاب کو

سجاد نے کہا کہ نہیں آپ کا یہ کام
خدمت کے واسطے ابھی حاضر ہے یہ غلام
تنہا ہمارے بعد جو رہ جائیں گے امام
تب تھامیو رکابِ شہنشاہِ تشنہ کام
حیدر نے دی صدا کہ ادھر دل حزیں بھی ہے
زہرا ابھی ہے رکاب میں روح الامیں بھی ہے

روتے ہوئے فرس پہ چڑھے بادشاہِ دیں
تھے پشتِ زیں پہ شاہ کہ خاتم پہ تھا نگیں
رخسارِ آفتاب تو مہتاب تھی جبیں
کوسوں فروغِ حسن سے روشن ہوئی زمیں
جن کے تنوں میں جان نہ تھی زندہ ہو گئے
ذرے زمیں پہ اختر تابندہ ہو گئے

مطلع سوم

میدان میں جب سواریِ شاہِ امم چلی
کس شان سے جلو میں سپاہِ حشم چلی
فتح و ظفر ادب سے قدم با قدم چلی
بدلی ہوا نسیمِ ریاضِ ارم چلی
سرتاجِ عرش تھا جو مکیں صدرِ زین پر
قدسی پروں کو فرش کیے تھے زمین پر

جوں جوں قدم بڑھاتا تھا سرور کا خوش خرام
بنتے تھے نقشِ سُم سے زمیں پر مہِ تمام
تھا ارضِ کربلائے معلےٰ کا یہ کلام
گو فرش تھی پہ اب میں ہوئی عرش احتشام
ذرّوں کا اُس زمیں کے فلک پر دماغ تھا
ہر سنگ ریزہ رشکِ وہ شب چراغ تھا

بچھی تھی ایک نور کی چادر جو دور دور
ہنستا تھا کہکشاں پہ یہ جادو کو تھا غرور
ہنستے تھے روئے مہر پہ ذرّوں میں تھا یہ نور
ہر سنگ ریزہ کہتا تھا میں ہوں چراغِ طور
تھا یہ زمیں کا قول کہ عنبر سرشت ہوں
کہتی تھی گرد نکہتِ باغِ بہشت ہوں

وہ صبح اور وہ جلوۂ خورشیدِ خاوری
وہ صاف صاف آئنۂ چرخِ اخضری
وہ نور اور وہ شانِ جوانانِ حیدری
راکب ہر اک ملک تھا تو مرکب ہر اک پری
صدقے سواریِ شہِ گردوں رکاب کے
گویا ستارے جاتے تھے ساتھ آفتاب کے

پہونچا جو اس حشم سے خدیوِ جہانِ دیں
صف باندھ کر کھڑے ہوئے سب ناصرانِ دیں
کھولا نشانِ مرتضوی نے نشانِ دیں
غل پڑ گیا کہ آج دوبالا ہے شانِ دیں
قدسی سب اُٹھ کھڑے ہوئے تعظیم کے لیے
طوبیٰ کا سر بھی جھک گیا تسلیم کے لیے

ظاہر میں گرچہ تھے رفقا شاہ کے قلیل
پیشِ خدا مگر وہ حقیقت میں تھے جلیل
جرأت میں بے نظیر شجاعت میں بے عدیل
سرگرم جان دینے پہ سب صورتِ خلیل
فاقوں میں صبر و شکر سے دل اُن کے سیر تھے
جانباز تھے جری تھے مجاہد تھے شیر تھے

سر پر عمامے چاند سی پیشانیوں پہ نور
حاضر گلا کٹانے کو سب شاہ کے حضور
لب برگِ گل سے سوکھے ہوئے پیاس کا وفور
یکتا ہر اک مگر نہ تکبر نہ کچھ غرور
پیروِ امام کے تھے نہ کیوں خوش طریق ہوں
آقا حسین سا ہو تو ایسے رفیق ہوں

ہر دم فروتنی کا لبوں پہ کلام تھا
شکر خدا سے اُن کی زبانوں کو کام تھا
ایک ایک دل سے عاشقِ شاہِ انام تھا
آنکھوں میں نشۂ مئے حُبِّ امام تھا
ہر حال میں وہ لوگ رضا جوئے شاہ تھے
رخ اُن کے مثلِ قبلہ نما سوئے شاہ تھے

ذی جاہ و ذی جلالت و ذی فہم و ذی شعور
شایقِ ریاضِ خلد کے مشتاقِ وصلِ حور
ہر شخص نشۂ مئے حبِ علی میں چور
ذکرِ دعائے نور سے پیشانیوں پہ نور
ذرّہ نہ مہر و ماہ میں اور اُن میں فرق تھا
اک اک جوان حُسن کے دریا میں غرق تھا

ناگاہ فوجِ شام میں بجنے لگا دُہل
تیغیں کھنچیں چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
کڑکیں کمانیں آنے لگے ناوکِ اجل
شیروں کے تیوروں پہ پڑے اس طرف بھی بل
تن تن کے ہونٹ چاب کے تھرّا کے رہ گئے
تیروں کے زخم شاہ کو دکھلا کے رہ گئے

بولے یہ رنگ دیکھ کے شبیرِ خوش نہاد
ہاں اے مجاہدو رہِ حق میں کرو جہاد
جوں غنچہ کھل گئے وہ جواں ہو کے شاد شاد
سُرخی لبوں پہ آ گئی پایا گلِ مُراد
بڑھ بڑھ کے پیدلوں نے سواروں سے جنگ کی
ایک ایک تشنہ لب نے ہزاروں سے جنگ کی

جس غول پر جھپٹ کے گئے صورتِ اسد
بھاگے وہ لوگ چھوڑ کے دشتِ ستم کی حد
لاکھوں میں اُن کا وار کوئی کر سکا نہ رد
نعرہ ہر ایک ضرب پہ تھا یا علی مدد
دو کرتے تھے وہ مجمعِ قومِ جہول میں
گھوڑوں کو عرض میں تو سواروں کو طول میں

کس کس دلاوری سے وہ خاصانِ رب لڑے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دریا کے سمت رُخ نہ کیا تشنہ لب لڑے
پیاسے تھے تین روز کے لیکن غضب لڑے
بے دست ہو گئے تو یہ جوہر دکھا گئے
لوہے کو مثلِ شیرِ درندہ چبا گئے

الحق تھے شیرِ بیشۂ ہیجا وہ صف شکن
مرنے کی یہ خوشی تھی کہ خنداں تھے زخمِ تن
کھا کھا کے تیر کہتے تھے وہ غیرتِ چمن
قربانِ بندہ پروریِ سرورِ زمن
غازی ستمگروں سے وغا کر کے مر گئے
حقِ نمک جو تھا وہ ادا کر کے مر گئے

جب اہلِ جفا ہوئے وہ خاصگانِ حق
برہم ہوئے نبی کے مرقع کے بھی ورق
فرزندِ فاطمہ کو نہایت ہوا قلق
صدمے سے ہوگیا رُخِ انور کا رنگ فق
چمکی جو اُن کی تیغ تو بجلی چمک گئی
شیروں کی آنکھ خوف کے مارے جھپک گئی

لڑکے ہوئے جو معرکہ آرائے کارزار
واں کے جواں نہ روک سکے نیچوں کے وار
بیدل نہ اُن کی ضرب سے بچتا تھا نہ سوار
کردیتے تھے وہ ایک کو دو اور دو کو چار
چھوٹے سے نیچوں سے ستمگر بھی تنگ تھے
گہ سر پہ گہ کمر پہ کبھی زیرِ تنگ تھے

لشکر میں اہلِ ظلم کے غل تھا کہ الاماں
دو بجلیاں چمکتی ہیں بھاگے کوئی کہاں
ان سے کہیں پناہ نہیں زیرِ آسماں
کس کے شیر ہیں کہ نہیں جن کو خوفِ جاں
حضرت پکارتے تھے کہ دونوں کے پیارے ہیں
جس کا پسر ہوں میں یہ اُسی کے نواسے ہیں

پامال کر کے فوج کو جب وہ ہوئے تمام
روشن کیا چراغِ حسن نے تب اپنا نام
نکلا جہاد کرنے کو پھر بازوئے امام
ایسا لڑا کہ ڈوب گئی خوں میں فوجِ شام
روئے امام اُس کی جوانی کے واسطے
دریا پہ قتل ہوگیا پانی کے واسطے

رخصت ہوا پدر سے علی اکبرِ دلیر
لشکر کو سرکشوں کے کیا دم میں اُس نے زیر
آخر ہجوم کر کے لیا ظالموں نے گھیر
برچھی جگر پہ چل گئی مارا گیا وہ شیر
صدمہ سے حالِ سبطِ نبی غیر ہوگیا
ناظر سب کا خاتمہ بالخیر ہوگیا

تنہا کھڑے تھے دل کو سنبھالے ہوئے حسین
ہلتا تھا چرخ کہتے تھے جب ہائے نورِ عین
خیمے کے در پہ بیبیاں روتی تھیں کر کے بین
چلاتی تھی یہ فاطمہ زہرا بہ شور و شین
صدمے سہوں کلیجے پہ کس کس کے داغ کے
افسوس پھول جھڑ گئے سب میرے باغ کے

راوی نے یہ لکھا ہے کہ اس دم بحالِ زار
لائے حسین ہاتھوں پہ اک طفلِ شیرخوار
دن کو ہوا قرانِ مہ و مہر آشکار
مُرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وہ گلعذار
تھا فرطِ غش سے ننھا سا منہ کا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھے مٹھیاں منہ تھا کھلا ہوا

چھوٹا سا ایک سبز عمامہ تھا زیبِ سر
جُھٹّی بھویں وہ جن پہ تصدّق دلِ پدر
سایہ ہیں دامنِ خلفِ بوتراب کے
پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل اِدھر اُدھر
باچھوں سے تھا نمود جمے دودھ کا اثر
ننھے سے دل کو ماں سے بچھڑنے کا درد تھا
مہکی ہوئی تھی دشت میں گل سے بدن کی بو
شہ سونگھتے تھے دودھ بھرے اُس دہن کی بو
آثارِ مرگ پھول سے رُخ پر نمود تھے
تھے لعلِ لب نگینۂ یاقوتِ احمری
غنچہ کا مُنہ ہی کیا جو کرے اُن سے ہمسری
تھی نازکی میں اس پہ خزاں مارے پیاس کے
روشن گلا تھا شمعِ تجلّیِ طورِ حسن
گھیرے ہوئے تھا ننھی سی ہنسلی کو نورِ حسن
چھیدیں وہی گلا یہ لعینوں کے جی میں تھا
کُرتا بدن میں آتا تھا اس رنگ سے نظر
سینہ تھا صاف صورتِ آئینہ جلوہ گر
چھاتی میں دمبدم جو دم اُس کا اٹکتا تھا
صدمے سے پیاس کے رخِ معصوم تھا جو زرد
ہچکی جب اُس کو آتی تھی اُٹھتا تھا دل میں درد
پانی کی جستجو تھی شہِ خوش صفات کو

ماتھا جھنڈولے بالوں میں ہالے میں جوں قمر
آنکھیں تو نرگسی پہ نقاہت زیادہ تر
رخسار تھے کہ پھول کھلے تھے گلاب کے
خشکیدہ ہونٹ ہوئے تھے آنسوؤں سے تر
ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے ہیکل تھی سینے پر
رن کی ہوائے گرم سے جسم اُس کا زرد تھا
ان گورے گورے گالوں میں تھی یاسمن کی بو
گویا لبوں سے آتی تھی نہرِ لبن کی بو
ہچکی لگی ہوئی تھی مسوڑے کبود تھے
رنگیں ہیں جن کے وصف میں باغِ سخنوری
وہ خار ہیں رگِ گلِ بستانِ حیدری
تالو سے لگ گئی تھی زباں مارے پیاس کے
مثلِ ستارۂ سحری تھا وفورِ حسن
ہوتا ہے جس طرح مہِ نو سے ظہورِ حسن
یاں کنٹھ بیٹھ جانے سے دم دُھکدُکی میں تھا
پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسے دمِ سحر
گرمی سے ہو گیا تھا شلوکہ عرق میں تر
گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دیتے پٹکتا تھا
حسرت فلک کو دیکھتے تھے بھر کے آہِ سرد
آنسو رواں تھے آنکھوں سے رخ پر جمی تھی گرد
تکتے تھے چشمِ یاس سے نہرِ فرات کو

جاری یہ لب پہ تھا کہ نہ آیا تجھے حجاب
دو دن سے خشک ہے چمنستانِ بوتراب
سیراب سب چرند و پرند اور پیاسے ہم

یہ کہہ کے شامیوں کو صدا دی بچشمِ تر
نکلا یہ سُن کے فوج سے ظالم بکرّ و فر
خادم تھے ساتھ ساتھ میں عہدے لیے ہوئے

بولے دکھا کے بچّے کو شاہِ فلک سریر
پانی ملا ہے کل سے نہ ممکن ہوا ہے شیر
مہماں ہے کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے

نالاں ہے تجھ سے روحِ رسولِ فلک اساس
موجود ہیں صراحیاں پانی کی تیرے پاس
بچّے پہ ظلم صاحبِ ایماں سے دور ہے

برپا ہے اہلِ بیتِ محمد میں شور و شین
آنکھیں پھرائے دیتا ہے اب تو یہ نورِ عین
تجھ کو قسم ہے روحِ رسالت مآب کی

یہ کہہ کے چپ ہوئے جو شہنشاہِ بحر و بر
رویا جھکا کے سر پسرِ سعد خیرہ سر
مضطر تمام فوج کے پیر و جواں ہوئے

بولے یہ ابنِ سعد سے سردارِ فوجِ شام
دیتے ہیں اُس کو آب جو کافر ہو تشنہ کام
کچھ شرم بھی ہے شرطِ مسلماں کے واسطے

اے نہر مر گئے مرے بچّے بغیرِ آب
محشر میں دے گی ساقیِ کوثر کو کیا جواب
شکوہ ترا کریں گے رسولِ خدا سے ہم

کہتا ہے کچھ مجھے عمرِ سعد ہے کدھر
پہنے لباسِ فاخرہ باندھے ہوئے کمر
اور ایک شخص چتر کا سایہ کیے ہوئے

مرتا ہے پیاس سے مرا کودکِ صغیر
للّٰہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر
اِس کا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

اتنا بھی دل نہ سخت کر اے ناخدا شناس
اک گھونٹ دے اسے کہ ہے سولہ پہر کی پیاس
چھوٹے سے میہماں کی خاطر ضرور ہے

در پر پھوپھی بلکتی ہے ماں کر رہی ہے بین
لایا ہے اس عطش میں ترے پاس اب حسین
ٹپکا دے اُس کے حلق میں اک بوند آب کی

دِل دشمنوں کے ہل گئے تھرا گئے جگر
فولاد موم ہو گیا اللہ رے اثر
آنکھوں سے مردموں کے بھی آنسو رواں ہوئے

واللہ اے امیر یہ ہے رحم کا مقام
بیکس و غریب و تشنہ ہے اولادِ امام
دے حکم آپ اصغرِ ناداں کے واسطے

تب ابنِ سعد شمر سے کرنے لگا کلام | اصغر کو خود پلا دے تو پانی کا ایک جام
کہنے لگا بگڑ کے یہ وہ نطفۂ حرام | ہم کو نہیں ہے تابِ عتابِ امیرِ شام
پیاسا کریں گے ذبح ہم اس نونہال کو | پانی نہ دیں گے بانوئے بیکس کے لال کو

یہ کہہ کے ابنِ سعد کے کچھ کان میں کہا | حضرت کے سامنے سے ہٹا تب وہ بے حیا
آنسو بہا کے کہنے لگے شاہِ کربلا | سمجھا میں تیرے مکر کو اے بانیِ جفا
خیر اب کچھ آرزو نہیں ہے آبِ پست کی | لہرا رہی ہیں سامنے نہریں بہشت کی

فرما کے یہ حسین چلے سوئے خیمہ گاہ | گھوڑے بڑھا بڑھا کے ہوئی فوج سدِّ راہ
تنہا کماں کشوں میں گھرا فاطمہ کا ماہ | جھپٹے ادھر اُدھر پہ نہ پائی کہیں پناہ
چھایا ستم کا ابر شہِ نامدار پر | تیروں کا مینہ برسنے لگا شیرخوار پر

آئے جو ہر طرف سے شہِ بحر و بر پہ تیر | تلوار سے قلم کیے روکے سپر پہ تیر
غل تھا چلیں حسین کے لختِ جگر پہ تیر | آنے دیا نہ شاہ نے لیکن پسر پہ تیر
آنسو رواں تھے آنکھوں سے بچے کے حال پر | مثلِ کماں جھکے ہوئے تھے اپنے لال پر

پیہم پکارتے تھے شہِ آسماں جناب | یہ کیا خطا ہے روحِ نبی سے کرو حجاب
منہ پھیرتے تھے سب کوئی دیتا نہ تھا جواب | نکلا پرے سے حرملۂ خانماں خراب
جلدی کماں پہ جوڑ کے سرکش نے تیر کو | تاکا نگاہِ قہر سے حلقِ صغیر کو

کتنا بچایا شہ نے اجل سے نہ بس چلا | کڑکی اُدھر کمان اِدھر چھد گیا گلا
آنسو بھر آئے آنکھوں میں منکا جو ہیں ڈھلا | آنکھوں سے شہ نے آنکھیں ملیں منہ سے منہ ملا
جو حسرتیں تھیں دل میں قضا نے نکال دیں | ننھی سی باہیں باپ کی گردن میں ڈال دیں

اک آہ کر کے غش ہوئے سلطانِ بحر و بر | سینے میں فرطِ غم سے لہو ہو گیا جگر
رونے لگے صغیر کی صورت کو دیکھ کر | منہ رکھ دیا کھلے ہوئے منہ پر بچشمِ تر
چوما گلا چھدا ہوا اُس نونہال کا | ملنے لگے جبیں پہ لہو اپنے لال کا

کھینچا جو شہ نے تیر تو بچہ دہل گیا
خوں جوش کھا کے زخم گلو سے اُبل گیا
مُردہ ہوئے حیات کا نقشہ بدل گیا
ہچکی کے ساتھ ہونٹ کھلے دم نکل گیا
حضرت نے سر کو پیٹ کے اس طرح آہ کی
تڑپی لحد میں روحِ رسالت پناہ کی

ای اہل بزم پیٹنے رونے کی ہی یہ جا
اولاد والو ہی یہ دمِ نالہ و بُکا
کیا شاہِ دیں پہ ظلم ہوئے وا مصیبتا
گودی میں مر گیا چھ مہینے کا دلربا
چھٹ جائے کیوں جگر نہ شہِ خوش خصال کا
ماتم اُدھر جواں کا اِدھر خُرد سال کا

غصے سے حرملہ سے کہا یوں پُکار کر
نازاں ہی تیر حلق پہ بچے کے مار کر
مجھ سے نکل کے جنگ اب ای نابکار کر
آتا ہوں ننھی لاش لحد میں اُتار کر
سینے پہ میرے تیر لگاتا تو غم نہ تھا
بچہ مرا یہ ناقۂ صالح سے کم نہ تھا

یہ کہہ کے رو رہے تھے شہنشاہِ بحر و بر
ناگہ پُکاری ڈیوڑھی سے فضہ بچشمِ تر
یا شاہ اب نکلتی ہی بانو برہنہ سر
اصغر جو رو رہے ہوں تو لے آیئے اِدھر
بہنیں ہیں بے قرار پھوپھی بے حواس ہی
مادر کی گود خالی ہی جھولا اُداس ہی

چلائے منہ پھرا کے شہنشاہِ مشرقین
اصغر تو کوچ کر گئے لائے کسے حسین
فضہ یہ شہر بانو سے کہدے بشور و شین
گھر میں بس اب نہ آئے گا زہرا کا نورِ عین
جن کی تمھیں طلب ہی وہ سوئے جناں گئے
جاتے ہیں ہم بھی اب وہاں اصغر جہاں گئے

یہ کہہ کے ذوالفقار سے کھودی وہیں زمیں
ہاتھوں سے کی سپردِ لحد لاشِ نازنیں
تربت پہ منہ کو رکھ کے پکارے یہ شاہِ دیں
اب سوؤ خوب چین سے ای میرے مہ جبیں
تم یہ نہ جانیو کہ ہمیں چھوڑے جاتے ہیں
ہم بھی تمھارے پاس کوئی دم میں آتے ہیں

یہ کہہ کے اُٹھے واں سے بحسرت امامِ پاک
رخسار پہ لگی تھی مزارِ پسر کی خاک
بازو سے خوں رواں تھا گریباں چاک چاک
اعدا پہ کی نظر صفتِ شیرِ خشمناک
دل دشمنوں کے خنجرِ ابرو سے کٹ گئے
اُلٹے جو آستیں تو پرے سب اُلٹ گئے

نعرہ کیا تو رعد نے گردوں پہ کی فغاں
کھینچی جو تیغ برق پکاری کہ الاماں
اُٹھا جو ہاتھ کانپ گیا شیشۂ آسماں
گردش جو دی تو سب تہ و بالا ہوا جہاں
طبقے زمیں کے روحِ امیں کے پروں پہ تھے
یاں سر پڑے تھے خاک پہ اور تن سروں پہ تھے

جس صف پہ کوند کر وہ گری سر اُڑا دیئے
بازو کماں کشوں کے برابر اُڑا دیئے
پھل برچھیوں کے پھول سپر پر اُڑا دیئے
جو مرغِ تیر اُدھر سے اُڑا پر اُڑا دیئے
جاں سرکشوں کی جانبِ مُلکِ عدم چلی
ایسی ہوا بھی گلشنِ عالم میں کم چلی

شمشیرِ شہ کے وصف میں لکھتا ہوں چند بند
جوہر شناس بھی یہ کریں گے پسند بند
نیزہ کا جس نے باندھا بڑھا کر تمند بند
کاٹا علی کی تیغ نے گرتے ہی بند بند
کیا ضرب تھی کہ فتح کا دروازہ کھل گیا
اجزائے جسمِ نحس کا شیرازہ کھل گیا

بجلی سی کوند کر صفِ اعدا پہ جب گری
ہر سمت غل ہوا کہ وہ برقِ غضب گری
بیدم تھا جس پہ تیغِ شہِ تشنہ لب گری
کھلتا نہ تھا کب اُٹھ گئی اور سر پہ کب گری
چل پھر سے اس کی فوجِ ستم دردناک تھی
گردوں پہ تھی کبھی تو کبھی زیرِ خاک تھی

دو لاکھ پر وہ تیغ برستی چلی گئی
ناگن کی طرح فوج کو ڈستی چلی گئی
بجلی سی دونوں باگوں پہ کستی چلی گئی
دم میں جلا کے خرمنِ ہستی چلی گئی
زخموں کو اُس نے آتشِ سوزاں بنا دیا
ہر نخلِ قد کو سروِ چراغاں بنا دیا

اس تیغ کی برش سے زبردست زیر تھے
روباہ بن گئے تھے وہ دل جن کے شیر تھے
گوشوں میں چھپتے پھرتے تھے جتنے دلیر تھے
تودے تھے سرکشوں کے کمانوں کے ڈھیر تھے
غل تھا کہ ای نبی کے نواسے پناہ دے
ای دو شبانہ روز کے پیاسے پناہ دے

آئی ندائے غیب کہ ای ابنِ مرتضیٰ
معنی یہی ہیں جنگ کے شاباش مرحبا
کس کا یہ منہ ہے تجھ سے کوئی کر سکے وغا
اعدے پہ بخشنے کے مناسب ہے اب وفا
ہم منتقم ہیں ان سے نہ تو انتقام لے
ای صابروں کے فخر بس اب ہاتھ تھام لے

آوازِ غیب سنتے ہی ٹھہر گئے امام — کی ذوالفقار میاں میں اور روک لی لگام
گردن پھرا کے منہ کو لگا تکنے خوش خرام — فرمایا تجھ سے ہوتا ہے رخصت یہ تشنہ کام
رک جا کہ خاتمہ ہوا جنگ و جدال کا — اب سر چڑھے گا نیزے پہ زہرا کے لال کا

رکنا تھا بس کہ چلنے لگے برچھیوں کے وار — اک جسمِ نازنیں پہ چلے تیر دس ہزار
تیغوں سے ہاتھ کٹ گئے سر ہو گیا فگار — تیورا گیا وہ فاطمہ زہرا کا گلعذار
کھائی سناں جو غش میں دلِ دردناک پر — کرسی نشینِ عرش گرا فرشِ خاک پر

پہونچی جو ضرب پھٹ گئے زخمِ تنِ حسین — سب خاک خون میں بھر گیا پیراہنِ حسین
سر خاک پہ پٹکنے لگا توسنِ حسین — سجدے کو سوئے قبلہ جھکی گردنِ حسین
اعدا نے کائنات کا دفتر الٹ دیا — نیزوں سے لاشِ شہ کو زمیں پر الٹ دیا

بولا یہ فوج سے عمرِ سعد روسیاہ — رہتی ہے اب تو غش ہے محمد کا رشکِ ماہ
نکلے کہیں نہ خیمے سے زینب باشک و آہ — ہاں کاٹ لو سرِ پسرِ ضیغم الہ
راحت کے بعد فتح سرانجام کیجیو — زہرا کے گھر کو لوٹ کے آرام کیجیو

خولی علم کیے ہوئے شمشیر کیں بڑھا — بڑھتے ہی اس کے اپنے پرے سے حصین بڑھا
خنجر کمر سے کھینچ کے شمرِ لعیں بڑھا — شہ کی طرف چڑھائے ہوئے آستیں بڑھا
زینب نے دی دہائی تو منہ کو پھرا لیا — زانو سے شہ کا سینۂ زخمی دبا لیا

پھیرا گلوئے خشک پہ خنجر جو ایک بار — آثارِ صبحِ حشر ہوئے رن میں آشکار
شہ رگ پہ جب پہنچ گئی تیغِ ستم کی دھار — چلائے ہاتھ اٹھا کے امامِ فلک وقار
بیکس ہوں تشنہ کام ہوں تیغوں سے چور ہوں — یارب گواہ رہیو کہ میں بے قصور ہوں

یارب بحقِ گوہرِ دندانِ مصطفا — یارب بحقِ خونِ سرِ شاہِ مرتضا
یارب بحقِ حرمتِ زہرا و مجتبا — کچھ اور مانگتا نہیں اصغر کا خوں بہا
ہے تجھ سے التجا یہی مجھ دل ملول کی — امت کو بخش دے مرے نانا رسول کی

ش ناگاہ تشنہ لب پہ چلے برچھیوں کے وار

یہ کہتے تھے کہ حلق سے خنجر گزر گیا
خورشیدِ آسمانِ شرف خوں میں بھر گیا
دُنیا سے بادشاہِ اُمم کوچ کر گیا
چلائی فاطمہ کہ مرا شبیر مر گیا
برپا ہو جب یہ حشر تو کیا دل کو کل پڑے
باہر سب اہلِ بیتِ محمد نکل پڑے

زینب نے خیمہ گاہ سے باہر جو کی نظر
دیکھا اک آفتاب کو نیزے پہ جلوہ گر
لڑکی جو ساتھ تھی وہ پکاری بچشمِ تر
میں لُٹ گئی پھوپھی مرے بابا گئے کدھر
شہ ذبح ہو گئے نہ کسی کو خبر ہوئی
ہے ہے ذری سی عمر میں بے پدر ہوئی

بنتِ علی کی آنکھوں میں عالم ہوا سیاہ
ہاتھوں سے دل پکڑ کے کہا وا محمدا
مُنہ پیٹ کے زمیں پہ گری بھر اشک و آہ
چلائی ہائے خانۂ زہرا ہوا تباہ
ہم سب کے چین اب تہِ افلاک اُٹھ گئے
ہے ہے جہاں سے پنجتنِ پاک اُٹھ گئے

ہے ہے شہیدِ خنجرِ ظلم و جفا حسین
ہے ہے گلو بریدۂ راہِ خدا حسین
ہے ہے غریب و بیکس و بے آشنا حسین
ہے ہے ذبیحِ ماریہ و نینوا حسین
ہے ہے لہو بھری ہوئی زلفیں لٹکتی ہیں
ہے ہے رگوں سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں

لوٹا بلا کے گھر سے محمد کی آل کو
پیاسا کیا شہید شہِ خوش خصال کو
ہے ہے دیا کفن بھی نہ زہرا کے لال کو
لوگو خبر کرو اسدِ ذوالجلال کو
دیکھیں بغور زخمِ تنِ پاش پاش کے
ٹکڑے اُٹھائیں آن کے بیٹے کی لاش کے

بس اے انیس حشر ہے مجلس میں اب خموش
سر پیٹتے ہیں عاشقِ سرور بصد خروش
ہے ماتمِ حسین کا بزمِ عزا میں جوش
کیا مرثیہ پڑھا کہ کسی میں نہیں ہے ہوش
فرما رہے ہیں شیرِ خدا مرحبا تجھے
دیتی ہے روحِ فاطمہ زہرا دعا تجھے

مرثیہ (۱۵)

ای شمعِ قلم روشنیِ طور دکھا دے
ای لوحِ تجلیِ رخِ حور دکھا دے
ای بحرِ طبیعت گہرِ نور دکھا دے
ای شاہدِ معنی رخِ مستور دکھا دے
بزمِ غمِ شبیر میں وہ جلوہ گری ہو
خورشیدِ جہاں تاب چراغِ سحری ہو

ای طبعِ رسا خلد کا گلزار دکھا دے
ای باغِ سخن گلشنِ بے خار دکھا دے
ای شمعِ زباں لمعۂ انوار دکھا دے
ای حسنِ بیاں خوبیِ گفتار دکھا دے
لرزاں ہے قدم خامۂ اعجاز رقم کا
ہاں تیغِ زباں آج تو کر کام قلم کا

مانی کو بھی حیرت ہو وہ نقشہ نظر آئے
بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آئے
سب بزم کو حیدر کا سراپا نظر آئے
مہتاب تو کیا ہے رخِ خورشید بھی فق ہو
جو بند ہو تصویرِ تجلی کا ورق ہو

ہے رتبۂ مداحِ چمنِ فاطمہ عالی
ہاں باندھ لو گلدستۂ مضمونِ خیالی
ہر مصرعِ شاداب ہے اک پھولوں کی ڈالی
لفظوں کے بھی غنچے ہوں نہ نکہت سے خالی
لبریز لطافت سے ہو رنگین سخن ایسا
رضواں بھی پکارے نہیں دیکھا چمن ایسا

خاموش! زباں دعویِ بیجا نہیں اچھا
ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعوی نہیں اچھا
آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوا نہیں اچھا
کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

خورشید کو کچھ حاجتِ زیور نہیں زنہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار
اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجتِ اظہار
خود مشک ہو خوشبو نہ کہ خوشبو کہے عطار
جو بد ہے سو بد ہے جو نکو ہے وہ نکو ہے
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہے

انساں کے لیئے عجز ہی لازم ہی بہر کیف
ہی خانۂ دنیا میں ہر اک پیر و جواں ضیف
گر صاحب جوہر نہ چلے جھک کے تو صد حیف
خارج ہی اصالت سے وہ کستی نہیں جو سیف
آفاق میں یوں فیضِ نگیں عام نہ ہوتا
ہوتا نہ فروتن تو کبھی نام نہ ہوتا

مطلع دوم

یا رب مری فریاد میں تاثیر عطا کر
بلبل بھی پھڑک جائے وہ تقریر عطا کر
دولت کے عوض فقر کی جاگیر عطا کر
توفیقِ ثنا خوانیِ شبیر عطا کر
دعویٰ نہ سخن کا ہی نہ اعجاز بیاں ہوں
تو عالم و دانا ہی کہ میں ہیچمداں ہوں

ای باعثِ ایجادِ جہاں وقتِ مدد ہی
ای منتظمِ کون و مکاں وقتِ مدد ہی
ای خضرِ رہِ گم شدگاں وقتِ مدد ہی
ای دادرسِ پیر و جواں وقتِ مدد ہی
چلنا ہی دمِ تیغِ دو دم پر کوئی دم کو
یوں ہاتھ پکڑ لے کہ نہ لغزش ہو قدم کو

ای قبلۂ کونین اعانت کی طلب ہی
ای ہادیِ دارین ہدایت کی طلب ہی
ای بحرِ عطا ہمت و رحمت کی طلب ہی
ای نورِ خدا نورِ بصیرت کی طلب ہی
مقبول ہی وہ تو جسے منظور کرے گا
اس ذرّہ کو خورشید ترا نور کرے گا

ای ساقیِ کوثر مئے فردوس عطا کر
ای عیسیِ دوراں مرضِ دل کی دوا کر
ای دستِ خدا قلبِ مکدّر کی صفا کر
ای نورِ حق آئینۂ خاطر کی جلا کر
مستی میں نہ فکرِ خرد و ہوش کروں میں
کیفیتِ دنیا کو فراموش کروں میں

اندیشۂ توصیفِ شہنشاہِ امم ہی
زانو پہ سرِ فکر ہی سجدے میں قلم ہی
یہ راہ ہی باریک کہ لغزش میں قدم ہی
ای دستِ زبردستِ خدا وقتِ کرم ہی
خامے سے نہ کچھ طبعِ خداداد سے ہوگا
یہ مرحلہ طی آپ کی امداد سے ہوگا

بلبل سے کبھی وصفِ گلِ تر نہیں ممکن
آئینہ سے اوصافِ سکندر نہیں ممکن
ذرّے سے ثنائے شہِ خاور نہیں ممکن
جبریل سے تعریفِ پیمبر نہیں ممکن
مقدور کسے شیرِ الٰہی کی ثنا کا
ہو سکتا ہی بندے سے کہیں شکر خدا کا

ہے عرش جہاں فرش یہ کاشانہ ہے کس کا
ہر سو ہے تجلّی یہ جلو خانہ ہے کس کا
جلتا ہے دلِ شمع یہ افسانہ ہے کس کا
سرگشتہ ہے مہتاب یہ پروانہ ہے کس کا
روشن ہے جہاں جلوۂ نورِ ازلی ہے
ہاں بزم معلائے حسین ابنِ علی ہے

مجلس کا نہ ہے نور خوشا محفل عالی
حیدر کے محبّوں سے کوئی جا نہیں خالی
عاشق ہیں سب اُس کے جو ہے کونین کا والی
اثنا عشری پنجتنی شیعہ غالی
ششدر نہ ہوں کیوں چار طرف جلوہ گری ہے
یہ بزمِ عزا آج ستاروں سے بھری ہے

اللہ رے رتبہ یہ فلک ہے کہ زمیں ہے
ہے عرش مکاں جس کا وہ آج اس میں مکیں ہے
جو دل ہے سو وابستۂ لطفِ شہِ دیں ہے
مجلس ہے کہ گلدستۂ فردوسِ بریں ہے
یہ اوج یہ رُتبہ کسی محفل کو ملا ہے
ان پھولوں کے قربان عجب باغ کھلا ہے

فرماتے ہیں شیعوں کے یہ حق میں شہِ اکرم
یہ بزمِ عزا ہوتی ہے جس گھر میں فراہم
بن جاتے ہیں اشک ان کے مرے زخموں کے مرہم
یہ لوگ ہیں سب میرے مصاحب مرے ہمدم
مر جاتا ہے کوئی تو بکا کرتا ہوں میں بھی
ان کیلئے بخشش کی دعا کرتا ہوں میں بھی

کیسا ہی گنہگار مرے میرا عزادار
ہے اس کے گناہوں سے فزوں رحمتِ غفّار
فرماتے ہیں بخشش کی دُعا احمدِ مختار
اللہ سے میں ہوتا ہوں بخشش کا طلبگار
گر نزع میں سختی ہو تو زہرا و نبی ہیں
اور قبر کی مشکل میں شریک اُس کے علی ہیں

کیوں مومنو کیا فیض ہے کیا لطف و عطا ہے
کیا مرتبۂ اشک ہے کیا اجرِ بکا ہے
گوہر ہیں یہ وہ جن کا خریدار خدا ہے
جو کچھ ہے سو بس دوستیِ آلِ عبا ہے
دُنیا پہ نہ دولت پہ توجہ ہے نہ زر پر
زہرا کی نظر پڑتی ہے اشکوں کے گہر پر

کیا اشکِ عزادار کا رتبہ کوئی جانے
یہ گنج گہر بخشا ہے مردم کو خدا نے
کی ہے نظرِ عینِ عنایت شہدا نے
دکھلائیں گے کیا کیا ثمر ان اشکوں کے دانے
یاں اس کا نہ عقدہ دلِ مضطر پہ کھلے گا
یا قبر پہ یا چشمۂ کوثر پہ کھلے گا

یاں اشک کا دانہ ہے تو واں دُرِّ ثمیں ہے
یاں آب ہے واں غازہ کشِ چہرۂ دیں ہے
یاں آنسوؤں کا تار ہے واں حبلِ متیں ہے
یاں قطرہ ہے واں خاتمِ رحمت کا نگیں ہے
قطرہ ہے مگر بحر کو بھی گرد کرے گا
دوزخ کے شراروں کو یہی سرد کرے گا

جو لوگ ہیں پاک انھیں دوزخ سے نہیں باک
منہ اشکوں سے دھویا تو گناہوں سے ہوئے پاک
ہے دولتِ ایماں غمِ سبطِ شہِ لولاک
ہوجاتی ہے کیا بعدِ بُکا طبع فرحناک
آنکھوں کی ضیا رُخ کی صفا دل کی جلا ہے
سب ایک طرف گلشنِ فردوس ملا ہے

مہلت جو اجل دے تو غنیمت اسے جانو
آمادہ ہو رونے پہ سعادت اسے جانو
آنسو نکل آئیں تو عبادت اسے جانو
ایذا بھی ہو مجلس میں تو راحت اسے جانو
فاقے کیے ہیں دھوپ میں لب تشنہ رہے ہیں
آقا نے تمھارے لیے کیا ظلم سہے ہیں

تکلیف کچھ ایسی نہیں سایہ ہے ہوا ہے
پانی ہے خنک مروحہ کش بادِ صبا ہے
کچھ گرمیِ عاشور کا بھی حال سنا ہے
سر پیٹنے کا وقت ہے فریاد کی جا ہے
گزری ہے بیاباں میں وہ گرمی شہِ دیں پر
بھن جاتا تھا دانہ بھی جو گرتا تھا زمیں پر

وہ گرم ہوا آہ وہ آندھی وہ بگولے
اُٹھے جو ترائی سے تو دم شیر کا بھولے
دو گام چلے گر تو ہرن چوکڑی بھولے
کیا تاب ہے اس کی جو کوئی سنگ کو چھو لے
خاک اُڑ کے جمی جاتی تھی زلفوں پہ قبا پر
اس دھوپ میں سایہ بھی نہ تھا نورِ خدا پر

حالت تو یہ خورشید کی اور پیاس کا وہ حال
لب خشک تھے سونلا گیا تھا فاطمہ کا لال
سایہ نہ علم کا تھا نہ عباسِ خوش اقبال
گہ رُخ پہ سپر روکتے تھے اور کبھی رومال
تھی دھوپ کڑی فاطمہ کے رشکِ چمن پر
تھی گرم زرہ جلتے تھے ہتھیار بدن پر

زلفیں وہ جنھیں سونگھتی تھی فاطمہ ہر شب
غیرت دہِ مشکِ ختن و عنبرِ اشہب
کہتے تھے جنھیں فاطمہ کا رشتۂ جاں سب
کیوں داغ پریشان ہو وہ مٹی میں اٹیں جب
آہوں کا دھواں کیوں نہ اٹھے کون و مکاں سے
فریاد کہ باندھا انھیں ظالم نے سناں سے

وہ چاند سی پیشانیِ نورانیِ شبیر
اندھیر ہے اس پر بنِ اشعث کا لگا تیر
سجدے کریں محرابِ حرم کی ہو یہ توقیر
اُن ابروؤں پر ہائے چلی ظلم کی شمشیر
آہو کو ستاتے نہیں دیندارِ حرم میں
آنکھیں وہ لہو روتی تھیں فرزندوں کے غم میں

وہ ریش جو ہالہ تھی تو چہرہ مہِ انور
فاقوں سے تھا یہ زرد وہ تھی آنسوؤں سے تر
وہ پھول سے رخسار وہ لعلِ لبِ اطہر
اس کے لیے تلواریں تھیں اس کے لیے پتھر
دنداں دہنِ پاک میں سب رشکِ گہر تھے
گزرے تھے کئی روز کہ دنداں پہ جگر تھے

وہ حلق جسے چومتے تھے احمدِ مختار
تیر اس کے لیے ہوتے تھے واں خنجرِ خونخوار
وہ دوش جو امت کا اُٹھائے ہوئے تھا بار
لگتا تھا تبر اس پہ کبھی اور کبھی تلوار
لڑنے کی نہ طاقت تھی شہِ تشنہ گلو میں
ڈوبی ہوئی تھیں مچھلیاں بازو کی لہو میں

وہ شمعِ سرِ طور سی پُر نور کلائی
اُس پر خطِ شمشیر دوہائی ہے دوہائی
منہ دیکھ لو صاف ایسی ہتھیلی میں صفائی
ہے سب پہ کھلی انگلیوں کی عقدہ کشائی
نسبت نہیں ناخن سے کبھی بدر کی ضو کو
ہفتہ میں دکھائے تو کوئی دن مہِ نو کو

وہ سینۂ روشن کہ جو تھا مطلعِ انوار
گنجینۂ علمِ احدی مخزنِ اسرار
قرآن کو رکھ لیتے ہیں سر پر جو ہیں دیندار
کیا قہر ہے واں پاؤں دھرے شمرِ ستمگار
سینے پہ نہ تھا اس کا قدم حشر بپا تھا
ہو جاتی جو دنیا تہ و بالا تو بجا تھا

عباس سے بھائی کا جو تھا صدمۂ جاں کاہ
ٹکڑے تھا جگر ٹوٹ گئی تھی کمرِ شاہ
اس ضعف میں لغزش سے نہ وہ پاؤں تھے آگاہ
پایا تھا ثباتِ قدمِ پاکِ ید اللہ
سب خاک پہ ٹکڑے تو کلیجے کے پڑے تھے
لاکھوں سے لڑائی تھی یہ بشاش کھڑے تھے

منہ کر کے سوئے چرخ یہ فرماتے تھے ہر بار
عالم مری نیت سے ہے تو آگہ مرے مختار
گھر سے نہ علاقہ ہے نہ بچوں سے سروکار
ہر حال میں ہوں تجھ سے اعانت کا طلبگار
گو شاہِ زمن ہوں پہ ترے در کا گدا ہوں
محتاج ہوں بیکس ہوں غریب الغربا ہوں

کس کس ترے احساں کا کروں شکر زباں سے ہے ناطقہ عاجز کہ زیادہ ہے بیاں سے
واقف نہیں کوئی ترے اسرار نہاں سے دشوار ہے عالم کی صفت ہیچمداں سے
پیاس آج کے دن کی مجھے مرغوب ہے مولا جو تیری مشیت ہے وہی خوب ہے مولا

ہر دم ہے ترا لطف مرے حال کے شامل پیدا کیا واں وحی جہاں ہوتی تھی نازل
بخشا وہ مکاں رہنے کو اے خالق عادل بے اذن ملک جس میں نہ ہو سکتے تھے داخل
یہ لطف و عنایت ہے تری کون سے گھر پر جبریل و سرافیل کھڑے رہتے تھے در پر

نانا تو دیا اشرف ذریت آدم بابا شہ مرداں سا دیا فخر دو عالم
ماں سیدۂ کون و مکاں ثانی مریم بھائی وہ کہ تو جس کی بزرگی سے ہے محرم
دنیا میں کسی اور کا رتبہ ہے کب ایسا نام ایسا گھر ایسا نسب ایسا حسب ایسا

ماں طاہرہ جد طیب و پاکیزہ پدر پاک رحمت سے تری کیوں نہ ہو ایسوں کا پسر پاک
گلشن کی زمیں پاک شجر پاک ثمر پاک گھر پاک جگہ پاک صدف پاک گہر پاک
پھولے وہ شجر جس کو ثمر دار کرے تو جس قطرے کو چاہے در شہوار کرے تو

بچپن میں محمد نے زباں اپنی چسائی اب تک کسی نعمت میں وہ لذت نہیں پائی
قرباں رہی احمد مختار کی جائی جب مرے دودھ چھٹا نعمت فردوس بھی کھائی
افلاک سے دن میں کئی بار آتے تھے جبریل ڈوری مرے جھولے کی ہلا جاتے تھے جبریل

دم بھر بھی تنہا نہ رہا آٹھ پہر میں گہ دوش نبی پر گہے آغوش پدر میں
ماں ساتھ مرے ہوتی تھیں پھرتا تھا جو گھر میں پتلی کی طرح رکھتے تھے سب مجھ کو نظر میں
اس رتبۂ اعلیٰ کا سزاوار میں کب تھا مولا یہ تری چشم عنایت کا سبب تھا

تھا عید کو عریاں کہ عنایت ہوئی پوشاک عمامہ و پیراہن و پاجامہ و روپاک
مرکب جو نہ تھا اونٹ بنے سید لولاک بالا ہوا سب سے مرا رتبہ تہ افلاک
یہ تخت سلیماں کو نہ یہ تاج ملا تھا بچپن میں مجھے رتبۂ معراج ملا تھا

رخصت ہوئی خورشیدِ فلک کو پدرِ حیدر — یعنی نہ قضا ہوئے نمازِ شہِ صفدر
روزہ جو رکھا میں نے تو اے خالقِ اکبر — دن تھا پہ ہوئی رات چھپا مہرِ منوّر
منظور تھی خوردی میں بزرگی مرے سن کی — دن ہوگیا واں شب کا تو یاں شب ہوئی دن کی

کیا عمر تھی جب سر سے اُٹھا باپ کا سایا — دو بھائی تھے دو بہنیں تھیں اور دیس پرایا
تھا تو جو نگہبان تو نہ اعدا نے ستایا — ماں باپ کا مرنا تری شفقت نے بھلایا
رحمت سے تری خلق کے مختار ہوئے ہم — دیکھی جو یتیمی دُرِ شہوار ہوئے ہم

دولت مجھے دی گوہرِ عزت مجھے بخشا — بابا کی طرح اوجِ شرافت مجھے بخشا
مسند مجھے دی تختِ امامت مجھے بخشا — ان سب کے سوا تاجِ شفاعت مجھے بخشا
اختر کو قمر قطرے کو گوہر کیا تو نے — ذرّہ تھا سو خورشیدِ منوّر کیا تو نے

انصار دیئے وہ جو پیمبر نے نہ پائے — اصحاب وہ بخشے کہ جو حیدر نے نہ پائے
احباب وہ یکرنگ جو شبر نے نہ پائے — لوگ ایسے کسی صاحبِ لشکر نے نہ پائے
تیروں سے نہ تلواروں سے منہ پھرتا تھا اُن کا — خادم کے پسینے پہ لہو گرتا تھا اُن کا

فرزند وہ امداد کیا حور شمائل — تھی جس کی زیارت سببِ روشنیِ دل
خورشیدِ زمیں بُرجِ شرف کا مہِ کامل — یہ بھی تری امداد تھی اے خالقِ عادل
دولت یہ نہ ملتی جو خداوند نہ دیتا — کیا کرتا اگر تو مجھے فرزند نہ دیتا

اکثر ترے بندے ہیں کہ جن کے نہیں اولاد — نے فاتحہ خواں کوئی نہ فرزند نہ احفاد
کہتے ہیں کہ غمگین ہیں کبھی اور کبھی شاد — بچے ہوئے اور مر گئے اور گھر ہوا برباد
مرتے ہوئے دیکھا ہے برابر کے پسر کو — اس داغ کی قدر آج ہوئی میرے جگر کو

سو مرتے جو فرزند تو بے صبر نہ ہوتا — خادم کبھی اس اجر کو ہاتھوں سے نہ کھوتا
دامن کو ترے خوف میں اشکوں سے بھگوتا — اکبر کو میں فرزند سمجھ کر نہیں روتا
یوں تو وہ کلیجہ تھا مرا اور مرا جی تھا — میں اس لیے روتا ہوں کہ ہمشکلِ نبی تھا

بچھڑا تھا کبھی مجھ سے نہ وہ گیسوؤں والا — پیری کی عصا تھا وہی اور گھر کا اُجالا
جب چاند سی چھاتی پہ لگا ظلم کا بھالا — تھا سینے میں خادم کا کلیجہ تہ و بالا
اشک آنکھوں سے تھمتے نہیں تفتیدہ جگر ہوں — تو رحم کر اے خالقِ اکبر کہ بشر ہوں

دریا پہ جو عباس نے جان اپنی گنوائی — خادم کی کمر ٹوٹ گئی مرگیا بھائی
باعث تھا یہ لاشے پہ جو رقت بہت آئی — مولا مجھے یاد آگئی بابا کی جدائی
صدمے سے نہ پھر ضبط کا یارا ہوا مجھکو — پھر داغِ ید اللہ دوبارا ہوا مجھکو

تنہا ہوں بس اب کوئی نہیں مونس و ہمدم — موجود ہو تو سر پہ کچھ اس کا بھی نہیں غم
اب رنج نہ گھر کا ہے نہ اولاد کا ماتم — بہتر ہے گزر جائے تری یاد میں جو دم
وابستۂ تسبیح رکھوں رشتۂ جاں کو — جب تک ہے دہن میں حرکت خشک زباں کو

گو روح کو راحت نہیں اور قلب کو آرام — ہے تقویتِ جان و دل و روح ترا نام
کم ہے ترے سجدے میں ہوں گر سحر و شام — قاصر ہے زباں شکر میں اے خالقِ علام
آنکھیں تری جانب ہیں تو دل تیری طرف ہے — گر تو اسے مقبول کرے عین شرف ہے

نے پیاس کا شکوہ ہے نہ فاقہ کی شکایت — ہر طرح ہے راضی پسرِ شاہِ ولایت
وہ بھی ترا انعام تھا یہ بھی ہے عنایت — الطاف کا پایاں ہے نہ بخشش کی نہایت
وہ کونسی دولت ہے جو موجود نہیں ہے — ہاں ایک شہادت ہے سو اب وہ بھی قریں ہے

ہر چند کہ ہے سخت بہت ذبح کی منزل — تو چاہے تو ہو جائے گی آسان یہ مشکل
زانو جو رکھے سینۂ مجروح پہ قاتل — وہ صبر عطا کیجو کہ تڑپے نہ مرا دل
سجدہ تہِ شمشیر یہ ناشاد نہ بھولے — سب محو ہوں دل سے پہ تری یاد نہ بھولے

حضرت تو یہ کرتے تھے سخن صبر و رضا کے — بندھنے لگے اُدھر ران میں تیر اہلِ جفا کے
چلاتا تھا یوں شمر کماں داروں میں آکے — تاکے رہو سینہ کو امامِ دوسرا کے
یاں تک خلفِ شاہِ نجف آنے نہ پائے — یہ شبیر ترائی کی طرف آنے نہ پائے

برچھے لیئے ہاتھوں میں سوارانِ جفاکار
آلودۂ خوں برچھیاں تولے ہوئے خونخوار
لشکر کے جواں گرزِ گراں تولے ہوئے تھے
وہ غل عربی باجوں کا وہ بوق کے نالے
رستم کی نہ طاقت تھی جو واں دل کو سنبھالے
پیدا تھی جلاجل سے اک افسوس کی آواز
دو روکے یہ ہر دُر و صدا دیتی تھی شہنا
فانی ہے زمیں اس پہ ہمیشہ نہیں رہنا

دو بڑوں کے پیاسے شہِ مظلوم کھڑے ہیں
چلّے سے جو بدکیش ملانے لگے سوفار
فرمایا قسم ہے تمہیں اے قومِ ستمگار
انصاف سے کہدو کہ طلبگار ہوں جس کا
ہے کون گلِ سرسبد گلشنِ اسلام
آتی تھی کسے وحیِ الٰہی سحر و شام
جبریلِ امیں ہمدم و ہمراز ہے کس کا
برپا عَلَمِ نظم و نسق کر دیا کس نے
رنگِ رُخِ کفّار کو فق کر دیا کس نے

لب ہل گئے جب نخلِ دعا میں ثمر آیا
بخشا کسے اللہ نے معراج کا پایا
پڑتا تھا نہ اس خاک پہ کس شخص کا سایا
کس رُخ کو تجلّی صفتِ بدرِ عطا کی

بڑھ بڑھ کے صفِ جنگ میں چمکاتے تھے ہتھیار
تھی ڈھال پہ ڈھال اور تھی تلوار پہ تلوار
ہر صف میں علمدار نشاں کھولے ہوئے تھے
وہ شورِ دُہل سر پہ جو گردوں کو اُٹھا لے
دب جائے اگر رعد بھی آواز نکالے
جاتی تھی کئی کوس تلک کوس کی آواز
اچھا نہیں سیّد کا لہو خاک پہ بہنا
دریغ نہ ہو مظلوم کے ماتم کا کہنا

اس غم سے کلیجے میں مرے چھید پڑے ہیں
خود چھیڑ کے گھوڑے کو بڑھے سیدِ ابرار
کس شخص کا دلبند ہوں میں بیکس و ناچار
جد کس کا ہے تم سب کلمہ پڑھتے ہو کس کا
آباد کن کعبۂ حق کا شکنِ اصنام
جو نام خدا سے ہے بہم کس کا ہے وہ نام
قرآن جسے کہتے ہو اعجاز ہے کس کا
عالم کو سوئے کعبۂ حق کر دیا کس نے
ہاں بدر کو انگشت سے شق کر دیا کس نے

انگشتِ شہادت کو اُٹھا کر شجر آیا
سو مردوں کو عیسیٰ کی طرح کس نے جلایا
جد کس کا ہے جو سورۂ کوثر جسے آیا
دنیا میں کسے حق نے نسبِ قدر عطا کی

سب بولے کہ اس بات سے واقف ہے زمانہ
روشن ہے شبِ ماہ سے معراج کا جانا
وہ قبلۂ دیں باعثِ ایجادِ فلک ہے
شبیر نے فرمایا کہ وہ کس کی ہے مادر
دنیا کا شرف زینتِ دیں عرش کا زیور
بھیجی ہے انھیں چادرِ تطہیر خدا نے
کہنے لگے بے شرم کہ اے خاصۂ قیوم
سب جانتے ہیں ساکنِ شام و عرب و روم
زہرا کا پدر فخرِ رسولانِ سلف ہے
اس حجتِ باری نے یہ فرمایا پھر اک بار
کس کا ہے لقب شیرِ خدا حیدرِ کرار
ہر جنگ میں کفار پہ ور کون رہا ہے؟
آباد ہوئی کس کی رعایت سے رعایا
کس کے لیے اکملت لکم دینکم آیا
یکتائے جہاں کون ہے جرات میں سخا میں
وہ کون ہے اللہ و نبی کو جو ہے پیارا
ہے انفسنا انفسکم کس سے اشارا
اعلٰی کسے فرمایا علی کس کو کہا ہے
طاعت سے جو افضل ہے اطاعت وہ کس کی
پہونچا دے جو کوثر پہ رفاقت وہ کس کی
انصاف کا اب وقت طلبگار ہوں تم سے

لاریب ہیں محبوبِ خدا آپ کے نانا
کافر ہے وہ اس بات کو جس نے نہیں مانا
آپ ان کے نواسے ہیں کچھ اس میں نہیں شک ہے
قرآں میں جسے حق نے کہا طاہر و اطہر
خاتونِ جہاں نورِ خدا بنتِ پیمبر
امت کے گنہ ڈھانپ دیے جن کی ردا نے
وہ آپ کی مادر ہیں یہ کس کو نہیں معلوم
وہ سیدہ معصوم ہے اور آپ بھی معصوم
جو اس کا نہ رتبہ ہے نہ مریم کا شرف ہے
من بعد نبی کون ہے کونین کا سردار
اللہ نے بھیجی ہے کسے عرش سے تلوار
محبوبِ الٰہی کی سپر کون رہا ہے؟
کس شاہ نے دینداروں کی بستی کو بسایا
اتممت علیکم کا ملا ہے کسے پایا
دو حصے ہے قرآنِ خدا کس کی ثنا میں
جو عرش کی زینت ہے وہ ہے کونسا تارا
اللہ نے کس گھر میں ستارے کو اتارا
اللہ نے قرآں میں ولی کس کو کہا ہے
پوچھے گا خدا جس کو محبت ہے وہ کس کی
جو اجرِ رسالت ہے مودت وہ کس کی
ہے کون مراد آیۂ لا اسئلکم سے

جو والیِ کونین ہے وہ کون ولی ہے
قرآن میں کس کے لئے وہ نصِ جلی ہے
وہ کون ہے جو شاہِ امامِ ازلی ہے
سب نے کہا برحق وہ علی ہے وہ علی ہے
برعکس ہیں جو لوگ وہی بانیِ شر ہیں
سب پر ہے یہ آئینہ کہ آپ اُن کے پسر ہیں

گروہوں کی طرف دیکھ کے بولے شہِ بیکس
کافی ہے شہادت کو تری ذاتِ مقدس
یارب مجھے ان سے کوئی حجت نہ رہی بس
کرتے ہیں ستم دیدہ و دانستہ یہ ناکس
دُکھ کونسا اور کونسی ایذا نہیں دیتے
مہماں ہوں اور پانی کا قطرہ نہیں دیتے

جاہل نہیں سب ہیں مرے رُتبے کے شناسا
خود اس کے مقر ہیں کہ نبی کا ہوں نواسا
اس نہر سے پانی نہیں دیتے ہیں ذرا سا
شاہد تجھے کرتا ہوں کہ دو دن سے ہوں پیاسا
ٹکڑے ہو بدن یا تہِ شمشیر گلا ہو
اس سب کے عوض حشر میں شیعوں کا بھلا ہو

سُن کر یہ سخن رونے لگے فوج کے بے پیر
مظلوم کی فریاد نے کی سنگ میں تاثیر
بولا پسرِ سعد کہ یا حضرتِ شبیر
تنہا ہوئے اب کیوں نہ کرو عجز کی تقریر
میداں سے ہٹاتے نہیں اس فوجِ گراں کو
ایسا ہے مرا رعب کہ لکنت ہے زباں کو

اس عجز کو مانے گا نہ یہ لشکرِ سفاک
پھر کیا کریں گر ہو پسرِ سیدِ لولاک
سو رل گئے ہیں خاک میں ایسے گہرِ پاک
حاکم ہیں کہ ہے دور ہمارا تہِ افلاک
ڈرتے نہیں گر شکوۂ بیداد کرو گے
کیا ہوگا جو اللہ سے فریاد کرو گے

عباس سے کہدو کہ مدد کرنے کو آئیں
جعفر کے پسر جوہرِ شمشیر دکھائیں
قاسم ہیں کدھر خون کے دریا جو بہائیں
اکبر سے کہو جنگ کریں برچھیاں کھائیں
اب آپ کی جرات کا بھی وہ طور نہیں ہے
شاید کوئی زینب کا پسر اور نہیں ہے

بیدرد نے چھڑکا جو نمک زخمِ جگر پر
طاری ہوا غصہ شہِ مرداں کے پسر پر
سُرخی سی نظر آنے لگی دیدۂ تر پر
کی تیز نظر قبضۂ شمشیرِ دوسر پر
شہ کی نظرِ غیظ نہ تھی قہرِ خدا تھا
شمشیر ید اللہ جدا میان جدا تھا

خود تیغِ علی شاہ کے اعجاز سے نکلی　　فریاد دلِ فوجِ دغا باز سے نکلی
کس شان و تحمل سے کس انداز سے نکلی　　پریوں کے بھی ہوش اُڑ گئے اس ناز سے نکلی
فانوس سے خود شمعِ تجلی نکل آئی　　محمل سے تڑپتی ہوئی لیلی نکل آئی

تھیں تیغ کی دونوں جو زبانیں شرر افشاں　　موسیٰ کا عصا کہتا تھا کوئی کوئی ثعباں
غل چار طرف تھا کہ زہے قدرتِ یزداں　　ہیں ایک جگہ دو مہِ نو دست و گریباں
شہباز اجل بازوؤں کو تولے ہوئے ہے　　پر اوجِ سعادت کے ہما کھولے ہوئے ہے

نعرہ کیا ہاں ای پسرِ سعد جفا کار　　لے دیکھ تو ان کانپتے ہاتھوں کا کوئی وار
ہر چند کہ ہے عجز ہی بندے کو سزاوار　　مجبور نہیں لختِ دلِ احمدِ مختار
شاید مرا رتبہ تجھے معلوم نہیں ہے　　وہ کونسی شی ہے کہ جو محکوم نہیں ہے

حاکم ہوں ہیں سب خلقِ خدا ہے مرے تابع　　ہیں بابِ اجابت ہوں دعا ہے مرے تابع
مختارِ قدر ہوں ہیں قضا ہے مرے تابع　　آتش مری محکوم ہوا ہے مرے تابع
قبضہ ہے مرا خاک کے ہر گنجِ نہاں پر　　جاری ہے مرا حکم روانِ آب رواں پر

آتش کو جو دوں حکم ابھی سب کو جلا دے　　ہستی کے چراغاں کو ہوا دم میں بجھا دے
پانی کا یہ طوفاں ہو کہ عالم کو ڈبا دے　　ہل ہل کے زمیں خاک زمانے کی اُڑا دے
ہستی ہو نہ پستی نہ مکیں ہوں نہ مکاں ہوں　　آثارِ اذا زلزلت الارض عیاں ہوں

ذرّ بخ سے کچھ بیم نہ دہشت ہے بلا سے　　مضطر ہوں نہ دُکھ سے نہ ستم سے نہ جفا سے
خائف ہوں نہ جن سے نہ بشر سے نہ قضا سے　　ہاں ایک جو ڈرتا ہوں تو ڈرتا ہوں خدا سے
کیا غم ہے اگر لاکھ سواروں کے پرے ہیں　　روباہ کے لشکر سے کہیں شیر ڈرے ہیں

تو کیا ہے ترا رعب ہے کیا او سگِ ناپاک　　میں بیشۂ حیدر کا ہوں اک شیرِ غضبناک
اُف کر دوں تو جل کر ترا لشکر ہو سب خاک　　مشتاقِ اجل ہوں مجھے مرنے سے نہیں باک
باتوں میں کروں بند جہانِ جہاں کو　　یہ پیاس سے لکنت ہے مری خشک زباں کو

چلتی ہے یوں حرارتِ خورشید سے دو چند
مرجھا گئے ہیں نخل ہوائیں ہیں یہ گزند
جھیلوں میں ہیں درند درختوں پہ ہیں پرند
ہے دھوپ میں رسول کا فرزندِ ارجمند
غربت میں بیکسی ہے شہِ دیں پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہرا کے ماہ پر

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر
لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے
گیسوے مشک بار اٹے ہیں غبار سے

اہلِ حرم ہیں محمل و ہودج میں بے قرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ یا شاہِ نامدار
گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیر خوار
کیونکر یہ دکھ اُٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

چلّاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کریں خیمہ کہیں بپا
ٹھنڈی ہوا میں لے کے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ چاہ ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت تباہ ہے

جب طے ہوئی وہ منزلِ آفت قریبِ شام
اس روز ثعلبیہ میں شہ کا ہوا مقام
اکبر نے آن کر کیا پردے کا اہتمام
ناقوں سے اُترے آلِ نبی با صد احترام
ڈوبے ہوئے عرق میں سبھوں کے لباس تھے
دل رُندھ گئے تھے چاند سے چہرے اُداس تھے

اُترے رفیق خاص قریبِ خیامِ شاہ
کچھ فاصلے سے گرد فروکش ہوئی سپاہ
نکلا حرم سے حضرتِ خیر النسا کا ماہ
کرسی پہ جلوہ گر ہوا وہ عرش بارگاہ
ہر نخل غیرتِ شجرِ طور ہو گیا
صحرا خدا کے نور سے معمور ہو گیا

اُس دن بہت اُداس تھا زہرا کا یادگار
زردی تھی رُخ پہ گیسوؤں پر راہ کا غبار
صحرا پہ گہہ نظر تھی گہے سوے کوہسار
کہتے تھے دیکھ دیکھ کے گردوں کو بار بار
کس کو نہ بے وطن کیا کس پہ جفا نہ کی
اے دہر تو نے آہ کسی سے وفا نہ کی

اس شان سے لشکر پہ امامِ اُمم آئے
اتنا تو پکارے کہ خبردار ہم آئے
پُل بندھ گئے لاشوں کے اک پل میں ہوئی آخر
جب تیغِ علی قبلۂ عالم نے علم کی
اللہ ری برش سیفِ شہنشاہِ اُمم کی
گلرنگ ہوئے جوہر اک جسم شقی تھا

شمشیرِ ید اللہ نے نئی چال دکھائی
ہر بار چمک برق کی تمثال دکھائی
جل جل کے بدن ناریوں کے سرد ہوئے تھے
کٹ کٹ کے صفیں خاک پہ بے جاں نظر آئیں
بے چلّہ کمانیں سرِ میداں نظر آئیں
چلّاتے تھے وہ ہوش نہ تھا خوف سے جن کو

خالی نہ کوئی وار گیا تیغِ دو سر کا
سینہ جو بچا اس سے کسی بانیٔ شر کا
تیغ اُس نے سپر اس نے زرہ اس نے نہ چھوڑی
رہ رہ کے چمکتی تھی جو شمشیرِ قضا دم
فوجیں تھیں بس جان کی سب درہم و برہم
جب برق چمکتی تھی سرک جاتے تھے جبریل

ناگاہ محمد کی صدا آئی کہ شبیر
یہ سنتے ہی بس تھم گیا وہ تابعِ تقدیر
تھا دھیان غلاموں کا جو اس خاصۂ حق کو

جیسے صفِ آہو پہ ہژبرِ اجم آئے
اک دم میں ستمگر تہِ تیغِ دو دم آئے
ثابت نہ ہوا کب صفِ اول ہوئی آخر
اک برق سی میدانِ بلاخیز میں چمکی
اعدا کو نظر آنے لگی راہ عدم کی
تھی دوپہر اور دامنِ صحرا شفقی تھا

سرداروں کی صف فوج کو پامال دکھائی
سب خون سے مقتل کی زمیں لال دکھائی
ڈر ڈر کے سیہ کاروں کے منہ زرد ہوئے تھے
جو برچھیاں یاں جمع تھیں وہ واں نظر آئیں
ساری سپریں خون سے افشاں نظر آئیں
فریاد کہ شب خون گرا فوج پہ دن کو

ہاتھ اُڑ گئے گر پاؤں بچا کر کوئی سرکا
تھی عقدہ کشا کھول دیا بند کمر کا
وہ انگلیوں میں ایک گرہ اُس نے نہ چھوڑی
غل ہوتا تھا پریوں میں کہ یا حافظِ عالم
مضطر تھے ملک کانپتا تھا عرشِ معظم
یا شیرِ خدا کہہ کے جھجک جاتے تھے جبریل

اب عصر کا ہے وقت کرو میان میں شمشیر
تلوار کا تھمنا تھا کہ چھاتی پہ لگا تیر
بس روکا خود اُلٹے ہوئے نیزے کے رُخ کو

حضرت پہ جھکے اہلِ ستم چار طرف سے
پڑنے لگی شمشیرِ دو دم چار طرف سے
تر خون میں سر تا بقدم ہو گئے شبیر
جھکنا تھا کہ تیغوں کے برابر سے چلے تیر
جب گرنے لگا خاک پہ وہ بیکس و ناچار
گھیرا ہے لعینوں نے اکیلا اُسے پا کر

گھوڑے نے جو دیکھا کہ سنبھلتے نہیں سرور
زخموں سے جو تھا چور تنِ سبطِ پیمبر
افراطِ جراحت سے بدن رشکِ چمن تھا
دس سو نو کماں دار تھے اک سینۂ شبیر
یا شاہِ نجف کہتے تھے جب پڑتی تھی شمشیر
تم کھاتے ہو تلوار میں مری جاتی ہوں بھائی

اس وقت بھی شہ ہاتھ سے کرتے تھے اشارا
رتبہ ہے فزوں مریم و حوّا سے تمھارا
للّٰلہ نہ اس دم تنِ صد پاش پہ آنا
تھی رانڈوں میں ڈیوڑھی پہ عجب گریہ و زاری
کہتی تھی سکینہ کہ پھوپھی جان میں واری
یاں چھوڑ کے ہم سب کو چلے جائیں گے بابا

ڈیوڑھی سے ہٹو تن سے نکلتا ہے مرا دم
کہتی تھی لے تھامے ہوئے زینبِ پُر غم
واں چلتی ہے تلوار کہاں جاؤ گی بی بی

نیزے ہوئے بیکس پہ علَم چار طرف سے
بس گھر گیا اک کشتۂ غم چار طرف سے
برچھی جو لگی پشت پہ خم ہو گئے شبیر
قدموں سے رکابیں بھی جدا ہو گئیں اک بار
زہرا کی صدا آئی کہ یا حیدرِ کرّار
گرتا ہے مرا لال مدد کیجیے آ کر

بس بیٹھ گیا ٹیک کے گھٹنوں کو زمیں پر
غش ہو گئے رہوار سے ریتی پہ اُتر کر
سب فوج کے حربے تھے اور اک شاہ کا تن تھا
برچھی کا جہاں زخم تھا لگتا تھا وہیں تیر
چلاتی تھی دروازے سے یہ زینبِ دلگیر
اب سینہ سپر ہونے کو میں آتی ہوں بھائی

ہٹ جاؤ بہن گھر سے نکلو نہ خدا را
دم تن میں ہے جب تک نہیں یہ مجھ کو گوارا
سر تن سے اُتر لے تو مری لاش پہ آنا
سر کھولے ہوئے روتی تھیں ان بیبیاں ساری
مجھ کو تو دکھاؤ مرے بابا کی سواری
کیوں روتی ہو کیا گھر میں نہ آئیں گے بابا

میں جاؤں وہاں رن میں جہاں ہیں شہِ عالم
اصغر کی طرح تیر نہ ماریں کہیں ظالم
بابا کو بس اب حشر کے دن پاؤ گی بی بی

ناموسِ نبی میں تو قیامت یہ تھی برپا
سر کھولے ہوئے بیٹھی تھی دخترِ زہرا
راوی نے یہ لکھا ہے کہ میں دیکھتا ہوں کیا
روتا ہوا اک طفلِ حسین خیمے سے نکلا
آنکھیں کہیں آہو کی بھی آنکھوں سے بڑی تھیں
منہ چاند سا تھا ہنسلیاں گردن میں پڑی تھیں

چہرے پہ بھلی لگتی تھی کیا زلفِ مسلسل
ظاہر تھا کہ گھیرے ہوئے ہے چاند کو بادل
تھا طوقِ گلو رشکِ ہلالِ شبِ اوّل
ہاتھوں میں کڑے کان میں دُر سینے پہ ہیکل
کُرتے کا عجب رنگ تھا اس گل سے بدن پر
معلوم یہ ہوتا تھا کہ شبنم ہے چمن پر

ماں ڈیوڑھی کے پردے کو اُٹھا کر یہ پکاری
میں بھی نکل آتی ہوں کہاں جاتے ہو واری
پھر آؤ کہ بے تاب ہوں میں روکی ماری
بیوہ ہوں کرو رحم غریبی پہ ہماری
کہنا مرا مانو نہ ارادہ کرو رن کا
میں واسطہ دیتی ہوں تمہیں روحِ حسن کا

وہ کہتا تھا اماں ہمیں قسمیں نہ دلاؤ
ہم گھر میں نہ آئیں گے تم خیمے میں جاؤ
قاسم کی طرح داغ ہمارا بھی اُٹھاؤ
ماں کہتی تھی اک بات تو سُن لو ادھر آؤ
لاکھوں میں کہاں جاتے ہو اس آن اکیلے
وہ کہتا تھا ہیں میرے چچا جان اکیلے

میداں میں چچا قتل ہوں ہم خیمے میں آئیں
جیتے رہیں بعد ان کے تو منہ کس کو دکھائیں
ہم سایے میں ہیں دھوپ میں وہ برچھیاں کھائیں
تیغوں میں نہ عمو کی سپر ہونے کو جائیں
بس صبر کرو قید ہوں کیا خیمے میں آ کے
فردوس میں اب جائیں گے ہمراہ چچا کے

چلاتی تھی رو رو کے یہ بیوہ جگر افگار
صدقے میں ارادے کے ترے اے مرے دلدار
کس طرح لڑو گے نہ سپر پاس نہ تلوار
پھر اتنا سن جنگ کے قابل نہیں زنہار
وہ کہتا تھا قربانِ شہنشاہِ اُمم ہیں
کیا ہم علی اصغر سے بھی کچھ عمر میں کم ہیں

دروازے پہ خیمے کے تڑپتی رہی مادر
جنگاہ میں جا پہنچا وہ لختِ دلِ شبّر
بند آنکھیں کئے جھومتے تھے سبطِ پیمبر
لپٹا پسرِ فاطمہ زہرا سے وہ دلبر
کہتا تھا کہ سب خوں سے بدن لال ہوا ہے
اے میرے چچا جان یہ کیا حال ہوا ہے

میں تھامے ہوں یا شاہ ذرا غش سے سنبھلیے
زخموں کا لہو چہرۂ انور پہ نہ ملیے
سب روتے ہیں اس وقت نہیں ہوش کسی کو
فرمانے لگے کھول کے آنکھیں شہِ ذی جاہ
ان تیغوں سے اے لال بچائے تمھیں اللہ
کٹتا ہے گلا تیغِ ستم سے کوئی دم میں
یہ کہتے تھے حضرت کہ بڑھا ایک جفاکار
ہاتھ اس نے سرِ شہ پہ سپر کر دیے اک بار
رہتی پہ وہ ننھے سے گرے ہاتھ جو کٹ کر
گودی میں اسے لے کے پکارے شہِ دلگیر
گودی میں تڑپتا تھا کہ گردن میں لگا تیر
لپٹا جو تڑپ کر وہ شہِ تشنہ گلو سے
منہ زرد ہوا جان نکلنے لگی تن سے
جس وقت سفر کر گیا ہستی کے چمن سے
فردوس سے زہرا بصد افغاں نکل آئی
بیٹھے تھے سوئے قبلہ دو زانو شہِ بے پر
تھے ذکرِ خدا میں کہ لگا تیر دہن پر
بہہ آیا لہو تا بہ زنخدانِ مبارک
نیزے کا ابنِ وہب نے پہلو پہ کیا وار
ناوک بنِ کاہل کا کلیجے کے ہوا پار
تلوار سے وقفہ نہ ملا چند نفس کا

کیوں آپ جھکے جاتے ہیں زانو کو دبائے
سر ننگے نکلتی ہیں پھوپھی خیمے میں چلیے
پیٹی ہیں پسینہ کہ غش آیا ہے چچی کو
کیوں گھر سے نکل آئے یہ کیا تم نے کیا آہ
لو خیمے میں اب جاؤ کہ عمو ہے سرِ راہ
گھر میں تمھیں لے چلنے کی طاقت نہیں ہم میں
چاہا کہ قریب آن کے حضرت پہ گرے اور
بچے کے کہاں ہاتھ کہاں ظلم کی تلوار
غش ہو گیا شبیر کی گردن سے لپٹ کر
صدقے ترے ان دونوں کٹے ہاتھوں کے شبیر
چلایا کہ قربان علیِ اصغرِ بے شیر
تر ہو گئیں سب ہنسلیاں گردن کی لہو سے
خوں ہچکیوں کے ساتھ اگلتا تھا دہن سے
رونے کی صدا آنے لگی قبرِ حسن سے
خیمے سے ادھر خاک بسر ماں نکل آئی
جھکتے تھے کبھی غش میں اٹھاتے تھے کبھی سر
یاقوت سے ڈوبے کے خوں میں لبِ اطہر
ٹھنڈے ہوئے دو گوہرِ دندانِ مبارک
کاندھے پہ چلی ساتھ زرارہ کی بھی تلوار
بازو میں در آیا تبرِ خولیِ خونخوار
دم رک گیا نیزہ جو لگا ابنِ انس کا

لکھا ہے کہ جب مر گیا لختِ دلِ شبّر
اک سیدہ نکلی درِ خیمے سے کھلے سر
چلاتے لعیں خوف سے ہاتھ آنکھوں پہ دھر کے

اس بھیڑ میں آکر وہ ضعیفہ یہ پکاری
گھوڑا تو ہے کوتل کدھر اتری ہے سواری
مرجاؤں گی حضرت کو جو پانے کی نہیں ہیں

اس وقت شہِ دیں نے سنی زاریِ خواہر
فرمایا اشارے سے کہ اے شمرِ ستمگر
آخر تو سفر ہوتا ہے اس دارِ محن سے

منہ پھیر لیا شمر نے خنجر کو ہٹا کے
تڑپاتی ہو بھائی کو بہن ہلوے میں آکے
اٹھ سکتے نہیں جسم پہ تلوار پڑی ہیں

دوڑی یہ صدا سن کے یداللہ کی جائی
پر ہائے بہن بھائی تلک آنے نہ پائی
قاتل کو نہ گردن کو نہ شمشیر کو دیکھا

سر دیکھ کے بھائی کا وہ بیکس یہ پکاری
خنجر سے یہ گردن کی رگیں کٹ گئیں ساری
آفت میں پھنسی آلِ رسولِ عربی کی

بھیّا مرا کوئی نہیں تم خوب ہو آگاہ
ڈھارس تھی بڑی آپ کی اے سرورِ ذیجاہ
چلتے ہوئے کچھ مجھ سے نہ فرما گئے بھائی

بارہ ستم ایجاد بڑھے کھینچ کے خنجر
مقنع تھا نہ برقع تھا نہ ہوتے تھے نہ چادر
لو فاطمہ آتی ہیں بچانے کو پسر کے

اے سبطِ نبی ابنِ علی عاشقِ باری
بھیّا بہن آئی ہے زیارت کو تمھاری
بے آپ کے دیکھے ہٹنے جانے کی نہیں ہیں

جس وقت کہ تھا حلقِ مبارک تہِ خنجر
زینب نکل آئی ہے ٹھہر جا ابھی دم بھر
دو باتیں تو کر لینے دے بھائی کو بہن سے

دی شہ نے یہ زینب کو صدا اشک بہا کے
دیکھو گی کسے ہم تو ہیں نیچے ہیں قضا کے
گھبراؤ نہ اماں مرے پہلو میں کھڑی ہیں

چلائی کہ دیدار تو میں دیکھ لوں بھائی
یاں ہو گئی سبط کے سر و تن میں جدائی
پہونچی تو سناں پر سرِ شبیر کو دیکھا

دکھ پائے بہن آپ کی مظلومی کے واری
تم مر گئے پوچھے گا خبر کون ہماری
اب جائیں کہاں بیٹیاں زہرا و علی کی

احمد ہیں نہ زہرا نہ حسن ہیں نہ یداللہ
چھوڑا مجھے جنگل میں یہ کیا قہر کیا آہ
بہنا کو نجف تک بھی نہ پہونچا گئے بھائی

ای میرے شہید ای مرے ماں جائے برادر
کس سے ترا لاشہ بہن اٹھوائے برادر

کس طرح مرے دل کو قرار آئے برادر
پانی بھی نہ قاتل نے دیا ہائے برادر

انساں پہ ستم یوں کبھی انسان نہیں کرتا
حیواں کو بھی پیاسا کوئی بیجان نہیں کرتا

خاموش انیس اب کہ ہی دل سینے میں بیچین
لکھے نہیں جاتے ہیں جو زینب نے کیے بین

اب حق سے دعا مانگ کہ ای خالق کونین
حاسد ہیں بہت دل کو عطا کر مرے تو چین

ناحق ہی عداوت انھیں اس ہیچداں سے
بے تیغ کٹے جاتے ہیں شمشیر زباں سے

رباعی

ایک ایک قدم لغزش مستانہ ہی
گلزار بہشت اپنا میخانہ ہی
سرمست ہیں حب ساقی کوثر سے
آنکھیں شیشے ہیں قلب پیمانہ ہی

رباعی

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہی
آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہی
نہ دوست کا جھگڑا ہی نہ دشمن کا فساد
مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہی

رباعی

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہی
ہنگام یخ و برف و تگرگ آیا ہی
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا
چلئے اب چوبدار مرگ آیا ہی

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے
مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اُٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمد کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا
گذری شبِ فراق دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام
یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام
لکھے خدا نماز گزاروں میں ان کا نام
سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اُٹھے
دُنیا سے جو شہید اُٹھے سرخرو اُٹھے

یہ سُن کے بستروں سے اُٹھے وہ خدا شناس
اک اک نے زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے ہراس
باندھے عمامے آئے امامِ زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ کمریں کسے ہوئے
مُشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رخوں پہ نور
خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض حق شناس اولو العزم ذی شعور
خوش فکر و بذلہ سنج و ہنرپرور و غیور
کانوں کو حسنِ صوت سے حظ بر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

ساونت بردبار فلک مرتبت دلیر
عالی منش سبا میں سلیماں وغا میں شیر
گُردانِ دہر اُن کی زبردستیوں سے زیر
فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر
دُنیا کو ہیچ و پوچ سراپا سمجھتے تھے
دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے تھے

تقریر میں وہ رمز و کنایے کہ لاجواب
گویا دہن کتاب بلاغت کا ایک باب
نکتہ کبھی منہ سے گر کوئی نکلا تو انتخاب
سوکھی زباں میں شہد فصاحت سے کامیاب
لبوں پہ شاعرانِ عرب تھے مرے ہوئے
پستے لبوں کے وہ کہ نمک سے بھرے ہوئے

لب پہ ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو
غلماں کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو
پیدا تنوں سے پیرہن یوسفی کی بو
پرہیزگار روزہ و ابرار و نیک خو
پتھر میں ایسے لال صدف میں گہر نہیں
حوروں کا قول تھا کہ ملک میں بشر نہیں

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب
پر تھی رخوں پہ خاکِ تیمم سے طرفہ آب
ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابوتراب
مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئنوں میں جلا اور ہو گئی

خیمے سے نکلے شہ کے عزیزان خوش خصال
قاسم سا گلبدن علی اکبر سا خوش جمال
جن میں کئی تھے حضرتِ خیر النسا کے لال
اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال
سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاری فلک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربانِ صنعتِ قلمِ آفریدگار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار
تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیع آشکار
ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار
عالم تھا محو قدرتِ ربِ عباد پر
مینا کیا تھا وادیِ مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا / درّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوشنوا / سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے / تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار / پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار / بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے / شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم / کوکو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سبحان ربّنا کی صدا تھی علی العموم / جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی مدح / ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار / اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیُّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار / تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیلِ کردگار
طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں / جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

کانٹوں میں اک طرف تھے ریاضِ نبی کے پھول / خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول
دنیا کی زیب زینتِ کاشانۂ بتول / وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے رسول
ماہِ عزا کے عشرۂ اول میں لٹ گیا / وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لٹ گیا

اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار / پھولے سماتے تھے نہ محمدؐ کے گلعذار
دولہا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلوں کا ہار / جاگے تھے ساری رات کے وہ نیند کا خمار
راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں / جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں کھل گئیں

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار رنگوں کی شان / گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسماں
نیچا ہو جس سے سپہر بنے جس کا سائباں / بیت العتیق دیں کا مدینہ جہاں کی جاں
اللہ کے حبیب کے پیارے اسی میں تھے / سب عرش کبریا کے ستارے اسی میں تھے

گردوں پہ ناز کرتی تھی اس دشت کی زمیں
کہتا تھا آسمانِ دہم چرخِ ہفتمیں
پردے تھے رشکِ پردۂ چشمانِ حورِ عیں
تاروں سے تھا فلک اسی خرمن کا خوشہ چیں
دیکھا جو نورِ شمسۂ کیواں جناب پر
کیا کیا ہنسی ہے صبحِ گلِ آفتاب پر

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں
تشریف جانماز پہ لائے شہِ زماں
سجادے بچھ گئے عقبِ شاہِ انس و جاں
صوتِ حسن سے اکبرِ مہرو نے دی اذاں
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسول کی کانوں میں آ گئی

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محو ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبرِ شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

ناموسِ شاہ روتے تھے خیمے میں زار زار
چپکی کھڑی تھی صحن میں بانوے نامدار
زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھی بار بار
صدقے نمازیوں کے مؤذن کے میں نثار
کرتے ہیں یوں ثنا صفتِ ذوالجلال کی
لوگو اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

یہ حسنِ صوت اور یہ قرأت یہ شدّ و مد
حقا کہ افصح الفصحا ہے انھیں کا جد
گویا ہے لحنِ حضرتِ داؤد با خرد
یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے
عین الکمال سے تجھے بچے خدا بچائے
وہ خوش بیاں کہ جس کی طلاقت دلوں کو بھائے
دو دو دن ایک بوند بھی پانی کی وہ نہ پائے
غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسین پر
فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نورِ عین پر

صف میں ہوا جو نعرۂ قد قامت الصلوٰۃ
قائم ہوئی نماز اٹھے شاہِ کائنات
وہ نور کی صفیں وہ مصلّی ملک صفات
قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہِ نجات
جلوہ تھا تا بہ عرشِ معلّیٰ حسین کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلّے حسین کا

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھے شہِ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقبِ شاہِ سرفراز
کرتی تھی خود نماز بھی ان کی ادا پہ ناز
صدقے سحر بیاض پہ ہیں اسطور کی
سب آیتیں تھیں مصحفِ ناطق کے نور کی

اُمیدِ مغفرت ہے خدائے علیم سے
غیر از کرم کچھ اور نہ ہوگا کریم سے
لیکن ڈگیں نہ پاؤں رہِ مستقیم سے
پہلے اشارہ ہے یہ الف لام میم سے
حبل المتین یہی ہے نجات ان کے ہاتھ ہے
قرآں کا اور آلِ محمدؐ کا ساتھ ہے

باہم مکبّروں کی صدائیں وہ دلپسند
کرّوبیانِ عرش تھے سب جن سے بہرہ مند
ایماں کا نور چہروں پہ تھا چاند سے دوچند
خوفِ خدا سے کانپتے تھے سب کے بند بند
خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں
سجدوں میں چاند تھے مہِ نو تھے رکوع میں

اک صف میں سب محمد و حیدر کے رشتہ دار
اٹھارہ نوجواں ہیں اگر کیجیے شمار
پر سب جگر فگار و حق آگاہ و خاکسار
پیرو امامِ پاک کے دانائے روزگار
تسبیح ہر طرف تہِ افلاک انھیں کی ہے
جس پر درود پڑھتے ہیں خاک انھیں کی ہے

دنیا سے اُٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود
ان کے لیے تھی بندگیِ واجب الوجود
وہ عجز وہ طویل رکوع اور وہ سجود
طاعت میں نیست جانتے تھے اپنی ہست و بود
طاقت نہ چلنے پھرنے کی تھی ہاتھ پاؤں میں
گر گر کے سجدے کرگئے تیغوں کی چھاؤں میں

ہاتھ ان کے جب قنوت میں اُٹھے سوئے خدا
خود ہوگئے فلک پہ اجابت کے باب وا
تھرائے آسمان ہلا عرشِ کبریا
شہپر تھے دونوں ہاتھ پئے طائرِ دعا
وہ خاکسار محوِ تضرع تھے فرش پر
روح القدس کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلۂ انام
آئے مصافحے کو جوانانِ تشنہ کام
چومے کسی نے دستِ شہنشاہِ خاص و عام
آنکھیں ملیں قدم پہ کسی نے باحترام
کیا دل تھے کیا سپاہِ رشید و سعید تھی
باہم معانقے تھے کہ مرنے کی عید تھی

سجدے میں شکر کے کوئی تھا مردِ باخدا
پڑھتا تھا کوئی حزن سے قرآں کوئی دعا
نعتِ نبی کہیں تھی کہیں حمدِ کبریا
مولا اُٹھا کے ہاتھ یہ کرتے تھے التجا
فاقوں پہ تشنہ کامی و غربت پہ رحم کر
یارب مسافروں کی جماعت پہ رحم کر

زاری تھی التجا تھی مناجات تھی ادھر
واں صف کشی و ظلم و تعدی و شور و شر
کہتا تھا ابنِ سعد یہ جا جا کے نہر پر
گھاٹوں سے ہوشیار ترائی سے باخبر
ڈو روز سے ہے تشنہ دہانی حسین کو
ہاں مرتے دم بھی دیجو نہ پانی حسین کو

بیٹھے تھے جانماز پہ شاہِ فلک سریر
ناگہ قریب آ کے گرے تین چار تیر
دیکھا ہر اک نے مڑ کے سوئے لشکرِ شریر
عباس اُٹھے تول کے شمشیرِ بے نظیر
پروانہ تھے سراجِ امامت کے نور پر
روکی سپر حضورِ کرامت ظہور پر

اکبر سے مڑ کے کہنے لگے سرورِ زماں
تم جا کے کہہ دو خیمے میں یہ اے پدر کی جاں
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ گراں
بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیر سے کوئی بچہ تلف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردنِ اصغر ہدف نہ ہو

کہتے تھے یہ پسر سے شہِ آسماں سریر
فضہ پکاری در سے کہ اے خلق کے امیر
ہے ہے علی کی بیٹیاں کس جا ہوں گوشہ گیر
اصغر کے گاہوارے تک آ کر گرے ہیں تیر
گرمی میں ساری رات تو گھٹ گھٹ کے روئے ہیں
بچے ابھی تو سرد ہوا پا کے سوئے ہیں

باقر کہیں پڑا ہے سکینہ کہیں ہے غش
گرمی کی فصل یہ تب و تاب اور یہ عطش
رو رو کے سو گئے ہیں صغیرانِ ماہوش
بچوں کو لے کے یاں سے کہاں جائیں فاقہ کش
یہ کس خطا پہ تیر پیاپے برستے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے واسطے بچے ترستے ہیں

اُٹھے یہ شور سن کے امامِ فلک وقار
ڈیوڑھی تک آئے ڈھالوں کو روکے رفیق و یار
فرمایا مڑ کے چلتے ہیں اب بہرِ کارزار
کرسی کسو جہاد پہ منگواؤ راہوار
دیکھو فضا بہشت کی دل باغ باغ ہو
اُمت کے کام سے کہیں جلدی فراغ ہو

فرما کے یہ حرم میں گئے شاہِ بحر و بر — ہونے لگیں صفوں میں کمر بندیاں ادھر
جوشن پہن کے حضرتِ عباسِ نامور — دروازے پر ٹہلنے لگے مثلِ شیرِ نر
پرتو سے رخ کے برق چمکتی تھی خاک پر — تلوار ہاتھ میں تھی سپر دوشِ پاک پر

شوکت میں رشکِ تاجِ سلیماں تھا خودِ سر — کلغی پہ لاکھ بار تصدق ہما کے پر
دستانے دونوں فتح کا مسکن ظفر کا گھر — وہ رعب الاماں وہ تہور کہ الحذر
جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آڑ ہو — پھر کس طرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ ہو

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال — چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینب کی یہ دعا ہے کہ اے ربِ ذوالجلال — بچ جائے اس فساد سے خیر النسا کا لال
بانوے نیک نام کی کھیتی ہری رہے — صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

آفت میں ہے مسافرِ صحرائے کربلا — بیکس پہ یہ چڑھائی ہے سیّد پہ یہ جفا
غربت میں ٹھن گئی جو لڑائی تو ہوگا کیا — ان ننھے ننھے بچوں پہ کر رحم اے خدا
فاقوں سے جاں بلب ہیں عطش سے ہلاک ہیں — یارب ترے رسول کی ہم آلِ پاک ہیں

سر پر ہیں اب علی نہ رسولِ فلک وقار — گھر لٹ گیا گزر گئیں خاتونِ روزگار
امّاں کے بعد روئی حسن کو میں سوگوار — دنیا میں اب حسین ہے ان سب کا یادگار
تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے — کچھ اس پہ بن گئی تو یہ مجمع تباہ ہے

بولے قریب جا کے شہِ آسماں جناب — مضطر نہ ہو دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب — خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہِ صواب
موقع بہن نہیں ابھی فریاد و آہ کا — لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

معراج میں رسول نے پہنا تھا جو لباس — کشتی میں لائیں زینب اسے شاہِ دیں کے پاس
سر پر رکھا عمامۂ سردارِ حق شناس — پہنی قبائے پاکِ رسولِ فلک اساس
بر میں درست و چست تھا جامہ رسول کا — رومال فاطمہ کا عمامہ رسول کا

شملے کے دو سرے جو پڑے تھے بصد وقار
ثابت یہ تھا کہ دوش پہ گیسو پڑے ہیں چار
بل کھا رہا تھا زلفِ سمن بو کا تار تار
جس کے ہر ایک مو پہ خطا و ختن نثار
مشک و عبیر و عود اگر ہیں تو ہیچ ہیں
سنبل کی اصل کیا ہے یہ گیسو کے پیچ ہیں

کپڑوں سے آرہی تھی رسولِ زمن کی بو
دولھا نے سونگھی ہوگی نہ ایسی دلھن کی بو
حیدر کی فاطمہ کی حسین و حسن کی بو
پھیلی ہوئی تھی چار طرف پنجتن کی بو
لنڈھتا تھا عطر وادیِ عنبر سرشت میں
گل جھومتے تھے باغ میں رضواں بہشت میں

پوشاک سب پہن چکے جس دم شہِ زمن
لیکر بلائیں بھائی کی رونے لگی بہن
چلائی ہائے آج نہیں حیدر و حسن
امّاں کہاں سے لائے تمھیں اب بے وطن
رخصت ہے اب رسول کے یوسف جمال کی
صدقے گئی بلائیں تو لو اپنے لال کی

صندوق اسلحہ کے جو کھلوائے شاہ نے
پٹیا منہ اپنا زینبِ عصمت پناہ نے
پہنی زرہ امامِ فلک بارگاہ نے
بازو پہ جوشنیں پڑھے عز و جاہ نے
جوہر بدن کے حسن سے سارے چمک گئے
حلقے تھے جتنے اتنے ستارے چمک گئے

یاد آگئے علی نظر آئی جو ذوالفقار
قبضے کو چوم کر شہِ دیں روئے زار زار
تولی جو لیکے ہاتھ میں شمشیر آبدار
شوکت نے دی صدا کہ تری شان کے نثار
فتح و ظفر قریب ہو نصرت قریب ہو
زیبا اس کی تجھ کو ضرب عدو کو نصیب ہو

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے
پھاڑا فلک پہ اپنا گریباں ہلال نے
دستانے پہنے سرورِ قدسی خصال نے
معراج پائی دوش پہ حمزہ کی ڈھال نے
رتبہ بلند تھا کہ سعادت نشان تھی
ساری سپر میں مہرِ نبوت کی شان تھی

ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص و عام
تیار ادھر ہوا علمِ سیدِ انام
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام
رونق تھی تھامے چوبِ علم خواہرِ امام
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیرِ علم آ کھڑے ہوئے

گرداتے دامنوں کو قبا کے وہ گلعذار
مرفق تک آستینوں کو اُلٹے بصد وقار
جعفر کا رعب دبدبۂ شبیرِ کردگار
بوٹا سے اُن کے قد پہ نمودار و نامدار
آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کے
رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے

گہ ماں کو دیکھتے تھے گہے جانبِ علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہِ اُمم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علیِ ولی کے نشان کا
امّاں کسے ملے گا علم نانا جان کا

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہِ خوش خصال
ہم بھی محق ہیں آپ کو اس کا رہے خیال
پاسِ ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال
اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں او جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں نام کے اُمیدوار ہیں

بے مثل تھے رسول کے لشکر کے سب جواں
لیکن ہمارے جد کو نبی نے دیا نشاں
خیبر میں دیکھتا رہا منہ لشکرِ گراں
پایا علم علی نے مگر وقتِ امتحاں
طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں کے ہم ہیں انھیں کے نواسے ہیں

زینب نے تب کہا کہ تمھیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو لوگے علم کا زباں سے نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سر کو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس
بس قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگوگے تم جو بُرا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قلیل اور ہوسِ منصبِ جلیل
اچھا علم کا لو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اُٹھے گا یہ علم
نکلیں تنوں سے سبطِ نبی کے قدم پہ دم
رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہو
پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخرِ روزگار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
کیا کچھ علم سے جعفرِ طیار کا تھا نام
بگڑی لڑائیوں میں بن آئے انھیں سے کام
بیجاں ہوئے تو نخلِ دعا نے ثمر دیئے
لشکر نے تین دن وہ ہزیمت اُٹھائی جب
مرحب کو قتل کرکے بڑھا جب وہ شیرِ رب
اکھڑا وہ یوں گراں تھا جو در سنگِ سخت سے
نرغے میں تین دن سے ہے مشکلکشا کا لال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال
غم خوار تم مرے ہو نہ عاشق امام کے
ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام
واللہ کیا مجال جو اب لیں علم کا نام
فوجیں بھگا کے گنجِ شہیداں میں سوئیں گے
بس کہہ کے یہ ہٹے جو سعادت نشاں پسر
دیتے ہو اپنے مرنے کی پیارو نہ مجھے خبر
کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بُری لگی

چھوٹے قدوں میں سب سے سنوں میں سبھوں سے کم
عہدہ یہی ہے بس یہی منصب یہی حشم
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہو
زیبا نہیں ہے وصفِ[1] اضافی پہ افتخار
دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کارزار
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں
یہ بھی تھی اک عطائے رسولِ فلک مقام
جب کھینچتے تھے تیغ تو ہلتا تھا روم و شام
ہاتھوں کے بدلے حق نے جو اہر کے پر دیئے
بخشا علم رسولِ خدا نے علی کو تب
در بند کرکے قلعہ کا بھاگی سپاہ سب
جس طرح توڑ لے کوئی پتّا درخت سے
اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
میں لٹ رہی ہوں اور تمھیں منصب کا ہے خیال
معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے
غصّے کو آپ تھام لیں اے خواہرِ امام
کھل جائے گا لڑیں گے جو یہ باوفا غلام
تب قدر ہوگی آپ کو جب ہم نہ ہوئیں گے
چھاتی بھر آئی ماں نے کہا تھام کر جگر
ٹھہرو ذرا بلائیں تو لے لے یہ نوحہ گر
بچو یہ کیا کہا کہ جگر پر چھری لگی

[1] وصفِ اضافی وہ ہے کہ جو بات بذاتِ خود نہ ہو بلکہ دوسرے کی وجہ سے اُس کی تعریف کی جائے۔

زینب کے پاس آ کے یہ بولے شہِ زمن
کیوں تم نے دونوں بیٹوں کی باتیں سنیں بہن
شبیروں کے شیر عاقل و جرار و صف شکن
زینب وحیدِ عصر ہیں دونوں یہ گل بدن
یوں دیکھنے کو سب ہیں بزرگوں کے طور ہیں
تیور ہی ان کے اور ارادے ہی اور ہیں

نو دس برس کے سن میں یہ جرأت یہ ولولے
بچے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی من چلے
اقبال کیونکر ان کے نہ قدموں سے منہ ملے
کس گود میں بڑے ہوئے کس دودھ کے پلے
بے شک یہ ورثہ دار جنابِ امیر ہیں
پر کیا کہوں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

بس جس کو تم کہو اسے دیں فوج کا علم
کی عرض جو صلاح شہِ آسماں حشم
فرمایا جب سے اٹھ گئیں زہرائے باکرم
اس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم
مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خرد ہو
جس کو کہو اسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

بولیں بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام
ہے کس طرف توجہ سردارِ خاص و عام
گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام
قرآں کے بعد ہو تو علی ہی کا کچھ کلام
شوکت میں قد میں شان میں ہمسر کوئی نہیں
عباسِ نامدار سے بہتر کوئی نہیں

عاشق۔ غلام۔ خادمِ دیرینہ۔ جاں نثار
فرزند۔ بھائی۔ زینتِ پہلو۔ وفا شعار
جرار۔ یادگارِ پدر۔ فخرِ روزگار
راحت رساں مطیع و نمودار و نامدار
صفدر ہے شیر دل ہے بہادر ہے نیک ہے
بے مثل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن
ہاں تھی یہی علی کی وصیت بھی اے بہن
اچھا بلائیں آپ کدھر ہے وہ صف شکن
اکبر چچا کے پاس گئے سن کے یہ سخن
کی عرض انتظار ہے شاہِ غیور کو
چلیے پھوپھی نے یاد کیا ہے حضور کو

عباس آئے ہاتھوں کو جوڑے حضورِ شاہ
جاؤ بہن کے پاس یہ بولا وہ دیں پناہ
زینب وہیں علم لیے آئیں بہ عز و جاہ
بولے نشاں کو لے کے شہِ عرش بارگاہ
ان کی خوشی وہ ہے جو رضا پنجتن کی ہے
لو بھائی لو علم یہ عنایت بہن کی ہے

رکھ کر علم پہ ہاتھ جھکا وہ فلک وقار
ہمشیر کے قدم پہ ملامت یہ افتخار
زینب بلائیں لیکے یہ بولیں کہ میں نثار
عباس فاطمہ کی کمائی سے ہوشیار
ہو جائے آج صلح کی صورت تو کل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لیکر نکل چلو

کی عرض میرے جسم پہ جس وقت تک ہے سر
ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوجِ بد گہر
تیغیں کھنچیں جو لاکھ تو سینہ کروں سپر
دیکھیں اٹھا کے آنکھ یہ کیا تاب کیا جگر
ساونت ہیں پسر اسدِ ذو الجلال کے
گر شیر ہو تو پھینک دیں آنکھیں نکال کے

منہ کر کے سوئے قبرِ علی پھر کیا خطاب
ذرے کو آج کر دیا مولا نے آفتاب
یہ عرض خاکسار کی ہے بس یا ابو تراب
آقا کے آگے میں ہوں شہادت سے کامیاب
سر تن سے ابنِ فاطمہ کے روبرو گرے
شبیر کے پسینے پہ میرا لہو گرے

یہ سن کے آئی زوجۂ عباسِ نامور
شوہر کی سمت پہلے کنکھیوں سے کی نظر
لیں سبطِ مصطفےٰ کی بلائیں بچشمِ تر
زینب کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا
عزت بڑھی کنیز کی رتبہ غلام کا

سر کو لگا کے چھاتی سے زینب نے یہ کہا
تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا
کی عرض مجھ سی لاکھ کنیزیں ہوں تو فدا
بانوئے نامور کو سہاگن رکھے خدا
بچے جئیں ترقیِ اقبال و جاہ ہو
سایہ میں آپ کے علی اکبر کا بیاہ ہو

قسمت وطن میں خیر سے پھر شہ کو لیکے جائے
یثرب میں شور ہو کہ سفر سے حسین آئے
ام البنین جاہ و حشم سے پسر کو پائے
جلدی شبِ عروسیِ اکبر خدا دکھائے
مہندی تمھارا لال لے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلھن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

ناگاہ آکے بالی سکینہ نے یہ کہا
کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا
عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا
لوگو مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا
شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی

عباس مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ
عمو نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ
بولی لپٹ کے وہ کہ مری مشک لینے جاؤ
اب تو علم ملا تمھیں پانی مجھے پلاؤ
تحفہ کوئی نہ دیجیے نہ انعام دیجیے
قربان جاؤں پانی کا اک جام دیجیے

باتوں پہ اس کی روتی تھیں سیدانیاں تمام
کی عرض آکے ابنِ حسن نے کہ یا امام
انبوہ ہے بڑھی چلی آتی ہے فوجِ شام
فرمایا آپ نے کہ نہیں فکر کا مقام
عباس اب علم لیے باہر نکلتے ہیں
ٹھہرو بہن سے مل کے گلے ہم بھی چلتے ہیں

ڈیوڑھی پہ شادمانِ محل کی ہوئی پکار
آتے ہیں اب حضور خبردار ہوشیار
خلعت پہن رہے ہیں علمدارِ نامدار
نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا

ناگہ بڑھے علم لیے عباسِ باوفا
دوڑے سب اہلِ بیت کھلے سر برہنہ پا
حضرت نے ہاتھ اٹھا کے یہ اک ایک سے کہا
لو الوداع اے حرمِ پاکِ مصطفےٰ
صبحِ شبِ فراق ہے پیاروں کو دیکھ لو
سب مل کے ڈوبتے ہوئے تاروں کو دیکھ لو

شہ کے قدم پہ زینبِ زار و حزیں گری
بانو پچھاڑیں کھا کے پسر کے قریں گری
کلثوم تھرتھرا کے بروئے زمیں گری
باقر کہیں گرا تو سکینہ کہیں گری
اجڑا چمن ہر اک گلِ تازہ نکل گیا
نکلا علم کہ گھر سے جنازہ نکل گیا

دیکھی جو شانِ حضرتِ عباسِ عرش جاہ
آگے بڑھی علم کے پس زینبِ سیاہ
نکلا حرم سرا سے دو عالم کا بادشاہ
منتشر بدل تھی بنتِ علی کی فغان و آہ
رہ رہ کے اشک بہتے تھے رخِ جناب سے
شبنم ٹپک رہی تھی گلِ آفتاب سے

مولا چڑھے فرس پہ محمدؐ کی شان سے
ترکش لگا یا ہر نے پہ کس آن بان سے
نکلا یہ جن و انس و ملک کی زبان سے
اترا ہے پھر زمیں پہ براق آسمان سے
سارا چلن خرام میں کبکِ دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دلہن کا ہے چہرہ پری کا ہے

غصے میں انکھڑیوں کے ابلنے کو دیکھیے
جوبن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
گردن میں ڈالیں ہاتھ یہ پریوں کو شوق ہے
بالا دوی میں اس کو ہما پر بھی فوق ہے

تھم کر ہوا جلی فرس خوش قدم بڑھا
جوں جوں وہ سوئے دشت بڑھا اور دم بڑھا
گھوڑوں کی لیں سواروں نے باگیں علم بڑھا
رایت بڑھا کہ سرو ریاض ارم بڑھا
پھولوں کو لیکے باد بہاری پہونچ گئی
بستان کربلا میں سواری پہونچ گئی

پنجہ ادھر چمکتا تھا اور آفتاب ادھر
اس کی ضیا تھی خاک پہ ضو اس کی عرش پر
زرریزی علم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
دولھا کا رخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر
تھے دو طرف جو دو علم اس ارتفاع کے
الجھے ہوئے تھے تار خطوط شعاع کے

اللہ ری سپاہ خدا کی شکوہ و شاں
جھکنے لگے جنود ضلالت کے بھی نشاں
کمریں کسے علم کے تلے ہاشمی جواں
دنیا کی زیب دین کی عزت جہاں کی جاں
ایک ایک دودمان علی کا چراغ تھا
جس کو بہشت پر تھا تفوق وہ باغ تھا

لڑکے وہ سات آٹھ ہی قد سمن عذار
گیسو کسی کے چہرے پہ دو اور کسی کے چار
حیدر کا رعب نرگسی آنکھوں سے آشکار
کھیلیں جو پنجوں سے کریں شیر کا شکار
تیروں کی سمت چاند سے سینے تنے ہوئے
آئے تھے عیدگاہ میں دولھا بنے ہوئے

غرفوں سے حوریں دیکھ کے کرتی تھیں یہ کلام
دنیا کا باغ بھی ہے عجب پر فضا مقام
دیکھو درود پڑھ کے سوئے لشکر امام
ہمشکل مصطفےٰ ہے یہی عرش احتشام
رایت لیے وہ لال خدا کے ولی کا ہے
اب تک جہاں میں ساتھ نبی و علی کا ہے

دنیا سے اٹھ گئے تھے جو پیغمبر زماں
ہم جانتے تھے حسن سے خالی ہے سب جہاں
کیونکر سوئے زمیں نہ جھکے پیر آسماں
پیدا کیا ہے حق نے عجب حسن کا جواں
سب خوبیوں کا خاتمہ بس ان حسیں پہ ہے
محبوب حق ہیں عرش پہ سایہ زمیں پہ ہے

ناگاہ تیر اُدھر سے چلے جانبِ امام | گھوڑا بڑھا کے آپ نے حجت بھی کی تمام
نکلے ادھر سے شہ کے رفیقانِ تشنہ کام | بے سر تھے پروں میں سرانِ سپاہ شام
بالا کبھی تھی تیغ کبھی زیرِ تنگ تھی | اک اک کی جنگ مالکِ اشتر کی جنگ تھی

نکلے پئے جہاد عزیزانِ شاہِ دیں | نعرے کیے کہ خوف سے ہلنے لگی زمیں
روباہ کی صفوں پہ چلے شیرِ خشمگیں | کھینچی جو تیغ بھول گئے صف کشی لعیں
بجلی گری پروں پہ شمال و جنوب کے | کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل میں ڈوب کے

اللہ رے علی کے نواسوں کی کارزار | دونوں کے نیچے تھے کہ چلتی تھی ذوالفقار
شانہ کٹا کسی نے جو روکا سپر پہ وار | گنتی تھی زخمیوں کی نہ کشتوں کا کچھ شمار
اتنے سوار قتل کیے تھوڑی دیر میں | دونوں کے گھوڑے چھپ گئے لاشوں کے ڈھیر میں

وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ وہ گوری کلائیاں | آفت کی پھرتیاں تھیں غضب کی صفائیاں
ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں | فوجوں میں تھیں نبی و علی کی دہائیاں
شوکت ہُوہُو تھی جنابِ امیر کی | طاقت دکھا دی شیروں نے زینب کے شیر کی

کس حسن سے حسن کا جوانِ حسیں لڑا | گھر گھر کے صورتِ اسدِ خشمگیں لڑا
دو دن کی بھوک پیاس میں وہ مہ جبیں لڑا | سہرا الٹ کے یوں کوئی دولہا نہیں لڑا
حملے دکھا دیے اسدِ کردگار کے | مقتل میں سوئے ازرقِ شامی کو مار کے

چمکی جو تیغ حضرتِ عباسِ عرش جاہ | روح الامیں پکارے کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں میں چھپ گیا پسرِ سعد روسیاہ | کشتوں سے بند ہو گئی امن و اماں کی راہ
جھپٹا جو شیر شوق میں دریا کی سیر کے | لے لی ترائی تیغوں کی موجوں میں پیر کے

بے سر ہوئے موکل سرچشمۂ فرات | بل چل میں مثلِ موج صفوں کو نہ تھا ثبات
دریا میں گر کے ڈوب گئے کتنے بدصفات | گویا حباب ہو گئے تھے نقطۂ حیات
عباس بھر کے مشک کو یوں تشنہ لب لڑے | جس طرح نہروال میں امیرِ عرب لڑے

آفت تھی حرب و ضربِ علی اکبرِ دلیر — غصے میں جھپٹے صید پہ جیسے گرسنہ شیر
سب سربلند پست زبردست تھے زیر — جنگل میں چار سمت تھے زخمیوں کے ڈھیر
سر اُن کے اُترے تن سے جو تھے رن چڑھے ہوئے — عباس سے بھی جنگ میں کچھ تھے بڑھے ہوئے

تلواریں برسیں صبح سے نصف النہار تک — ہلتی رہی زمین لرزتے رہے فلک
کانپا کیے پروں کو سمیٹے ہوئے ملک — نعرے نہ پھر وہ تھے نہ وہ تیغوں کی تھی چمک
ڈھالوں کا دَور برچھیوں کا اوج ہو گیا — ہنگامِ ظہر خاتمۂ فوج ہو گیا

لاشے سبھوں کے سبطِ نبی خود اُٹھا کے لائے — قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے — فرماتے تھے بچھڑ گئے سب ہم سے ہائے ہائے
اتنے پہاڑ گر پڑیں جس پر وہ خم نہ ہو — گر سو برس جیوں تو یہ مجمع بہم نہ ہو

لاشے تو سب کے گرد تھے اور بیچ میں امام — ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبی کی قبا تمام
افسردہ و حزین و پریشان و تشنہ کام — برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام
اعدا کسی شہید کا جب نام لیتے تھے — تھرّا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے

پوچھو اسی سے جس کے جگر پر ہوں اتنے داغ — اک عمر کا ریاض تھا جس پر لُٹا وہ باغ
فرصت نہ اب بکا سے نہ ماتم سے الفراغ — جو گھر کی روشنی تھے وہ گل ہو گئے چراغ
پڑتی تھی دھوپ سب کے تنِ پاش پاش پر — چادر بھی اک نہ تھی علی اکبر کی لاش پر

مقتل سے آئے خیمہ کے در پر شہِ زمن — پر شدتِ عطش سے نہ تھی طاقتِ سخن
پردے پہ ہاتھ رکھ کے پکارے بصد محن — اصغر کو گاہوارے سے لے آؤ ای بہن
پھر ایک بار اس مہِ انور کو دیکھ لیں — اکبر کے شیر خوار برادر کو دیکھ لیں

خیمے سے دوڑی آلِ پیمبر برہنہ سر — اصغر کو لائیں ہاتھوں پہ بانوئے نوحہ گر
بچے کو لے کے بیٹھ گئے آپ خاک پر — مُنہ سے ملے جو ہونٹ تو چونکا وہ سیمبر
غم کی چھری چلی جگرِ چاک چاک پر — بٹھلا لیا حسین نے زانوئے پاک پر

بچے سے ملتفت تھے شہِ آسماں سریر
تھا اس طرف کمیں میں بنِ کاہلِ شریر
مارا جو تین پھال کا اُس بے حیا نے تیر
بس دفعتاً نشانہ ہوئی گردنِ صغیر
تڑپا جو شیر خوار تو حضرت نے آہ کی
معصوم ذبح ہو گیا گودی میں شاہ کی

جس دم تڑپ کے مر گیا وہ طفلِ شیر خوار
چھوٹی سی قبر تیغ سے کھودی بحالِ زار
بچے کو دفن کرکے پکارا وہ ذی وقار
اے خاکِ پاک حرمتِ مہماں نگاہ دار
دامن میں رکھ لے اسے جو محبت علی کی ہے
دولت ہے فاطمہ کی امانت نبی کی ہے

پہلے پہل چھٹا ہے یہ ماں کی کنار سے
واقف نہیں ہے قبر کی شبہائے تار سے
اے قبر ہوشیار مرے گلعذار سے
گردن چھدی ہوئی ہے بچانا فشار سے
سیدؔ ہے لال حضرتِ خیر النسا کا ہے
معصوم ہے شہید ہے بندہ خدا کا ہے

یہ کہہ کے آئے فوج پہ تولے ہوئے حسام
آنکھیں لہو تھیں رونے سے چہرہ تھا سرخ فام
زیبِ بدن کیے تھے بصد عز و احتشام
پیراہنِ مطہرِ پیغمبرِ انام
حمزہ کی ڈھال تیغ شہِ لافتا کی تھی
بر میں زرہ جنابِ رسولِ خدا کی تھی

رستم تھا درع پوش کہ پاکھر میں راہوار
جرار بردبار سبک رو وفا شعار
کیا خوشنما تھا زینِ طلاکار و نقرہ کار
اکسیر تھا قدم کا جسے مل گیا غبار
خوش خو تھا خانہ زاد تھا دُلدل نژاد تھا
شبیر بھی سخی تھے فرس بھی جواد تھا

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لوں کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولتا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں سے چارپائے نہ اُٹھتے تھے تا بہ شام / مسکن میں مچھلیوں کے سمندر[1] کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام / پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثلِ مومِ خام
سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے / پانی کنووں میں اُترا تھا سلسلے کی چاہ سے

آبِ رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور / جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر اُدھر
مردم[2] تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر / خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں / پڑجائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار / ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گُل نہ لہکتا تھا سبزہ زار / کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے / پتّے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے / آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے / گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر / بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں / انگارہ تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں / تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی / ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب / چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب / کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر[3] میں / بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ اُمم / نے دامنِ رسول تھا نے سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اُٹھتے تھے دم بدم / اودے تھے لب زبان میں کانٹے کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو / ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

[1] سمندر ایک جانور ہے جو آگ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ کھاتا ہے۔ مگر اس روز بسببِ شدّتِ حرارت اس کو بھی پانی کی تلاش تھی ۱۲
[2] یہاں آنکھ کی پتلی سے مراد ہے سات پردہ چشم کے اندر ہے ۱۲
[3] اثیر یعنی بلند

گھوڑوں کو اپنے کرتے تھے سیراب سب سوار
پیتے تھے آبِ نہر پرند آکے بے شمار
آتے تھے اونٹ گھاٹ پہ باندھے ہوئے قطار
سقّے زمیں پہ کرتے تھے چھڑکاؤ بار بار
پانی کا دام ودو کو پلانا ثواب تھا
اک ابنِ فاطمہ کے لیئے قحطِ آب تھا

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر
کرتے تھے آب پاش مکرّر زمیں کو تر
خادم کئی تھے مروحہ جنباں اِدھر اُدھر
فرزندِ فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر
وہ دھوپ دشت کی وہ جلال آفتاب کا
سونلا گیا تھا رنگِ مبارک جناب کا

کہتا تھا ابنِ سعد کہ اے آسماں جناب
فرماتے تھے حسین کہ او خانماں خراب
بیعت جو کیجیے اب بھی تو حاضر ہو جامِ آب
دریا کو خاک جانتے ہیں ابنِ بوتراب
فاسق ہے پاس کچھ تجھے اسلام کا نہیں
آبِ بقا ہو یہ تو مرے کام کا نہیں

کہدوں تو خوان لیکے خود آئیں ابھی خلیل
کیا جام آب کا تو مجھے دے گا او ذلیل
چاہوں تو سلسبیل کو دم میں کروں سبیل
بے آبرو خسیس ستمگر دنی بخیل
جس پھول پر پڑے ترا سایہ وہ بو نہ دے
کھلوائے فصد تو تو کبھی رگ لہو نہ دے

گر جم کا نام لوں تو ابھی جام لیکے آئے
روح الامیں زمیں پہ مرا نام لیکے آئے
کوثر یہیں رسول کے احکام لیکے آئے
لشکر ملک کا فتح کا پیغام لیکے آئے
چاہوں جو انقلاب تو دُنیا تمام ہو
اُلٹے زمین یوں کہ نہ کوفہ نہ شام ہو

فرماکے یہ نگاہ جو کی سوئے ذوالفقار
مظلوم پر صفوں سے چلے تیر بے شمار
تھرّا کے پچھلے پاؤں ہٹا وہ ستم شعار
آواز کوسِ حرب ہوئی آسماں کے پار
نیزے اُٹھا کے جنگ پہ اسوار تُل گئے
کالے نشان فوجِ سیہ رو کے کھُل گئے

وہ دھوم طبلِ جنگ کی وہ بوق کا خروش
تھرّائی یوں زمیں کہ اُڑے آسماں کے ہوش
کر ہو گئے تھے شور سے کرّوبیاں کے گوش
نیزے ہلاکے نکلے سوارانِ درع پوش
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سوارانِ شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

جب ان میں تیغ تول کے سلطانِ دیں بڑھے
گیتی کے تھامنے کو روح الامیں بڑھے
مانندِ شیرِ نر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے
گویا علی اُلٹتے ہوئے آستیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروسِ مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا رگِ جاں سے لہو جدا
گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

آئے حسین یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح
تابندہ برق سوئے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح
یوں تیغ تیز کوند گئی اس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

گرمی میں برقِ تیغ جو چمکی شرر اُڑے
جھونکا چلا ہوا کا جو سن سے تو سر اُڑے
پرکالہ سپر جو ادھر اور اُدھر اُڑے
روح الامیں نے صاف یہ جانا کہ پر اُڑے
ظاہر نشانِ اسمِ عزیمت اثر ہوئے
جن پر علی لکھا تھا وہی پر سپر ہوئے

جس پر چلی وہ تیغ دوپارا کیا اسے
کھنچتے ہی چار ٹکڑے دوبارا کیا اسے
واں تھی جدھر اجل نے اشارا کیا اسے
سختی بھی کچھ پڑی تو گوارا کیا اسے
نے زیں تھا نہ فرس تھا نہ اسوار زین پر
کڑیاں زرہ کی بکھری ہوئی تھیں زمین پر

آئی چمک کے غول پہ جب سر گرا گئی
دم میں جمی صفوں کو برابر گرا گئی
ایک ایک قصرِ تن کو زمیں پر گرا گئی
سیل آئی زور شور سے جب گھر گرا گئی
آپہونچا اس کے گھاٹ پہ جو مر کے رہ گیا
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہہ گیا

اس آب پہ یہ شعلہ فشانی خدا کی شان
پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان
خاموش اور تیز زبانی خدا کی شان
استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
لہرا کے جب اُتر گیا دریا چڑھا ہوا
نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی بڑھا ہوا

قلب و جناح میمنہ و میسرہ تباہ
گردن کشانِ اُمّت خیر الوریٰ تباہ
جنباں زمیں صفیں تہ و بالا پرا تباہ
بے جان جسم روح مسافر بسرا تباہ
بازار بند ہو گئے جھنڈے اُکھڑ گئے
فوجیں ہوئیں تباہ محلّے اُجڑ گئے

اللہ ری تیزی و برش اس شعلہ رنگ کی
چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی
پیاسی فقط لہو کی طلبگار جنگ کی
حاجت نہ سان کی تھی اسے اور نہ سنگ کی
خوں سے فلک کو لاشوں سے مقتل کو بھرتی تھی
سو بار رو میں چرخ پہ چڑھتی اُترتی تھی

تیغ خزاں تھی گلشنِ ہستی سے کیا اسے
گھر جس کا خود اُجڑ گیا بستی سے کیا اسے
وہ حق نما تھی کفر پرستی سے کیا اسے
جو آپ سربلند ہو پستی سے کیا اسے
کہتے ہیں راستی جسے وہ خم کے ساتھ ہے
تیزی زباں کے ساتھ برش دم کے ساتھ ہے

سینے پہ چل گئی تو کلیجہ لہو ہوا
گویا جگر میں موت کا ناخن فرو ہوا
چمکی تو الاماں کا غل چار سو ہوا
جو اس کے مُنہ پہ آ گیا بے آبرو ہوا
رُکتا تھا ایک وار نہ دس سے نہ پانچ سے
چہرے سیاہ ہو گئے تھے اُس کی آنچ سے

بجھ بجھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی
چمکی تو اس طرف اُدھر آئی وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی
اس نے کہا وہاں وہ پکارا یہاں چلی
مُنہ کس طرف ہے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی
سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوئے تھے جاں سے ہاتھ
گردن سے سر الگ تھا جدا تھے نشاں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ
جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہ تھے منہ چھپانے کو
ہاں پاؤں رہ گئے تھے فقط بھاگ جانے کو

اللہ رے خوف تیغ شہِ کائنات کا
زہرہ تھا آب خوف کے مارے فرات کا
دریا میں حال یہ تھا ہر اک بدصفات کا
چارہ فرار کا تھا نہ یارا ثبات کا
غل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
تھا گو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر
منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن اُدھر اُدھر
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر
تھے تہ نشیں نہنگ مگر آب تھے جگر
دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

آیا خدا کا قہر جدھر سن سے آگئی
کانوں میں الاماں کی صدا رن سے آگئی
دو کر کے خود زین پہ جوشن سے آگئی
کھنچتی ہوئی زمین پہ توسن سے آگئی
بجلی گری جو خاک پہ تیغ جناب کی
آئی صدا زمین سے یا بوتراب کی

پس پس کے کشمکش سے کماندار مر گئے
چلّے تو سب چڑھے رہے بازو اُتر گئے
گوشے کٹے کمانوں کے تیروں کے پر گئے
مقتل میں ہو سکا نہ گزارا گزر گئے
وحشت سے ہوش اُڑ گئے تھے مکر و ہم کے
سوفار کھول دیتے تھے منہ سہم سہم کے

تیر افگنی کا جن کی ہر اک شہر میں تھا شور
گوشہ کہیں نہ ملتا تھا ان کو سوائے گور
تاریک شب میں جن کا نشانا نہ تھا ہلے مور
لشکر میں خوفِ جاں نے انھیں کر دیا تھا کور
ہوش اُڑ گئے تھے فوجِ ضلالت نشان کے
پیکاں میں زہ کو رکھتے تھے سوفار جان کے

صف پر صفیں پروں پہ پرے پیش و پس گرے
اسوار پہ سوار فرس پر فرس گرے
اُٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
مخبر پہ پیک پیک پہ مرکہ عسس گرے
ٹوٹے پرے شکست بنائے ستم ہوئی
دنیا میں اس طرح کی بھی اُفتاد کم ہوئی

غصّے تھا شیرِ شرزۂ صحرائے کربلا
چھوڑے تھا گرگ منزل و ماوائے کربلا
تیغِ علی تھی معرکہ آرائے کربلا
خالی نہ تھی سروں سے کہیں جائے کربلا
بستی بسی تھی مُردوں کی ویرانے اُجاڑ تھے
لاشوں کی تھی زمین سروں کے پہاڑ تھے

غازی نے رکھ لیا تھا جو شمشیر کے تلے
تھی طرفہ کشمکش فلکِ پیر کے تلے
چلّے سمٹ کے جاتے تھے زہ گیر کے تلے
چھپتی تھی سر جھکائے کماں تیر کے تلے
اس تیغِ بے دریغ کا جلوہ کہاں نہ تھا
سہمے تھے سب پہ گوشۂ امن و اماں نہ تھا

چاروں طرف کمانِ کیانی کی وہ ترنگ
رہ رہ کے ابرِ شام سے تھی بارشِ خدنگ
وہ شور و صیحۂ فرسِ ابلق و سرنگ
وہ لون وہ آفتاب کی تابندگی وہ جنگ
پھنکتا تھا دشتِ کین کوئی دل تھا نہ چین سے
اس دن کی تاب و تب کوئی پوچھے حسین سے

سقّے پکارتے تھے یہ مشکیں لیے اُدھر
بازارِ جنگ گرم ہے ڈھلتی ہے دوپہر
پیاسا جو ہو وہ پانی سے ٹھنڈا کرے جگر
مشکوں پہ دوڑ دوڑ کے گرتے تھے اہلِ شر
کیا آگ لگ گئی تھی جہانِ خراب کو
پیتے تھے سب حسین ترستے تھے آب کو

گرمی میں پیاس تھی کہ پھنکا جاتا تھا جگر
اُف اُف کبھی کہا کبھی چہرے پہ لی سپر
آنکھوں میں ٹپیں اُٹھی جو پڑی دھوپ پر نظر
جھپٹے کبھی ادھر کبھی حملہ کیا اُدھر
کثرت عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر
موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر

سیراب چھپتے پھرتے تھے پیاسے کی جنگ سے
چلتی تھی ایک تیغ علی لاکھ رنگ سے
چمکی جو فرق پر تو نکل آئی تنگ سے
رُکتی تھی نہ سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے
خالق نے منہ دیا تھا عجب آب و تاب کا
خود اس کے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

سہمے ہوئے تھے یوں کہ کسی کو نہ تھی خبر
پیکاں کدھر ہے تیر کا سوفار ہے کدھر
مردم کی کش مکش سے کمانوں کو تھا یہ ڈر
گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں زمیں پر جھکا کے سر
ترکش سے کھینچے تیر کوئی یہ جگر نہ تھا
جس نے کہ سر پہ ہاتھ رکھا تن پہ سر نہ تھا

گھوڑے کی وہ تڑپ وہ چمک تیغ تیز کی
سو سو صفیں کچل گئیں جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی
آری جو ہو گئیں تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے منہ پھرا لیے تھے کارزار سے

اللہ رے لڑائی میں شوکت جناب کی
سونلائے رنگ میں تھی ضیا آفتاب کی
سوکھے تھے لب کہ پنکھڑیاں تھیں گلاب کی
تصویر ذوالجناح پہ تھی بوتراب کی
ہوتا تھا غل جو کرتے تھے نعرے لڑائی میں
تھا گو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسین کی
اللہ کا غضب ہے لڑائی حسین کی
دریا حسین کا ہے ترائی حسین کی
دنیا حسین کی ہے خدائی حسین کی
بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوح کا
اب رحم واسطہ علی اکبر کی روح کا

اکبر کا نام سن کے جگر پر لگی سناں
آنسو بھر آئے روک لی رہوار کی عناں
مڑ کر پکارے لاش پسر کو شہ زماں
تم نے نہ دیکھی جنگ پدر اے پدر کی جاں
قسمیں تمھاری روح کی یہ لوگ دیتے ہیں
لو اب تو ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں

چلایا ہاتھ مار کے زانو پہ ابن سعد
اے وا فضیحتا یہ ہزیمت ظفر کے بعد
زیبا دلاوروں کو نہیں ہے خلاف وعد
اک پہلواں یہ سنتے ہی گرجا مثال رعد
نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امام پر
اے ابن سعد لکھ لے ظفر میرے نام پر

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر
ناوک پیام مرگ کے ترکش اجل کا گھر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

ساتھ اس کے اور ہی قد و قامت کا ایک یل
آنکھیں کبود رنگ سیہ ابروؤں پہ بل
بدکار و بدشعار و ستمگار و پر دغل
جنگ آزما بھگائے ہوئے لشکروں کے دل
بھالے لیئے کسے ہوئے کمریں ستیز پر
نازاں وہ خوب گرز پہ یہ تیغ تیز پر

کھنچ جائے شکل حرب وہ تدبیر چاہیئے
دشمن بھی سب مقر ہوں وہ تقریر چاہیئے
تیزی زباں میں صورت شمشیر چاہیئے
فولاد کا قلم دم تحریر چاہیئے
نقشہ کھنچے گا صاف صف کارزار کا
پانی دوات چاہتی ہے ذوالفقار کا

لشکر میں اضطراب تھا فوجوں میں کھلبلی
ساونت بے حواس ہراساں دھنی بلی
ڈر تھا کہ لو حسین بڑھے تیغ اب چلی
غل تھا ادھر ہیں مرحب و عنتر ادھر علی
کون آج سربلند ہو اور کون پست ہو
کس کی ظفر ہو دیکھیے کس کی شکست ہو

آواز دی یہ ہاتفِ غیبی نے تب کہ ہاں
بسم اللہ اے امیرِ عرب کے سرورِ جاں
اٹھی علی کی تیغِ دو دم چاٹ کر زباں
بیٹھے درست ہو کے فرس پر شہِ زماں
واں سے وہ شور بخت بڑھا نعرہ مار کے
پانی بھر آیا منہ میں ادھر ذوالفقار کے

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے
وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں دھر گڑائے
ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑگڑائے
غصے میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کرکرائے
ماری جو ٹاپ رک کے ہٹے ہر لعیں کے پاؤں
ماہی پہ ڈگمگائے گاوِ زمیں کے پاؤں

نیزہ ہلا کے شاہ پر آیا وہ خود پسند
مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند
تیر و کماں سے بھی نہ ہوا جب وہ بہرہ مند
چلہ ادھر کھنچا کہ چلی تیغِ سربلند
وہ تیر کٹ گئے جو درآتے تھے سنگ میں
گوشے نہ تھے کماں میں نہ پیکاں خدنگ میں

ظالم اٹھا کے گرز کو آیا جناب پر
طاری ہوا غضب خلفِ بوتراب پر
مارا جو ہاتھ پاؤں جما کر رکاب پر
بجلی گری شقی کے سرِ پرعتاب پر
دو ہاتھ میں شکست ظفر ایک ہاتھ میں
ہاتھ اڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

کچھ دست پاچہ ہو کے چلا تھا وہ نابکار
پنجے سے پر اجل کے کہاں جا سکے شکار
واں اس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغِ آبدار
یاں سر سے آئی پشت کے مہروں پہ ذوالفقار
قربان تیغِ تیزِ شہِ نامدار کے
دو ٹکڑے تھے سوار کے دو راہوار کے

پھر دوسرے پہ گرز اٹھا کر پکارے شاہ
کیوں ضربِ ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ
سرشار تھا شرابِ تکبر سے روسیاہ
جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئے تھی راہ
غل تھا اسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
لو دوسرا شکار چلا منہ میں شیر کے

آتا تھا وہ کہ اسپِ شہِ دیں پلٹ پڑا
ثابت ہوا کہ شیرِ گرسنہ جھپٹ پڑا
تیغہ شقی نے ڈھال پہ مارا تو پھٹ پڑا
ضربت پڑی کہ گنبدِ دوّار پھٹ پڑا
پیوندِ صدرِ زیں جسد و فرق ہو گیا
گھوڑا زمیں میں سینے تلک غرق ہو گیا

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر
تیروں سے دشت گرگ سے بن اژدروں سے در
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر
اُڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور
سمٹے پہاڑ منہ کو جو دامن سے ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرادیئے پر کانپ کانپ کے

آئی صدائے غیب کہ شبیر مرحبا
اس ہاتھ کے لیئے تھی یہ شمشیر مرحبا
یہ آبرو یہ جنگ یہ توقیر مرحبا
دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

بس اب نہ کرو غا کی ہوس ای حسین بس
دم لے ہوا ہیں چند نفس ای حسین بس
گرمی سے ہانپتا ہے فرس ای حسین بس
وقتِ نمازِ عصر ہے بس ای حسین بس
پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں ازدہام میں
اب اہتمام چاہیئے امت کے کام میں

لبیک کہہ کے تیغ رکھی شہ نے میان میں
پلٹی سپاہ آئی قیامت جہان میں
پھر سرکشوں نے تیر ملائے کمان میں
پھر کھل گئے لپٹ کے پھریرے نشان میں
بیکس حسین ظلم شعاروں میں گھر گئے
مولا اکیلے لاکھ سواروں میں گھر گئے

سینے پہ سامنے سے چلے دس ہزار تیر
چھاتی پہ لگ گئے کئی سو ایک بار تیر
پہلو کے پار برچھیاں سینے کے پار تیر
پڑتے تھے دس جو کھینچتے تھے تن سے چار تیر
یوں تھے خدنگ ظلِّ الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پر

چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسین پر
ٹوٹے ہوئے تھے برچھیوں والے حسین پر
یہ دکھ نبی کے گود کے پالے حسین پر
قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسین پر
تیرِ ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا

لاکھوں میں ایک بیکس و دلگیر ہائے ہائے
فرزندِ فاطمہ کی یہ توقیر ہائے ہائے
بھالے وہ اور وہ پہلوئے شبیر ہائے ہائے
وہ زہر میں بجھائے ہوئے تیر ہائے ہائے
غصّے میں تھے جو فوج کے سرکش بھرے ہوئے
خالی کیئے حسین پہ ترکش بھرے ہوئے

وہ گروہ تھے جو بھاگتے پھرتے تھے وقتِ جنگ — اک سنگ دل نے پاس سے مارا جبیں پہ سنگ
صدمے سے زرد ہو گیا سبطِ نبی کا رنگ — ماتھے پہ ہاتھ تھا کہ گلے پر لگا خدنگ
تھاما گلا جناب نے ماتھے کو چھوڑ کے — نکلا وہ تیر حلقِ مبارک کو توڑ کے

لکھا ہے تین بھال کا تھا ناوکِ ستم — منہ کھل گیا الٹ گئی گردن رکا جو دم
کھینچی چھری گلے کی طرف سے بچشمِ نم — بھالیں نکالیں پشت کی جانب سے ہو کے خم
ابلا جو خوں نکلتا ہوا دم ٹھہر گیا — چلّو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا

دشمن تھا شہ کا اعورِ سلمی عدوئے دیں — سر پر لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں
ماری جگر پہ ابنِ انس نے سنانِ کیں — بھاگا گڑو کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں
گھوڑے پہ ڈگمگا کے جو حضرت نے آہ کی — تھرّا گئی ضریح رسالت پناہ کی

گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہے غضب — نکلی رکاب پائے مطہر سے ہے غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب — غش میں جھکے عمامہ گرا سر سے ہے غضب
قرآن رحلِ زیں سے سرِ فرش گر پڑا — دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

گر کر کبھی اٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر — اگلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر — کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی کبھی ادھر
اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے — تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے

جنگل سے آئی فاطمہ زہرا کی یہ صدا — امّت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمدا
اس وقت کون حقِ محبت کرے ادا — ہے ہے یہ ظلم اور دو عالم کا مقتدا
انیس سو ہیں زخم تنِ چاک چاک پر — زینب نکل حسین تڑپتا ہے خاک پر

پردہ الٹ کے بنتِ علی نکلی ننگے سر — لرزاں قدم خمیدہ کمر غرقِ خوں جگر
چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر — اے کربلا بتا ترا مہمان ہے کدھر
اماں قدم اب اٹھتے نہیں تشنہ کام کے — پہونچا دو لاش پر مرے بازو کو تھام کے

اس وقت سب جہاں مری آنکھوں میں ہے سیاہ — لوگو خدا کے واسطے مجھکو بتا دو راہ
سیّد کدھر تڑپتا ہے اماں کدھر ہیں آہ — کس سمت ہے نبی کے نواسے کی قتل گاہ
شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے — یہ کون نام لیتا ہے میرا کراہ کے

کس نے صدا یہ دی کہ بہن اس طرف نہ آؤ — بس اب سفر قریب ہے للّٰلہ گھر میں جاؤ
اب ڈوبتی ہے آلِ رسولِ خدا کی ناؤ — یا مرتضیٰ غریبوں کے بیڑے کو تم بچاؤ
اب چھوڑیو نہ دشتِ بلا میں حسین کو — یا فاطمہ چھپا لو ردا میں حسین کو

بنتِ علی تو پیٹتی پھرتی تھی ننگے سر — کٹتا تھا نورِ چشمِ علی کا گلا ادھر
زینب کو منع کرتے تھے ہر چند اہلِ شر — لیکن وہ دوڑی جاتی تھی بھائی کی لاش پر
پہونچی جو قتل گاہ میں اس روک ٹوک پر — دیکھا سرِ حسین کو نیزے کی نوک پر

نیزے کے نیچے جاکے پکاری وہ سوگوار — سیّد تری لہو بھری صورت کے میں نثار
ہے ہے گلے پہ چل گئی بھیّا چھری کی دھار — بھولے بہن کو اے اسدِ حق کی یادگار
صدقے گئی لٹا گئے گھر وعدہ گاہ میں — جنبش لبوں کو ہے ابھی یادِ الٰہ میں

بھیّا سلام کرتی ہے خواہر جواب دو — چلّا رہی ہے دخترِ حیدر جواب دو
سوکھی زباں سے بہرِ پیمبر جواب دو — کیونکر جیے گی زینبِ مضطر جواب دو
جز مرگ دردِ ہجر کا چارا نہیں کوئی — میرا تو اب جہاں میں سہارا نہیں کوئی

بھیا میں اب کہاں سے تمھیں لاؤں کیا کروں — کیا کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں کیا کروں
کس کی دہائی دوں کسے چلاؤں کیا کروں — بستی پرائی ہے میں کدھر جاؤں کیا کروں
دنیا تمام اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا — بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزاخانہ ہو گیا

ہے ہے تمھارے آگے نہ خواہر گزر گئی — بھیّا بتاؤ کیا تہِ خنجر گذر گئی
آئی صدا نہ پوچھو جو ہم پر گزر گئی — صد شکر جو گزر گئی بہتر گزر گئی
سر کٹ گیا ہمیں تو الم سے فراغ ہے — گر ہے تو بس تمھاری جدائی کا داغ ہے

گھر لوٹنے کو آئے گی اب فوجِ نابکار
کہیو نہ کچھ زباں سے بجز شکرِ کردگار
خیمے میں جبکہ آگ لگا دیں ستم شعار
رہیو مری یتیم سکینہ سے ہوشیار
بیزار ہو وہ خستہ جگر اپنی جان سے
باندھے نہ کوئی اسکا گلا ریسمان سے

بس اے انیسؔ ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم کو یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند بند ہیں سلطان پسند بند
یہ فصل اور یہ بزم عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے میں خزاں کی بہار ہے

رباعی

گر لاکھ برس جیئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کرلے
غافل تجھے دُنیا سے سفر کرنا ہے

رباعی

کس طرح کرے نہ ایک عالم افسوس
جی بھر کے کیا نہ شہ کا ماتم افسوس
کیا جلد گزر گئے یہ دس دن غم کے
لیصا جو ہو گیا محرّم افسوس

رباعی

قاسم کو عدو نے خوں میں جب لال کیا
شبیر نے یہ کہہ کے عجب حال کیا
تابوت پہ جس کے باپ کے مارے تیر
گھوڑوں کے سموں سے اُسے پامال کیا

جب خاتمہ بخیر ہوا فوجِ شاہ کا
گھر لُٹ گیا جنابِ رسالت پناہ کا
بھائی نہ وہ رفیق نہ وہ نورِ عین تھے
ڈیوڑھی وہ صبح تک تھے دو دستہ جہاں سوار
وہ لُو وہ دوپہر کی تپش اور وہ غبار
آفت تھی بیکسی تھی مصیبت تھی یاس تھی
وہ گھر کہ جس میں لاتے تھے جبرئیل وحیِ رب
نہوڑائے سر کھڑے تھے شہنشاہِ تشنہ لب
لب پیاس سے کبود تھے رخسار زرد تھے
فرماتے تھے کہ واہ یہ تاخیر اے اجل
اب مجھ کو اک برس کے برابر ہے ایک پل
اک جا چھری گلوں پہ چلتی تو خوب تھا
اُٹھتا نہیں حسین سے اب بارِ زندگی
جیتے رہیں وہ جو ہیں طلبگارِ زندگی
عبرت کی جا ہے خاک میں رنگِ چمن ملے
کی خوب سیر باغِ جہاں خوب پھل ملے
ممکن نہیں کہ خلق میں چین ایک پل ملے
جنّت میں پیاس تشنہ دہانوں کو لے گئی

کوثر پہ قافلہ گیا پیاسی سپاہ کا
خاک اُڑ رہی تھی حال یہ تھا بارگاہ کا
دو بہنیں رونے والیاں تھیں اک حسین تھے
خادم ہی واں کوئی نہ کوئی ہم رفیق و یار
پردہ ہوا سے سر کو پٹکتا تھا بار بار
بے فوج بادشاہ تھا ڈیوڑھی اُداس تھی
واں تیر فوجِ ظلم سے آتے تھے ہی غضب
تر تھا جواں پسر کے لہو سے لباس سب
مولا کی ایک جان تھی اور لاکھ درد تھے
اکبر کے بعد کونسا تھا زیست کا محل
موت آئے اب یہ ہے شجرِ زندگی کا پھل
یہ جان اُن کے ساتھ نکلتی تو خوب تھا
اے موت اب گرا کہیں دیوارِ زندگی
اب تنگ ہے اپنی جان سے بیمارِ زندگی
زندہ ہو باپ اور نہ پسر کو کفن ملے
ہو عید اب گلے سے جو تیغِ اجل ملے
دُنیا میں آج اُن کو نہ پایا جو کل ملے
افسوس خوب چُن کے جوانوں کو لے گئی

ہے ہے کہاں وہ گوہرِ بحرِ شرف گئے
جو میرے پاس رہتے تھے وہ کس طرف گئے
قاسم سدھارے شبرِ خدا کے خلف گئے
سارے مرے چنے ہوئے دُرِ نجف گئے
کیا تفرقہ پہ لشکرِ شاہی میں پڑ گیا
میں قافلے سے چھٹ کے تباہی میں پڑ گیا

ہم سب کے بعد خلق سے جانے کو رہ گئے
سر پیٹنے کو خاک اُڑانے کو رہ گئے
پیری میں آہ ٹھوکریں کھانے کو رہ گئے
اس نوجواں کا داغ اُٹھانے کو رہ گئے
بیٹا کہاں خبر جو دمِ انتقال لے
اتنا نہیں جو گرتے ہوئے کو سنبھال لے

فرماکے یہ جو گھر میں گئے شاہِ خوش خصال
محبوبِ حق کی آل کا دیکھا عجیب حال
بیٹھے ہوئے ہیں سب صفِ ماتم پہ کھولے بال
برپا ہے شورِ ماتمِ فرزندِ خوش جمال
بانو قریبِ مرگ ہے زینب ہلاک ہے
سینے تو سب کبود ہیں بالوں پہ خاک ہے

بہنیں پکارتی تھیں کہ بیرن ترے نثار
اب تک تو گھر میں آتے تھے مقتل سے چند بار
بھیّا سنگھا دو نکہتِ گیسوئے مشکبار
اُس بھینی بھینی بو کے لئے دل ہے بے قرار
آئے نہ عموجان کا پُرسا بھی دینے کو
کیا بے کہے چلے گئے صغرا کے لینے کو

شہ نے کہا بہشت میں ہیں اکبرِ حسیں
صغرا کہاں ہماری ہے اُن کو خبر نہیں
رخصت کرو حسین کو اے زینبِ حزیں
خیمے تک آ نہ جائے کہیں فوجِ اہلِ کیں
لادو رسولِ پاک کا رختِ کہن ہمیں
پہنا دو اپنے ہاتھ سے زینب کفن ہمیں

بیخود تھی غم میں نورِ نظر کے وہ دلفگار
سمجھی نہ کچھ کہ کون یہ روتا ہے زار زار
جب یہ سنا کھڑا ہے محمد کا یادگار
ماتم کی صف پہ گر پڑی اُٹھ کر وہ سوگوار
رو کر کہا نہ پاؤں نہ قابو میں ہاتھ ہیں
کیوں صاحبو کہو علی اکبر بھی ساتھ ہیں

پُرخوں جبیں پھٹے ہوئے کپڑے بدن پہ خاک
چادر سیاہ ایک گریباں ہزار چاک
سر بھی جگر بھی سینہ پُرخوں بھی دردناک
بیکس بہن کے حال پہ روئے امامِ پاک
فرمایا آئیں کیا کہ سناں دل پہ کھائے ہیں
ہم اُن کی لاش چھوڑ کے رخصت کو آئے ہیں

میں کیا ہوں ایک عبد نحیف و ضعیف و زار
قدرت نہ زندگی کی نہ مرنے پہ اختیار
حاضر ہوں جب بلائے کہ حاکم ہے کردگار
ہے اُس کی ذات راحم و غفّار و پردہ دار
منظور پرورش ہے جو سب کی کریم کو
رانڈوں کو بھولتا ہے نہ طفلِ یتیم کو

جو معرضِ فنا میں ہوں کیا اُن کا آسرا
میں ہوں تو کیا ہوں مالک و مختار ہے خدا
اُٹھ جائیں بھائی بھانجے یا ہوں پسر جدا
صابر اُسی سے صبر کی کرتے ہیں التجا
وہ قید میں نہ گھر کی تباہی میں روتے ہیں
روتے ہیں گر تو خوفِ الٰہی میں روتے ہیں

وہ کہتی تھی کہ جان نکل لے تو جائیے
خنجر اجل کا حلق پہ چل لے تو جائیے
مضطر ہے دل بہن کا سنبھل لے تو جائیے
اچھا ذرا سکینہ بہل لے تو جائیے
بالوں پہ خاک اُڑا لوں نہ اشکوں سے دھو تو لوں
ماں جائے بھائی میں تجھے جی بھر کے رو تو لوں

بولی قدم پہ گر کے یہ بانوے خوش خصال
اے جانِ فاطمہ خلفِ شیر ذوالجلال
فرمائیے تو ساتھ چلے یہ شکستہ حال
رُخ پر نقاب ڈال کے بکھرا کے سر کے بال
عزّت اب اس کنیز کی ہے ہاتھ آپ کے
پردہ مرا رہے جو مروں ساتھ آپ کے

منجدھار میں ہے ناؤ تلاطم ہے آشکار
موجیں ستم کی آتی ہیں طوفاں میں بار بار
اے ناخدا ہے کشتیِ امّت ترے نثار
بیکس کا ڈوبتا ہوا بیڑا لگا دے پار
رحم اب کہ بیقراریِ بسمل کا وقت ہے
حلالِ مشکلات یہ مشکل کا وقت ہے

بانو کے اضطراب پہ روئے شہِ اُمم
فرمایا ناگوار ہے صاحب تمھارا غم
بانو اسیر و بیکس و بے آشنا ہیں ہم
یاور نہ بھائی بند نہ لشکر نہ وہ علم
موت اپنی خود طلب کرے وہ تو کیا کرے
جس کا کوئی نہ ہو نہ مرے وہ تو کیا کرے

لازم ہے تم کو صبر یہ ہے صبر کا مقام
مالک کی ہے اسی میں خوشی اور اسی میں نام
یاں گھر لُٹے کہ قید میں جا ہو سوئے شام
ہر دم رہے زبان کو شکرِ خدا سے کام
دیں یہ تمھارا ساتھ تم ان سب کے ساتھ ہو
میرا یہی ہے ساتھ کہ زینب کے ساتھ ہو

یہ کہہ کے نکلے خیمے سے شبیرِ دلفگار
دیکھا کھڑا ہے ڈیوڑھی پہ اسپِ فلک شعار
گردن پہ ہاتھ پھیر کے بولا وہ نامدار
طاقت نہ ہو تو جائے پیادہ ترا سوار
یہ گردشِ فلک یہ جفائے زمانہ ہے
تو بھی تو تین روز سے بے آب و دانہ ہے

منہ رکھ کے شہ کے بازو پہ بولا وہ باوفا
اے شہسوارِ دوشِ محمد ترے فدا
کچھ حق نہ دانہ خوری کا مجھ سے ہوا ادا
فاقہ ہو جب کہ آپ کو مولا تو میں ہوں کیا
جیوں آج پر نہ ترکِ رفاقت کروں گا میں
جیتا ہوں گر تو آپ کے آگے مروں گا میں

پھیلا کے دونوں ہاتھ جھکا وہ سوئے زمیں
گھوڑے پہ جلوہ گر ہوا حیدر کا نازنیں
پرنور ہو گیا رخِ انور سے صدرِ زیں
مرکب پہ تھے حسین کہ خاتم پہ تھا نگیں
شورِ درود غرب سے تا شرق ہو گیا
بیٹھے جو تن کے آپ فرس برق ہو گیا

بوئے بہشت لے کے نسیمِ سحر چلی
آگے فرس کے فتح تو پیچھے ظفر چلی
خود سر پہ چتر بن کے ضیائے قمر چلی
گھوڑا اچھلا کہ فتح کی گویا خبر چلی
غرفوں سے حوریں دیکھتی تھیں شہسوار کو
پریاں طبق لیے تھیں سروں پر نثار کو

ہاتوں پہ زرہیں سب گلِ خوش رنگ لیے ہوئے
دوڑی صبا بہشت کی خوشبو لیے ہوئے
تیغ و سپر جو ہیں شہِ خوشخو لیے ہوئے
غل ہے کہ ہاں نجات کا پہلو لیے ہوئے
شبیر تو امام ہے ابنِ امام ہے
گر غیظ آ گیا تو یہ دنیا تمام ہے

بجلی کی ضو دکھاتی ہے رخ کی چمک ادھر
خود عرش اس طرف نگراں تھا فلک ادھر
ڈر سے سما ادھر تھا ہراساں سمک ادھر
جنات اس طرف تھے صف آرا ملک ادھر
کچھ کہکشاں سے بڑھ گئی تھی شان راہ کی
غل تھا سواری جاتی ہے ثنا ہو کے شاہ کی

جھکتی تھیں جب صفوفِ ملائک پئے سلام
ہنس کر جواب دیتے تھے مولا سے خاص و عام
جن ہوتے تھے جو خم پئے تسلیم و احترام
رکھتے تھے سر پہ ہاتھ امامِ فلک مقام
مطلب یہ صاف تھا کہ مدد ناگوار ہے
میرا یہ سر امانتِ پروردگار ہے

شرمندہ ہے جبینِ مبیں سے قمر کا نور پیدا ہوا ہے زلف سے شب کی سحر کا نور
صلِ علیٰ یہ نور ہے خیر البشر کا نور پروانہ روشنی پہ ہے جس کی نظر کا نور
دیکھو نشانِ سجدہ جبینِ جناب پر غنچہ ہے نیلوفر کا گلِ آفتاب پر

کیا خوشنما ہیں چہرے پہ گیسو کو دیکھیے شب اور آفتاب کے پہلو کو دیکھیے
دو راتیں اک سحر رُخِ نیکو کو دیکھیے جنگل تمام بس گیا خوشبو کو دیکھیے
چہرے کی ضو سے دشتِ پر آشوب عرش ہے ساری زمیں پہ عنبرِ سارا کا فرش ہے

ابرو ہے یا کھنچی ہوئی حیدر کی ذوالفقار یہ مو بھرے ہوئے نہیں جوہر ہیں آشکار
قرباں کمان ہلالِ فلک مرتبت نثار آنکھوں پہ چین کی جا ہے یہ ایسی ہیں ذی وقار
پیوستہ منکسر ہیں وہ جو ارجمند ہیں اُتنی فروتنی بھی ہے جتنی بلند ہیں

آنکھوں کو کہیے عین تو عین خطا ہے یہ پردے نہ کیوں ہوں سات کہ نورِ خدا ہے یہ
سب کو ہے چشمداشت کہ عینِ عطا ہے یہ بیمار خود پہ سب کے مرض کی دوا ہے یہ
سرخوش ہے جام ان کی جو الفت کا پی گیا دیکھا نگاہِ لطف سے جس کو وہ جی گیا

احسان بھی حیا بھی مروّت بھی قہر بھی خود موت بھی حیات بھی امرت بھی زہر بھی
بینا بھی نکتہ سنج بھی دانائے دہر بھی تسنیم بھی بہشت بھی کوثر کی نہر بھی
سر شرم سے جھکائے ہے نرگس ریاض میں جنّت سواد میں ہے یدِ بیضا بیاض میں

آہو شکار و تیر و کماں دار و شیر گیر ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر
خونریز و جاں فریب و دلاویز و بے نظیر قبضے میں ابروؤں کی کمانیں مژہ کے تیر
جس سادہ دل کو ان کی سیاہی کی یاد ہو ناخواندہ بھی اگر ہو تو روشن سواد ہو

ذرّہ نواز و زہد نما صاحبِ امتیاز طنّاز و شرمگین و گراں خواب و سرفراز
حق بین و پاکباز و خدا بین و بے نیاز بیدار و داغ دادہ و خونبار و غم طراز
گرد اس کے پھر یہ کعبۂ ایماں کا طوف ہے بس اک انھیں بس نظرِ بد کا خوف ہے

اللہ رے رعب شیر ہرن ہوگئے ہیں سب
آماجِ خوف تیر فگن ہوگئے ہیں سب
خود دل شکستہ قلعہ شکن ہوگئے ہیں سب
خم صورتِ کماں ہمہ تن ہوگئے ہیں سب
آنکھیں ملائیں کب یہ شریروں کی تاب ہے
کس دل کو اس نگاہ کے تیروں کی تاب ہے

شیرِ خدا کے شیر سے کیونکر ہو چار آنکھ
خورشیدِ فاطمہ سے ملائیں ہزار آنکھ
وہ گربہ چشم اور یہ آہو شکار آنکھ
عاجز ہے جھپکی جاتی ہے بے اختیار آنکھ
گھوڑے کو دی تو حاصلِ عین الکمال لے
خود اس کی آنکھ پنجۂ مژگاں نکال لے

گر کوئی شوخ چشم و جفا جو نظر لگائے
عین الکمال کی سرِ میداں سزا وہ پائے
یوں بھینچے چشم زخم کہ ظالم نہ تاب لائے
انگشت بن کے موئے مژہ چشم میں در آئے
بینا کہیں کہ کھوئی بصیرت بصیر نے
مردم کہیں کہ عین خطا کی شریر نے

کیا نور ہے رخِ خلفِ بوتراب پر
کچھ تیرگی سی آگئی ہے آب و تاب پر
ہے یہ عرق کہ عطر کے قطرے گلاب پر
سونا چڑھاؤ پھر ورقِ آفتاب پر
آئے جلال میں نہ جلالت حضور کی
تشبیہ ہے خدا و محمد کے نور کی

کیوں منہ کو پھیرتا ہے خجل ہو کے آفتاب
آنکھیں ملے اٹھا ہے اگر سو کے آفتاب
شرمندہ ہوگا اپنی چمک کھو کے آفتاب
لازم ہے آئے سامنے منہ دھو کے آفتاب
گر چاہتا ہے عرش سے سر اس کا جا ملے
کہدو کہ ارضِ پاک کے ذروں میں آ ملے

درجِ دہن پہ لعل و عقیقِ یمن نثار
حسنِ بیاں پہ طوطیِ شکر شکن نثار
غنچے نثار پھول تصدق چمن نثار
شورِ نمک پہ شاعرِ شیریں سخن نثار
فقروں میں لطف باتوں میں لذت بھری ہوئی
قرآں کی طرح ہے فصاحت بھری ہوئی

توبہ تنافرِ کلمات اور یہ دہن
پھولا ہوا فصاحتِ الفاظ کا چمن
جملے صحیح شستہ و رفتہ ہر اک سخن
تقریر وہ سمجھ لیں جسے صاف مرد و زن
معنی کا بھی یہ حال ہے حسنِ قبول سے
خوشبو سحر کو جیسے نکلتی ہے پھول سے

لفظوں میں یوں ہے معنیِ روشن کی آب و تاب　　جس طرح عکس آئینہ میں جام میں گلاب
مضمون میں تناسبِ الفاظ لاجواب　　تصریح بھی فصیح کنائے بھی انتخاب
یاں منتہی وہ سب ہیں جو علم و کمال ہیں　　صلِ علیٰ یہ مصحفِ ناطق کے لال ہیں

دنداں کواکبِ فلکِ عز و شانِ حسن　　گر ہیں تو بس یہی ہیں زمانہ میں جانِ حسن
خالق نے موتیوں سے بھرا ہے دہانِ حسن　　خود لال ہو صفات ہیں جن کی زبانِ حسن
کوسوں ضیا ہے وادیِ مینو سرشت میں　　گویا چمک رہے ہیں ستارے بہشت میں

بتیس دُر وہ لعبتِ محبوبِ کردگار　　اختر چمک سے جن کی خجل برق شرمسار
برّاق و درفشان و ضیا بار و آبدار　　بھولا ہیں اُن سبھوں سے ہے ان کا فزوں وقار
ہیرے نہیں نجومِ سعادت اثر نہیں　　یہ شیرِ فاطمہ کے ہیں قطرے گہر نہیں

وہ ریشِ پاک اور وہ چہرے کی آب و تاب　　نکلا ہے چیر کر شبِ یلدا کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب　　رخصت ہو دل رہے ہیں گلے پیری و شباب
تا وقتِ عصر اور زمانِ حیات ہے　　اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

سینے کا آئینہ ہے کہ نورِ خدا کا گھر　　یا وہ مدینہ علم کا حیدر ہے جس کا در
اس صدر میں بھرے ہوئے ہیں راز کے گہر　　آئندہ و گزشتہ کی سب ہے انھیں خبر
پنہاں جو دل میں ہے اُسے پہچانتے ہیں یہ　　جو بے زباں ہیں اُن کی زباں جانتے ہیں یہ

ذکرِ گلو جو ہے تو گلے میں رکا ہے دم　　حوروں کی گردنیں ہیں اسی جا ادب سے خم
لیتے ہوں بوسے جن کے رسولِ فلک حشم　　افسوس اُس گلے پہ چلا خنجرِ ستم
سوکھی رگیں گلوئے مبارک کی کٹ گئیں　　افلاک گر پڑے نہ زمینیں الٹ گئیں

پیہم زباں دکھا کے کہا آب آب آب　　اے وا محمدا نہ کسی نے دیا جواب
قطرے سے بھی زبان نہ ہوئی آہ کامیاب　　آخر تڑپ کے رہ گیا وہ آسماں جناب
جلتی زمیں پہ لاشِ شہِ نیک خو رہی　　گردن گلے سے کٹنے پہ بھی قبلہ رو رہی

وہ سر رکھا خدا نے شفاعت کا جس پہ تاج
گردن وہ بزمِ لم یزلی کا جو ہے سراج
وہ صدر جس کے علم کی عالم کو احتیاج
وہ ہاتھ جس سے خیر و عطا کا ہوا رواج
دشمن تو لاکھ اور اکیلے حضور تھے
سارے یہ عضو ظلم کی تیغوں سے چور تھے

وہ پاؤں معرکے سے کبھی جو نہیں ہٹے
وہ کیا ہٹیں ہٹے تو وصفِ فوجِ کیں ہٹے
دشوار ہے یہ امر کہ رکنِ رکیں ہٹے
سرکیں نہ آسمان ہٹے یا زمیں ہٹے
مسکن سے منہ پہاڑ کبھی موڑتے نہیں
ثابت قدم جو ہیں وہ جگہ چھوڑتے نہیں

گھر کا خدا کے رکنِ رکیں ہے کہاں ہٹے
نقش اس قدم کا نقشِ نگیں ہے کہاں ہٹے
یہ لنگرِ سفینۂ دیں ہے کہاں ہٹے
قطبِ آسمان و زمیں ہے کہاں ہٹے
زور اس سے آسمان کا بھی چلتا نہیں کبھی
نقطہ ہے دائرے سے نکلتا نہیں کبھی

اس دبدبے سے لشکرِ بیاں شکن میں آئے
جیسے شکار کھیلنے کو شیر بن میں آئے
یا بلبل اشتیاق میں گل کے چمن میں آئے
غل پڑ گیا ہٹو اسد اللہ رن میں آئے
اگلی صفیں الٹ گئیں پچھلی فوج پر
طوفاں میں موج گرتی ہے جس طرح موج پر

بھڑکے فرس پرے ہوئے ابتر علم ہٹے
بڑھتے ہوئے جو بانیِ ظلم و ستم ہٹے
نامی نشان چھوڑ کے ثابت قدم ہٹے
دریا ہٹا کہ فوج کے بادل بہم ہٹے
بھاگے یہیں خاک اڑ کے جو سوئے فلک گئی
لشکر میں غل ہوا کہ زمیں بھی سرک گئی

چلّے ہیں چٹکیوں سے سراسر چھٹے ہوئے
افسر سے فوج فوج سے افسر چھٹے ہوئے
خالی ہیں دور چال توسنگ چھٹے ہوئے
غربت میں یاد کرتے ہیں سب گھر چھٹے ہوئے
تلوار اگر کھنچے تو خدا کی پناہ ہو
دیکھو یہ سب کرشمۂ تیغِ نگاہ ہو

ہل چل کو دیکھ کر یہ پکارا وہ حق شناس
اے اہلِ شام اک متنفس سے یہ ہراس
سب مر گئے امید کسی کی ہے اب نہ آس
اک ہم ہیں اور حسرت و اندوہ و درد و یاس
ہاتھ میں اپنی فکر نہ لڑکوں کا ہوش ہے
خنجر سے کاٹ لو کہ یہ سر بارِ دوش ہے

کیوں بھاگتے ہو بیکس و تنہا کی جنگ کیا
جب مر گیا ہو دل تو وغا کی اُمنگ کیا
بے دست و پا دکھائے لڑائی کا ڈھنگ کیا
طاقت ہو گر تو شیر ہی پھر کیا۔ پلنگ کیا
پر جبر کیا ہیں تم سے عوض لوں عناد کا
لڑ لوں گا کچھ کہ حکم ہی مجھ کو جہاد کا

یہ سُن کے پھر جمائے پرے فوجِ شام نے
کالے نشان کھل گئے لشکر کے سامنے
چھوڑا اُدھر نیام علی کے حسام نے
جلوہ دیا عروسِ ظفر کو امام نے
گھونگھٹ ہٹا تو برق سی چمکی لڑائی میں
نقدِ حیات لینے لگی رونمائی میں

گھوڑا جو پھاند کر صفِ اوّل سے مل گیا
تھا صاعقہ کہ شام کے بادل سے مل گیا
وہ پیپلا جو فوج کے اُس دَل سے مل گیا
بے برگ و بر ہوئے یہ ثمر پھل سے مل گیا
پھرتے ہوئے سروں پہ نہ سر تھے نہ ہاتھ تھے
گویا چھری لیے ملک الموت ساتھ تھے

وہ تیغِ تیز جب صفِ ثانی سے مل گئی
خفت ہر اک کو اس کی گرانی سے مل گئی
لذّت چھری کی تیز زبانی سے مل گئی
دریا کی باڑھ گھاٹ کے پانی سے مل گئی
چمکی جو سر پہ برق تو بے فرق ہو گئے
دریا میں خوں کے تا بہ کمر غرق ہو گئے

کھا کھا گئی صفوں کو جدھر آئی ذوالفقار
گہ چھپ گئی تو گاہ نظر آئی ذوالفقار
سر پہ چمک کے تا بہ کمر آئی ذوالفقار
زیں کاٹ کر زمیں پہ اُتر آئی ذوالفقار
یوں صیدِ پنجتن میں گرفتار ہو گئے
اک جوش میں سوار و فرس چار ہو گئے

وہ مُنہ کہ الحذر وہ روانی کہ الاماں
وہ گھاٹ الحفیظ وہ پانی کہ الاماں
وہ دم وہ خم وہ تیز زبانی کہ الاماں
وہ دل شکن وہ دشمنِ جانی کہ الاماں
ناز اُس کے سب کو بھائے کرشمے بھلے لگے
چھوڑے نہ بے لہو پیے جس کے گلے لگے

تھی دست گاہ خاص اُسے قتلِ عام میں
بے دم ہوا جو آ گیا جوہر کے دام میں
کس کس ادا سے چلتی تھی وہ فوجِ شام میں
دونوں زبانیں ایک سی تھیں اپنے کام میں
کیا بس چلے کسی کا ہوا جب بُری سے چلے
چلتی تھی یوں گلوں پہ کہ جیسے چھری چلے

جوہر میں فرد تھی پہ زبانیں ملی تھیں فوج
پستی میں تھی کبھی کبھی جاتی تھی سوئے اوج
کرتی تھی کارِ تیغ چمک ذوالفقار کی

وہ فوج کا ہجوم وہ گرمی وہ لو وہ بن
بھڑکی تھی آگ جل رہے تھے ناریوں کے تن
ڈوبا تھا وہ پسینے میں جو سینہ زور تھا

ابتر صفیں تھیں کینہ وروں کی اِدھر اُدھر
چھائی تھی اک گھٹا سپروں کی اِدھر اُدھر
غل تھا اتر رہی گھاٹ میں دریا کی باڑھ کا

کاٹا سر اس کا اُس کا جگر چاک کر دیا
جس پر گری جلا کے اُسے خاک کر دیا
شرما کے شرک و کفر نے سر کو فرو کیا

اللہ رے جنگ میں شہِ ذیقدر کی شکوہ
قہرِ خدا تھی برہمیِ طبعِ حق پژوہ
حملوں میں ساری شان خدا کے ولی کی ہے

ساعد سے کچھ بلند جو کر لی تھی آستیں
نعرے نہ کھینچے گونجتا تھا شیرِ خشمگیں
دستِ علی سے ہاتھ حسینِ دلیر کے

وہ آستیں چڑھی ہوئی ساعد وہ صاف صاف
ضربت کا شور قاف سے پہنچا تھا تا بہ قاف
ڈر تھا کہ پاؤں گاو کا ماہی سے ہٹ نہ جائے

وہ شور اُس کے آب کا وہ جوہروں کی موج
بجلی غضب کی کوند رہی تھی میانِ فوج
پرتو میں تیزیاں تھیں سروہی کے وار کی

دریا پہ شیر ہانپتے تھے دشت میں ہرن
مثلِ صدف تھے زخم بھی کھولے ہوئے دہن
فوجوں میں ذوالفقار کے پانی کا شور تھا

جانیں ہوا تھیں فتنہ گروں کی اُدھر اُدھر
بوچھار تھی زمیں پہ سروں کی اِدھر اُدھر
برسا ہی نصفت تب کے مہینا اساڑھ کا

بجلی کو اور آگ نے چالاک کر دیا
قصہ جو دین و کفر میں تھا پاک کر دیا
اسلام شاد تھا کہ مجھے سرخرو کرو

جس جا قدم جمے نہ ہٹے پھر مثالِ کوہ
بے خوفِ جاں نہ تھا کوئی مجمع کوئی گروہ
فوجوں میں شور تھا یہ لڑائی علی کی ہے

فانوس سے بڑھا ہوا تھا نورِ شمعِ دیں
جنبش میں آسمان تزلزل میں تھی زمیں
قبضے میں انگلیاں تھیں کہ ناخن تھے شیر کے

اُگلی ہوئی تھی میان سے شمشیر خوش غلاف
وہ تہلکہ وہ زلزلہ وادیِ مصاف
وحشت زمیں کو تھی کہ زمانہ الٹ نہ جائے

نورآورانِ روئے زمیں کس طرح بڑائیں
وہ اُنگلیاں کہ باب میں خیبر کے جو دآئیں
تلوار کیسی آنکھ اُٹھا کر اگر ڈرائیں
زہرے ہوں آب سامنے تو شیر بھی گرائیں
ای تو یہ جانور ہی اسد گو دلیر ہے
آنکھیں یہ اُس کی ہیں کہ جو حیدر کا شیر ہے

غصے میں سب کھڑے ہوئے ہیں یش کے جو بال
زیر و زبر ہیں صاف پئے مصحفِ جمال
نقطے عیاں ہیں سورۂ والشمس پر کہ خال
سرخی کے مد کہ آنکھوں کے ڈورے ہیں لال لال
وہ خط وہ رنگِ چہرۂ تاباں کھلا ہوا
دیکھو دھرا ہی رحل پہ قرآن کھلا ہوا

کیا مدح ہو حسین کی جنگ و جدال کی
تصویر بن گئی تھی علی کے جلال کی
وہ آؤ جاؤ اشہبِ ضیغم خصال کی
روندا جو یہ پرا تو وہ صف پائمال کی
اُن اُبلی انکھڑیوں کے اشارے غضب کے تھے
چل پھر تھی قہر کی تو طرارے غضب کے تھے

حیرت میں یکہ تاز تھے سب شام و روم کے
پھرتی تھی برق گرد قدم چوم چوم کے
سیر اُس کی دیکھتے تھے تماشا ہجوم کے
پھرتا تھا اُس ہجوم میں کیا جھوم جھوم کے
حیراں سیاہ گوش تو چیتے خموش تھے
شیروں میں جان تھی نہ چکاروں میں ہوش تھے

جم کر اِدھر اڑا اُدھر اُترا وہ جا پڑا
نکلا اُدھر صفوں سے وہ پلٹا یہ آپڑا
جب اس پہ روبہیں سایۂ زلفِ دوتا پڑا
سمجھا کہ تازیانۂ موجِ ہوا پڑا
تسمہ ہر اک جو باگ کا تھا ناگ ہو گیا
آنکھیں اُبل پڑیں یہ مزاج آگ ہو گیا

گرما کے سب رگوں میں لہو دوڑنے لگا
فرفر کی دونوں نتھنوں سے آنے لگی صدا
اُٹھنے لگے زمیں پہ جم جم کے دست و پا
غصہ کہ مجھ تک آکے کدھر رہ گئی ہوا
نزدیک تھا کہ پھاند کے ندی کے پار ہو
روکے وہی حسین سا جو شہسوار ہو

آہو کی آنکھ شیر کی چتون غضب کی چال
وہ بال تھے کہ جولے نے بکھرا دیئے تھے بال
گردن کے خم کو دیکھ کے ہو سرنگوں ہلال
پوچھے کوئی سوار سے تابستگی کا حال
اُڑ کر زمیں تک کبھی گردِ قدم گئی
جب بس کہا چمکتی ہوئی برق تھم گئی

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام
جاندار و شوخ چشم و سعید و خجستہ گام
غازی تھا سرفراز تھا عالی دماغ تھا
چالاکیاں بھی غیظ بھی غیرت بھی جنگ بھی
بر میں اسد بھی بحرِ وغا میں نہنگ بھی
ہے آگ کا مزاج تو سرعت ہوا کی ہے

وہ ساز اور وہ زینِ مرصع کی زیبِ زین
کلغی سے سر کی صاف عیاں فرِّ فرقدین
دعویٰ کہ ہیں براق کی توقیر پائے ہوں
وہ چھوٹی چھوٹی گامچیاں گول گول سُم
طاؤس کی طرح جو وغا میں چنور تھی دُم
پھرنا تجھے نصیب ہو راہِ ثواب میں

وہ گشت اور وہ اُس کے طرارے وہ آؤ جاؤ
گھونگھٹ میں دیکھ پائے اگر چال کا بناؤ
دعویٰ غلط خرام میں کبکِ دری کا ہے
کوہی ہے وہ تدرو ہے کیا اُس کی چال کیا
کیا پیکِ عقل شاطرِ وہم و خیال کیا
دیکھی نہیں کسی نے یہ چھل بل سمند میں

پیکاں ہیں دو کنوتیاں ہنگامِ دار و گیر
روئیں وہ نرم جلد وہ باریک و بے نظیر
ایسی سبک روی نہیں دیکھی شہاب میں

خوش رو و خوش جمال و ادا فہم و تیزگام
گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام
گویا ہوا کی دوش پہ اک زندہ باغ تھا
بالا وہی براق کی دلدل کا ڈھنگ بھی
گھوڑا بھی شیر نر بھی ہرن بھی پلنگ بھی
اضداد اتنے جمع ہیں قدرت خدا کی ہے

اُس میں تمیزِ ارض و سما کا تھا فرق و بین
سینے میں دل قوی تھا کہ ہیں پشت پر حسین
ناز اس پہ ہے کہ بارِ امامت اُٹھائے ہوں
سرعت وہ تھی کہ عقل تھی یونانیوں کی گُم
آتی تھی آسمان سے ندا مدظلہم
قائم یہ دونوں پاؤں ہیں اس کی رکاب میں

پانی پہ گر حباب تو آبِ رواں میں ناؤ
دولہا کے دل میں پھر نہ رہے کچھ دُلھن کی چاؤ
اس بادپا کے سائے میں جلوہ پری کا ہے
طاؤس کیا ہمائے سعادت خصال کیا
اُس کے قدم کی گرد کو پہونچے مجال کیا
پارا بھرا ہوا ہے ہر اک جوڑ بند میں

حلقے سے یوں نکلتا ہے جیسے کماں سے تیر
چینی پرند جس کے مقابل نہ ہے حریر
دوڑے تو فرق آئے نہ مخمل کی خواب میں

ہر چند تیز رو ہے بہت ادہم قلم
کچھ کچھ مداد کی بھی روانی ہوئی ہے کم
پر اُس کی شوخیوں کو یہ کیونکر کرے رقم
دوڑا بہت تو ذہن کا بھی بھر گیا ہے دم
تازی کوئی ہو بات تو لطفِ کلام ہے
بس اے قلم ٹھہر تری تگ کی تمام ہے

گھوڑے سے بھی بڑھی ہوئی تھی تیغ آبگوں
جب ہاتھ اُٹھا تو قبضے سے ٹپکا زمیں پہ خوں
اُلٹی ہوئی صفوں میں نشاں سب تھے سرنگوں
دہشت سے زرد تھا ابنِ سعدِ سیہ دروں
اک شور تھا جو لہر ہے اس کی وہ ناگ ہے
گھوڑے بھگاؤ تیغ کے پانی میں آگ ہے

سر کاٹ کر جو تیغِ علیِ ولی پھری
دل پر خفی پھری تو جگر پر جلی پھری
تھی شاخِ نخلِ فتح کہ پھولی پھلی پھری
کس کس ہنر سے رن میں گلوں پر چلی پھری
بگڑا نہ پھر بناؤ وہ جب سے سجی گئی
قامت سے راستی و ادا سے کجی گئی

دہشت سے اُس کی سخت جگر کانپتے تھے سب
پتا ہوئے تھے برگِ شجر کانپتے تھے سب
قدسی وہاں سے دور تھے پر کانپتے تھے سب
دریا میں تھے نہنگ مگر کانپتے تھے سب
ساتوں طبق جو ہلتے تھے خوفِ درشت سے
گاوِ زمیں لپٹتی تھی ماہی کی پشت سے

بے سر تھے وہ سوار جو بڑھتے تھے خیل خیل
پر تیغِ مرتضے کو نہ اصلا تھا خیف و میل
جوہر چمک دکھاتے تھے سب صورتِ سہیل
آتی تھی شور سے سوئے دریا لہو کی سیل
آفت بپا تھی خانۂ تن سب خراب تھے
موجیں تھیں مست دریا کی سروں کے حباب تھے

اک شور تھا کہ آئی ہے آفت جہان پر
انساں زمیں پہ دق تھے ملک آسمان پر
ہونٹوں پہ دم اجل کی حرارت زبان پر
دہشت سے آ بنی تھی جنوں کی بھی جان پر
پریوں میں شور تھا کہ اجل سر پہ آئی ہے
جلد آئیے جنابِ سلیماں دہائی ہے

تلوار رن میں گر کسی سرہنگ سے چلی
ظالم کا دم نکل گیا اس ڈھنگ سے چلی
جس پہ چلی وہ تیغ نئے رنگ سے چلی
سر پہ سوار کے جو پڑی تنگ سے چلی
مدت کا تال میل تھا برسوں کا ساتھ تھا
جیسی وہ ذوالفقار تھی ویسا ہی ہاتھ تھا

قاصر تھے اُن کے عزم جو تھے بانیِ فساد
رشتے تھے قطع اُٹھ گیا تھا اُنس و اتحاد
ہردم اشارہ کرتی تھی تیغِ ظفر نہاد
سب مجھ کو سرگزشتِ جہادِ علی ہے یاد
ٹکڑے کیا ہے عمر سے نامی نہنگ کو
جھیلے ہوئے ہوں خیبر و خندق کی جنگ کو

جس غول کی طرف وہ سلیماں حشم پھرا
تلوار کا نہ منہ نہ فرس کا قدم پھرا
چمکی اُدھر اُدھر رُخِ اہلِ ستم پھرا
جس صف پہ آئی سطرِ غلط پر قلم پھرا
صحت پہ حرف آگیا مجبور ہو گئے
سرتن سے مثلِ نقطۂ شک دور ہو گئے

وہ ہاتھ کی صفائیاں وہ تیغ کی چمک
ہلتے تھے دل سما سے تزلزل تھا تا سمک
وہ آب و تاب گھاٹ کی وہ باڑھ کی دمک
تھا آبِ شورِ تیغ ہر اک زخم پر نمک
منہ اپنے زخم کھولے تھے لطفِ غذا یہ تھا
بسمل بھی ہونٹ چاٹ رہے تھے مزا یہ تھا

رُکتی نہ تھی وغا میں کسی درعہ پوش سے
گرتی تھی تیغ ہاتھ سے اور ڈھال دوش سے
کچھ ہو سکا نہ رن میں کسی سرفروش سے
خود حرز بن گئی تھی وہ جوہر کے جوش سے
غل تھا چلی یہ جب وہ دامِ اجل میں ہے
تھا گو دعائے سیفی اسی کی عمل میں ہے

اللہ رے رعبِ نعرۂ مولائے خوش خصال
لرزاں تھیں برچھیاں قدمِ پیر کے مثال
لپٹی ہوئی تھیں پشت سے ڈھالوں کا تھا یہ حال
تیغوں کے جوہروں سے کھڑے ہوگئے تھے بال
گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں کمانیں مصاف میں
خنجر بھی مُنہ چھپائے ہوئے تھے غلاف میں

اُفتادہ تھے زمیں پہ نشانہائے سربلند
لاشوں سے راہ امن و اماں ہوگئی تھی بند
تھرّاتے تھے جوڑ سے لعینوں کے بند بند
پرچم علم کے کرتے تھے اعدا پہ ریش خند
جب سہم سہم کر قدر انداز روتے تھے
سوفار کے ہنسی سے نہ لب بند ہوتے تھے

ہر دم چمک دمک تھی زیادہ برش مزید
لوہے کو اس کے مان گیا لشکرِ یزید
اُس فوج میں بجا تھی جو تھی دہشتِ شدید
نازل اُسی کی شان میں ہے سورۂ حدید
سفاک تھی اوپی ہوئی تھی بے دریغ تھی
جو عرشِ ذوالجلال سے اُتری وہ تیغ تھی

گہ سر پہ گاہ سینے پہ گاہے گلو پہ تھی
جوہر کا تھا خیال نگہ آبرو پہ تھی
دریا پہ تھی نہ اُس کی نظر آبجو پہ تھی
ہاں تھی اگر تو جنگ میں رغبت لہو پہ تھی
کاوش سروں کو درپئے قتلِ عدو نہ ہوں
مطلب یہ تھا کہ معرکہ میں سرخرو ہوں

کاری جواں سپاہ کے ناکارہ ہو گئے
پانچوں حواس سبعۂ سیارہ ہو گئے
ٹکڑے کٹی کمانوں کے آوارہ ہو گئے
پیکانِ تیر غنچۂ صد پارہ ہو گئے
سرکی وہ جب کہ برچھیوں سے پھل گرا لیے
خنجر تو کیا تھے تیغوں نے بھی منہ پھرا لیے

گر طبع میں کسی کی روانی ہوئی تو کیا
کیا کہہ سکے گا تیز زبانی ہوئی تو کیا
بالفرض قوتِ ہمہ دانی ہوئی تو کیا
مثلِ انیس سحر بیانی ہوئی تو کیا
فقروں کا ذوالفقار کے مطلب ادا نہ ہو
کٹ جائے ساری عمر تو اُس کی ثنا نہ ہو

پھرتا ہے پتلیوں کے اشاروں پہ راہوار
اس صف کے بیچ میں ہو کبھی اس پرے کے پار
قربان اس جلال کے اس عزم کے نثار
اک ہاتھ میں ہے تیغ سپر اک میں استوار
انگشتِ مصطفےٰ ہے اُدھر بدر اس طرف
شمس الضحےٰ اُدھر ہے شبِ قدر اس طرف

دارالامانِ کعبۂ نصرت تھی وہ سپر
پشت و پناہِ شاہِ ولایت تھی وہ سپر
لاریب فیہ سایۂ رحمت تھی وہ سپر
حقا سوادِ اعظمِ شوکت تھی وہ سپر
پرتو فگن تھی یوں کبھی روئے جناب پر
آ جائے جیسے ابرِ سیہ آفتاب پر

آفت تھی ہر پرے میں لڑائی تھی ہر طرف
تلوار سے صفوں کی صفائی تھی ہر طرف
روحوں کی قالبوں سے جدائی تھی ہر طرف
پیغمبرِ خدا کی دوہائی تھی ہر طرف
دانتوں میں خس پکڑ کے عدو گڑگڑاتے تھے
شقّے علم کے امن کی چادر ہلاتے تھے

غل تھا کہ اے نبی کے نواسے اماں اماں
گرمی میں تین روز کے پیاسے اماں اماں
اب روک لے یہ ہاتھ وغا سے اماں اماں
سیّد بچا لے قہرِ خدا سے اماں اماں
یاں سے خطا اُدھر سے ہمیشہ عطا ہوئی
بچے کو ہم نے تیر سے مارا خطا ہوئی

نکلا سپاہِ شام سے بل کھا کے ایک گیو — قامت میں عمر زور میں مرحب قوی ہیں دیو
عفریت جس کے ڈر سے کرے دشت میں غریو — اقلیم مکر و مملکتِ خدع کا خدیو
بل ابروؤں پہ زخم بدن پر پڑے ہوئے — اکثر لڑائیوں میں عرب کی لڑے ہوئے

سر میں غرور دل میں بدی طبع میں فساد — بدکار و بدمزاج و سلح شور و بدنہاد
شبیرِ خدا سے بغضِ ولیِ آل سے عناد — کچھ دردِ دیں نہ رحم نہ ایماں نہ اعتقاد
پیرو تھا شمر کا تو ثنا خواں یزید کا — مرتد مُریدِ خاص تھا دیوِ مَرید کا

غصے میں ابنِ سعد سے بولا وہ روسیاہ — نامرد تجھ سا اور یہ سالاریِ سپاہ
خود بھاگ کر بتاتا ہے تو بھاگنے کی راہ — فوجوں کا کیا قصور ہے لشکر کا کیا گناہ
پُشتی پہ ہو رئیس تو بیشک وغا کریں — سردار پیشہ ہی نہ کرے گر تو کیا کریں

اُس سے یہ ڈر جو غم سے ہو خود مرگ کے قریب — تنہا نہ کوئی بھائی ہے جس کا نہ اب حبیب
محتاج و فاقہ کش وطن آوارہ و غریب — بیکس عزیز مردہ جفاکش بلا نصیب
دانہ سوائے اشک فشانی ملا نہیں — غربت میں تین روز سے پانی ملا نہیں

بازو شکستہ چھید جگر میں کمر میں خم — بیٹی کے رانڈ ہونے کا ماتم پسر کا غم
اک جان لاکھ تیر پہ تلواریں ایک دم — اب تک گرا نہیں یہ تھمے کس طرح قدم
طاقت نہ قلب میں ہے نہ ہاتوں میں زور ہے — پھر اس پہ الاماں کا ہزاروں میں شور ہے

اُس اضطراب میں پسرِ سعد نے کہا — لشکر کے پاؤں اُٹھ گئے میرا قصور کیا
دعوے مقابلہ کا اگر ہے تجھے تو جا — فرزندِ مرتضےٰ سے کچھ آساں نہیں وغا
قبضے میں اس کے زورِ خدا کے ولی کا ہے — تو ہی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہے

مغرور نے کہا کہ میں جاتا ہوں دیکھ تو — میداں میں رنگ جو دکھاتا ہوں دیکھ تو
حیدر کے دل کا خون بہاتا ہوں دیکھ تو — سر کاٹ کر حسین کا لاتا ہوں دیکھ تو
کیا بات ہے شکست ابھی دے کے آؤں گا — حمزہ کی ڈھال تیغِ علی لیکے آؤں گا

ڈھاٹا شقی نے باندھ کے کھولا کمند کو
نیچا کیا وہیں سے سنانِ بلند کو
قبضے پہ رکھ کے دستِ تعدی پسند کو
کوڑا کیا مثالِ تہمتن سمند کو
بڑھتے ہی اک غریو اٹھا اُس سپاہ سے
مرحب چلا نبرد کو شبیہِ الٰہ سے

کرّا کا کے اپنے گھوڑوں کو گرد آ گئے سوار
تھا ہیچ ہیں وہ اور حسینِ فلک وقار
فخریہ شعر پڑھ کے پکارا وہ نابکار
بسم اللہ اے نبیرۂ محبوبِ کردگار
افراسیاب و رستمِ میدانِ جنگ ہوں
شیرِ خدا ہیں آپ تو میں بھی پلنگ ہوں

چھپتے ہیں اژدہے مری دہشت سے غار میں
تمساح و شیرِ شرزہ جبال و بحار میں
رستم کو باندھ لیتا ہوں میں کارزار میں
سہراب ہیں یہ زور نہ اسفندیار میں
پھینکا ہے میں نے سامنے بزناؤ پھیر کے
ڈھالوں کو رویوں کی طرح چیر چیر کے

گیتی کے چار دانگ میں برپا ہے میرا شور
نیچے سے میں نے توڑ دیئے سرکشوں کے زور
بہرام ڈر سے کانپ رہا ہے میانِ گور
سیمرغ و فیل وہ پرِ پشہ یہ پائے مور
یاں زال کی نہ کچھ ہے حقیقت نہ گیو کی
تسمے سے باندھ لاتا ہوں گردن کو دیو کی

فرمایا آپ نے یہ تعلی ہے کیا ضرور
چپ رہ کہ تجھ کو پست کرے تیرا غرور
آپ اپنی مدح واہ رے کم ظرف بے شعور
تیرا نہیں یہ فہم غلط بیں کا ہے قصور
دعویٰ کوئی درست نہیں بے دلیل کے
جوہر کھنچے پہ کھلتے ہیں تیغِ اصیل کے

خوشبو کا اپنی گل نے کیا ہے کبھی بیاں
شیریں ہوں میں شکر کبھی کرتی ہے یہ عیاں
کھلتی ہے آپ مشک کی بو وقتِ امتحاں
کیسا جھکا ہے اتنی بلندی پہ آسماں
سایہ بڑا ہے تجھ سے بگولہ دراز ہے
البتہ خاکسار جو ہے سرفراز ہے

پیدا کیا ہے ایک سے بہتر خدا نے ایک
دارِ فنا میں کوئی جو بد ہے تو کوئی نیک
مانا کہ تو شجاع ہے سب سے فزوں ولیک
یہ سر عزیز ہے تو سرک جا قدم نہ ٹیک
گر فیل ہے تو آگے سلیماں کے مور ہے
اس دستِ رعشہ دار میں حیدر کا زور ہے

جھلی ہے سب یہ لاف و گزاف اے دروغ گو
افسانہ جانتے ہیں اسے ہیں شجاع جو

او ہرزہ کار جھوٹ نہ بک آبرو نہ کھو
مشہور ہے کہ ایک پہ بھاری ہیں ایک ہیں دو

روکے ہیں جس نے فوج کے ریلے ہمیں ہیں وہ
لڑتے ہیں لاکھ سے جو اکیلے ہمیں ہیں وہ

ہم اپنی جرأتوں کے گواہوں کو گر بلائیں
قرآن لیکے عرش سے قدسی زمیں پہ آئیں

خود اپنے پر کٹے ہوئے روح الامیں دکھائیں
بزدل جو ہیں وہ شیروں کی نظروں میں کیا سمائیں

پتھر پہ جوفِ نیزۂ حیدر کو دیکھ لے
کھل جائے گا ابھی درِ خیبر کو دیکھ لے

حملہ کیا یہ سنتے ہی ظلمت نے نور پر
پھینکی کمند آنکھ بچا کر حضور پر

آئی چمک کے تیغ جو اس پر غرور پر
گویا کہ برق کوند گئی کوہِ طور پر

قربان دستِ تیغِ شہِ ارجمند کے
کٹ کر اسی پہ جا پڑے حلقے کمند کے

خالی بڑھا کمانِ کیانی میں رکھ کے تیر
چلّے کو کھینچ لایا بناگوش تک شریر

داہنی طرف اڑا جو سمندِ فلک سریر
حلقے کے بیچ میں تھی زہے تیغِ بے نظیر

جوہر عجیب قطع کے اس کی زباں میں تھے
چلّہ نہ تیر میں تھا نہ گوشے کماں میں تھے

کعبہ ادھر تھا جلوہ نما اور ادھر کنشت
دو رخ تھا اس لعیں کی طرف اس طرف بہشت

نیزے کی ڈانڈ پر جو رکھا اس نے دستِ زشت
چمکی نئے طریق سے تیغِ قضا سرشت

ششدر رہی وہ فوج جو محوِ نظارہ تھی
راہیں بھی سب تھیں قطع سناں بھی دوپارہ تھی

پھر گرزِ گاؤسر کو اٹھایا شریر نے
لی ہاتھ میں سپر شہِ گردوں سریر نے

روکی وہ ضربِ ڈھال پہ اس قلعہ گیر نے
گویا دکھایا زور جنابِ امیر نے

ظالم کے ہوش سر سے اڑے کچھ نہ بن پڑی
یاں ہاتھ کج ہوا نہ جبیں پر شکن پڑی

داہنے میں لیکے تیغ کے ساتھ آپ نے سپر
جھٹکا دیا جو گرز کو بائیں سے تھام کر

گویا در آئے ناخنِ گیرائے شیرِ نر
دستِ لعیں سے چھوٹ گیا گرزِ گاؤسر

عاجز تھا ہر طرح وہ حسینؑ دلیر سے
یہ گاؤ زوریاں کہیں چلتی ہیں شیر سے

فرمایا خودسری نے تجھے کر دیا ہی کور
دیکھا ہمارے بازوئے زخمی کا تو نے زور
قوت وہ دے تو پیل کو پامال کرے مور
بیجا تھا یہ غرور یہ نخوت یہ زور و شور
انکارِ تیغِ برقِ تجلی نہ کیجیو
توبہ کر اب کلامِ تعلّی نہ کیجیو

مغرور نے حسام کو کھینچا مثالِ سام
منہ کھولے اژدہے کی طرح رہ گیا نیام
میدانیوں میں غل تھا کہ ہی روزِ ننگ و نام
ہاں اب لڑائے جان کو ای پہلوانِ شام
گو بن کے چند بار لڑائی بگڑ گئی
سکّہ ای پھر ترا جو کوئی ضرب پڑ گئی

مطلع

ای شہسوارِ ملکِ سخن صفدری دکھا
گیتی کو زلزلہ ہو وہ زور آوری دکھا
جمعیتِ سپاہ کی پھر ابتری دکھا
ہاں زور و شورِ معرکۂ حیدری دکھا
کٹ جائیں تنگ سینۂ اعدا فگار ہوں
پڑھنے میں دونوں لب جو کھلیں ذوالفقار ہوں

گھوڑا ہو واں جہاں نہ رسائی ہوا کی ہو
جو نکلے منہ سے لفظ وہ قدرت خدا کی ہو
مصرع ہر ایک تیغِ شہِ لافتا کی ہو
جو چوٹ ہو بندھی ہوئی مشکلکشا کی ہو
نقشا ہو صاف تیغِ علی کی صفائی کا
دکھلا دوں ہر ورق میں مرقع لڑائی کا

یوں کوند کوند کر صفِ اعدا پہ آئے جائے
ہر استخواں کو مثلِ ہما تیغ کھائے جائے
جب تک کہ دم ہی خون کا دریا بہائے جائے
بے جوہروں کو جوہرِ ذاتی دکھائے جائے
غل ہو نزاع اٹھ گئی فتنہ فرو ہوا
ٹکڑے گریں زمیں پہ تو جانے کہ دو ہوا

ای تیغِ آبدار زباں اور تیز ہو
سرگرمِ کشت و خون و قتال و ستیز ہو
دریا لہو کا وادیِ ہنگامہ خیز ہو
لگ جائے آگ دشت میں یوں شعلہ ریز ہو
کوثر علی سے پاؤں گا حلہ بتول سے
ہاں جنگ فتح کر کے صلہ لوں رسول سے

جب حکم ہو کہ مانگ لے کیا مانگتا ہی تو
گر گر کہوں قدم پہ کہ دنیا میں آبرو
ارشاد اگر ہو اور بھی کوئی ہی آرزو
اس دم کروں یہ عرض کہ یا شاہِ نیکخو
سب کچھ ہی اختیارِ شہِ مشرقین میں
مسکن جناں میں قبر جوارِ حسین میں

مرحب اُدھر ہے شبیر کا فرزند اس طرف
عمر اُس طرف نبی کا جگر بند اس طرف
اُس سمت ہے غلام خداوند اس طرف
کلمے غرور کے ہیں اُدھر پند اس طرف
ناصر کہاں عزیزوں کی لاشیں بھی دور ہیں
تلوار ہے سپر ہے فرس ہے حضور ہیں

گھوڑے کو اُس نے گشت ٹپالا پہ دور دور
کس غیظ سے ہلانے لگا سیف بے شعور
سن سن ہوا پہ ہاتھ لگا کرنے وہ پُرغرور
انیاں بتا رہا تھا وہیں سے سوئے حضور
جب اُس کے ساتھ کے سفہا غل مچاتے تھے
رہ رہ کے قبلۂ دوجہاں مسکراتے تھے

تعریفِ بے محل نے بڑھایا جو اُس کا دل
گھوڑا اُڑا کے آگیا حضرت کے متصل
دونوں طرف سے چلنے لگے وار جاں گسل
تیغوں کی برق و شرق سے بجلی ہوئی خجل
عبرت ہوئی کہ خون شجاعوں کے گھٹ گئے
ڈھالوں کے پُرزے اُڑ گئے دستانے کٹ گئے

ٹوٹی وہ تیغ ادھر یہ چمک کر اُدھر گئی
پستی سے یہ پھری تو وہ بالائے سر گئی
بجلی سی کوند کر یہ بڑھی وہ ٹھہر گئی
ندی تھی ایک دم میں چڑھی اور اُتر گئی
آنچ اس کے تیوروں کو شقی کے جلاتی تھی
اُس تیغ کی ہوا بھی یہاں پر نہ آتی تھی

سیماب تھا ہوا تھا چھلاوا تھا راہوار
اُس کو نہ چین تھا نہ اسے ایک جا قرار
قربانِ ذوالجناحِ شہنشاہِ نامدار
جاتا تھا یوں حریف کے گھوڑے پہ بار بار
جس طرح جائے شیر گرسنہ غزال پہ
ہر بار تھیں کلائیاں گھوڑے کے یال پر

ملتی ہوئی کنوتیاں لال آنکھیں منہ میں کف
بجلی سا اس طرف تھا کبھی گاہ اُس طرف
حیراں تھی اس کی تیزروی پر اُدھر کی صف
نتھنوں سے تھی نفس کی صدا یا شہِ نجف
ظالم سے معرکہ جو پڑا تھا لڑائی کا
مطلب یہ تھا کہ وقت ہے مشکلکشائی کا

گھوڑا کبھی نہ پھول کی جس پر چھڑی پڑی
کھولی گرہ وہ تیغ نے جب پھلجھڑی پڑی
ضرب اُس کی جو پڑی تو زرہ پر کڑی پڑی
فوجوں میں شور تھا کہ لڑائی بڑی پڑی
قوت علی کی ہاتھ میں ہے اس دلیر کے
کیونکر بچائیں صید کو پنجے سے شیر کے

تلوار اُدھر چمک کے چلی آنکھ ادھر لڑی　　پتلی سے پتلی اور نظر سے نظر لڑی
آری تھی وہ جو تیغ سے تیغِ دوسر لڑی　　آپ اس قدر بڑھی کہ سپر سے سپر لڑی
ظالم کے سر پہ تیغ کا قبضہ جو پھر پڑا　　جھجکا تو خود فرقِ ستم گر سے گر پڑا

بولے یہ مسکرا کے حسینِ فلک حشم　　تھا وا اسر سری سروگردن کو کر نہ خم
جھک کر اُٹھا لے خود جو ہی سرزنش کا غم　　سر جنگ ہو چلی نہ اُٹھانا بس اب قدم
آجم کے لڑ کہ ہم بھی تو دیکھیں ہنر ترا　　بھاگا تو پاؤں گھوڑے کے ہوں گے نہ سر ترا

کھینچی جو اس نے باگ سمٹنے لگا سمند　　سمجھے امام پاک کہ بھاگا یہ خود پسند
گر یوں نکل گیا تو کہیں گے یہ ہوشمند　　کس فکر میں تھے شاہ عدو گیر و صید بند
بے زخم کھائے صاف جفا جو نکل گیا　　پہنچے ہیں آکے شیر کے آہو نکل گیا

مغفر اُٹھا کے تیغ سے بولے امامِ دیں　　لے جنگ سراد فرق پہ رکھ خودِ آہنیں
شہ کی طرف اُٹھا کے بصد غیظ تیغ کیں　　مغفر کو بائیں ہاتھ سے لینے لگا لعیں
دیتے ہی خود دستِ مبارک جو مڑ گیا　　مغفر تو ہاتھ میں رہا سر تن سے اُڑ گیا

پستی میں آئی بڑھ کے جو وہ تیغ پر شرر　　گھوڑے کے پاؤں کٹ گئے مثلِ خیارِ تر
اسوار جو کھڑے تھے وہ بھاگے اِدھر اُدھر　　پھر پھر کے اضطراب میں کہتے تھے اہلِ شر
بھاگو جلا نہ دے کہیں آنچ اس کی دھار کی　　بیچھلے کئے ہوئے ہے چمک ذوالفقار کی

فاقے میں دیر تک جو لڑے شاہِ تشنہ کام　　غرقِ عرق تھے کانپ رہا تھا بدن تمام
ہاتھوں سے چھوڑ دی تھی جو رہوار کی لگام　　آنکھیں تھیں بند ہانپتا تھا اسپِ تیز گام
غش میں سوارِ دوشِ نبی کا یہ حال تھا　　بے تھامے خود فرس سے اُترنا محال تھا

دیکھا جو یہ کہ بھاگ گئے رن سے حیلہ ساز　　تلوار رکھ کے میان میں بولے شہِ حجاز
مہلت ہے ای حسین پڑھو عصر کی نماز　　یہ آخری ہی بندگیِ ربِ بے نیاز
فکرِ نجاتِ اُمتِ خیر البشر کرو　　سوکھی زباں کو ذکرِ الٰہی میں تر کرو

ناگاہ سوئے لاشِ پسر جا پڑی نظر
چلّائے دل کو تھام کے سلطانِ بحر و بر
اکبرؑ اٹھو کہ گھوڑے سے گرتا ہے اب پدر
سوتے ہو تم دھرے ہوئے رخسار خاک پر
بھولے پدر کو نیند میں قربان آپ کے
آؤ نماز عصر پڑھو ساتھ باپ کے

بیٹے ہو تم امام کے پوتے امام کے
کام آؤ مرتے دم پدرِ تشنہ کام کے
آتے ہیں پھر پلٹ کے پرے فوجِ شام کے
بٹھلا دو قبلہ رو مجھے ہاتھوں کو تھام کے
جاتی ہے نماز بھی اعدا جو پھر پڑیں
رعشہ ہے خود فرس سے جو اُتریں تو گر پڑیں

عباسِ نامدار ترائی سے اُٹھ کے آؤ
پھکتا ہے قلب جل رہے ہیں سب جگر کے گھاؤ
چھڑکو مری زرہ پہ جو پانی کہیں سے پاؤ
چلتے ہوئے عدم کے مسافر سے مل تو جاؤ
ہم سب کے کام آئے ہیں بیٹھے ہیں روئے ہیں
بارہ پہر ہوئے کہ نہ لیٹے نہ سوئے ہیں

کیا با فضا یہ سرد ترائی ہے اب اُٹھو
ہم جاں بلب ہیں ختم لڑائی ہے اب اُٹھو
نرغے میں فوجِ ظلم کے بھائی ہے اب اُٹھو
عباس دھوپ چہرے پہ آئی ہے اب اُٹھو
غفلت کی تم کو نیند ہے شبّیر کیا کرے
میری طرح کسی کو نہ بیکس خدا کرے

تم جب سے چھوٹے ساعد و بازو میں درد ہے
گردن میں سر میں آنکھ میں ابرو میں درد ہے
دل میں کمر میں سینے میں پہلو میں درد ہے
رگ رگ میں کیا ہر ایک بنِ مو میں درد ہے
ہر مرتبہ لڑے ہیں لہو میں نہائے ہیں
پیری میں نوجوانوں کے لاشے اُٹھائے ہیں

چلّایا فوج کو پسرِ سعدِ نابکار
لو رکھ لی میان میں شہِ والا نے ذوالفقار
پلٹے پرے سواروں کے لیکر رسالہ دار
دو غول باندھے آئے کماندار دس ہزار
تیر افگنوں میں تیغوں میں بھالوں میں گھر گئے
تنہا حسین برچھیوں والوں میں گھر گئے

فریاد ہے وہ فوج کا دل اور اک حسین
وہ بے شمار تیغوں کے پھل اور اک حسین
وہ تیر جاں ستاں وہ جدل اور اک حسین
وہ سیکڑوں پیامِ اجل اور اک حسین
فوجوں میں شام کی مہِ تاباں گھرا ہوا
بیکس بھی وہ کہ جس سے زمانہ پھرا ہوا

ڈوبے ہوئے تھے خون میں گیسو حسین کے
زخمی ہیں دونوں ساعد و بازو حسین کے
تیغیں اوپی ہوئی جو برابر سے چل گئیں
آنکھوں پہ کٹ کے آ پڑے ابرو حسین کے
تیروں نے چھان ڈالے تھے پہلو حسین کے
غش آ گیا قدم سے رکابیں نکل گئیں

سیّد کے مرتبے کو نہ جانا ہزار حیف
شانے تھے ناوکوں کا نشانا ہزار حیف
ٹوٹے تھے سب رسول کے پیارے حسین پر
تیروں سے صدرِ پاک کو چھانا ہزار حیف
مظلوم کو وہ برچھیاں کھانا ہزار حیف
کیا وقت پڑ گیا تھا تمھارے حسین پر

گرتے ہیں آپ کون سنبھالے کوئی نہیں
بے جاں پڑے ہیں گود کے پالے کوئی نہیں
بے کس ہیں اور سامنا فوجِ عدو کا ہے
سینے سے کون تیر نکالے کوئی نہیں
سب مر چکے ہیں چاہنے والے کوئی نہیں
منہ جس کا دیکھتے ہیں وہ پیاسا لہو کا ہے

کیونکر کہوں کہ عرشِ خدا خاک پر گرا
سرتاجِ بادشاہ و گدا خاک پر گرا
وہ ڈیڑھ ہزار زخم تنِ چاک چاک پر
خیر النسا کا ماہ لقا خاک پر گرا
زیں سے اُلٹ کے راہ نما خاک پر گرا
کیا گزری ہوگی جبکہ گرے ہوں گے خاک پر

ٹکڑے جدا ہیں حال یہ ہے تن کا ہے غضب
پانی کا واں ہے کام کہ آہن کا ہے غضب
اُس کے شریکِ ذبح میں بارہ شریر ہیں
اب مرحلہ ہے خنجر و گردن کا ہے غضب
لو سامنا ہے شمر سے دشمن کا ہے غضب
یاں اک گلا ہے جس پہ کئی زخم تیر ہیں

فضہ نے جا کے خیمے میں رانڈوں کو دی خبر
بستر سے اُٹھ کے گر پڑے سجادِ نوحہ گر
گر گر کے دوڑتی تھیں کہ مل لوں حسین سے
ہے ہے مرے خزادہ کا کٹتا ہے تن سے سر
خیمے سے نکلیں بی بیاں بچّوں کو چھوڑ کر
ہلتا تھا عرش حضرتِ زینب کے بین سے

مانندِ آفتاب لرزتا تھا جسمِ پاک
سر پر عصا نہ پاؤں میں نعلین نے ردا پہ خاک
عابد کا نورِ عین رواں تھا مے ساتھ تھا
جائیں کدھر وہ فوج وہ صحرائے ہولناک
لٹکے ہوئے تھے دونوں طرف پیرہن کے چاک
اک ہاتھ میں یتیم سکینہ کا ہاتھ تھا

چلاتی تھی ارے مرا بھائی ہے کس طرف
لوٹی ہوئی علی کی کمائی ہے کس طرف
دریا کدھر ہے خوں کا ترائی ہے کس طرف
سونے کی جا حسین نے پائی ہے کس طرف
رستا دے اے زمیں کہ فلک کی ستائی ہوں
میں اپنے پیارے بھائی سے ملنے کو آئی ہوں

ریتی پہ مصطفےٰ کے جگر کا لہو گرا
اے آسماں زمیں پہ اب تک نہ تو گرا
سیّد گرا امام گرا نیک خو گرا
وہ کعبۂ زمین و زماں قبلہ رو گرا
تاب اُٹھنے بیٹھنے کی کہاں ہاتھ پاؤں میں
شاید نماز پڑھتے ہیں تیغوں کی چھاؤں میں

میں سیّدہ ہوں رحم مری بیکسی پہ کھاؤ
اے اہل قریہ بنتِ نبی کی مدد کو آؤ
دُنیا میں تم خوشی رہو عقبیٰ میں چین پاؤ
سیّد کدھر ہے خون میں غلطاں مجھے بتاؤ
یاں لٹ گئے فلک نے یہ دُکھ ہم پہ ڈالے ہیں
اے بھائیو مدینے کے ہم رہنے والے ہیں

آتی تھی جس میں وحی وہ گھر ہے ہمارا گھر
علمِ نبی کے شہر کا در ہے ہمارا گھر
تاروں میں برجِ شمس و قمر ہے ہمارا گھر
تیغِ عذابِ حق کی سپر ہے ہمارا گھر
حاکم ہے برخلاف وطن ہم سے چھٹ گیا
ہے ہے وہی بھرا ہوا گھر آج لُٹ گیا

بے خانماں ہے تشنہ دہن ہے غریب ہے
بیکس ہے داغ دیدہ ہے آفت نصیب ہے
اب دوست ہے کوئی نہ کوئی اب حبیب ہے
اپنے وطن سے دور ہے تم سے قریب ہے
تم سب کو پاس چاہیئے اس ذی وقار کا
خادم یہ ہے تمھارے نبی کے مزار کا

اے قبرِ مصطفےٰ کے مجاور ترے نثار
اے بیکس و غریب و مسافر ترے نثار
اے تشنہ کام و صابر و شاکر ترے نثار
اے دینِ حق کے حامی و ناصر ترے نثار
آئے تھے کربلا میں شہادت کے واسطے
اک دن میں گھر لٹا دیا اُمّت کے واسطے

صدقے ہیں تیری لاش کے اے گلبدن حسین
اے تشنہ لب حسین غریب الوطن حسین
اے جاں بلب حسین امامِ زمن حسین
اے فاقہ کش حسین اسیرِ محن حسین
پیاسے گلے سے خنجرِ شمرِ لعیں ملا
پانی بھی مرتے وقت ملا یا نہیں ملا

شہ کے کراہنے کی جو آنے لگی صدا
دیکھا بہن نے بھائی کا کٹتے ہوئے گلا
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے گری بنتِ مرتضےٰ
دوڑی اُدھر نبی کی نواسی برہنہ پا
غم سے کلیجہ پھٹ گیا زہرا کی جائی کا
اس نے جو دیکھا نیزے پہ سر اپنے بھائی کا

بس اے انیسؔ قلب و جگر کو نہیں قرار
آگے نہ لکھ مصیبتِ شبیرؑ نامدار
رعشہ ہے دست و پا میں لرزتا ہے جسمِ زار
یہ بزم اور یہ آج کا پڑھنا ہے یادگار
وہ یوں پڑھے جسے نہ ہو طاقت کلام کی
تائید ہے حسین علیہ السّلام کی

رباعی

شمعوں کی طرح دلوں کو جلتے دیکھا
آہوں کا دھواں مُنہ سے نکلتے دیکھا
افسوس کہ مہماں ہیں بنی قاسم سے
دیکھا جسے اس کو ہاتھ ملتے دیکھا

رباعی

کس غم میں یہ ذلت ہے جو اس غم میں ہے
سینے کو سرورِ شہ کے ماتم میں ہے
ہر چشم یہ کہتی ہے دکھا کر دُرِ اشک
رونے کا مزا ماہِ محرّم میں ہے

مرثیہ (۱۸)

کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا
کیا درد ہے جز دل کوئی محرم نہیں جس کا
کیا داغ ہے جلنا کوئی دم کم نہیں جس کا
کیا غم ہے کہ آخر کبھی ماتم نہیں جس کا
کس داغ میں صدمہ ہے فراقِ تن و جاں کا
وہ داغ ضعیفی میں ہے فرزندِ جواں کا

جب باغِ جہاں اکبرِ ذی جاہ سے چھوٹا
پیری میں برابر کا پسر شاہ سے چھوٹا
فرزندِ جواں ابنِ ید اللہ سے چھوٹا
کیا اخترِ خورشید لقا ماہ سے چھوٹا
تصویرِ غم و درد سراپا ہوئے شبیرؑ
ناموس میں ماتم تھا کہ تنہا ہوئے شبیرؑ

ہے ہے علی اکبر کا اُدھر شور تھا گھر میں
اندھیر تھی دُنیا شہِ والا کی نظر میں
فرماتے تھے سوزش ہے عجب داغِ پسر میں
اُٹھتا ہے دھواں آگ بھڑکتی ہے جگر میں
ہنگامِ اجل اکبرِ ناشاد کا غم ہے
عاجز ہے بشر جس سے وہ اولاد کا غم ہے

اُس گیسوؤں والے کے بچھڑ جانے نے مارا
افسوس بڑھا ضعف گھٹا زور ہمارا
دُنیا میں محمد کا یہ ماتم ہے دوبارا
عالم سے عجب جانِ جہاں آج سدھارا
چادر بھی نہیں لاشۂ فرزندِ حسین پر
کس عرش کے تارے کو سُلا آئے زمیں پر

پیری پہ میری رحم کر اے خالقِ ذوالمن
طے جلد ہو اب مرحلۂ خنجر و گردن
قتلِ علی اکبر کی خوشی کرتے ہیں دُشمن
تجھ پر مرے اندوہ کا سب حال ہے روشن
مظلوم ہوں مجبور ہوں مجروح جگر ہوں
تو صبر عطا کر مجھے یارب کہ بشر ہوں

پھر لاشۂ اکبر نظر آئے تو نہ روؤں
برچھی جو کلیجے میں در آئے تو نہ روؤں
دل دردِ محبت سے بھر آئے تو نہ روؤں
سو بار جو منہ تک جگر آئے تو نہ روؤں
شکوہ نہ زباں سے غمِ اولاد میں نکلے
دم تن سے جو نکلے تو تری یاد میں نکلے

اِک عمر کی دولت تھی جسے ہاتھ سے کھویا ہر وقت رہا ہیں تری خوشنودی کا جویا
پالا جسے گودی میں وہ یوں خاک پہ سویا ہیں لاش پہ بھی خوف سے تیرے نہیں رویا
قسمت نے جوانوں کو سبکدوش کیا ہے مجھ کو تو اجل نے بھی فراموش کیا ہے

اس حال سے روتے ہوئے داخل ہوئے گھر میں تر تھی تنِ انور کی قبا خونِ پسر میں
سوزش دلِ پُرداغ میں تھی درد جگر میں خم آگیا تھا بارِ مصیبت سے کمر میں
پنہاں تھا جو فرزندِ جگربند نگہ سے موتی رُخِ انور پہ ٹپکتے تھے مژہ سے

بانو سے کہا رو کے خوشا حال تمھارا صرفِ رہِ معبود ہوا مال تمھارا
مقبول ہوئی نذر یہ اقبال تمھارا سجدے کرو پروان چڑھا لال تمھارا
دل خوں ہو کلیجے میں سناں کھا کے پھرے ہیں ہم اُس کی امانت اُسے پہنچا کے بھلے ہیں

جیتے تھے تو آخر علی اکبر بھی مرتے گر بیاہ بھی ہوتا تو زمانے سے گزرتے
سینے سے کلیجے کو جدا ہم جو نہ کرتے بگڑے ہوئے اُمت کے نہ پھر کام سنورتے
گر حلق سے اس شیر کے شمشیر نہ ملتی یہ اجر نہ ہاتھ آتا یہ توقیر نہ ملتی

اکبر نے تو جاں اپنی جوانی میں گنوائی تھی کونسی ایذا جو نہ اُس لال نے پائی
افسوس کہ پیری میں ہمیں موت نہ آئی تلوار نہ سر پر نہ سناں سینے پہ کھائی
غم کھائینگے خونِ دلِ مجروح پئیں گے کیا زور ہے جب تک وہ جلائے گا جیئنگے

دستور ہے مرتا ہے پدر آگے پسر کے پہلے وہ اُٹھے تھامنے والے تھے جو گھر کے
اب کون اُٹھائے گا جنازے کو پدر کے افسوس لحد بھی نہ ملے گی ہمیں مر کے
سر نیزے پہ اور دشت میں تن ہوگا ہمارا خاک اُڑ کے پڑے گی یہ کفن ہوگا ہمارا

زینب سے کہا رختِ کہن لاؤ تو پہنیں ملبوسِ شہنشاہِ زمن لاؤ تو پہنیں
موت آگئی اب سر پہ کفن لاؤ تو پہنیں کپڑے جو پھٹے ہوں وہ بہن لاؤ تو پہنیں
سر کٹ کے جو تن وادیِ پُرخار میں رہ جائے شاید یہی پوشاک تنِ زار میں رہ جائے

اللہ نے بچپن میں مرے ناز اُٹھائے
طفلی میں کسی نے شرف ایسے نہیں پائے
عریاں تھا کہ جبریلِ امیں عرش سے آئے
فردوس کے حُلّے مرے پہنانے کو لائے
بیکس ہوں دل افگار ہوں آوارہ وطن ہوں
میں ہوں وہی شبیرؑ کہ محتاجِ کفن ہوں

ناشاد بہن پاؤں پہ گر گر یہ پکاری
ماں جائے برادر تری غربت کے میں واری
بن بھائی کی ہوتی ہے یداللہ کی پیاری
گھر لُٹ گیا کیونکر نہ کروں گریہ و زاری
رونے کو نجف تک بھی کھلے سر نہ گئی میں
خالی یہ بھرا گھر ہوا اور مر نہ گئی میں

بچپن تھا کہ اماں سے ہوئی پہلے جُدائی
نانا کے لیے ماتمی صف میں نے بچھائی
روتی تھی پدر کو کہ سفر کر گئے بھائی
یثرب بھی چھٹا دیس سے پردیس میں آئی
غم دیکھوں بڑے بھائی کا ماں باپ کو روؤں
قسمت میں یہ لکھا تھا کہ میں آپ کو روؤں

فرمایا کہ دُنیا میں نہیں موت سے چارا
رہ جاتے ہیں ماں باپ بچھڑ جاتا ہے پیارا
ہجرِ علی اکبر تھا کسی کو بھی گوارا
وہ مر گئے اور کچھ نہ چلا زور ہمارا
دیکھا جسے آباد وہ گھر خاک بھی دیکھو
اب خاتمۂ پنجتنِ پاک بھی دیکھو

کس کس کی نہ دولت پہ زوال آ گیا زینب
پابندِ رضا تھا تو شرف پا گیا زینب
دُنیا سے گیا جو تنِ تنہا گیا زینب
کھلتا نہیں وہ پھول جو مرجھا گیا زینب
جو منزلِ ہستی سے گیا پھر نہیں ملتا
یہ راہ وہ ہے جس کا مسافر نہیں ملتا

میں کون ہوں اک تشنہ لب و بیکس و محتاج
بندہ تھا خدا کا سو ہوا ہوں میں طلب آج
وہ کیا ہوئے جو لوگ تھے کونین کے سرتاج
نہ حیدرِ کرّار ہیں نہ صاحبِ معراج
کچھ پیٹنے رونے سے نہ ہاتھ آئے گا زینب
آیا ہے جو اس دہر میں وہ جائے گا زینب

کس طرح وہ بیکس نہ اجل کا ہو طلبگار
ناصر نہ ہو جس کا کوئی دُنیا میں نہ غمخوار
اک جانِ حزیں لاکھ مصیبت میں گرفتار
اکبر ہیں نہ قاسم ہیں نہ عباس علمدار
کوشش ہے کہ سجدہ تہِ شمشیر ادا ہو
تنہائی کا مرنا ہے خدا جانیے کیا ہو

قاتل جو چھری خشک گلے پر مرے پھیرے — خالص رہے نیت کوئی تدبیر نہ گھیرے
کٹتے میں رگوں کے یہ سخن لب پہ ہو میرے — قربان حسین ابن علی نام پہ تیرے
بہنوں کی نہ ہو فکر نہ بچوں کی خبر ہو — اس صبر سے سر دوں کہ مہم عشق کی سر ہو

فرما کے یہ ہتھیار سجے آپ نے تن پر — غل پڑ گیا شاہِ شہدا چڑھتے ہیں رن پر
احمد کی قبا آپ نے پہنی جو کفن پر — پیدا ہوا اک جلوۂ نو رختِ کہن پر
اللہ ری خوشبو تنِ محبوبِ خدا کی — پھولوں کی مہک آ گئی کلیوں سے قبا کی

وہ پھول سے رخسار گلابی وہ عمامہ — تعریف میں خود جس کی سر افگندہ ہے خامہ
وہ زرد عبا نور کی وہ نور کا جامہ — برسوں جو لکھیں ختم نہ ہو مدح کا نامہ
کپڑے تنِ گلرنگ کی خوشبو سے بسے تھے — ڈوٹی کمر اُمت کی شفاعت پہ کسے تھے

شمشیر یداللہ لگائی جو کمر سے — سر پیٹ کے زینب نے ردا پھینک دی سر سے
سمجھاتے ہوئے سب کو چلے آپ جو گھر سے — بچوں کی طرف تکتے تھے حسرت کی نظر سے
اُس غل میں جدا اُن سے نہ ہوتی تھی سکینہ — پھیلائے ہوئے ہاتھوں کو روتی تھی سکینہ

شہ کہتے تھے بی بی ہمیں رو کر نہ رُلاؤ — پھر پیار کریں ہم تمھیں مُنہ آگے تو لاؤ
وہ کہتی تھی ہمراہ مجھے لے لو تو جاؤ — میں کیا کروں میداں میں اگر جا کے نہ آؤ
نیند آئے گی جب آپ کی بو پاؤں گی بابا — میں رات کو مقتل میں چلی آؤں گی بابا

فرمایا نکلتی نہیں سیدانیاں باہر — چھاتی پہ سُلائیں گی تمھیں رات کو مادر
وہ کہتی تھی سوئیں گے کہاں پھر علی اصغر — فرماتے تھے بس ضد نہ کرو صدقے میں تم پر
شب ہوئے گی ور بہشت میں ہم سوئیں گے بی بی — اصغر مرے ساتھ آج وہیں سوئیں گے بی بی

وہ کہتی تھی بس دیکھ لیا آپ کا بھی پیار — ہیں آپ سے بولوں گی نہ اب یا شہِ ابرار
اچھا نہ اگر کیجیے جلد آنے کا اقرار — مر جائے گی اس شب کو تڑپ کر یہ دلِ افگار
کیسی ہیں یہ باتیں مرا دل روتا ہے بابا — گھر چھوڑ کے جنگل میں کوئی سوتا ہے بابا

اصغر کبھی ساتھ آپ کے اب تک نہیں سوئے
بہلا لیا اماں نے اگر چونک کے روئے
شفقت تھی مجھی پر کہ یہ بے چین نہ ہوئے
یہ پیار ہو جس پر اسے یوں ہاتھ سے کھوئے
جیتے رہیں فرزند کہ سب لختِ جگر ہیں
ہیں آپ کی بیٹی ہو وہ اماں کے پسر ہیں

شہ کہتے تھے صدمہ دلِ مضطر پہ ہے بی بی
ہنگام سے تباہی میرے سب گھر پہ ہے بی بی
اعدا کا یورش سبطِ پیمبر پہ ہے بی بی
جس نے تمھیں پیدا کیا وہ سر پہ ہے بی بی
چھوٹے نہ وہ جو صبر کا جادہ ہے سکینہ
ماں باپ سے پیار اس کا زیادہ ہے سکینہ

لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کی جانی
کچھ دیتی ہو عباس کو پیغام زبانی
اودے ہیں لبِ لعل یہ ہے تشنہ دہانی
ملتا ہے تو بی بی کے لیے لاتے ہیں پانی
محبوب الٰہی کے نواسے ہیں سکینہ
ہم بھی تو کئی روز کے پیاسے ہیں سکینہ

دنیا ہے یہ شادی ہے کبھی اور کبھی آلام
راحت کی کبھی صبح مصیبت کی کبھی شام
یکساں نہیں ہوتا کبھی آغاز کا انجام
وہ دن گئے کرتی تھیں جو اس چھاتی پہ آرام
ضد کر کے نہ اب رات کو رویا کرو بی بی
جب ہم نہ ہوں تم خاک پہ سویا کرو بی بی

سمجھا کے چلے آپ سکینہ کو غش آیا
غل تھا کہ اٹھا سر سے شہنشاہ کا سایا
ڈیوڑھی سے جو نکلا اسد اللہ کا جایا
رہوارِ سبک سیر کو روتا ہوا پایا
کس عالم تنہائی میں سید کا سفر تھا
بھائی نہ بھتیجا نہ ملازم نہ پسر تھا

سائے کی طرح جو نہ جدا ہوتی تھی دم بھر
وہ رات کی جاگی ہوئی سوتی تھی زمیں پر
گردوں کی طرف دیکھ کے فرماتے تھے سرور
تو سر پہ ہے تنہا نہیں فرزندِ پیمبر
کچھ کام نہ اس بیکس و ناشاد سے ہوگا
جو ہوگا وہ مولا تری امداد سے ہوگا

فرماتے یہ مولا جو قریب فرس آئے
نصرت کو صفیں باندھے ملک پیش و پس آئے
فریاد کناں جن بھی مثالِ جرس آئے
جنگل سے ہٹے پانچ جو وحشی تو دس آئے
ڈھالیں لیے سب ہاتھوں کو قبضوں پہ دھرے تھے
لشکر سے جنوں کے بھی کئی دشت بھرے تھے

تھی قوم بنی جان بھی سرداری کو حاضر
فوجوں کے طلائے تھے نبرداری کو حاضر
لشکر تھا فرشتوں کا جگرداری کو حاضر
جبریل تھے خود غاشیہ برداری کو حاضر
تولے ہوئے نیزوں کو لڑائی پہ تلے تھے
رہوار تو ابلق تھے علم سبز کھلے تھے

اصرار کیا سب نے پہ حضرت نے نہ مانا
جز حق مدد غیر کو رد کرتے ہیں دانا
وہ شاہ کہ جس کے ید قدرت میں زمانا
کون آیا گیا کون یہ مطلق بھی نہ جانا
بندہ وہی بندہ ہے جو راضی ہو رضا پر
اوروں سے اُسے کیا جسے تکیہ ہو خدا پر

کی عرض ملائک نے کہ یا سیدِ ابرار
ہم آپ کے نانا کی مدد کرتے تھے ہر بار
فرمایا وہ خواہاں تھے کہ مغلوب ہوں کفّار
میں اپنی شہادت کا خدا سے ہوں طلبگار
جان آج ہماری کسی صورت نہ بچے گی
بالفرض بچا میں تو پھر اُمّت نہ بچے گی

زعفر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی
ہو حکم تو لے آؤں ابھی نہر سے پانی
کچھ کام تو لے اے اسد اللہ کے جانی
فرمایا کہ مطلق نہیں اب تشنہ دہانی
دریا جو خود آئے گا تو لب تر نہ کروں گا
احمد کا نواسا ہوں تو پیاسا ہی مرونگا

جس وقت فلک پر ہو عیاں ماہِ محرّم
ہر تعزیہ خانے میں بپا ہو مرا ماتم
جو بی بیاں ہیں روئیں گھروں میں مجھے باہم
مردوں میں یہ ہو شور کہ ہے ہے شہِ عالم
سب پیر و جواں روئیں یہ انجام ہو میرا
مظلوم حسین ابن علی نام ہو میرا

دُنیا میں مرے گا جو کسی شخص کا بھائی
یاد آئے گی عباس کی اور میری جُدائی
جان اپنی بھتیجے نے کسی کے جو گنوائی
روئے گا کہ قاسم نے سناں سینہ پہ کھائی
اولاد کا ماتم جسے ناشاد کرے گا
اکبر کے جواں مرنے کو وہ یاد کرے گا

دس روز شب و روز ہو غل ہائے حسینا
صدقے ترے اے فاطمہ کے جائے حسینا
زخمِ تبر و تیر و سناں کھائے حسینا
سب پانی پئیں اور نہ تو پائے حسینا
جب پانی پئیں اشک فشانی کو نہ بھولیں
بچّے بھی مری تشنہ دہانی کو نہ بھولیں

زینب نے پکارا میرے ماں جائے برادر
ناشاد بہن لینے رکاب آئے برادر
اب کوئی مددگار نہیں ہائے برادر
صدقے ہو بہن گر تمھیں پھر پائے برادر
غش آئے گا دو گام پیادہ جو بڑھو گے
اس ضعف میں رہوار پہ کس طرح چڑھو گے

حضرت نے صدا دی کہ نہ خواہر نہ نکلنا
جب تک کہ میں زندہ ہوں باہر نہ نکلنا
للہ بہن کھولے ہوئے سر نہ نکلنا
سر کھول کے کیا اوڑھ کے چادر نہ نکلنا
کیا تم نے کہا دل مرا ٹھہرا گیا زینب
بھائی کی مناجات میں فرق آگیا زینب

رخصت ہوئے روتے ہوئے سارے ملک و جن
گھوڑے پہ چڑھا تھم کے وہ کونین کا محسن
آفت کا وہ تھا وقت قیامت کا وہ تھا دن
سایا نہ کسی جا تھا نہ پانی کہیں ممکن
عباس کے حملے جو لعیں دیکھ چکے تھے
دریا بھی نظر بند تھا یوں گھاٹ رکے تھے

وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
وہ گرم زرہ اور وہ ہتھیاروں کا جلنا
وہ گرد کا مقتل میں تتق لوں کا وہ چلنا
وہ بن میں پہاڑوں سے شراروں کا نکلنا
گرمی سے فرس میں بھی نہ وہ تیزتگی تھی
پیاسے تھے حسین آگ زمانے کو لگی تھی

فوجوں کے برابر جو شہ بحر و بر آئے
اللہ ری تمازت کہ پسینے میں تر آئے
غصّے میں جو ہلتے ہوئے ابرو نظر آئے
غل تھا کہ علی تول کے تیغِ دوسر آئے
حسنِ خمِ ابرو تھا دوبالا مہِ نو سے
چہرے میں زیادہ تھی ضیا مہر کی ضو سے

چہرہ وہ کہ رضواں تو دکھائے چمن ایسے
جنّت کے گلستاں میں نہیں گلبدن ایسے
لب بند ہوئے جاتے ہیں شیریں دہن ایسے
ہر شور جہاں میں نمک ایسا سخن ایسے
قرآں نہ اتر آتا تو قرأت بھی نہ ہوتی
یہ خلق نہ ہوتے تو فصاحت بھی نہ ہوتی

منظورِ نظر گیسو و رخسارۂ تاباں
ظلمت کی سحر گیسو و رخسارۂ تاباں
ہالے میں قمر گیسو و رخسارۂ تاباں
مشک و گل تر گیسو و رخسارۂ تاباں
دیکھے نہ کبھی نورِ سحر دیکھ کے ان کو
دو راتوں میں دو چاند نظر آتے ہیں دن کو

آئینہ کا کیا منہ جو جبیں سے ہو مقابل — مہتاب کہوں گر تو وہ ناقص ہے یہ کامل
چہرے پہ کلف صاف یہ ہے عیب ہیں منفعل — خورشید بھی اصلا نہیں تشبیہ کے قابل
ہمسر ہوں وہ کیونکر کوئی نسبت نہیں جن کو — یہ رات کو پیشانی سے محجوب وہ دن کو

آراستہ لشکر ہے اُدھر ہٹتے ہیں بھالے — قبضوں پہ ہیں چالاک عجب ان ہاتھوں کو ڈالے
بدکیش ہیں وہاں تیروں کو ترکش سے نکالے — فوجوں پہ تو فوجیں ہیں یہ سالوں پہ سالے
خنجر وہ کلیجے پہ جو زہر کے بھرے ہیں — شاہِ شہدا قلعۂ آہن میں گھرے ہیں

تلواریں لئے دشمنِ جاں ایک طرف ہیں — گھوڑے پہ شہِ کون و مکاں ایک طرف ہیں
تیر ایک طرف گرزِ گراں ایک طرف ہیں — آپ ایک طرف لاکھ جواں ایک طرف ہیں
سر کٹنے کا دھڑکا نہیں وسواس نہیں ہے — فوجوں سے وغا اور کوئی پاس نہیں ہے

بے سایہ جو ہے لاشۂ ہمشکل پیمبر — بکسے ہوئے ہیں دھوپ میں زخمِ تنِ انور
وا حسرت و دردا کہ نہیں لاش پہ چادر — سوتے ہیں لبِ نہر علمدار دلاور
تنہا جو وہ ساونت ہزاروں سے لڑا ہے — مارا ہوا اک شیر ترائی میں پڑا ہے

فرماتے ہیں گرمی کی ہے اب مجھ کو نہیں تاب — ہیں تین شب و روز سے جنگل میں ہوئے بے آب
مرجھائے ہیں سب باغِ علی کے گلِ شاداب — کیونکہ وہ جئے جس سے بچھڑ جائیں یہ احباب
صابر ہوں میں ایسا ہی کہ غش آ نہیں جاتا — ان پھولوں کو اس دھوپ میں دیکھا نہیں جاتا

اتنی مجھے مہلت ہو کہ قبریں تو بناؤں — سیدانیوں سے بہرِ کفن چادریں لاؤں
اس خاک میں ان چاند کے ٹکڑوں کو چھپاؤں — یہ دفن ہوں میں قبر نہ پاؤں تو نہ پاؤں
قطرہ کوئی اس نہر سے پیاسے کو نہ دینا — مٹی بھی محمدؐ کے نواسے کو نہ دینا

کیا اُن سے عداوت جو گئے دارِ فنا سے — کوتاہ ہیں چلنے سے قدم ہاتھ وغا سے
مطلب انھیں دریا سے نہ کچھ سر و ہوا سے — رحم اُن کا طریقہ ہے جو ڈرتے ہیں خدا سے
مہماں تھے لڑے بھی تو یہ سب حق پہ لڑے ہیں — آخر یہ بشر ہیں کہ جو بے گور پڑے ہیں

مرتا ہے مسافر کبھی بستی میں کوئی گر
سب لوگ اسے غسل و کفن دیتے ہیں مل کر
قرآں کوئی پڑھتا ہے کہ بے کس تھا یہ بے پر
لے آتا ہے تربت پہ کوئی پھولوں کی چادر
غم کرتے ہیں سب فاتحہ خوانی ہیں سوم کو
سید ہیں یہ اور شرم نہیں آتی ہے تم کو

اس میں کئی بچے تھے کہ نکلے تھے نہ گھر سے
نازک ہیں صباحت میں زیادہ گلِ تر سے
اُفتادہ ہیں اس دھوپ میں یہ تین پہر سے
پوچھے کوئی یہ درد و الم میرے جگر سے
نرغہ ہے کہ تلواروں میں دم لے نہیں سکتا
زندہ ہوں میں اور اُن کو کفن دے نہیں سکتا

یہ سُن کے پُکارا پسرِ سعد بد افعال
کیسا کفن اور کیسی لحد فاطمہ کے لال
اکبر ہوں کہ ہو قاسم و عباس خوش اقبال
ہم گھوڑوں کی ٹاپوں سے کریں گے اُنھیں پامال
سینوں پہ گل زخم ابھی اور کھلیں گے
سجّاد کو ٹکڑے بھی نہ لاشوں کے ملیں گے

حضرت نے کہا دور ہو اُو ظالم مردود
اللہ شہیدوں کی حفاظت کو ہے موجود
یہ وہ ہیں کہ زہرا و نبی جن سے ہیں خوشنود
ہر لاش کو گھیرے ہوئے ہے رحمتِ معبود
قبروں میں بھی جنت کے چمن ان کو ملیں گے
فردوس کے حلّوں کے کفن ان کو ملیں گے

میں دیر سے آمادہ ہوں تلوار کو تولے
کہدے کہ علم فوج صفیں باندھ کے کھولے
مارو اُنھیں چھوٹیں کہیں کچھ دل کے پھپھولے
سر تن سے اُڑا دوں کوئی اب منہ سے جو بولے
آرام سفر کر گیا راحت نہیں باقی
بڑھتا ہوں کہ بس اب کوئی حجت نہیں باقی

یہ فوج ہے کیا آگ کا دریا ہو تو جھیلیں
کیا ڈر اُنھیں بچپن سے جو تلواروں سے کھیلیں
اُکسیں صفتِ کاہ اگر کوہ کو ریلیں
کوفہ تو ہے کیا شام کو اور روم کو لے لیں
چاہیں تو زمیں کے ابھی ساتوں طبق الٹیں
یوں اُلٹیں کہ جس طرح ہوا سے ورق الٹیں

کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں گنبدِ گرداں
نُہ ورقے ہیں اک جزوِ کتابِ شہِ مرداں
ہم آج ہیں عالم میں قضا فہم و قدرداں
حق بین و حق آگاہ و سخن سنج و ہنرداں
کس امر میں تقلیدِ محمد نہیں کرتے
فاقوں میں سوال فقرا وہ نہیں کرتے

اللہ نے کونین کی شاہی ہمیں دی ہے
مجھ میں بھی ہی دل ہی شوکت ہی جی ہے

سر تن سے کٹے جب تو ہم جنگ کی سر ہے
ہم دولتِ دنیا کبھی گھر میں نہیں رکھتے
رکھتے ہیں قدم خیر میں شر میں نہیں رکھتے
نذرِ رہِ معبود تن و سر ہے ہمارا

شہر اس کی تپ و تاب سے ویرانے ہوئے ہیں
منہ وہ ہے کہ تلواروں میں دندانے ہوئے ہیں
کر دیتی ہے شب دشمنِ ایماں کے دنوں کو
برباد اسی تیغ سے سر کٹ کے ہوئے ہیں
عاجز ہی زرہ خود بھی سر پٹکے ہوئے ہیں
باعث یہ نہ ہوتا تو پھر آرام نہ لیتے

مشہورِ جہاں عمرو علی کی ہے لڑائی
خندق کے ادھر آتے ہی تلوار جو کھائی
لاشہ کا ادھر ڈھیر سرِ نحس ادھر تھا

کب میان سے شمشیرِ دو سر لی نہیں ہم نے
جب تک کہ زمیں خون سے بھر لی نہیں ہم نے
شمشیر و سپر بعدِ ظفر کھولتے ہیں ہم

پیغامِ قضا تیغِ یداللہ کو جانو
بیناٸی ہو تو کوہِ گراں کاہ کو جانو
انگشت سے حلقے کو مروڑا ہے علی نے

امداد رسولوں کی میرے باپ نے کی ہے
سر بر سے ہیں جب تیغِ علی میان سے لی ہے
مر جائے یہ عزت یہ بہادر کی ظفر ہے

توقیرِ زر و مال نظر میں نہیں رکھتے
کچھ اور بجز تیغ کمر میں نہیں رکھتے
زیور ہے یہی اور یہی زر ہے ہمارا

جب چمکی ہے یہ دیو بھی دیوانے ہوئے ہیں
لوہا وہ کہ جبریل جسے مانے ہوئے ہیں
چڑھ آتی ہے تپ اس کے شرارے سے جنوں کو
جاں بر جو ہوئے بھاگ کے یا ہٹ کے ہوئے ہیں
اب تک سپرِ جبریلِ امیں لٹکے ہوئے ہیں
تھا خاتمہ گر ہاتھ علی تھام نہ لیتے

زور اس کا کہ یہ دیو نے قوت نہیں پائی
گویا کبھی پہلوں سے تن و سر میں جدائی
خندق کو جو دیکھا تو لہو تا بہ کمر تھا

لڑنے میں کبھی منہ پہ سپر لی نہیں ہم نے
کچھ اپنے سر و تن کی خبر لی نہیں ہم نے
جب صف ہو میداں تو کمر کھولتے ہیں ہم

ہمتائے علی فاطمہ کے ماہ کو جانو
عاجز نہ کبھی بندۂ اللہ کو جانو
خیبر کا در اک ہاتھ سے توڑا ہے علی نے

اللہ رے زورِ یدِ پاکیزہ و طاہر
آثار اذا زلزلت الارض تھے ظاہر
کھاتے تھے سدا نانِ جویں خلق ہی ماہر
کچھ زر نہ سماتا تھا نظر میں نہ جواہر
اسبابِ شہنشاہِ دو عالم یہی بس تھا
قرآں تھا یہ تلوار تھی بس ایک فرس تھا

بھاتا تھا نہ شہ کو پئے فقرا شاہ کو ہونا
بھولا نہیں راتوں کو مناجات میں رونا
ہے یاد ہمیں بوریئے پر راتوں کو سونا
بستر تھا یہی ان کا وہی شب کا بچھونا
اک ریزۂ زر خانۂ حیدر سے نہ نکلا
دنیا سے اٹھے جب تو کفن گھر سے نہ نکلا

پانی بھی ملک کوثر و تسنیم کا لائے
جبریل ہیں عرش سے روتے ہوئے آئے
پیوند پہ پیوند جو ملبوس میں پائے
سر پیٹ کے ہم بھائیوں نے اشک بہائے
جو کچھ تھا وہ قبل اپنے شہنشاہ نے بھیجا
کافور نبی نے کفن اللہ نے بھیجا

اللہ ہے عالم کہ وہی حال ہے میرا
ریتی پہ پڑا ہے جو زر و مال ہے میرا
یہ گوہر و یاقوت ہے یہ لعل ہے میرا
اس دشت میں جو مال ہے پامال ہے میرا
آرام پس از رنج و محن بھی نہ ملے گا
مجھ کو تو کبھی روز کفن بھی نہ ملے گا

ہم اپنے جو لشکر کے سپہ تم کو دکھائیں
تم کیا ہو نبی جان کی جانیں بھی جائیں
جرّار کبھی تاب ٹھہرنے کی نہ لائیں
مر جائیں ہزاروں تو ہزاروں کو غش آئیں
منظور ملائک کی جو امداد کروں میں
اک اپنے لیے لاکھوں کو برباد کروں میں

میں نے تو بھرے گھر کو تمھارے لیے چھوڑا
دریا پہ حبیب کو تمھارے لیے چھوڑا
اس قبرِ منوّر کو تمھارے لیے چھوڑا
بیماری میں دختر کو تمھارے لیے چھوڑا
نہ ماں کے نہ پہلو میں بڑے بھائی کے جا ہو
قسمت میں یہ تھا سب سے مری قبر جدا ہو

سچ ہے سخنِ حق میں عجب ہوتی ہے تاثیر
تھرّائے جگر ڈرنے لگے فوج کے بے پیر
مولا نے سنبھل کر جو رکھی دوش پہ شمشیر
ہنس کر پسرِ سعد پکارا کہ چلیں تیر
اک حشر بپا ہوگا جو یہ شیر لڑے گا
سر خاک پہ لوٹیں گے بڑا کھیت پڑے گا

نقارۂ رزمی پہ پڑی چوب یکایک
تلواریں کھنچیں نہر میں سر ڈوب یکایک
رحم آیا نہ اعدا کو ولی ابنِ ولی پر
غلِ طبل کا قرنا کی وہ آواز ڈرانی
کالے وہ علم شام کے لشکر کی نشانی
اک تیر سے مرجانے میں عرصہ نہیں کھنچتا
تلوار ادھر سبطِ ابرار نے کھینچی
تصویرِ اجل برقِ شرربار نے کھینچی
گھبرا گئی صدمہ یہ ہوا گاوِ زمیں پر
آثار نمایاں ہوئے خالق کے غضب کے
چونک اُٹھے وہ سوتے تھے جو جاگے ہوئے شب کے
ستار قدم گاڑے تھے ہر چند زمیں پر
نعرہ کیا بڑھ کر شہِ دیں نے کہ خبردار
صیحہ کیا جبریل امیں نے کہ خبردار
گیتی نہیں پھر گر یہ زد و کشت رہے گی
جنگل میں پہاڑوں کے جگر خوف سے کانپے
گھڑیال تھے پانی میں مگر خوف سے کانپے
گو قوت پرواز خداداد تھی اُن کو
چلاتے تھے ہر صف میں نقیبانِ جفاکیش
فرزندِ علی ہے یہ جگر خستہ و دل ریش
کوشش کی گھڑی جان لڑا دینے کا دن ہے

تھرّانے لگا دشتِ پر آشوب یکایک
لشکر سے بڑھے فوج کے سرکوب یکایک
نرغہ ہوا مظلوم حسین ابنِ علی پر
زہرے جسے سُن سُن کے ہوئے جاتے تھے پانی
وہ تیرِ جگر دوز کمانیں وہ کیانی
رستم سے بھی جن کا کبھی چلّہ نہیں کھنچتا
یا تیغِ دو سر حیدرِ کرّار نے کھینچی
گردن طرفِ غار ہر اک مار نے کھینچی
سر کھدبئے جھک جھک کے پہاڑوں نے زمیں پر
شیروں نے ترائی سے کنارا کیا دب کے
دل ہل گئے رنگ اُڑ گئے کفارِ عرب کے
گر گر گئے کھل کھل کے کمربند زمیں پر
لشکر سے کہا شمرِ لعیں نے کہ خبردار
ماہی سے کہا گاوِ زمیں نے کہ خبردار
شاخیں مری ہونگی نہ تری پشت رہے گی
گرنے لگے پتے یہ شجر خوف سے کانپے
تھے دد و دامِ اجمہ پر خوف سے کانپے
رودادِ پرِ روح امیں یاد تھی اُن کو
ہاں غازیو اس وقت بڑی جنگ ہے درپیش
سر کرتے ہیں سر دے کے مہم کو ظفر اندیش
صفّین کے کشتوں کے عوض لینے کا دن ہے

مولائے امم لشکرِ پُر کیں پہ آئے / انبوہِ عناد و حسد و سیہ پہ آئے
گہ عمر پہ آئے تو کبھی زید پہ آئے / یوں آئے کہ جس طرح اسد صید پہ آئے
ہل چل تھی کہ طوفاں میں جہاز آتا ہے جیسے / تیغ آتی تھی کنجشک پہ باز آتا ہے جیسے

سر گرنے لگے جسم سے چلنے لگی تلوار / چار آئینے میں جا کے نکلنے لگی تلوار
افعی کی طرح زہر اُگلنے لگی تلوار / پی پی کے لہو رنگ بدلنے لگی تلوار
پانی نے اثر زہرِ ہلاہل کا دکھایا / ہر ضرب میں جلوہ حق و باطل کا دکھایا

ہر غول میں غل تھا یہ لڑائی بھی نئی ہے / اسوار سر و تن میں صفائی بھی نئی ہے
سر تن سے اُترتے ہیں چڑھائی بھی نئی ہے / یہ گھاٹ نیا ہے یہ ترائی بھی نئی ہے
چھپنے کی جگہ دامنِ صحرا میں نہیں ہے / یہ باڑھ غضب کی کسی دریا میں نہیں ہے

تلواریں جو عاری ہیں تو بے آب سنانیں / بیکار کمیں میں ہیں کمینوں کی کمانیں
اک منہ میں اُسے حق نے جو دو دی ہیں زبانیں / اس رمز کو جو سیف زباں ہیں وہی جانیں
مطلب تھا کہ اب دین کو کامل یہ کرے گی / دو شرک کو اور کفر کو باطل یہ کرے گی

بربادی ہوئی کفر کے لشکر کی اسی سے / گردن نہ بچی عمر سے خود سر کی اسی سے
کچھ چل نہ سکی مرحب و عنتر کی اسی سے / چولیں ہوئیں ڈھیلی درِ خیبر کی اسی سے
میدان ہر اک معرکہ میں ہاتھ ہے اس کے / قبضے کی طرح فتح و ظفر ساتھ ہے اس کے

جو سایۂ شمشیرِ ظفر یاب میں آیا / ماہی کی طرح موت کے قلاب میں آیا
فی الفور خللِ نیست کے اسباب میں آیا / جو آگیا کاوے میں وہ گرداب میں آیا
کچھ مطلب دل ہاتھ بھی مارے سے نہ نکلا / دریا بھی دمِ تیغ کے دھارے سے نہ نکلا

جب مثلِ سموم آ کے نکل جاتی تھی سن سے / پتوں کی طرح خاک پہ سر گرتے تھے تن سے
جو شیر تھے میداں کے ہرن ہو گئے رن سے / وحشی بھی چلے جاتے تھے بھاگے ہوئے بن سے
افعی نہ فقط ڈر کے دراڑوں میں چھپے تھے / دب دب کے درندے بھی پہاڑوں میں چھپے تھے

اللہ ری مولا کی ہزاروں سے لڑائی
پرخاش پیادوں سے سواروں سے لڑائی
انبوہ میں سرگرم زد و کشت کہیں تھے
مقتل میں کوئی خاک پہ دم توڑ رہا تھا
ہٹ ہٹ کے کوئی دستِ ادب جوڑ رہا تھا
تلوار کے سائے سے ڈرے جاتے تھے اعدا
لاشیں تھیں وہاں اک لاش پہ گرتے تھے سر پہ
چار آئینے شانوں پہ کٹے تیر سپر پہ
بے چلّے کماں گرزِ گراں مشت کے نیچے
سیدھے جو نشاں تھے انھیں کیا تیغ نے الٹا
لشکر کا ورق وقتِ وغا تیغ نے الٹا
جو صاحبِ فتنہ تھا وہ مقتل سے ہٹا تھا
چلاتے تھے گر گر کے یہ جن بیرِ علم کے
جل جاتے ہیں سایہ سے اسی برقِ دو دم کے
ہاں سیفِ خدا عرش سے تیغ اتری ہے ان کو
غالب کوئی ان پر کسی صورت نہیں رہتا
بے سر ہے جو پابندِ اطاعت نہیں رہتا
حملوں سے یہ ہونٹوں پہ اگر جان نہ لائے
شمشیرِ اسدِ قلعہ شکن گونج رہا تھا
غرّانا سے ادھر چرخِ کہن گونج رہا تھا
غل تھا کہ لہو خوف سے گھٹ جانے کا دن ہے

فوجوں سے وغا ظلم شعاروں سے لڑائی
لشکر کی حدیں چار ہیں چاروں سے لڑائی
جو صف سے بڑھا تیغ بکف آپ وہیں تھے
باغی کوئی ہستی کا چمن چھوڑ رہا تھا
گھوڑے کی ادھر باگ کوئی موڑ رہا تھا
بھاگڑ تھی کہ پس پس کے مرے جاتے تھے اعدا
پاؤں پہ کبھی ہاتھ تو سینے تھے کمر پر
خنجر تھے انھیں کے جو پھرے ان کے جگر پر
تیغیں تہِ گردن سپریں پشت کے نیچے
اس صف کو بچھا کر وہ پرا تیغ نے الٹا
گردن بھی الگ تھی جو گلا تیغ نے الٹا
جس فرد کے چہرے پہ نظر کی وہ جدا تھا
جانوں کو بچاؤ کہیں پھر تیغ نہ چمکے
رن پڑتا ہے لڑتے ہیں یہ جس کھیت میں جم کے
جائیں وہی ان شیروں سے ہو سامنا جن کو
قایم قدم صاحبِ جرأت نہیں رہتا
کلمہ نہ پڑھے جو وہ سلامت نہیں رہتا
کافر تھے وہ جن جو وہاں ایمان نہ لائے
جنبش تھی پہاڑوں کو یہ رن گونج رہا تھا
نعروں سے ادھر ظلم کا بن گونج رہا تھا
بھاگو یہی گیتی کے الٹ جانے کا دن ہے

کیا تیغ کی تعریف کرے کوئی زباں سے
واں قطع سخن خوب جو باہر ہو بیاں سے
جن آنکھیں اماں جان کی جس آفت جاں سے
دھوئی ہوئی گوہر بیں بال لائے کہاں سے
یوں تیغ کبھی عرش سے اتری ہے کسی کو
ہاں یہ وہ خدا نے جسے بھیجا تھا علی کو

سر کاٹ لیا فرق پہ جس حال میں پہونچی
مچھلی تھی کہ جوشن کے کبھی جال میں پہونچی
چہرے پہ جو گھوڑے کے پڑی ٹال میں پہونچی
پنجے کے اڑانے کے لیے ڈھال میں پہونچی
سمجھا یہ ہر اک برق گری دشمن دیں پر
پنجہ تو سپر میں تھا کلائی تھی زمیں پر

اعضائے سواران تن و مند جدا تھے
باپ ان سے جدا باپ سے فرزند جدا تھے
نیزے تھے تو کیا جسم کے سب بند جدا تھے
کیا وصل ہی پیوند سے پیوند جدا تھے
تنہا نہ سر اہل ستم کاٹ دیئے تھے
تلوار نے رشتے بھی بہم کاٹ دیئے تھے

ہاتھ اٹھتا تھا جب تا بہ فلک جاتی تھی بجلی
جب بڑھتی تھی تلوار سرک جاتی تھی بجلی
گرتی تھی سروں پر تو کڑک جاتی تھی بجلی
اس پار سے اس پار چمک جاتی تھی بجلی
گرجے ہیں پہ اس طرح مسلسل نہیں گرجے
نعرے ہیں کہ ایسے کبھی بادل نہیں گرجے

شمشیر عدو کش کی ہوا کے وہ تھپیڑے
گھوڑے کو بڑھانے کے لیے کیا کوئی چھیڑے
ڈوبے ہوئے تھے خون میں اس فوج کے بیڑے
بوچھار سروں کی وہ لہو کے وہ دڑیڑے
ساون نہیں برسا ہے کہ بھادوں نہیں برسا
مینہ برسا ہے ہر سال مگر یوں نہیں برسا

ڈھالوں کی گھٹا کا وہ ادھر جھوم کے آنا
جنگل کی سیاہی تھی کہ تیرہ تھا زمانا
تلوار کی بجلی کا چمکتے ہوئے جانا
دریا کا کنارا تھا کہ جیحوں کا دہانا
یوں سیل کبھی جانب صحرا نہیں آتی
ایسی کبھی برسات میں بہیا نہیں آتی

سب تھے سپر انداختہ تلوار کے آگے
یوں موت تھی اس صاعقہ کردار کے آگے
دو چار کے پیچھے تھے تو دو چار کے آگے
جس طرح پیادہ چلے اسوار کے آگے
غل تھا وہ ہٹیں کھیت سے جو آگے بڑھے ہیں
سرنذر کرو آپ لڑائی پہ چڑھے ہیں

تلواریں ہزاروں ہیں پہ نایاب یہی ہے
بازوے درِ نصرت کا یہی باب یہی ہے
بجلی جسے کہتے ہیں وہ بیتاب یہی ہے
ہے باڑھ پہ دریا ہمہ تن آب یہی ہے
اس تال کو اس میل کو اس ساتھ کو دیکھو
تلوار کو کیا دیکھتے ہو ہاتھ کو دیکھو

ایسا ہی لڑائی کا چلن ہاتھ میں کس کے
ہے زورِ شہ قلعہ شکن ہاتھ میں کس کے
دیکھا ہے یہ بے ساختہ پن ہاتھ میں کس کے
یہ کاٹ یہ گردش ہے یہ فن ہاتھ میں کس کے
تلوار تو کیا انگلیاں دو تیغِ دو سر ہیں
ہاتھوں کی لکیریں نہیں تعویذِ ظفر ہیں

بجھ بجھ گئے بجلی سی چمک کر جدھر آئی
جل جل گئے شعلہ سی لپک کے جدھر آئی
کٹ کٹ گئے سینے سے سرک کر جدھر آئی
مر مر گئے مقتل میں لچک کر جدھر آئی
آفت تھی قیامت تھی چھلاوہ تھی پری تھی
جوہر نہ کہو موتیوں سے مانگ بھری تھی

سہمے ہوئے تھے مارِ سیہ کنڈلیاں مارے
ہرنوں میں تھے جو شیر تو چیتوں میں چکارے
غل تھا کہ جلا دیں گے جہاں کو یہ شرارے
دنیا کی تباہی کے یہ انداز ہیں سارے
تلوار کے پانی سے یہ آتش زدگی ہے
مسکن سے چلو آگ بیاباں میں لگی ہے

ڈوبا تھا کوئی اور کوئی خون میں تر تھا
ہر نخلِ قد اس معرکہ میں زیر و زبر تھا
ڈھالیں تھیں نہ ساعد تھے نہ بازو تھے نہ سر تھا
پتی تھی نہ شاخیں نہ شجر تھا نہ ثمر تھا
یوں باغ کی رونق کبھی جاتے نہیں دیکھی
ایسی بھی خزاں آج تک آتے نہیں دیکھی

جو برچھیاں بے پھل تھیں خجالت سے گڑی تھیں
عاری تھیں وہ تلواروں سے تیغیں جو لڑی تھیں
تھیں کند سنانیں بھی جو نیزے میں گڑی تھیں
جوشن پہ بھی ایسی کبھی کڑیاں نہ پڑی تھیں
پتی پہ کٹی ڈھالوں کا پشتارہ ہوا تھا
ہر پارۂ چار آئنہ صد پارہ ہوا تھا

ٹکڑے تھے کمانیں قدر انداز کریں کیا
آفت کا نشانہ ہیں فسوں ساز کریں کیا
بے تیر ہیں ترکش کا دہن باز کریں کیا
اُڑ جائیں پر تیر تو پرواز کریں کیا
چلّے بھی تو گوشوں کی طرح ساتھ نہیں ہیں
جس پاس کماں وہ کٹی ہے ہاتھ نہیں ہیں

رحم ایک جگہ ہی تو عتاب ایک جگہ ہی　　اک جا ہی ظفر فتح کا باب ایک جگہ ہی
برق ایک جگہ ہی تو سحاب ایک جگہ ہی　　حیرت کی ہی جا آتش و آب ایک جگہ ہی
وہ نار جسے خوں کی روانی نہ بجھائے　　یہ آگ وہی ہی جسے پانی نہ بجھائے

جس فرق پہ یہ صاعقہ کردار گری ہی　　سر تن سے گرا ہاتھ سے تلوار گری ہی
اک بار کہیں برق شرربار گری ہی　　سو بار یہ اُٹھی ہی تو سو بار گری ہی
ٹالے یہ بلا سر سے جو کوئی تو قدم لیں　　اتنی بھی تو مہلت نہیں ملتی ہی کہ دم لیں

مولا سا کوئی سائفِ سیاف نہیں ہی　　صف کونسی ایسی ہی کہ جو صاف نہیں ہی
دنیا میں عدالت نہیں انصاف نہیں ہی　　ایسا تو کوئی قاف سے تا قاف نہیں ہی
دکھلا گئے جوہر تھے جو خالق کے ولی کے　　نہ قبل لڑا یوں نہ کوئی بعد علی کے

اللہ ری لڑائی میں سبک تازیِ شبدیز　　شہبازہ بھی ہی قائل جانبازیِ شبدیز
وہ سینہ وہ گردن وہ سرافرازیِ شبدیز　　وہ آنکھ وہ چہرہ وہ خوش اندازیِ شبدیز
جس طرح فرو ہوتی ہی مایوس کی گردن　　گردن سے یونہیں جھکتی ہی طاؤس کی گردن

آہو جو کہوں اُس کو تو آہو ہی چکارا　　ساتھ اُس کے ہما کو نہیں پرواز کا یارا
وہ نعل وہ ہر کیل وہ سم معرکہ آرا　　پتلی وہ پری سمجھے جسے آنکھ کا تارا
دیکھی ہی سموں میں کسی گھوڑے کے یہ ضو بھی　　اک جا ہیں ستارے بھی قمر بھی مہِ نو بھی

اللہ ری جانداریِ شبدیز وغا میں　　تلوار کے چلنے سے بھی تھا تیز وغا میں
دل کا تھا اشارا اُسے مہمیز وغا میں　　ہر نعل تھا شمشیرِ شرر ریز وغا میں
ہاتھ اُس کے جدھر آئے اجل پا گئی اُس کو　　اک ٹاپ پڑی جس پہ زمیں کھا گئی اُس کو

تلوار کے مانند نہ بھرتا تھا دم اُس کا　　گردن وہ مہِ نو سی وہ جھکنے کا خم اُس کا
دریا سے روانی میں فزوں تر قدم اُس کا　　کس طرح لکھے وصفِ کمیت قلم اُس کا
دوڑاؤں کہاں تک فرسِ ذہنِ رسا کو　　کہہ دو کسی شاعر نے جو باندھا ہو ہوا کو

غل تھا کہ چھلاوے میں یہ چھل بل نہیں دیکھی
پھرتی ہوئی یوں آج تلک کل نہیں دیکھی
باریک یہ جلد اور یہ ہیکل نہیں دیکھی
ایسی تو کبھی خواب میں مخمل نہیں دیکھی
نازک ہے کہ مہمیز کی طاقت نہیں رکھتا
ابریشم چینی یہ ملاحت نہیں رکھتا

جو رگ ہے عوض خوں کے وہ سرعت سے بھری ہے
جلدی جو ہے سب جا بہ بھی جودت سے بھری ہے
شعلے کی طرح طبع شرارت سے بھری ہے
اُبلی ہوئی ہر آنکھ شجاعت سے بھری ہے
اُڑ جاتا تھا برچھوں میں محل جست کا پاکر
تلواروں کے پنجے سے نکل جاتا تھا آکر

جس جا یہ پھرے برق کی واں جلوہ گری کیا
چلنے میں ہوا کیا ہے نسیم سحری کیا
یہاں اوجِ سعادت کا ہما کیا ہے پری کیا
طاؤس ہے کیا نسر ہے کیا کبکِ دری کیا
راکب جو ذرا چھیڑ دے اُس برق شیم کو
سائے کو نہ وہ پائے نہ یہ گردِ قدم کو

اُس صف کو اُلٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا
فوجوں کو پلٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا
جوں تیر جھپٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا
بجلی سا سمٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا
تھمتا ہے چھلاوا بھی مگر یہ نہیں تھمتا
طائر بھی ٹھہر جاتا ہے پر یہ نہیں تھمتا

پامال نہ ہوں پھول جو گلزار پہ دوڑے
سم تر نہ ہوں گر قلزمِ زخار پہ دوڑے
اس طرح رگِ ابرِ گہربار پہ دوڑے
جس طرح کہ نغمہ کی صدا تار پہ دوڑے
اغراق ہے یہاں کچھ نہ تعلّی شعرا کی
کافی ہے یہ تعریف کہ قدرت ہے خدا کی

اک ظالمِ شامی سپہِ شوم سے نکلا
غدّار بڑے ٹھاٹھ بڑی دھوم سے نکلا
لڑنے کے لیے خاصۂ قیوم سے نکلا
کشتوں کا عوض لینے کو معصوم سے نکلا
دو بھائی بھی اُس کے شہِ والا سے لڑے تھے
سر اُن کے کہیں جسم کہیں رن میں پڑے تھے

غصّے سے غضب سرخ تھیں خونخوار کی آنکھیں
بجلی سے جھپکتی تھیں نہ غدّار کی آنکھیں
دیکھی جو نہ تھیں حیدرِ کرّار کی آنکھیں
مست مئے نخوت تھیں جفاکار کی آنکھیں
سر کاٹے سردار کا سودا تھا یہ سر میں
غرّہ کہ تہمتن نہ سماتا تھا نظر میں

سر طبلکِ معکوس جبیں حد سے فزوں تنگ
غدّار و سلحشور و جفا پیشہ و سرہنگ
کہنے کو بشر پر قد و قامت کا نیا ڈھنگ
حیراں شبِ ظلمات ہو یہ تیرگیِ رنگ
پہلے سے یہ کالا تھا منہ اُس دشمنِ رب کا
بن جائے تو اک عکس سے آئینہ حلب کا

لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منہ قیر سے کالا
شب ایک طرف دن کو ڈرے دیکھنے والا
قد دیو کے قامت سے بلندی میں دوبالا
دانتوں کی کبودی دہنِ مار کا چھالا
شیر اُس کی صدا سُن کے لرز جاتے تھے بن میں
فاسد تھی ہوا رن کی یہ بدبو تھی بدن میں

وہ ڈھال کہ جو سینۂ رستم کو چھپا لے
تلوار کا منہ ایسا کہ فولاد کو کھا لے
نیزہ وہ کہ مرحب کو جو مرکب سے اُٹھا لے
گرز ایسا کہ عنتر جسے مشکل سے سنبھالے
کج طبع کا سر جائے پہ کینے کو نہ چھوڑے
خنجر وہ کہ سالم کبھی سینے کو نہ چھوڑے

مولا نے کہا اپنے ارادے کی خبر دے
آنکھوں سے اُٹھا نشۂ پندار کے پردے
بو جاتے ہیں اُس تخم کو دانا جو ثمر دے
غرّہ یہ ترا تجھ کو کہیں پست نہ کر دے
دنیا میں نہیں کچھ عملِ نیک سے بہتر
پیدا کیا اللہ نے ایک ایک سے بہتر

لڑنا ہے تو بڑھ عصر کا ہنگام قریں ہے
اب سجدۂ معبود کی مشتاق جبیں ہے
لشکر ہے ترے ساتھ اِدھر کوئی نہیں ہے
عباس سا غازی ہے نہ اکبر سا حسیں ہے
فاقہ ہے جدا پیاس جدا ضعف جدا ہے
اب میں ہوں یہ تلوار ہے اور سر پہ خدا ہے

یہ سُنتے ہی سفّاک نے بھالے کو سنبھالا
تلوار کو چمکا کے بڑھے سیّدِ والا
آ پہونچا تھا سینے کے قریں ظلم کا بھالا
فرزندِ یداللہ نے عجب ہاتھ نکالا
کیا جانیے بجلی تھی کہ تیغِ دو زباں تھی
نہ ہاتھ میں بھالا تھا نہ بھالے میں سناں تھی

حضرت نے کہا ہول سے دم اُس کا جو پھولا
کافی تھا ترے قتل کو اک تیغ کا ہولا
سُنتے تھے کہ نیزے میں تجھے ہے یدِ طولا
جو بند کہ تھے یاد اُنھیں خوف سے بھولا
نہ ہاتھ میں طاقت تھی نہ نیزے میں تواں تھی
نیزہ تھا کہ تنکا تھا قلم تھا کہ سناں تھی

جھنجلا کے کہا اُس نے کہ یا شاہِ سرافراز
سرہنگ تہ مجھسا ہے نہ سرکش نہ سرانداز
طاقت پہ مجھے فخر تھا نیزے پہ مجھے ناز
کیا جانیئے یہ سحر تھا یا آپ کا اعجاز
چمکی تھی کہاں تیغ کدھر چل گئی پھری تھی
مجھ پر کبھی اس طرح کی بجلی نہ گری تھی

حضرت نے کہا سحر نہ جان اس کو ستمگر
اعجاز دکھائیں تو نہ ہو تو۔ نہ یہ لشکر
ہیں سیفِ خدا کوئی ہمارا نہیں ہمسر
ان ہاتھوں میں شمشیر دو دستی کے ہیں جوہر
ہر وقت یہاں وردِ زباں نادِ علی ہے
بجلی نہیں یہ ضرب ہے ایجادِ علی ہے

ظالم نے اُدھر گرزِ گراں سر کو اُٹھایا
ثابت یہ ہوا دیو نے لنگر کو اُٹھایا
نہ ہاتھ میں لی ڈھال نہ جمدھر کو اُٹھایا
مولا نے فقط تیغ دو پیکر کو اُٹھایا
اُڑتے ہوئے دیکھا جو ہوا میں شرروں کو
سمٹا لیا تھرّا کے فرشتوں نے پروں کو

شبیر قریب آ گئے گھوڑے کو ڈپٹ کے
شبدیز اُدھر سے اِدھر آتا تھا پلٹ کے
ہر چند بچاتا رہا ضربت کو وہ ہٹ کے
پرکالۂ گرز اُڑنے لگے تیغ سے کٹ کے
باقی تھا جو کچھ گرز وہ دو ہو گیا آخر
فتنہ جو اُٹھا تھا وہ فرو ہو گیا آخر

مطلع

اے سیفِ یداللہ صفائی مجھے دکھلا
خیبر میں جو گزری وہ لڑائی مجھے دکھلا
دریائے شجاعت کی ترائی مجھے دکھلا
اے دستِ خدا عقدہ کشائی مجھے دکھلا
ہاں فتح کا اور تیرا سدا ساتھ رہا ہے
ہر جنگ میں میدان ترے ہاتھ رہا ہے

یا شیرِ خدا سیفِ دودم دیجیئے مجھ کو
یا شاہِ نجف طبل و علم دیجیئے مجھ کو
سر بر نہ ہو لشکر وہ حشم دیجیئے مجھ کو
میداں جو نہ چھوٹے وہ قلم دیجیئے مجھ کو
نیزے سپہ شام کے ہٹتے نظر آئیں
سب فوج کے چہرے ابھی کٹتے نظر آئیں

کوثر کا بھرا جام پلا دیجیئے مولا
بالائے ولا اور ولا دیجیئے مولا
پھر غنچۂ خاطر کو کھلا دیجیئے مولا
شمشیر فصاحت کو جلا دیجیئے مولا
میں وہ نہیں یا خلق میں انصاف نہیں ہے
مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہے

گو پیر ہوں پر زور جوانی ہے ابھی تک
سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک
دنداں نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک
قبضے میں وہ تیغِ صفہانی ہے ابھی تک
جوہر ہیں وہی باڑھ وہی گھاٹ وہی ہے
کہنہ تو ہے شمشیر مگر کاٹ وہی ہے

اس گھر کے دغا کرنے کا سب ڈھنگ دکھا دے
جس طرح علی لڑتے تھے وہ جنگ دکھا دے
تلوار کی بجلی کو تہِ تنگ دکھا دے
راکب کو بھی مرکب کو بھی جو رنگ دکھا دے
ٹھہرے نہ کہیں زیں سے جو مرکوب کے نکلے
دو تین وجب خاک میں پھل ڈوب کے نکلے

لو غور سے چلتی ہوئی صمصام کو دیکھو
بے رونقیِ ظالمِ ناکام کو دیکھو
تیغ و سپرِ شاہِ خوش انجام کو دیکھو
اعجاز ہے اک جا سحر و شام کو دیکھو
قربان رخِ تابانِ شہِ جن و بشر کے
خورشید میں بیچ میں ہے شام و سحر کے

منہ سرخ ہے سب خاطرِ اقدس ہے جو برہم
رخساروں پہ بل کھائے ہیں گیسوئے پُر خم
ابرو میں ہے چلتی ہوئی تلوار کا عالم
پتلی کا یہ ہے رعب کہ تھرّائے ہیں ضیغم
لو دیکھ لو اس صاحبِ شمشیر کی آنکھیں
غصّے میں نہ دیکھی ہوں اگر شیر کی آنکھیں

دبتا ہے سرکتا ہے سمٹتا ہے وہ ظالم
گھوڑے کے قریب آکے پلٹتا ہے وہ ظالم
بڑھ آتے ہیں جب آپ تو ہٹتا ہے وہ ظالم
رد ہوتا ہے جب وار تو کٹتا ہے وہ ظالم
شمشیر کلیجے پہ چھری پھیرے ہوئے ہے
بھاگے تو کدھر جائے اجل گھیرے ہوئے ہے

غل تھا کبھی دیکھی نہیں دو بدل ایسی
چلتی نہیں تلوار کبھی بر محل ایسی
اب ہوگی زمانے میں نہ جنگ و جدل ایسی
ہاتھ ایسا زبردست تو برقِ اجل ایسی
بل جسم میں کس ہاتھ میں تلوار میں جس ہے
سو سر کا جو دشمن ہو تو اک وار اسے بس ہے

جب چلتی ہے سن سے سر اڑتے ہیں ہوا میں
ذرّے بھی ادھر سے ادھر اڑتے ہیں ہوا میں
کاٹے ہوئے تیروں کے پر اڑتے ہیں ہوا میں
پرکالۂ قرصِ سپر اڑتے ہیں ہوا میں
کچھ شبہ و تشکیک غلط اس پہ نہیں ہے
اس ڈھال کے سو ٹکڑے ہیں خط اس پہ نہیں ہے

تلوار چمک کر ادھر آئی جو ادھر سے | بہی تو زرہ گر گئی خود اڑ گیا سر سے
چہرے سے جھلم کھل گئی زنجیر کمر سے | پہلو سے سپر میں تھی کلائی پہ سپر سے
دنیا سے اسے رشتۂ تقدیر نے کھویا | دستانوں کو بھی ہاتھ سے بے پیر نے کھویا

مولا کی طبیعت جو ذرا جوش پر آئی | تلوار اجل بن کے زرہ پوش پر آئی
گہ فرق پہ چمکی تو کبھی دوش پر آئی | آفت کمر و صدر و تن و توش پر آئی
جانے کی جہاں سے خبر آتی ہے کسی کو | گرتی ہوئی بجلی نظر آتی ہے کسی کو

سر پر جو پڑی تیغ جبیں سے اتر آئی | کیا ذکرِ جبیں صدرِ لعیں سے اتر آئی
بڑھ کر کمرِ دشمنِ دیں سے اتر آئی | کیا بندِ کمر خانۂ زیں سے اتر آئی
خوں بھی نہ تنِ توسنِ چالاک سے نکلا | بجلی سا چمکتا ہوا اچھل خاک سے نکلا

تکبیر کا نعرہ جو کیا آپ نے تن کے | صاف آئی صدا اوج سے یہ چرخِ کہن کے
ای لختِ جگر بادشۂ قلعہ شکن کے | لڑتے ہیں یوں نہیں فوج سے جو شیر ہیں رن کے
تو صبر میں ایوبِ خوش انجام ہے شبیر | اب سجدے میں جھک عصر کا ہنگام ہے شبیر

سن کر یہ صدا آپ نے تلوار کو روکا | تلوار کو کیا برقِ شرربار کو روکا
بے چین تھا پر اسپِ وفادار کو روکا | گردوں کی طرف دیکھ کے رہوار کو روکا
فرمایا کہ جینے سے دل اب تنگ ہے گھوڑے | تھم جا کہ بس اب خاتمۂ جنگ ہے گھوڑے

اب سینے کو وقفِ تبر و تیر کرینگے | اب طاعتِ معبود کی تدبیر کرینگے
اب عصر کی نیت میں نہ تاخیر کرینگے | اب سجدۂ باری تہِ شمشیر کریں گے
ایذا ہو کہ دکھ سہل ہے سب راہِ خدا میں | مرنے کے بس اب جائیں گے درگاہِ خدا میں

عاشق کو نہیں دوریِ معشوق گوارا | سر جلد کٹا دے یہ ہے خالق کا اشارا
مشتاقِ اجل ہے اسد اللہ کا پیارا | اب خنجرِ بے آب ہے اور حلق ہمارا
طالب ہوں رضامندیِ ربِ دوسرا کا | صد شکر کہ وقت آگیا وعدے کی وفا کا

یہ کہہ کے رکھی میان میں شبیر نے تلوار
بجلی جو تھمی ہونے لگی تیروں کی بوچھار
مجروح ہوا صدر بھی زخمی ہوا سر بھی
کیوں چرخ یہ حال اُس کا جو ہو خلق کا والی
وہ ناوکِ دل دوز وہ جسمِ شہِ عالی
طاری ہے غشی دل کو سنبھالا نہیں جاتا

مظلوم مسافر پہ یہ بیداد صد افسوس
ٹوٹے ہوئے ہیں پیاسے پہ جلاد صد افسوس
جز نیزہ و تیغ و تبر آتا نہیں کوئی
بیجان ہیں رہوار پہ آقائے خوش اوقات
سر پیٹتے ہیں اہلِ حرم لٹتے ہیں سادات
حالِ شہِ آوارہ وطن دیکھ رہی تھی

تو خاک پہ گھوڑے سے گرے سبطِ پیمبر
سر پیٹتی مقتل کو چلی زینبِ مضطر
سر ننگے نجف سے شہِ مرداں نکل آئے
چلائے ملائک کہ قیامت ہوئی برپا
آندھی ہوئی اک غرب کی جانب سے ہویدا
تیرہ ہوا دن اڑنے لگی خاک جہاں میں

اُس حشر میں احمد کی نواسی کا یہ تھا حال
چلاتی تھی سر پیٹ کے اے فاطمہ کے لال
کیا کیا مجھے صدمے یہ جدائی نہیں دیتی

حکمِ شہِ والا سے کھڑا ہو گیا رہوار
ڈولاکھ کے نرغے میں گھرے سید ابرار
چلنے لگیں تیغیں بھی سنانیں بھی تبر بھی
اک چاند پہ اُمڈی یہ گھٹا ظلم کی کالی
حلقہ کوئی جوشن کا نہیں تیر سے خالی
اک تیر بھی سینے سے نکالا نہیں جاتا

اک جان ہزاروں ستم ایجاد صد افسوس
شہ کی کوئی سنتا نہیں فریاد صد افسوس
فرزندِ محمد کو بچاتا نہیں کوئی
بند آنکھیں ہیں غش ہے تیا ہی کی جاتی نہیں بات
حامی نہیں کوئی کوئی پرساں نہیں ہیہات
تلواروں میں بھائی کو بہن دیکھ رہی تھی

تھرائی زمیں ہلنے لگا عرشِ منوّر
ہاں شمرِ ستمگار بڑھا کھینچ کے خنجر
مرقد سے نبی چاک گریباں نکل آئے
گھبرا کے درختوں سے اُڑے طائرِ صحرا
تھرانے لگے کوہ اُبلنے لگے دریا
غل ہائے حسینا کا اٹھا کون و مکاں میں

گرتی تھی کبھی اٹھتی تھی کھولے ہوئے بال
ہے ہے تمھیں تلواروں میں گھیرے ہیں جفا کار
لاش آپ کی زینب کو دکھائی نہیں دیتی

بھیّا اب مجھے رستہ نہیں ملتا کدھر آؤں　　کیونکر تمھیں جلاّدوں کے پنجے سے چھڑاؤں
بھیّا تمھیں اس بھیڑ میں کس طرح سے پاؤں　　سب قتل ہوئے بھر مرد کس کو بلاؤں
کیا ہو کہ جو نانا کی سواری نہیں آئی　　بھیّا مجھے آواز تمھاری نہیں آئی

میں کس کو پکاروں کہ ترس پیاسے پہ کھاؤ　　لی جن سے زمیں مول تمھیں لوگوں کو بلاؤ
اے اہلِ زراعت تمھیں امداد کو آؤ　　لٹتی ہوئی کھیتی کو محمدؐ کی بچاؤ
کام آؤ غریبوں کے تو احسان ہے تمھارا　　یہ بے وطن اس دشت میں مہماں ہے تمھارا

شہ نے جو سنی زاریِ زینب تہِ خنجر　　گھبرا کے صدا دی کہ ادھر آؤ نہ خواہر
کیا قہر ہے تم رن میں چلی آئیں کھلے سر　　مشغول ہے امت کی دعا میں یہ برادر
مطلوب رضامندیِ معبود ہے زینب　　تنہا نہیں اللہ تو موجود ہے زینب

کس طرح اٹھیں سینۂ زخمی پہ ہے جلاّد　　نانا نے مجھے گود میں لے کرتے ہیں فریاد
اماں مرے پہلو میں ہیں اے زینبِ ناشاد　　روتے ہیں بڑے بھائی بھی یہ دیکھ کے بیداد
گریاں و حزیں خاصۂ قیوم کھڑے ہیں　　بابا بھی سرہانے مرے مغموم کھڑے ہیں

یہ سنتے ہی دوڑی طرفِ لاش وہ مضطر　　چلائی کہ ہمشیر بھی آتی ہے برادر
لاشے پہ نہ پہونچی تھی کہ برپا ہوا محشر　　دیکھا کہ لیے جاتا ہے قاتل سرِ سرور
سب تیر اسی طرح سے سینے میں گڑے ہیں　　اور جلتی زمیں پر شہِ دلگیر پڑے ہیں

ہاں پیٹ کے سر روئیں وہ جو اہلِ عزا ہیں　　یاں احمدِ مختار بھی سرگرمِ بکا ہیں
مقتل میں کھلے سر حرمِ شیرِ خدا ہیں　　خاک اڑتی ہے جنبان طبقِ ارض و سما ہیں
سر کٹ چکا لختِ دلِ زہرا و علی کا　　اب لٹتا ہے ملبوسِ کہن سبطِ نبی کا

عمامۂ حضرت لیے جاتا ہے کوئی آہ　　بھاگا ہے کوئی لے کے عبائے شہِ ذی جاہ
ہاتھوں سے قبا کھینچ رہا ہے کوئی گمراہ　　عریاں ہے زمیں پر تنِ فرزندِ ید اللہ
اب لشکرِ کیں لاش کو پامال کرے گا　　بعد اس کے ستم لاش پہ کیا حال کرے گا

خاموش انیسؔ آگے نہیں طاقتِ تحریر
خالق سے دعا مانگ کہ اے مالکِ تقدیر
محبوب ہوں زوّارِ امامِ دوسرا میں
عالم جسے روتا ہے وہ مظلوم ہے شبیر
دکھلا مجھے آنکھوں سے مزارِ شہِ دلگیر
مرجاؤں تو مدفن ہو جوارِ شہدا میں

سلام

مرا رازِ دل آشکارا نہیں
وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں

وہ گل ہوں جدا سب سے ہے جس کا رنگ
وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور
وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

بہت زال دُنیا نے دیں بازیاں
میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

قطعہ

فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا
امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

سکندر کی خاطر بھی ہے سدِّ باب
جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں

گئے پہنے نعلین واں مصطفےٰ
فرشتے کا جس جا گزارا نہیں

جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا
جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

پھرے دوست جب ہو گئی قبر بند
کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

گرے ڈگمگا کر زمیں پر حسینؑ
فرس سے کسی نے اُتارا نہیں

ترے صبر کے میں فدا یا حسینؑ
چھری کے تلے دم بھی مارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

مرثیہ (۱۹)

میر صاحب کی اولاد میں منجھلے صاحبزادے میر عسکری اپنے خاندانی فن کی طرف متوجہ نہ تھے اور کئی پشت سے یہی ذریعہ معاش تھا میر صاحب نے یہ مرثیہ اُن کو کہہ دیا رئیس اُن کا تخلص رکھ کر مقطع میں بھی رئیس کا نام ڈال دیا مقصود یہ تھا کہ اس سے اُن کو بھی مرثیہ کہنے کا شوق پیدا ہوگا اور یہی ذریعہ معاش ہو جائے گا لیکن میر عسکری صاحب اس فن سے مناسبت نہ رکھتے تھے آخر کو یہ مرثیہ خود میر صاحب کے نام سے مجلسوں میں پڑھا جانے لگا اور حقیقت میں ایک لفظ بھی میر عسکری کا نہیں ہے۔

مطلع

نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سُن سن کے بلاغت میری
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں
بحرِ مواجِ فصاحت کا تلاطم کردوں
ماہ کو مہر کروں ذرّہ کو انجم کردوں
گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلم کردوں
دردِ سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح
جدِ اعلیٰ سا نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مدّاح
باپ مدّاح کا مدّاح ہے دادا مدّاح
عمّ ذی قدر ثنا خوانوں میں یکتا مدّاح
جو عنایات الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

طبع ہر ایک کی موزوں قد زیبا موزوں　　صورت سرو ازل سے ہیں سراپا موزوں
نثر بے سجع نہیں نظم معلّیٰ موزوں　　کہیں سکتا نہیں آسکتا کجا ناموزوں
تول لے عقل کے میزاں میں جو فہمیدہ ہے　　بات جو منہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

خلق میں مثل خلیق اور بھا خوش گو کوئی کب　　نام لے دھولے زباں کوثر و تسنیم سے جب
بلبل گلشن زہرا و علی عاشق رب　　متبع مرثیہ گوئی میں ہوئے جن کے سب
ہو اگر ذہن میں جودت ہے کہ موزونی ہے　　اس احاطہ سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

بھائی خوش فکر و خوش لہجہ و پاکیزہ خصال　　جن کا سینہ گہر علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال　　معجزہ گر اسے کہیے نہ تو ہے سحر حلال
اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے　　لطف حضرت کا یہ ہے رحمت یزدانی ہے

کیوں نہ ہو بندۂ موروثی مولا ہوں میں　　قلزم رحمت معبود کا قطرہ ہوں میں
جس میں لاکھوں دُر و مرجاں ہیں وہ دریا ہوں میں　　مدح خوان پسر حضرت زہرا ہوں میں
وصف جوہر کا کروں یا صفت ذات کروں　　اپنے رتبہ پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں

بندی ہوں مجھے توقیر عطا کر یا رب　　شوق مداحی شبیر عطا کر یا رب
سلک گوہر ہو وہ تقریر عطا کر یا رب　　نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یا رب
جدّ و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو　　لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور　　ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کشش موقلم طرۂ حور　　ایک ایک حرف میں ہو صنعت صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے　　نقش ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے

قلزم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ　　شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ　　خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفت جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی　　بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضموں بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حُسن ہے ابرو کے لیئے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیئے
زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیئے
داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

مطلع

ماجرا صبح شہادت کا بیاں کرتا ہوں
رنج و اندوہِ مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں
جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہونگے نہ صاحب ایسا

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور
زمزمہ کرنے لگے یادِ الٰہی میں طیور
مثلِ خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور
یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رُخِ مولا سے ظہورِ حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر
دمبدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

بلبلوں کی وہ صدائیں وہ گلوں کی خوشبو
دل کو اُلجھاتے تھے سنبل کے وہ پرخم گیسو
قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یا ہو یا ہو
فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی کو کو کو
وقت تسبیح کا تھا عشق کا دم بھرتے تھے
اپنے معبود کی سب حمد و ثنا کرتے تھے

مطلع

آئے سجادۂ طاعت پہ امامِ دو جہاں
اُس طرف طبل بجے یہاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلّی کہ زباں جن کی حدیث و قرآں
وہ نمازی کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

عرشِ اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں اُن کی
وجد کرتے تھے ملک سن کے صدائیں اُن کی
وہ عمامے وہ قبائیں وہ عبائیں اُن کی
حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں اُن کی
ذکرِ خالق میں لب اُن کے جو ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے سبحان اللہ
کیا رفیقانِ وفادار تھے سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرّار تھے سبحان اللہ
زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے
عجب اسوار تھے بے مثل عجب تازی تھے
لائقِ مدح و سزاوارِ سرافرازی تھے
گو بہت کم تھے پہ آمادۂ جانبازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

زہد میں حضرتِ سلماں کے برابر تھا کوئی
دولتِ فقر و قناعت میں اباذر تھا کوئی
صدقِ گفتار میں عمار کا ہمسر تھا کوئی
حمزۂ عصر کوئی مالکِ اشتر تھا کوئی
ہوں گے ایسے ہی محمد کے جو شیدا ہوں گے
پھر جہاں ایسا نہ ہوگا نہ وہ پیدا ہوں گے

گو مصیبت میں تلاطم میں تباہی میں رہے
سر کٹے پاؤں مگر راہِ الٰہی میں رہے
یوں سرافراز وہ سب لشکرِ شاہی میں رہے
جس طرح تیغِ دو دم دستِ سپاہی میں رہے
اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شاکی اُن کو
آبرو ساقیِ کوثر نے عطا کی اُن کو

وہ تخشع وہ تضرع وہ قیام اور وہ قعود
وہ تذلل وہ دعائیں وہ رکوع اور وہ سجود
یادِ حق دل میں تو سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ درود
یہ دعا خالقِ اکبر سے کہ اے ربِّ ودود
یوں بسیں ہم کہ نہ آل اور نہ اولاد رہے
مگر احمد کے نواسے کا گھر آباد رہے

موم فولاد ہو آوازوں میں وہ سوز و گداز　　اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
سر تو سجادوں پہ تھے عرش معلّٰی پہ نماز　　شیر دل منتخبِ دہر وحید و ممتاز
چاند شرمندہ ہو چہرے متجلّی ایسے　　نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلّی ایسے

جب فریضہ کو ادا کر چکے وہ خوش کردار　　کس کے کمروں کو بصد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہ عرش وقار　　علمِ فوج کو عباس نے کھولا اک بار
دشت میں نکہتِ فردوس بریں آنے لگی　　عرش تک اُس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

ہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک　　شرم سے ابر میں چھپ جاتا ہے خورشیدِ فلک
کہتے تھے صلِ علیٰ عرش پہ اُٹھ اُٹھ کے ملک　　دنگ تھے سب وہ سماں سے تھا سماتا بہ سمک
کہیئے پستی اُسے جو اوج ہمانے دیکھا　　وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سمانے دیکھا

اس طرح جب علمِ دلیر تہرا جائے　　کس سے پھر معرکۂ رزم میں ٹھہرا جائے
سانپ دشمن کی نہ کیوں چھاتی پہ لہرا جائے　　لہر میں تا بہ فلک جس کا پھریرا جائے
رفعِ شر کو علمِ خیبر بشر آیا تھا　　سورۂ نصر پے فتح و ظفر آیا تھا

وہ علمدار کہ جو شیرِ الٰہی کا خلف　　گوہرِ بحرِ وفا نیّرِ دین درِ نجف
فخرِ حمزہ سے نمودار تھا جعفر کا شرف　　کس طرح چاند کہوں چاند میں ہے عیب کلف
کس نے پایا وہ جو تھا جاہ و حشم ان کے لئے　　یہ علم کے لئے تھے اور علم ان کے لئے

سرو شرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی　　اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی
شیر نعروں سے دہل جاتے تھے صولت ایسی　　جا کے پانی نہ پیا نہر میں ہمّت ایسی
جان جب تک تھی اطاعت میں رہے بھائی کی　　تھے علمدار مگر بچوں کی سقائی کی

وہ بہشتی نے کیا جس کو وفا کہتے ہیں　　سب انھیں عاشقِ شاہِ شہدا کہتے ہیں
جو بہادر ہیں وہ شمشیرِ خدا کہتے ہیں　　اُن کو قبلہ تو انھیں قبلہ نما کہتے ہیں
عشق سردار و علمدار کا افسانہ ہے　　وہ چراغِ رہِ دیں ہے تو یہ پروانہ ہے

اک طرف اکبرِ مہ رو سا جوانِ نایاب
کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمدِ ایامِ شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب
آنکھیں ایسی کہ رہا نرگسِ شہلا کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا
شبِ معراج میں محبوبِ خدا کو دیکھا

اے خوشا حسنِ رخِ یوسفِ کنعانِ حسن
راحتِ روحِ حسین ابنِ علی جانِ حسن
جسم میں زورِ علی طبع میں احسانِ حسن
ہمہ تن خلقِ حسن حسن حسن شانِ حسن
تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شاہانی پوشاک

اللہ اللہ اسد اللہ کے نواسوں کا جلال
چاند سے چہروں پہ بل کھائے ہوئے زلفوں کے بال
نیمچے کاندھوں پہ رکھے ہوئے مانندِ ہلال
گرچہ بچپن تھا پہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال
صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
مورچے لشکرِ کفار کے ہٹ جاتے تھے

آستینوں کو چڑھائے تھے آمادۂ جنگ
وہی سارا اسد اللہ کا نقشہ وہی ڈھنگ
سرخ چہرے تھے کہ شیروں کا یہی ہوتا ہے رنگ
ولولہ صف کے الٹنے کا لڑائی کی امنگ
جسم پر تیر چلیں نیزۂ خونخوار چلے
شوق اس کا تھا کہ جلدی کہیں تلوار چلے

مطلع

یک بیک طبل بجا فوج کے گرجے بادل
کوہ تھرّائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے تلواروں کے پھل
مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اجل
ڈال کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

شور میدانوں میں تھا کہ دلیرو نکلو
نیزہ بازی کرو تلواروں کو پھیرو نکلو
نہر قابو میں ہے اب پیاسوں کو گھیرو نکلو
غازیو صف سے بڑھو غول سے شیرو نکلو
رستمو دادِ وغا دو کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدرِ کرّار کی اولاد کا ہے

شورِ سادات میں تھا یا شہِ مرداں مدد ے
کعبۂ دیں مدد اے قبلۂ ایماں مدد ے
قوتِ بازوئے پیغمبرِ ذیشاں مدد ے
دم تائید ہے اے فخرِ سلیماں مدد ے
تیسرا فاقہ ہے طاقت میں کمی ہے مولا
طلبِ قوتِ ثابت قدمی ہے مولا

پیاس میں حرف نہ شکوے کا زباں پر لائیں — سینۂ صاف پہ فاقوں میں سنائیں کھائیں

دل نہ تڑپے جو دمِ نزع نہ پانی پائیں — تیرے فرزند کی تائید کریں مر جائیں

لاشے مقتل میں ہوں لاشِ شہِ دلگیر کے پاس — سر ہو نیزے پہ سرِ حضرتِ شبیر کے پاس

مطلع

سامنے بڑھ کے یکایک صفِ کفار آئی — جھوم کر تیرہ گھٹا تاروں پہ یکبار آئی

روزِ روشن کے چھپانے کو شبِ تار آئی — تشنہ کاموں کی طرف تیروں کی بوچھار آئی

ہنس کے منہ بھائی کا شاہِ شہدا نے دیکھا — اپنے آقا کو بہ حسرت رفقا نے دیکھا

عرض عباس نے کی جوش ہے جراروں کو — تیر سب کھاتے ہیں تولے ہوئے تلواروں کو

میہمانوں کا نہیں پاس ستمگاروں کو — مصلحت ہو تو رضا دیجیے غمخواروں کو

روسیاہوں کو ہٹا دیں کہ بڑھے آتے ہیں — ہم جو خاموش ہیں وہ منہ پہ چڑھے آتے ہیں

شہ نے فرمایا مجھے خود ہے شہادت منظور — نہ لڑائی کی ہوس ہے نہ شجاعت کا غرور

ان سے منظور نہ تھی جنگ پر اب ہوں مجبور — خیر لڑلو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور

ذبح کرنے کے لیے تشنہ کو ناری آئے — کہیں جلدی مرے سر دینے کی باری آئے

حکم پانا تھا کہ شیروں نے اُڑائے تازی — مثل شہباز گیا ایک کے بعد اک غازی

واہ رے حرب خجل تھا ضرب پہ جانبازی — اُڑ گیا ہاتھ بڑھا جو پئے دست اندازی

تن و سر لوٹتے ریتی پہ نظر آتے تھے — ایک حملے میں قدم فوج کے اُٹھ جاتے تھے

جس پہ غصے میں گرے صید پہ شہباز گرا — یہ کماں کٹ کے گری وہ قدر انداز گرا

جب گرا خاک پہ گھوڑے سے تو ممتاز گرا — نہ اُٹھا پھر کبھی جو تفرقہ پرداز گرا

ہاتھ منہ کٹ گئے سر اُڑ گئے جی چھوٹ گئے — مورچے ہو گئے پامال پرے ٹوٹ گئے

مطلع

بعد غیروں کے عزیزوں نے کیا عزمِ نبرد — سر کو نہوڑا کے بھرا سبطِ نبی نے دمِ سرد

ہوک اُٹھی کبھی سینے میں تو دل میں کبھی درد — سرخ ہوتا تھا کبھی چاند سا چہرہ کبھی زرد

کوئی گلرو تو کوئی سروِ سہی بالا تھا — وہ بچھڑنے لگے گودی میں جنھیں پالا تھا

زلفوں والا تھا کوئی کوئی مرادوں والا
کوئی بھائی کا پسر کوئی بہن کا پالا
چاند سا منہ جو کسی کا تھا تو گیسو ہالا
کوئی قامت میں بہت کم کوئی قد میں بالا
نوجواں کون سا خوش رو و خوش اندام نہ تھا
کتنے ایسے تھے کہ سبزہ ابھی آغاز نہ تھا

ہاتھ وہ بچوں کے اور چھوٹی سی وہ تلواریں
موم کر دیتی تھیں فولاد کو جن کی دھاریں
آب ہو شیر کا زہرہ جسے وہ للکاریں
بجلیاں کوند رہی ہیں کسے نیزہ ماریں
کس بشاشت سے ہزاروں پہ دلیر آتے ہیں
بچے آتے ہیں کہ بپھرے ہوئے شیر آتے ہیں

یہی ہنگامہ رہا صبح سے تا وقتِ زوال
لاش پر لاش گری بھر گیا میدانِ قتال
مورچے سب تہ و بالا تھے پرے سب پامال
سرخرو خلق سے اٹھے اسد اللہ کے لال
کھیت ایسے بھی کسی فوج میں کم پڑتے ہیں
جو لڑا سب یہی سمجھے کہ علی لڑتے ہیں

قاسم و اکبر و عباس کا اللہ رے جہاد
الاماں کا تھا کہیں شور کہیں تھی فریاد
غل ہر اک ضرب پہ تھا اب ہوئی دُنیا برباد
دے گئے خلق میں مردانگی و حرب کی داد
گو وہ دُنیا میں نہیں عرش مقام اُن کے ہیں
آج تک عالم ایجاد میں نام اُن کے ہیں

مطلع

دوپہر میں وہ چمن بادِ خزاں نے لوٹا
پتا پتا ہوا تاراج تو بوٹا بوٹا
باپ بیٹے سے چھٹا بھائی سے بھائی چھوٹا
ابن زہرا کی کمر جھک گئی بازو ٹوٹا
پھر نہ یاور نہ وہ جانباز نہ وہ شیدا تھے
ظہر کے وقت حسین ابنِ علی تنہا تھے

ساتھ جو جو کہ بہادر تھے وطن سے آئے
سامنے سوتے تھے ریتی پہ سنانیں کھائے
دھوپ میں پیاس سے مثل گل تر مرجھائے
مر گئے پر نہ غریبوں نے کفن تک پائے
دھوپ پڑتی تھی یہ دن چرخ نے دکھلایا تھا
نہ تو چادر تھی کسی لاش پہ نہ سایا تھا

صاحبِ فوج پہ طاری تھا عجب رنج و ملال
زرد تھا رنگ تو آنکھیں تھیں لہو رونے سے لال
کبھی بھائی کا الم تھا کبھی بیٹے کا خیال
کبھی دھڑکا تھا کہ لاشیں نہ کہیں ہوں پامال
کبھی بڑھتے تھے وغا کو کبھی رک جاتے تھے
سیدھے ہوتے تھے کبھی اور کبھی جھک جاتے تھے

بڑھکے چلاتے تھے بدر کہ اب آپ آئیں
جوہر تیغ شہنشاہ نجف دکھلائیں
مرنے والے نہیں جیتے جو سنائیں کھائیں
کاٹ لیں آپ کا سر تن سے تو وعدہ پائیں
پسر سعد سے وعدہ ہے صلہ لینے کا
حکم ہے خیمۂ اقدس کے جلا دینے کا

شہ نے فرمایا کہ سر کاٹ لو حاضر ہوں میں
نہ تو لڑنے میں نہ مرجانے میں قاصر ہوں میں
فوج بھی اب نہیں بے یار و ناصر ہوں میں
شہر و صحرا بھی تمھارا ہے مسافر ہوں میں
لوٹ لو پھونک دو تاراج کرو بہتر ہے
کلمہ گو ہو یہ تمھارے ہی نبی کا گھر ہے

کئی سیدانیاں خیمے میں ہیں پردے والی
جن کا رتبہ ہے زمانہ میں ہر ایک پہ عالی
اب نہ وارث ہے کوئی سر پہ نہ کوئی والی
ان کو وہ بیچ کوئی رہ جائے جو خیمہ خالی
یہ نبی زادیاں بے پردہ نہ ہوں جس میں
ایک گوشہ ہو کہ سب بیٹھ رہیں جس میں

سن کے ان باتوں کا اعدا نے دیا جو یہ جواب
گر لکھوں اس کو تو ہو جائے جگر سنگ کا آب
قلب تھرا گیا ہر گز نہ رہی ضبط کی تاب
دیکھ کر رہ گئے گردوں کو شہ عرش جناب
اشک خالی اسے کرتے ہیں جو دل بھر آئے
آپ وداع کے لیئے خیمے کے در پر آئے

تھم کے چلائے کہ اے زینب و ام کلثوم
تم سے رخصت کو پھر آیا ہے حسین مظلوم
اب مرے قتل کے درپے ہے یہ سب لشکر شوم
ہاں جگا دو اسے غش ہو جو سکینہ معصوم
نہیں ملتا جو زمانہ سے گزر جاتا ہے
کہدو عابد سے کہ مرنے کو پدر جاتا ہے

یہ صدا سن کے حرم خیمے سے مضطر دوڑے
شہ کی آواز پہ سب بیکس و بے پر دوڑے
گر پڑیں سر سے ردائیں تو کھلے سر دوڑے
بچے روتے ہوئے ماؤں کے برابر دوڑے
رو کے چلائی سکینہ شہ والا آؤ
میں تمھیں ڈھونڈھتی تھی دیر سے بابا آؤ

آؤ اچھے مرے بابا میں تمھارے واری
دیکھو تم بن ہیں گلے تک مرے آنسو جاری
آج کیا ہے کہ بھولے مری خاطر داری
ہاتھ پھیلا کے کہو آ مری بیٹی پیاری
منہ چھپانے کی ہے کیا وجہ نہ شرماؤ تم
اب میں پانی بھی نہ مانگونگی چلے آؤ تم

دیکھ کر پردے سے کہنے لگی یہ زینب زار ۔۔۔ ابنِ زہرا تری مظلومی و غربت کے نثار
آؤ چادر سے کروں پاک میں چہرے کا غبار ۔۔۔ شہ نے فرمایا بہن مر گئے سب مونس و یار
تم نے پالا تھا جسے ہم اُسے کھو آئے ہیں ۔۔۔ علی اکبر سے جگر بند کو کھو آئے ہیں

منہ دکھائیں کسے سب ہے یہ ندامت زینب ۔۔۔ گھر میں آنے کی نہیں بھائی کو طاقت زینب
کھینچ لائی ہے سکینہ کی محبت زینب ۔۔۔ بھائی جاتا ہے دکھا دو ہمیں صورت زینب
نہ تو سر کھولو نہ منہ پیٹو نہ فریاد کرو ۔۔۔ بھول جاؤ ہمیں اللہ کو اب یاد کرو

صبر سے خوش ہے خدا اے مری غمخوار بہن ۔۔۔ سہل ہو جاتا ہے جو امر ہو دشوار بہن
اپنی ماں کا ہے طریقہ تمھیں درکار بہن ۔۔۔ پھر میں کہتا ہوں سکینہ سے خبردار بہن
ناز پرور ہے مرے بعد الم اس پہ نہ ہو ۔۔۔ بندے کانوں سے اُتارو کہ ستم اس پہ نہ ہو

کہیو عابد سے یہ پیغام مرا بعدِ سلام ۔۔۔ غش تھے تم پھر گئے دروازے تلک آکے امام
قید میں پھنس کے نہ گھبرائیو تم اے گلفام ۔۔۔ کاٹیو صبر و رضا سے سفرِ کوفہ و شام
ناسمجھ دار ہیں ہے شورِ تلاطم جانو ۔۔۔ ناخدا جاتا ہے گھر جانے بس اب تم جانو

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرفِ لشکرِ شام ۔۔۔ پڑ گیا خیمۂ ناموسِ نبی میں کہرام
رن میں گھوڑے کو اُڑاتے ہوئے آئے جو امام ۔۔۔ رعب سے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام
سر جھکے اُن کے جو کامل تھے زباں دانی میں ۔۔۔ اُڑ گئے ہوش فصیحوں کے رجز خوانی میں

تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسا ہوں میں ۔۔۔ مجھکو پہچانو کہ خالق کا شناسا ہوں میں
زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں ۔۔۔ تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں ۔۔۔ اس پہ شکوہ نہیں کچھ صبر اسے کہتے ہیں

اُس کا پیارا ہوں جو ہے ساقیِ حوضِ کوثر ۔۔۔ اُس کا بیٹا ہوں جو ہے فاتحِ بابِ خیبر
اُس کا فرزند ہوں کی جس نے مہم بدر کی سر ۔۔۔ اُس کا دلبر ہوں ہیں دی جس کو نبی نے دختر
صاحبِ تخت ہوئے تیغ ملی تاج ملا ۔۔۔ دوشِ احمد پہ انھیں رتبۂ معراج ملا

وہ علی حق نے جسے عرش سے کھینچی شمشیر
وہ علی جس کا دو عالم میں نہیں کوئی نظیر
وہ علی جو ہوا احمد کا وصی روز غدیر
وہ علی جس کی رسولوں سے سوا ہے توقیر
وہ علی سب سے زیادہ ہے عبادت جس کی
وہ علی گھر میں خدا کے ہے ولادت جس کی

بے وطن ہوں نہ مسافر کو ستاؤ للہ
قتل کیوں کرتے ہو تم کونسا میرا ہے گناہ
اب کوئی ساتھ نہ یاور ہے نہ لشکر نہ سپاہ
تم کو لازم ہے غریبوں پہ ترحم کی نگاہ
ہاتھ آئے گا نہ انعام نہ زر پاؤ گے
یاد رکھو میرا سر کاٹ کے پچھتاؤ گے

نہ ابھی ختم ہوئی تھی یہ مسلسل تقریر
حجت اللہ کے فرزند پہ چلنے لگے تیر
چوم کر تیغ کے قبضے کو پکارے شبیر
لو خبردار چمکتی ہے علی کی شمشیر
پسر فاتح صفین و حنین آتا ہے
لو صفیں باندھ کے روکو تو حسین آتا ہے

لو کھنچی تیغ دو سر فوج پہ آفت آئی
لو ہلا قائمۂ عرش قیامت آئی
فتح تسلیم کو آداب کو نصرت آئی
فخر سے غاشیہ برداری کو شوکت آئی
چوم لوں پاؤں جلال اس تگ و دو میں آیا
ہاتھ جوڑے ہوئے اقبال جلو میں آیا

آپ سیدھے جو ہوئے رخش نے بدلے تیور
دونوں آنکھیں ابل آئیں کہ ڈرے بانی شر
تھوتھنی مل گئی سینے سے کیا دم کو چنور
مثل طاؤس اٹھا گاہ ادھر گاہ ادھر
دم بدم گرد نسیم سحری پھرتی تھی
جھوم کر پھرتا تھا گویا کہ پری پھرتی تھی

ابر ڈھالوں کا اٹھا تیغ دو پیکر چمکی
برق چھپتی ہے یہ چمکی تو سرا سر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی کبھی سر پر چمکی
کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن اسے ڈستے دیکھا
مینہ سروں کا صف دشمن میں برستے دیکھا

دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہے دھارا جیسے
گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے
روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کوندنا برق کا شمشیر کی ضو میں دیکھا
کبھی ایسا نہیں دم خم مہ نو میں دیکھا

اک اشارے میں ہر ابر کوئی دو تھا کوئی چار
نہ پیادہ کوئی بچتا تھا سلامت نہ سوار
برق گرتی تھی کہ چلتی تھی صفوں پہ تلوار
غضب اللہ علیہم کے عیاں تھے آثار
موت ہر غول کو برباد کیے جاتی تھی
آگ گھیرے ہوئے دوزخ میں لیے جاتی تھی

تیغیں عاری ہوئیں ڈھالوں کے اڑے پرکالے
بند سب بھول گئے خوف سے نیزوں والے
جو بڑھے ہاتھ سرِ دست قلم کر ڈالے
تیغ کہتی تھی یہ سب ہیں مرے دیکھے بھالے
صف پہ صف باندھ کے نیزوں کو عبث تولے ہیں
ایسے عقدے مرے ناخن نے بہت کھولے ہیں

جب کبھی جائزۂ فوجِ ستم لیتی ہوں
موت سے رحم نہ کرنے کی قسم لیتی ہوں
دو زبانوں سے سدا کارِ قلم لیتی ہوں
چہرے کٹ جاتے ہیں لشکر کے تو دم لیتی ہوں
ہر طرف ہو کے عدم کے سفری ہوتے ہیں
طبلقیں گھٹتی ہیں چہرے نظری ہوتے ہیں

وہ برش اور وہ چمک اور وہ صفائی اس کی
کسی تلوار نے تیزی نہیں پائی اس کی
اس کا بازو جو اڑایا تو کلائی اس کی
جس کی گردن سے وہ گزری اجل آئی اس کی
صورتِ مرگ کسی نے بھی نہ آتے دیکھا
سر پہ چمکی تو کمر سے اسے جاتے دیکھا

کبھی ڈھالوں پہ گری اور کبھی تلواروں پر
پیدلوں پر کبھی آئی کبھی اسواروں پر
کبھی ترکش پہ رکھا منہ کبھی سوفاروں پہ
کبھی سر کاٹ کے آ پہونچی کمانداروں پر
گر کے اس غول سے اٹھی تو اس انبوہ میں تھی
کبھی دریا میں کبھی بر میں کبھی کوہ میں تھی

کبھی چہرہ کبھی شانہ کبھی پیکر کاٹا
کبھی در آئی گلے میں تو کبھی سر کاٹا
کبھی مغفر کبھی جوشن کبھی بکتر کاٹا
طول میں راکبِ مرکب کو برابر کاٹا
برشِ تیغ کا غل قاف سے تا قاف رہا
پی گئی خون ہزاروں کا پہ منہ صاف رہا

نہ رکی خود پہ وہ اور نہ سر پہ ٹھہری
نہ کسی تیغ پہ دم بھر نہ سپر پہ ٹھہری
نہ جبیں پہ نہ گلے پر نہ جگر پہ ٹھہری
کاٹ کر زیں کو نہ گھوڑے کی کمر پہ ٹھہری
جان گھبرا کے تنِ دشمنِ دیں سے نکلی
ہاتھ بھر ڈوب کے تلوار زمیں سے نکلی

کٹ گئی تیغ تلے جب صفِ دشمن آئی
یک بیک فصلِ فراقِ سر و گردن آئی
بگڑی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی
تیغ کیا آئی کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی
غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں
زہر اس کا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

وہ چمک اس کی سروں کا وہ برسنا ہر سو
گھاٹ سے تیغ کے اک حشر بپا تھا لبِ جو
آب میں صورتِ آتش تھی جلانے کی خو
اور دم بڑھتا تھا پیتی تھی جو اعدا کا لہو
کبھی جوشن تو کبھی صدر کشادہ کاٹا
جب چلی ضربتِ سابق سے زیادہ کاٹا

تنِ تنہا شہِ دیں لاکھ سواروں سے لڑے
بے سپر برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے
صورتِ شیرِ حق اظلم شعاروں سے لڑے
دو سے اک لڑ نہیں سکتا یہ ہزاروں سے لڑے
گر ہو غالب تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو
جو دل و جانِ علی ابن ابی طالب ہو

تیسرے فاقہ میں یہ جنگ یہ حملے یہ جدال
پیاس وہ پیاس کہ ظلمت تھے سراسر لبِ لال
دھوپ وہ دھوپ کہ سوکھے ہوئے تھے تازہ نہال
لو وہ لو جس کی حرارت سے پگھلتے ہیں جبال
سنگریزوں میں تب و تاب تھی انگاروں کی
سر پہ یا دھوپ تھی یا چھاؤں تھی تلواروں کی

تیر سے تھے کبھی جنگل میں ترائی میں کبھی
ڈھال کو پھیرے پہ روکا نہ لڑائی میں کبھی
تیغِ حیدر نے کمی کی نہ صفائی میں کبھی
فرق آیا نہ سر و تن کی جدائی میں کبھی
کبھی ابرو کا بھی ایسا نہ اشارہ دیکھا
جس پہ اک بار چلی اس کو دوبارہ دیکھا

آنکھ وہ آنکھ کہ شیروں کی جلالت جس میں
رخش وہ رخش کہ سب رن کی سرعت جس میں
تیغ وہ تیغ عیاں موت کی صورت جس میں
ہاتھ وہ ہاتھ یداللہ کی طاقت جس میں
روک لے وار جگر کیا کسی بے پیر کا ہو
زور وہ جس میں اثر فاطمہ کے شیر کا ہو

جنگ میں پیاس کا صدمہ شہِ دیں سے پوچھو
تنِ تنہا کی وغا لشکرِ کیں سے پوچھو
زلزلہ دشت پر آفت کا زمیں سے پوچھو
ضربِ شمشیرِ دو سر روحِ امیں سے پوچھو
باپ اس فوج میں تنہا پسر اس لشکر میں
کربلا میں یہ تلاطم ہوا یا خیبر میں

اسد اللہ کے صدقے شہِ والا کے نثار
فتح حیدر نے کیا جنگ میں خیبر کا حصار
کیوں نہ ہوں احمدِ مرسل کے نواسے تھے حسین
ہر طرف فوج میں غل تھا کہ دہائی مولا
الاماں غوب سزا جنگ کی پائی مولا
ہاتھ ہم باندھتے ہیں پھینک کے شمشیروں کو

آئی ہاتف کی یہ آواز کہ ای عرش مقام
ای محمّد کے جگر بند امام ابنِ امام
اب نہیں حکم لعینوں سے وغا کرنے کا
آج ہی آٹھ بہشتوں کی نئی تیاری
نتِ سے حوریں ہیں مکلل بجواہر ساری
پیشوائی کو رسول الثقلین آتے ہیں

تھم گئے سن کے یہ آواز شہِ جن و بشر
عید ہو جلد اگر ذبح کریں بانیِ شر
ہے وہ عاشق جو فدا ہونے کو موجود رہے
کہہ کے یہ میان میں مولا نے رکھی تیغِ دودم
رہ گیا سر کو ہلا کر فرسِ تیز قدم
نیزے یوں گڑ گئے جیسے گل تر خاروں میں

وہی حملے تھے وہی زور وہی تھی تلوار
مونچے فوج کے حضرت نے بھی توڑے کئی بار
فرق اتنا تھا کہ دو روز کے پیاسے تھے حسین
ہم نے دیکھی ترے ہاتھوں کی صفائی مولا
آپ کہتے ہیں دل سے بھی بھلائی مولا
بخشئے امتِ نا اہل کی تقصیروں کو

یہ وغا تیسرے فاقہ میں بشر کا نہیں کام
لوحِ محفوظ پہ مرقوم ہے صابر تیرا نام
ہاں یہی وقت ہے وعدے کے وفا کرنے کا
نخل سر سبز ہیں فردوس میں لہریں جاری
خانۂ دوست میں ہے دوست کی مہمانداری
عرش تک شور یہی ہے کہ حسین آتے ہیں

روک کر تیغ کو فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر
شمرِ ظالم ہے کدھر کھینچ کے آئے خنجر
بس مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے
ہاتھ اٹھا کر یہ اشارہ کیا گھوڑے سے کہ تھم
چار جانب سے مسافر پہ چلے تیرِ ستم
چھپ گئے سبطِ نبی ظلم کی تلواروں میں

پہلے تیروں سے کمانداروں نے چھائی چھاتی
سر پہ تلواریں چلیں زخمی ہوئی پیشانی
جسم سب چور تھا پرزے تھے زرہ جامہ کے
نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی
خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخِ نورانی
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامہ کے

برچھیاں مارتے تھے گھاٹ پہ جو تھے پہرے
ایک ہزار اور کئی سو زخم تھے تن پر گہرے
خوں میں ڈوبا ہوا وہ مصحفِ رخ سارا تھا

ہاتھ سے باگ جدا تھی تو رکابوں سے قدم
بہتے تھے پہلوؤں سے خوں کے تریڑے پیہم
مارے تلواروں کے مہلت تھی نہ دم لینے کی

دشت سے آتی تھی زہرا کی صدا ہائے حسین
در سے چلاتی تھی زینب مرے ماں جائے حسین
فاطمہ روتی ہی ہاتھوں سے پہلو تھامے

ہائے سیّد ترا تن اور ستم کے بھالے
اس پہ یہ ظلم دکھوں سے جسے زہرا پالے
کون فریاد سنے بے سروسامانوں کی

نہ رہا جب کہ ٹھہرنے کا فرس پر یارا
غش سے کچھ دیر میں چونکا جو علی کا پیارا
واں تو نیزے کی انی پشت سے باہر نکلی

کھینچ کر سینے سے نیزہ جو بڑھا دشمنِ دیں
تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمرِ لعیں
کیا کہوں تیغ کو کس طرح گلے پر رکھا

ڈھانپ کر ہاتھوں سے منہ بنتِ علی چلائی
ضربِ اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی
اٹھ کے دوڑی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا

کس طرف جائیے کہاں تیغوں میں بیکس ٹھہرے
دیکھنے والوں کے ہو جاتے تھے پانی زہرے
جسم ہر اک تنِ شبیر کا سی پارہ تھا

غش میں سجدے کبھی ہوتے تھے فرس پر کبھی خم
کوئی بیکس کا مددگار نہ تھا ہائے ستم
کوششیں ہوتی تھیں کعبہ کے گرا دینے کی

ہیرے بیکس میرے بے بس میرے دکھ پائے حسین
کون تیغوں سے بچا کر تجھے لے آئے حسین
حکم گر ہو تو بہن دوڑ کے بازو تھامے

کس کو چلاؤں کہ جیتے نہیں مرنے والے
کون سر سے ترے تلواروں کی آفت ٹالے
یہاں تو بستی بھی نہیں کوئی مسلمانوں کی

گر پڑا خاک پہ وہ عرش خدا کا تارا
نیزہ سینے پہ سناں ابنِ انس نے مارا
یاں بہن خیمہ کی ڈیوڑھی سے کھلے سر نکلی

جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں جبیں
آسماں ہل گئے تھرا گئی مقتل کی زمیں
پاؤں قرآں پہ رکھا حلق پہ خنجر رکھا

ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی
گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی
منہ جو کھولا تو سرِ شہ کو سناں پہ دیکھا

رو کے چلائی کہ ہے ہے مرے مظلوم حسین — فوج اعدا میں ترے قتل کی ہے دھوم حسین

کچھ مجھے آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم حسین — ہائے میں رہ گئی دیدار سے محروم حسین

مڑ کے دیکھو کہ مصیبت میں پڑی ہوں بھائی — ننگے سر بلوۂ اعدا میں کھڑی ہوں بھائی

بس انیس آگے نہ لکھ زینب ناشاد کے بین — قتل ہو جانے پہ بھی دھوپ میں تھی لاش حسین

قبر میں بھی نہ ملا احمد مختار کو چین — گھر جلا قید ہوئی آل رسول الثقلین

کتنے گھر شاہ کے مرجانے سے برباد ہوئے — لٹ گئے یوں کہ نہ سادات پھر آباد ہوئے

رباعی

ہر دم غم سبط شہ لولاک کیا — جب نام لیا چشم کو نمناک کیا

تر ہو گیا رومال تو پھاڑا دامن — پایا نہ گریباں تو جگہ چاک کیا

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشت مصاف سے
اڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے
صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے
طبقے فلک کے صورت گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

لرزہ تھا تحت و فوق و جنوب و شمال میں
مضطر تھے شش جہت کے مکیں ایک حال میں
سکان غرب و شرق تھے بیم و زوال میں
غل تھا کہ گھر گئے غضب ذوالجلال میں
شہ کا غضب نمونۂ قہر الٰہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

راحت میں جن و انس و ملک کی خلل پڑے
کھا کھا کے جوش خاک سے چشمے ابل پڑے
قلزم میں ڈر کے مردم آبی اچھل پڑے
بیر الالم سے غول جنوں کے نکل پڑے
الٹی زمیں سبھوں کے دلوں پہ چھٹن گئی
پریوں کے ہوش اڑ گئے جانوں پہ بن گئی

اٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور
چلائے گرگ و شیر و غزالان و مار و مور
مردے دہل کے چونک پڑے سب میان گور
ہے بازوئے حسین میں دست خدا کا زور
الٹے ہیں مثل شیر خدا آستین کو
اے کردگار عرش بچا لے زمین کو

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغ شرر فشاں
غار اژدروں سے چھٹ گئے شیروں سے نیستاں
تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
برپا تھا بر و بحر میں اک شور الاماں
مانند موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

تاریک تھا شکاروں کی آنکھوں میں سب جہان
بن سے سیاہ گوش بھی بھاگے دبا کے کان
مضطر تھے شیر و گرگ نکالے ہوئے زبان
غل تھا یہ دام و دد میں کہ کیونکر بچے گی جان
تیغ علی علم تھی جو دشت قتال میں
چیتوں نے منہ چھپائے تھے گینڈوں کی ڈھال میں

گھڑیال زیرِ آب تھے مضطر اِدھر اُدھر | جا گہہ پناہ کی کہیں ملتی نہ تھی مگر
تھی مچھلیوں کے چہروں پہ گرداب کی سپر | بری میانِ بحر تھے، بحری میانِ بر
گھر چھٹ گئے تھے جانوروں کے یہ رنگ تھے
خشکی میں تھے نہنگ تری میں پلنگ تھے

غل تھا کہ ضربِ تیغِ علی سے خدا بچائے | یہ برق دیکھیے کسے پھونکے کسے جلائے
قہرِ خدا سے بچ کے کوئی کس طرف کو جائے | بچ جائے آج وہ جو دوبارہ حیات پائے
فولاد ہو کہ سنگ یہ منہ موڑتی نہیں
بے ڈوبے کسی کو کبھی چھوڑتی نہیں

اعدا پہ جبکہ تیغِ شہِ لافتا چلی | بجتی ہوئی پرے سے جلو میں قضا چلی
غل پڑ گیا کہ صرصرِ قہرِ خدا چلی | اک دم میں خرمنوں سے اُڑانے یہ ہوا چلی
غل تھا غضب حسین کا قہرِ الٰہ ہے
بادِ فنا سے گلشنِ ہستی تباہ ہے

تھرا رہے تھے شیر نرے ہیبتِ حسین | گیتی کو زلزلہ تھا زہے شوکتِ حسین
فاقوں میں کم ہوئی تھی نہ کچھ طاقتِ حسین | اک قدرتِ خدا تھی خوشا قدرتِ حسین
سوکھی ہوئی زباں پہ کسی کا گلا نہ تھا
سولہ پہر ہوئے تھے کہ پانی ملا نہ تھا

فاقوں سے رنگ زرد تو لب پیاس سے کبود | چہرے سے تھا جلالِ جہاں آفریں نمود
کرتا تھا نورِ حق جو سوئے آسماں صعود | تسبیح پڑھ رہے تھے ملک وردِ درود
تھم جاتے تھے حسین جو تلوار تول کر
حوریں بلائیں لیتی تھیں گیسوؤں کو کھول کر

وہ ماہِ رخ پہ ہالۂ گیسوئے تابدار | خوشبو پہ جس کی عنبرِ سارا بھی تھا نثار
تھا فاطمہ کا رشتۂ جاں ان کا تار تار | قرباں ہر ایک تار پہ سو نافۂ تتار
گیسو نہ تھے رخِ خلفِ بوتراب پر
تھی جدولِ سیہ ورقِ آفتاب پر

سر لوحِ مصحفِ رخِ پر نور ہے جبیں | آئینہ کی طرح سے نہ جس میں شکن نہ چیں
مرآتِ نورِ حق کا قمر آسمانِ دیں | قطرے عرق کے تھے کہ وہ گوہرِ ثمیں
چھڑکاؤ تھا گلاب کا اس سرزمین پہ
گرتے تھے ٹوٹ ٹوٹ کے اختر زمین پہ

وہ اوجِ ذوالفقار وہ جبیں بھووں کا بل
اک نخل قد دکھاتا تھا تیغوں کے تین پھل
ملتے تھے غیظ سے جو وہ ابروے بے بدل
گویا پروں کو تولتا تھا طائرِ اجل
پلکوں کے تیر سب کے کلیجوں کے پار تھے
کھینچی تھی یاں کمان ادھر اعدا ٹنگے تھے

آنکھیں وہ نرگسی کہ غزال آنکھ کو چرائے
ہنگامِ غیظ شیر یہ چتون کہاں سے لائے
پنجہ سے اس مژہ کے غا میں خدا بچائے
زہرہ ہے آب آب جگر کیوں نہ تھرتھرائے
سمجھو نہ دور آنکھ ملانے کی دیر ہے
پتلی ہے چشم میں کہ ترائی میں شیر ہے

ابرو ہیں نونِ حسن تو چشمِ حسیں ہے صاد
محرابِ کعبہ وہ ہے تو یہ قبلۂ مراد
گو یہ جدا جدا ہیں پہ ہے عین اتحاد
دیکھے عدو جو کور نہ ہو چشمِ اعتقاد
لاریب نورِ چشمِ نبی و علی یہ ہے
نصِّ جلی ہوا کہ خدا کا ولی یہ ہے

رخسار ہیں وہ گل جنھیں خوفِ خزاں نہیں
ٹکڑے ہیں لعل کے لبِ شیریں بیاں نہیں
ہے ماہیِ محیطِ فصاحت زباں نہیں
یہ فرطِ نازکی ہے کہ گویا دہاں نہیں
باتوں میں بند ہیں فصحا کائنات کے
صدقے ہیں بات بات پہ کوزے نبات کے

سوکھے لبوں پہ لعلِ بدخشاں نثار ہیں
دانتوں کے نور پر دُرِ غلطاں نثار ہیں
تابندگی پہ اخترِ تاباں نثار ہیں
یہ آب ہے کہ قطرۂ نیساں نثار ہیں
ایسے گہر نہیں کہیں بحرِ عمیق میں
گویا چمک رہے ہیں ستارے عقیق میں

وہ لعلِ لب وہ موے مطہر وہ ریشِ شاہ
ہیں ایک جا ہلالِ شبِ قدر و نورِ ماہ
کیا خوشنما ہے گردِ قمر ہالۂ سیاہ
ہے صبح و شام ایک جگہ کیجیے نگاہ
ہے رتبۂ رُخِ شہِ ذی شاں کھلا ہوا
دیکھو دھرا ہے رحل پہ قرآں کھلا ہوا

مدحِ گلوے پاک کوئی کیا کرے بھلا
محبوبِ کبریا نے سدا جس پہ منہ ملا
حیرت ہے کیوں الٹ نہ گیا دشتِ کربلا
خنجر سے کٹ گئیں وہ رگیں اور وہ گلا
بخشا فروغ جس نے یہ ایماں کے طور کو
سر کاٹ کر بجھا دیا اُس شمعِ نور کو

وہ دوشِ پاکِ بادشہِ آسماں وقار
بازو وہ ہیں کہ بازوئے دیں جن سے استوار
سب پر کھلی ہے عقدہ کشائی حضور کی
ہر دم اُٹھا کے ہاتھ یہ فرماتے ہیں سخن
کیوں جانتے ہو کون ہیں دُنیا میں پنجتن
وہ رُکن جب اُٹھ گئے رنج و بلا میں ہوں
اعضا میں کیوں نہ ہاتھ کا ہو مرتبہ بلند
ہے پنجتن کی ذات سے سب خلق بہرہ مند
عقدے یہ اُن سے کھلتے ہیں جو ذی شعور ہیں
ہے طورِ نورِ ذاتِ خدا سینۂ حسین
اسرارِ حق ہے گوہرِ گنجینۂ حسین
سینہ نہیں سفینۂ طوفانِ نوح ہے
آئینۂ حلب سے فزوں تر صفا میں ہے
یاں دل میں ہے وہ ضو جو کلامِ خدا میں ہے
کیا قہر ہے کسی نے نہ پاسِ ادب کیا
سینے پہ وہ پسینے کے قطروں کی آب و تاب
ہے گو کہ تین روز سے فاقے سے وہ جناب
پھولوں کی بو سے خوش ہے ہیں کپڑے بسے ہوئے
بازو ہے تیرِ ظلم سے زخمی کمر ہے خم
پر واہ رے ثبات کہ اُٹھتے نہیں قدم
آنکھیں ہیں سرخ سحرِ شجاعت ہے جوش پہ

ہے کُل کے عاصیوں کی شفاعت کا جس پہ بار
ساعد سے زورِ دستِ یداللہ آشکار
روشن ہے انگلیوں سے کہ ہیں شمع نور کی
عالم میں خمسۂ نُجَبا ہیں شہِ زمن
ہیں اور نبی و فاطمہ و حیدر و حسن
اب میں فقط مخمسِ آلِ عبا میں ہوں
دستِ کرم وہ ہے کہ خدا کو بھی ہے پسند
پانچ انگلیوں میں ہاتھ کے ہیں چار پر وہ چوبند
چودہ بزرگ خلق میں خالق کے نور ہیں
صاف آئینہ ہے اک دلِ بے کینۂ حسین
روح الامیں ہے خادمِ دیرینۂ حسین
ایماں کی سجدہ گاہ ہے قرآں کی روح ہے
یہ ضو نہ بدر میں ہے نہ شمس الضحےٰ میں ہے
قرآں غلاف میں ہے کہ سینہ قبا میں ہے
زانو اُسی پہ شمر نے رکھا غضب کیا
غرقِ عرق تھا شرم کے مارے جہاں گلاب
پر نور ہے شکم صفتِ قرصِ آفتاب
اُمت کی مغفرت پہ کمر ہیں کسے ہوئے
طاقت جواب دے چکی ہے مولا کو دم بدم
تیغِ شہِ نجف ہے اسی ہاتھ میں علم
شملہ چھٹا ہوا ہے عمامے کا دوش پر

اللہ رے نبی کی عبا و قبا کا نور
زہرا و حیدر و حسن و مجتبیٰ کا نور
حیراں لباسِ نور پہ سب حلہ پوش ہیں
بالائے دوش حضرتِ حمزہ کی ہے وہ ڈھال
پھول اس کے وہ کہ تیغ کا پھل جس سے پائمال
اس کو عروج کیوں نہ ملے قتل گاہ میں
وہ آہنی کلہ وہ زرہ جامۂ حضور
حلقے وہ جن کو دیکھ کے شرمائے چشمِ حور
جوشن نہ تھا تنِ شہِ گردوں وقار میں
شانے پہ کس شکوہ سے ہے حلقۂ کماں
پیغام موت کا ہے ہر اک تیرِ جاں ستاں
سرکش کہاں ہیں لشکرِ کج عقل و فہم کے
دستانہ ہے کہ قبضۂ سیفِ قضا ہے یہ
ہمدستِ آستینِ شہِ لافتا ہے یہ
دستِ خدا کے لال جری ہیں دلیر ہیں
نیزہ ہے رشکِ افعیِ گیسوئے دل ستاں
کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں
لشکر جو دیو کا ہو تو دم میں ہلاک ہو
اس شان سے ہیں رن میں اکیلے امام دیں
خنجر کہیں ہیں تیر کہیں برچھیاں کہیں
لشکر بڑھے ہیں شاہ پہ یوں شام و روم کے

پردے ہیں جس کے جلوہ نما ہے خدا کا نور
ہے شش جہت میں خامسِ آلِ عبا کا نور
ادریس میں حواس نہ موسیٰ میں ہوش ہیں
زیبا ہے کہیے گر رخِ فتح و ظفر کا خال
شب میں عیاں ہیں چاند ستارے تو اک ہلال
پشت پناہِ خلق ہے جس کی پناہ میں
جس کی ہر اک کڑی سے نکلتا تھا چھن کے نور
قندیلِ آہنی میں فروزاں ہے شمعِ طور
تارے چمکتے تھے شبِ تاریک و تار میں
ہے جس کے ڈر سے قوسِ قزح چرخ پر تپاں
ہر دم صدا یہ ہے لبِ سوفار سے کہ ہاں
گوشوں میں چھپتے پھرتے ہیں کیوں سہم سہم کے
شمشیر ہے زبانِ دہن اژدہا ہے یہ
ثابت ہوا کہ پنجۂ شیرِ خدا ہے یہ
اس ہاتھ سے جہاں کے زبردست زیر ہیں
سینے کو جس کے ڈر سے چراتا ہے آسماں
غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں
اس کی ہوا لگے تو بدن جل کے خاک ہو
اور واں پرے جمائے ہیں میداں میں اہلِ کیں
اللہ ری کشمکش نظر آتی نہیں زمیں
آتی ہے جس طرح سے گھٹا جھوم جھوم کے

تیغوں کی اس گھٹا میں چمکتی ہیں بجلیاں
یاجوج کے غول ہیں شور ہے ہر دم کی فغاں
چھائے ہوئے ہیں شیشہ پہ زرہ پوش سب جواں
لوہے کی ہے زمین تو ڈھالوں کا آسماں
چاروں طرف سے نرغۂ فوجِ کثیر ہے
ابرِ کرم پہ بارشِ بارانِ تیر ہے

ٹھہری ہے صف جمائے ہوئے اس طرح سے فوج
طوفاں میں جوش کھا کے اٹھے جس طرح سے موج
ہر مرد کی کمر میں ہیں تلواریں زوج زوج
ڈھالوں کا دور دور ہے نیزوں کا اوج اوج
آفت جنابِ فاطمہ کے گھر پہ آئی ہے
ٹاپوں سے مرکبوں کے زمیں تھرتھرائی ہے

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں چمکتی ہیں
نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں
نیزے تُلے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں
سنگینوں لوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرزِ گراں سر اٹھائے ہیں

گھوڑوں سے گونجتا ہے وہ سب وادیِ نبرد
گردوں ہیں مثلِ شیشۂ ساعت بھری ہے گرد
ہے چرخ چار میں پہ رُخِ آفتاب زرد
ڈر ہے گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجومِ فوج سے وہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اُڑی کہ ہوا بند ہو گئی

دستے وہ مصر زنگ کے وہ فوجِ روم و شام
دن وہ پہر وہ دشت کی گرمی وہ ازدہام
تیغیں برہنہ ہو گئی تھیں چھوڑ کر نیام
مانندِ شمع جل رہی تھیں برچھیاں تمام
تلواریں منہ چھپائے تھیں سائے میں ڈھال کے
خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے

لوں چل رہی تھی رن میں کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں کے رنگ ہو گئے تھے دھوپ میں سیاہ
برچھی کے پھل پہ ہوتا تھا شعلے کا اشتباہ
گلخن بنی ہوئی تھی ہر اک آہنی کلاہ
گویا کہ قوس میں تھا گزر آفتاب کا
عالم تھا ہر خدنگ پہ تیرِ شہاب کا

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر
تھے وہ غلام مروحہ جنباں ادھر اُدھر
تنہا تھا دھوپ میں اسد اللہ کا پسر
نے سایۂ علم تھا نہ عباسِ نامور
لگتی تھی کچھ بدن کو ہوا آہِ سرد سے
گیسو اٹے ہوئے تھے بیاباں کی گرد سے

جنگل سے آرہی تھی یہ آواز بار بار
تو دھوپ میں کھڑا ہے مرا دل ہے بے قرار
عالم سیاہ ہے مری چشمِ پُرآب میں
مادر سے رو کے کہتے ہیں سلطانِ کربلا
منصف ہو آپ فرق پہ سایہ کروں میں کیا
پڑتی ہے خاک اُڑ کے تنِ پاش پاش پر
کرتے ہیں ماں کی روح سے حضرت تو یہ کلام
کہتے ہیں مسکرا کے امامِ فلک مقام
فاقوں سے حال غیر ہے محتاجِ آب ہوں
اللہ کیا ہجوم ہے کیا شور گیرودار
اک سینہ اور یہ ناوکِ بیدادِ بے شمار
ان برچھیوں سے کس کو زمیں پر گرائینگے
لشکر یہ ہے کہ قہر کا دریا ہے موج زن
اکبر نہ ہیں جلو میں نہ لختِ دلِ حسن
دیکھیں پسر پہ نرغۂ فوجِ کثیر کو
آئی قریب سے یہ صدائے شہِ نجف
مصروف ہے ثنا میں تری قدسیوں کی صف
دیں ہے بلند کفر کی بنیاد پست ہے
پیاسا جو تین روز رہا تو کنارِ جو
مقبول کردگار ہے نورِ خدا ہے تو
جائینگے یہ کہاں جو ہیں تجھسے بھرے ہوے

کیا آج تجھ پہ بن گئی اے میرے گلعذار
سایہ تو کر لے رُخ پہ عبا کا یہ ماں نثار
سونلا گیا ہے چاند مرا آفتاب میں
کافی ہے آج سر پہ مرے سایۂ خدا
سوتے ہیں آفتاب میں سب میرے مہ لقا
اماں رو رہی ہیں علی اکبر کی لاش پہ
ہر سمت سے بڑھی چلی آتی ہے فوجِ شام
کس سے لڑینگے کیوں ہے یہ کوشش یہ ازدہام
میں آپ ہی مسافرِ پا در رکاب ہوں
اک جسم زار اور یہ نیزے کئی ہزار
میرے لیئے تو بس ہے خود تیغِ آبدار
سو خنجر اک گلے پہ یہ کیونکر پھرائینگے
میں اک ضعیف تشنہ و مظلوم و بے وطن
وا حسرتا کہ مر گئے عباسِ صف شکن
لاؤں کہاں سے آج جنابِ امیر کو
تجھ سا پسر دیا مجھے حق نے زہے شرف
لاکھوں ہیں گو اُدھر پہ خدا ہے تری طرف
ہر طرح تیری فتح ہے ان کی شکست ہے
دینِ نبی کی رہ گئی دنیا میں آبرو
ناجی ہیں تیرے دست تو نا رہی تمہے عدو
ہیں سب کے سب خدا کے غضب میں گھرے ہوے

ایوب تیرے صبر کے ہیں آج مدح خواں
لب پر خلیل کے ہے ترے حلم کا بیاں

یعقوب نوح و آدم و یحییٰ ہیں یک زباں
ہے کل کا فخر دلبر پیغمبر زماں

عیسیٰ پکارتے ہیں کہ حق کا ظہور ہے
موسیٰ کا ہے یہ قول کہ خالق کا نور ہے

عباس جب سے قتل ہوا ہے فرات پر
حاضر ہے کربلا میں اسی وقت سے پدر

نانا ہیں بے حواس حسن ہیں برہنہ سر
ماں بے قرار پھرتی ہے تھامے ہوئے جگر

تجھ پر نثار ہونے کی کس کو ہوس نہیں
تقدیر سے کسی کا مری جان بس نہیں

کی عرض شاہ دیں نے پدر سے بانکسار
مولا میں اس عنایت و اشفاق کے نثار

یہ پرورش یہ غور ہے عزو افتخار
کیا سرفراز ہو گیا اس دم یہ خاکسار

بیٹے پہ چاہئیں یوں ہیں اشفاق باپ کے
جان آ گئی غلام میں آنے سے آپ کے

بندہ تو قابل اس کے نہیں بادشہ زماں
جو ہوں مقربان خدا میرے مدح خواں

کیا میرا صبر اور مری ہمت کا کیا بیاں
اک بندۂ حقیر و گنہگار و ناتواں

لب پر جو وہ بزرگ مرا نام لائے ہیں
یہ سب شرف حضور کے صدقے میں پائے ہیں

اب کچھ نہیں ہراس اگر لاکھ ہوں ستم
ہاں ایک ہے تباہی زینب کا مجھکو غم

جب ذبح ہو حسین تہ خنجر دودم
اس کی ہوا بچائے گا کون اے شہ امم

سب گھر لٹے مگر وہ اسیر بلا نہ ہو
میں بے کفن رہوں یہ بہن بے ردا نہ ہو

فرما کے یہ فرس سے اشارہ کیا کہ ہاں
کوندا مثال برق کمیت سبک عناں

وہ غیظ وہ رجز وہ جلال و شکوہ و شان
تھی دم بدم وہ سیف زبانی کہ الاماں

دونوں زبانیں تیغ کی بھی شعلہ بار تھیں
بیتیں رجز کی تیغ دودم سے بھی تیز تھیں

نعرہ یہ تھا کہ دلبر مشکل کشا ہوں میں
جوہر کشائے تیغ شہ لافتا ہوں میں

شمس الضحیٰ علی ہیں تو بدرالدجیٰ ہوں میں
قرآں گواہ ہے کہ زبان خدا ہوں میں

کس آیۂ کریمہ میں ذکر علی نہیں
قرآں میں کیا خفی ہے کہ ہم پر جلی نہیں

ہم تو ہیں اس کلام میں اور ہم ہیں وہ کلام
لاریب فیہ گر ہی وہ ہادی تو ہم امام
جو منحرف ہوا وہ مطیعِ خدا نہیں
کچھ یاد ہی وصیتِ محبوبِ ذوالجلال
بھولے کلامِ حق کو بھی ای قومِ بد خصال
کیوں منہ پھرا لیا ہی حدیث و کتاب سے

تم یہ نہ جانیو کہ مجھے کچھ ہی خوفِ جاں
قبضے میں ہی حسین کے تیغِ شرر فشاں
لاکھوں سے منہ پھرے نہ کبھی وہ دلیر ہوں
بخشا ہی مجھ کو حق نے شہِ لافتا کا زور
ہی انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور
الٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا

آگے بڑھوں جو تیر کو چلے ہیں جوڑ کے
بیکار کر دوں شیر کا پنجہ مروڑ کے
الٹوں طبق زمین کے یوں جھٹک کے زین سے
اعلیٰ ہی عرش سے بھی مری ہمتِ بلند
رستم ہی ذوالفقار کی دہشت سے دردمند
جس شقی کے سینے سے گزرا وہ فوت ہی
دیتا ہوں اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
بے جبرئیل کارِ قضا و قدر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی

جس طرح لام میں ہی الف اور الف میں لام
امت کو فرضِ عین ہی دونوں کا احترام
قرآن و اہلبیت ازل سے جدا نہیں
فرما گئے تھے خلق سے کیا وقتِ انتقال
ہم اہلِ بیت ہیں سو ہمارا کیا یہ حال
محشر میں کیا کہو گے رسالت مآب سے

لازم ہی یہ سخن کہ میں ہوں ہادیِ جہاں
دشمن کو جس کی ضرب سے ملتی نہیں اماں
میں بیشۂ شجاعت و ہمت کا شیر ہوں
اس دستِ حق پرست میں ہی دستِ خدا کا زور
باقی ہی میرے زور کے آگے ہوا کا زور
جس طرح ٹوٹ جاتا ہی ساغر حباب کا

بھاگیں خطا شعار کمانوں کو چھوڑ کے
پھینکوں نہ میں پیر درِ خیبر کو توڑ کے
جس طرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے
بجلی ابھی گرے جو بڑھوں چھیڑ کر سمند
کھلتا نہیں ہی دو سے نیزے کا میرے بند
اس کی سنانِ تیز ہر انگشتِ موت ہی
آئے غضب خدا کا ادھر رخ جدھر کروں
انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
رکھ دوں زمیں پہ پھیر کے ڈھال آفتاب کی

یہ تیغ سر پہ گر کے ٹھہرتی ہے زین پر
جب ہاتھ اُٹھا ہے برق گری ہے زمین پر
خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغِ دو پیکر نے تین پر
جس وقت ضربِ شیرِ خدا یاد آتی ہے
ماہی سمیت گاوِ زمیں تھرتھراتی ہے

میں شیر ہوں چھ لاکھ اگر ہو تو کیا ہو تم
اُٹھا جو میرا ہاتھ تو دم میں فنا ہو تم
واللہ میرے سامنے بیدست و پا ہو تم
پر کیا کروں کہ اُمّتِ خیر الوریٰ ہو تم
لو واسطہ رسولِ خدا کا پناہ دو
اب بھی کسی طرح مجھے جانے کی راہ دو

یہ کہہ کے چپ ہوئے جو امامِ فلک سریر
اس فوج قاہرہ سے اُٹھا شورِ دار و گیر
کھولے ہوئے نشانوں کو آگے بڑھے شریر
فرزندِ فاطمہ پہ چلے دس ہزار تیر
دہشت سے عافیت نے منہ اپنا چھپا لیا
کالی گھٹا نے ڈھالوں کی جنگل کو چھا لیا

وہ شورِ کوسِ حرب کا وہ بوق کا غریو
شرمندہ برچھیوں کی چمک سے سنانِ گیو
تیرِ دراز صورتِ خنجر زبانِ دیو
وہ صورتیں کہ دیکھ کے ڈر جائے جن کو دیو
سب فوج یوں بڑھی تھی وغا کو امام سے
آندھی سیاہ آتی ہے جس وقت شام سے

برسے اُدھر سے تیر تو کوندی ادھر سے برق
وہ برق چھپتی پھرتی تھی خود جس کے ڈر سے برق
چمکی وہ یوں کہ گر گئی سب کی نظر سے برق
روکیں کسے رکی ہے کسی کی سپر سے برق
جل تھل بھرے لہو سے نہ دیر اک گھڑی لگی
کیا ابرِ تیغ تھا کہ سروں کی جھڑی لگی

معجز نما تھی شاہ کی شمشیرِ آبدار
دکھلائی ماہِ صیف میں برسات کی بہار
یاں برق واں ہوا تو ادھر ابرِ دُربار
بہتا کہیں لہو کی کہیں خوں کی آبشار
یوں سر برس گئے کہ روانی تھی باڑھ میں
پڑتا ہے دونگڑا کبھی جیسے اساڑھ میں

بہتے تھے خوں میں چار طرف سر کٹے ہوئے
بڑھتے تھے جو بہت وہ کھڑے تھے ہٹے ہوئے
جو گھاٹ پر تھے زور تھے ان کے گھٹے ہوئے
تھے جا بجا سے ڈھالوں کے بادل پھٹے ہوئے
لڑنے میں اوجِ تیغ کا دو چند ہو گیا
نکلی کمان تیروں کا مینہ بند ہو گیا

بازو ہر اک کمان کا کمزور ہو گیا
تیروں کے مینہ برسنے کا اک شور ہو گیا
ڈھالوں کا ابر خوں میں شرابور ہو گیا
جو تھا کنارِ نہر لبِ گور ہو گیا
مشقِ شناوری تھی قیامت بڑھی ہوئی
اُتری وہ تیغ خون کی ندی چڑھی ہوئی

کیا کیا چاٹ کھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے
منتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانیے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہاتھ میں اُڑا کے کلائی نکل گئی
کوندی گری زمیں میں سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
مچھلی تھی اک کہ دم میں آئی نکل گئی
چار آئینے کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
پہونچوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر
قبضے سے تیغ بر سے زرہ ہاتھ سے سپر
برچھی سے پھل کماں سے زرہ زین سے تیر
ترکش کہیں پڑے تھے نشانِ نری کہیں
پیکاں کہیں تھے شست کہیں تھی سپری کہیں

مقتل میں ہوش فوجِ عمر کے اُڑا دیے
ٹکڑے ہر ایک کے تن و سر کے اُڑا دیے
پرزے ستمگروں کے جگر کے اُڑا دیے
پرکالے ایک دم میں سپر کے اُڑا دیے
جب ڈھال پر چمک کے در آتی تھی خود میں
سر کٹ کے آن پڑتا تھا ترکش کی گود میں

وقتِ وغا عصا تھی کبھی اژدہا کبھی
تلوار بن گئی وہ کبھی اور قضا کبھی
بجلی کبھی تھی ابر کبھی اور ہوا کبھی
بنتی تھی نفیِ کفر کے خاطر بلا کبھی
پھرتے تھے جب حسین پیادوں کو رول کر
کھا لیتی تھی سروں کو دہن کھول کھول کر

اللہ کے غضب کی نشانی دکھا گئی
دریائے قہرِ حق کی روانی دکھا گئی
جل جل گئے وہ شعلہ فشانی دکھا گئی
کٹ کٹ گئے وہ سیف زبانی دکھا گئی
لب صورتِ شگافِ قلم بند کر دیے
فقروں نے ذوالفقار کے دم بند کر دیے

پہونچی سمِ فرس پہ جو بالائے سر گری
چمکی ادھر زمیں سے نکل کر ادھر گری
ناری چلے ادھر وہ جدھر کوند کر گری
جس صف سے گر چلی یہ وہ صف خاک پر گری
دکھلا کے موج جاتی تھی یوں ہر سوار پہ
جنگل میں باز گرتا ہے جیسے شکار پہ

دم میں گئی فلک پہ اور آئی ہزار بار
معراج دستِ شاہ میں پائی ہزار بار
دکھلا گئی صفوں کو صفائی ہزار بار
گرمی یہ تھی کہ خوں میں نہائی ہزار بار
جب تک چلی وہ زرد سپاہِ عدو رہی
اس دن کے معرکہ میں وہی سرخرو رہی

غل تھا خطِ سیاہ نہ سمجھو یہ ناگ ہے
جو دشمنِ علی ہیں اسے ان سے لاگ ہے
جلتا ہے دشت چار طرف بھاگ بھاگ ہے
جائیں بچا کے تیغ کے پانی میں آگ ہے
پھونکے نہ یہ سم اس سے ہمارے نکلتے ہیں
اژدر کی طرح منہ سے شرارے نکلتے ہیں

ہلچل وہ ان صفوں کی وہ گھوڑے کی جستِ تیز
تھا رک کے تا زمیں کہیں صرصر سے تند و تیز
صدقے گندھی ایال پہ گیسوئے مشک بیز
گرد اوڑی میں ابر تو بجلی دمِ ستیز
ذرّے قدم کے فیض سے سارے چمک گئے
جب پتلیاں اٹھیں تو ستارے چمک گئے

جرأت میں رشکِ شیر تو ہیکل میں پیل تن
بولی کے وقت کبکِ دری جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

آنکھیں وہ جن کو دیکھ کے حیران ہے غزال
گردن وہ جس کی شرم سے ہے سرنگوں ہلال
آہو کی جست شیر کی چتون پری کی چال
دل اس کے دستِ پائے حنائی سے پائمال
ہر نعلِ پا کا حسن یہ تھا اس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

کیوں اعتقادِ حکما کے نہ آئے فرق
اشراقی اس سے بحرِ تفکر میں سب ہیں غرق
راکب گر اس کو غرب سے دوڑائے سوئے شرق
اور آسماں سے ساتھ ہی چمکے نکل کے برق
بجلی کی واں چمک نہ فلک پر تمام ہو
یاں کر کے غرب میں فرسِ تیز گام ہو

دیکھی نہیں کسی نے یہ نرمی شتاب میں
ہے جس کے زینِ صاف سے مخمل بھی خواب میں
سرعت کا اس کی وصف لکھیں گر کتاب میں
سطریں ہیں بہ صورتِ موجِ اضطراب میں
اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر

رہ میں سوار ہاتھ سے کبھی اگر گرا اسے
اور یہ فرس جنوب سے سوئے شمال جائے
وہ تازیانہ یاں نہ زمیں تک پہنچنے پائے
اس حد سے ایک دم میں وہ حد دیکھ کر پھر آئے
تنگی سے آسماں کی خفا یہ سمند ہے
کیونکر اڑے پری ہے کہ شیشے میں بند ہے

کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
بجلی ہے جس طرف دمِ پیکار پھیر لو
کاوے میں شکلِ گنبدِ دوار پھیر لو
نقطے کے گرد صورتِ پرکار پھیر لو
دوڑے برے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

طاؤس ساجدھر گیا دم کو چنور کیے
دم میں پرے سپاہ کے زیر و زبر کیے
کچلے کبھی بدن کبھی پامال سر کیے
کشتوں کو روند روند کے سم خوں میں تر کیے
میداں میں تھا کسی کو نہ یارا ستیز کا
عالم ہر ایک نعل میں تھا تیغِ تیز کا

زیبا ہے گر کہیں شعرا باد پا اسے
آہستہ گر چلے تو نہ پائے ہوا اسے
طائرِ جہاں کے جانتے ہیں سب ہما اسے
مہمیز و تازیانہ کی حاجت ہے کیا اسے
نزاک گر ہوا سے کبھی اک ذری اڑی
یوں اڑ گیا کہ سب نے یہ جانا پری اڑی

معروف جنگِ تیغ سے تھے سرورِ حجاز
چمکا کے اسپ اس سے بڑھا ایک نیزہ باز
نامرد نے کیا جو ہیں دستِ ستم دراز
نیزہ اٹھا کے کہنے لگے شاہِ سرفراز
ہاں اے اجل گرفتہ کمر استوار کر
نیزے کا ہے غرور تو آ کوئی وار کر

کس طنطنہ سے شاہ پہ آیا وہ خود پسند
کل کی طرح سے پھرنے لگا ہر طرف سمند
نیزے سے اس کے آپ کو پہونچی نہ کچھ گزند
مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند
تھا گو کہ نیزہ بازی پہ ظالم تلا ہوا
یاں تھا سبب اس کے عزم کا عقدہ کھلا ہوا

نیزے کی اس لعیں سے لڑائی جو آپڑی دونوں طرف سے جنگ میں کوشش ہوئی بڑی
انیوں سے اُڑ رہے تھے شرارے گھڑی گھڑی تھی چوب سے تو چوب سناں سے سناں لڑی
اک معرکہ تھا بیچ میں دشتِ قتال کے
دو مار گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

پیہم ہوئیں نکاں پہ نکانیں جو یک دگر ظالم کبھی ادھر تھا تو حضرت کبھی ادھر
کس نوک جھوک سے دہیں نیزے کو پھیر کر فرزندِ شبیر حق نے دکھایا عجب ہنر
ظالم پہ آسماں سے بلا ناگہاں گری
دو تین نیزے اُڑ کے زمیں پر سناں گری

تھرا گیا بدن نہ رہی طاقتِ قرار گھوڑے کی باگ پھیر کے بھاگا وہ نابکار
بچکر نکل چلا تھا کہ چمکا کے راہوار نیزے کا اک کمر پہ کیا شاہ دیں نے وار
موذی تھا وہ لعیں پہ انی فتنہ کوب تھی
سر میں سناں تھی پشت کے مہروں میں چوب تھی

قربانِ زورِ بازوئے سلطانِ ارجمند زیں سے اُٹھا کے اس کو سناں پر کیا بلند
پہونچا سقر میں دارِ جہاں سے وہ خود پسند پٹکا زمیں پہ جب تو ہوا چور بند بند
اپنے ہنر پہ ناز تھا اس نیزہ باز کو
دکھلا دیا جہاں کے نشیب و فراز کو

کام اس خطا شعار کا جب ہو گیا اخیر نکلا پرے سے اک قدر انداز بے نظیر
بدکیش و کج نہاد و خطا پیشہ و شریر پلّے سے توڑ جاتا تھا جوشن کو جس کا تیر
کیا کوئی اس کے آگے بھلا سر اُٹھا سکے
رستم بھی جس کماں کی نہ سیسر اُٹھا سکے

قبضے میں تیغ لیکے بڑھائے شہِ زماں ہاں ناوک افگنی مجھے دکھلا تو اے جواں
ہاں نکلی مونھ سے یاں کہ کھنچی اس طرف کماں کھنچنا کماں کا تھا کہ چلا تیر بے اماں
حلقہ ادھر کماں کا خم ہو کے رہ گیا
یاں تیغِ شہ سے تیر قلم ہو کے رہ گیا

خالی اسی روش سے ہوا ترکش شریر تودے لگائے کاٹ کے حضرت نے سارے تیر
چاہا تھا کش مکش میں کہ ہو جائے گوشہ گیر چلائے شہ کہ بھاگ نہ او سرکشوں کے پیر
پیچھے ہٹے نہ پاؤں مزا ہے یہ جنگ کا
تو بھی تو توڑ دیکھ لے میرے خدنگ کا

یاں دوش سے کماں کو اُتارا جناب نے
قبضے میں ماہِ نو کو کیا آفتاب نے
بیٹے کے ہاتھ چوم لیئے بوتراب نے
تاکا خطا کو تیرِ نگہ سے صواب نے
ترکش بھی اژدہا سا دہن کھولنے لگا
نکلا عقابِ تیر تو پر تولنے لگا

چلّے میں رکھ کے تیر بڑھے قبلۂ اُمم
اک ہاتھ راست کر کے کیا دوسرے کو خم
کچھ کہکے گوشِ شہ میں چلا تیر تیز دم
آواز دی کماں نے زہے شاہِ باکرم
چِلّا تو شستِ شاہِ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے سن سے نکل گیا

گرز و سنان و تیغ و تبر کانپنے لگے
نیزے مثالِ شاخِ شجر کانپنے لگے
ڈرسے کماں کشوں کے جگر کانپنے لگے
گو ترکشوں میں تیر تھے پر کانپنے لگے
پیچھے ہٹے کھڑے تھے جو ظالم بڑھے ہوئے
گوشوں سے خود اُتر گئے چلّے چڑھے ہوئے

اللہ ری زد گزرتا تھا ہنگامِ دار و گیر
سَو دل سے مثلِ رشتۂ تسبیح ایک تیر
کرتے تھے واہ واہ صفوں میں جوان و پیر
بازو کو چومتے تھے رسولِ فلک سریر
روحِ علی یہ کہتی تھی پاس آن آن کے
صدقے ہر ایک تیر کے قرباں کمان کے

شہ کے غضب سے چاہتی تھی ہر کماں اماں
مضطر زمیں تھی مانگتا تھا آسماں اماں
دیتے نہ تھے کسی کو امامِ زماں اماں
ہر صف میں تھا یہ شور کہ مولا اماں اماں
جب شاہ حملہ کرتے تھے شیرِ خدا کی طرح
دانتوں میں خس پکڑتے تھے سب کہربا کی طرح

کہتا تھا ہاتھ جوڑ کے یوں کوئی پُر غرور
اس وقت رحم اپنے غلاموں پہ ہے ضرور
موقوف کر جلال کو اے کبریا کے نور
صدقہ علی کی روح کا اب بخشیئے قصور
آنکھیں ہم اپنی دور سے قدموں پہ ملتے ہیں
تلوار روکیئے کہ بس اب دم نکلتے ہیں

اے نورِ چشمِ احمدِ مختار رحم کر
اے یادگارِ حیدرِ کرّار رحم کر
اے امتِ نبی کے مددگار رحم کر
اے بحرِ غیظِ حضرتِ قہّار رحم کر
اے نوحِ عصر ہم سے نہ تو انتقام لے
اُمّت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تھام لے

ای افتخارِ حضرتِ آدم پناہ دے
ای زیبِ بخشِ عرشِ معظم پناہ دے
ای فخرِ نوح و عیسیِ مریم پناہ دے
ای باعثِ پناہِ دو عالم پناہ دے
مولا تجھے قسم ہی رسولِ کبیر کی
چمکا نہ ذوالفقار جنابِ امیر کی

اس غیظ میں سنا جو بزرگوں کا شہ نے نام
صدمہ ہوا یہ دل کو کہ رونے لگے امام
گردن پھرا کے پاس سے دیکھا سوے خیام
تھاما جگر کو ہاتھوں سے اور چھوڑ دی لگام
آنکھوں کو بند کر کے فرس ہانپنے لگا
روکی جو ذوالفقار بدن کانپنے لگا

لڑنے میں تھا نہ آپ کو کچھ پیاس کا خیال
رکھی جو تیغ ہاتھ سے جی ہو گیا نڈھال
آئی صدائے حضرتِ محبوبِ ذوالجلال
تو صابروں کا فخر ہی ای فاطمہ کے لال
سمجھا تھا میں کہ اب مری امّت تمام ہی
یہ جبر اختیار پہ تیرا ہی کام ہی

صبر و رضا و علم کا رتبہ دکھا دیا
دم میں ہزار طرح کا جلوہ دکھا دیا
نانا کا خلق زور پدر کا دکھا دیا
خالق کے رحم و قہر کا نقشہ دکھا دیا
باطل شقاوت و حسد و کینہ ہو گیا
ایسی جلا ہوئی کہ حق آئینہ ہو گیا

شبیر واہ کیوں نہ ہو کس کا پسر ہی تو
حقا کہ آسمانِ شرف کا قمر ہی تو
کھولا ہی جس کو حق نے وہ رحمت کا در ہی تو
ہیں اصل جس شجر کی ہوں اس کا ثمر ہی تو
امّت کے ظلم سہتے ہو نانا سے چھوٹ کر
کیا ان کو پھل ملے گا مرا باغ لوٹ کر

کیسی ہوا جہان کی بے اعتدال ہی
سرسبز سب ہیں باغ مرا پائمال ہی
سائے سے جس نہال کے طوبیٰ نہال ہی
مرجھا گیا ہی دھوپ سے اس کا یہ حال ہی
میں جن کی فکر میں کبھی سویا نہ چین سے
پانی انھیں عزیز ہی میرے حسین سے

فاقوں میں جن کے واسطے باندھا شکم پہ سنگ
ان دشمنوں نے لال کا میرے کیا یہ تنگ
کیونکر نہ ہو یہ غنچہ دہن زیست سے یہ تنگ
اک فاقہ کش نحیف ہے یہ صف کشی یہ جنگ
بچپن سے میں نثار ہوں اس نورِ عین کے
میرا گلا بھی ساتھ کٹے گا حسین کے

رو کر کہا حسین نے یا سیدِ عرب لڑتا کبھی نہ ان سے یہ مظلوم و تشنہ لب
فریاد ہے کہ مجھ کو ستایا ہے بے سبب للہ لیجئے چلیے مجھے ساتھ اپنے اب
دشمن ہوا ہے سارا زمانا غلام کا امت میں اب نہیں ہے ٹھکانا غلام کا

جس دن سے آپ اٹھ گئے پایا نہ میں چین سب گھر تباہ ہو گیا یا شاہِ مشرقین
پیری میں چھٹ گیا علی اکبر سا نورِ عین کب تک جہاں میں ٹھوکریں کھایا کرے حسین
پھیلا کے پاؤں خاک پہ سونا نصیب ہو راحت ملے جو قبر کا کونا نصیب ہو

یہ کہتے تھے کہ فوج ستمگر بپھر گئی خیر النسا کے چاند پہ بدلی سی چھا گئی
بھائی جو گھر گیا تو بہن بلبلا گئی فریادِ فاطمہ کی فلک تک صدا گئی
یاں گھر نبی کی آل کا بے نور ہو گیا زخموں سے واں تنِ شہِ دیں چور ہو گیا

یاں اک تنِ ضعیف ادھر لاکھ نابکار تیروں کے زخم تیغوں کے پھل برچھیوں کے وار
سینہ شکستہ پسلیاں مجروح سر فگار کیا درد کا حساب جراحت کا کیا شمار
یوں تو دل و جگر کے بھی جانکاہ زخم تھے تن پر ہزار و نہ صد و پنجاہ زخم تھے

حربے ہزار ہا کئے وہ کیسے بچائے بے یار و آشنا کسے ڈھونڈے کسے بلائے
دکھ میں سپر ہو کون حمایت کو کون آئے کیا وقت ہے نبی کے نواسے پہ ہائے ہائے
جھکتے ہیں زیں پہ منہ سے لہو ڈال ڈال کے گھوڑے سے غش میں کون اتارے سنبھال کے

گھوڑے سے گاہ غش میں ادھر گہ ادھر جھکے تیغیں چلیں جدھر کو شہِ بحر و بر جھکے
سیدھے کبھی ہوئے کبھی پکڑے جگر جھکے تھامی کبھی ایال کبھی زین پر جھکے
صدمہ جو تھا بہن کے نکلنے کا شاہ کو گردن پھرا کے دیکھتے تھے خیمہ گاہ کو

ہنگامِ عصر تھا کہ شہِ نیک خو گرے زخموں سے اڑ کے قطرۂ خوں چار سو گرے
کیا سنبھلے جس کے زخموں سے بہہ کر لہو گرے سجدے کا اشتیاق جو تھا قبلہ رو گرے
آنکھیں تھیں بند جلوۂ حق تھا نگاہ میں گرتے ہی محو ہو گئے یادِ الٰہ میں

اعدا میں غل ہوا کہ ہماری ظفر ہوئی
زینب ردا کو پھینک کے عریاں سر ہوئی
ہی ہی کوئی نہیں شہِ والا کی لاش پر
مسند پہ شہ کی لوٹتی تھی کوئی سوگوار
چلّاتی تھی کوئی مرے سید ترے نثار
غل تھا فلک نے دفترِ دنیا اُلٹ دیا

دیکھا یہ ذوالجناح کا سید انہوں نے حال
گردن پہ اس طرح سے ہے بکھری ہوئی ایال
روتا ہے یوں وہ غم میں شہِ نامدار کے
دنیا نظر میں بیبیوں کی ہو گئی سیاہ
عابد پکارے ہائے غضب گھر ہوا تباہ
بتلا سوارِ دوشِ پیمبر کو کیا کیا

زیں سے ترے رسول کا پیارا کہاں گرا
وہ عرشِ کبریا کا ستارا کہاں گرا
سایہ ہے کچھ کہ لاش ہے جلتی زمین پر
سر خاک پر پٹک کے پکارا وہ راہوار
جلدی اُتار لو یہ تبرک یہ ذوالفقار
زہرا قریبِ لاشِ پسر خاک اُڑاتی ہے

راوی رقم یہ کرتا ہے احوالِ رزمگاہ
خنجر ادھر تو شمر نے رکھا گلے پہ آہ
زانو دھرا جو سینہ پہ ایذا سوا ہوئی
گھوڑے سے لو حسین گرے جنگ سر ہوئی
چلائی یوں سکینہ کہ میں بے پدر ہوئی
امّاں بس اب چلو مرے بابا کی لاش پر

ہی ہی کا شور تھا کہ قیامت تھی آشکار
ڈیوڑھی پہ آ کے گر پڑے سجادِ دل فگار
فضّہ نے خیمہ گاہ کا پردا اُلٹ دیا
خالی ہے زین اور ہے ماتھا لہو سے لال
جس طرح کھولتی ہے زنِ سوگوار بال
جیسے پسر کو روتی ہے ماں ڈاڑھیں مار کے

سمجھے یہ سب کہ قتل ہوا فاطمہ کا ماہ
چلائی بنتِ فاطمہ اے ذوالجناحِ شاہ
ہی ہی مرے غریب برادر کو کیا کیا
دو دن کی بھوک پیاس کا مارا کہاں گرا
آقا ترا امام ہمارا کہاں گرا
لختے یہ کس کے خون کے ہیں تیرے زین پر

سہرا نہ ہو، بچھڑ گیا مجھ سے مرا سوار
کٹتا ہے واں گلوئے شہنشاہِ نامدار
خیمے میں جاؤ لوٹنے کو فوج آتی ہے
دن ہوگا تین چار گھڑی وقتِ قتلِ شاہ
آندھی اُٹھی کہ سارا جہاں ہو گیا تباہ
غل تھا کہ لو قیامت بپا ہوئی

تھا غش میں قبلہ رو وہ دو عالم کا مقتدا
سجدہ بھی اس ولی کو نہ کرنے دیا ذرا
گردن پہ تیغ اور لبوں پر یہ تھی دعا
وا جعفرا آہ وا ابتا وا محمدا
صدمے ہوئے رگوں پہ جو خنجر کی دھار کے
چپ ہو گئے نبی و علی کو پکار کے

اس حشر میں خیام کی جانب جو کی نظر
دیکھا وہ سانحہ کہ نہ دیکھے کوئی بشر
نکلی حرم سے ایک ضعیفہ برہنہ سر
چہرہ تو آفتاب سا اور کان میں گہر
چادر نہ اضطراب میں تھی جسمِ پاک پر
تھا اک سرا تو دوش پہ اور ایک خاک پر

چلاتی تھی ارے کوئی رستہ مجھے بتائے
کچھ سوجھتا نہیں یہ ضعیفہ کدھر کو جائے
اکبر کہاں ہو ہاتھ مرا تھامنے کو آئے
بھائی سے چھوٹتی ہے بہن ہائے ہائے ہائے
مہماں کیا تھا بادشہِ مشرقین کو
اے کربلا تجھی سے میں لونگی حسین کو

اے نہر پیاس سے مرا بھائی ہے بے قرار
اے دشت گرد میں نہ بھرے شہ کا جسمِ زار
اے نینوا حسین کے لاشے سے ہوشیار
اے خاکِ پاک حرمتِ مہماں لگا مدار
اے طائرو نہ دھوپ ہو بھائی کی لاش پر
سایہ کرو پروں کا تن پاش پاش پر

طے کر چکی تھی نصف مسافت وہ سوگوار
آئی صدائے حضرتِ خاتونِ روزگار
بیٹی ملے گا اب نہ محمد کا یادگار
پھر جا خدا کے واسطے پھر جا ترے نثار
تن سے جدا سرِ پسرِ فاطمہ ہوا
اب آکے کیا کرے گی یہاں خاتمہ ہوا

گھبرا کے اس نے جانبِ مقتل جو کی نظر
دیکھا اک آفتاب کو نیزے پہ جلوہ گر
لڑکی جو ساتھ تھی وہ پکاری یہ پیٹ کر
میں لٹ گئی پھوپی مرے بابا کا ہے یہ سر
زلفیں لہو بھری ہوئی رخ پر لٹکتی ہیں
ہے ہے رگوں سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں

خاموش اے انیس جگر ہو گیا دو نیم
کام آئے گی یہ مدح بروزِ امید و بیم
عسرت کا غم نہ کھا کہ ہے آقا ترا کریم
اب جا یہاں سے روضۂ سرور پہ ہو مقیم
حاصل حضوریِ شہِ گردوں اساس ہو
ہے وہ غلام خاص جو آقا کے پاس ہو

مرثیہ ۲۱

جب تیغِ یداللہ کھنچی دشتِ وغا میں
چمکے جو شرر چار طرف اُڑ کے ہوا میں
سایہ جو پڑا تیغِ دوپیکر کا زمیں پر
خورشید کو رعشہ ہوا کانپا فلکِ پیر
آنکھوں کے تلے پھرنے لگی موت کی تصویر
غل تھا کہ اُلٹتا ہے زمانہ کوئی دم میں

جبریل کو چلانے لگے عرش کے حامل
کہتے تھے سرافیل کہ قابو میں نہیں دل
کونین سے ضربِ شہِ عالم نہ رُکے گی
برہم تھی جو طبعِ پسرِ سیدِ لولاک
گھبرا کے نظر کرتے تھے عیسیٰ طرفِ خاک
سر چرخ پہ آ پہونچا ہے شمشیرِ دوسر کا

سکانِ سمٰوات میں برپا تھا ادھر غل
معشوق کو تھا صبر نہ عاشق کو تحمل
تاریک تھا دل تاب کسی دل کو نہیں تھی
تھا خوف کے عالم میں ہر اک بند کا آزاد
غنچوں کے چٹکنے میں نکلتی تھی یہ فریاد
ناحق گلِ زہرا پہ جفا ہوتی ہے کل سے

اک برقِ غضب کوند گئی ارض و سما میں
اعدا میں ہوا غل کہ گھرے قہرِ خدا میں
جبریلِ امیں کانپ گئے عرشِ بریں پر
رنگِ رُخِ جلادِ فلک ہو گیا تغییر
تھرا کے عطارد نے صدا دی کہ چلا تیر
چھپتا تھا قلم لوح میں اور لوح قلم میں

کرسی کو سنبھالو کہ قیامت ہوئی نازل
ہے قہرِ الٰہی غضبِ سرورِ عادل
یہ تیغ وہ بجلی ہے کہ اک دم نہ رُکے گی
سیاروں پہ ثابت تھا کہ اب گرتے ہیں افلاک
ڈر تھا سپہرِ نہم نہ ہو جائے کہیں چاک
شق ہوئے نہ سینہ کہیں پھر آج قمر کا

رو رو کے ادھر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل
گلشن پہ اُداسی تھی جدا تھے گل و بلبل
پروانہ کہیں جلتا تھا اور شمع کہیں تھی
شمشاد کی قمری کو فراموش ہوئی یاد
ہے ہے چمنِ کن فیکوں ہوتا ہے برباد
باغی نہیں بر آنے کے اس تیغ کے پھل سے

اڑنے سے پرندوں کے جہاں ہو گیا اندھیر
تھا عالم وحشت یہ ہرن ہو گئے تھے شیر
چیتوں میں یہ غل تھا کہ قیامت میں نہیں دیر
بھاگو کہ چمکتی ہے ید اللہ کی شمشیر
پھر جان کہاں آ گئے سایہ میں گر اس کے
ہستی کو جلا دیویں گے دم میں شرر اس کے

لرزاں تھا ہر اک غول شہ جن و بشر سے
فریاد کی آتی تھی صدا سنگ و شجر سے
ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے ڈر سے
جنات کی جانوں پہ بنی جان کے ڈر سے
شمشیر شرربار سے منہ سب کے مڑتے تھے
اڑ سکتی نہ تھیں ہوش پہ پریوں کے اڑے تھے

ہر بحر میں طوفاں تھا تو ہر بر میں تلاطم
تھا شور جزیروں میں سمندر میں تلاطم
جنت میں تزلزل تھا تو کوثر میں تلاطم
برپا تھا نبی جان کے لشکر میں تلاطم
جو خاک نشیں تھا وہ ہراساں اٹھا تھا
آب دم شمشیر سے طوفان اٹھا تھا

سب ساکن افلاک زمیں کانپ رہے تھے
لرزہ تھا مکانوں کو مکیں کانپ رہے تھے
ہلتا تھا نجف رکن رکیں کانپ رہے تھے
تھے امن میں پر روح امیں کانپ رہے تھے
اللہ رے ڈر ضربت اولاد علی کا
غل فرش سے تا عرش تھا نادِ علی کا

کس شان سے تولے ہوئے شمشیر شرربار
میدان شہادت میں کھڑے ہیں شہ ابرار
ہے چہرۂ نورانی مولا سے نمودار
اجلال محمد غضب حیدر کرار
عالم شب معراج کا دکھلاتی ہیں زلفیں
غیظ آتا ہے سرور کو تو بل کھاتی ہیں زلفیں

شمشیر کی تابیں ہیں کہ ماتھے پہ شکن ہے
ابرو جو کماں ہے تو مژہ تیر فگن ہے
وہ چشم سیہ آہوئے صحرائے ختن ہے
غصے سے جو ہو سرخ تو پھر شیر ہرن ہے
گہہ شام مصیبت ہے کبھی صبح طرب ہے
رحمت ہے سپیدی میں سیاہی میں غضب ہے

کچھ دھوپ سے کچھ غیظ سے تھے سرخ جو رخسار
تھا صاف شفق سے گل خورشید نمودار
دیتے تھے جو دانتوں کے تلے لعل گہربار
تھے پرچۂ یاقوت میں گویا دُر شہوار
مختار دو عالم کے جہاں زیر نگیں تھا
یہ نقش سلیماں کی بھی خاتم پہ نہیں تھا

وہ ریشِ مطہر کی سپیدی وہ سیاہی
دیتی تھی زمانے کی دورنگی پہ گواہی
یہ آئینۂ جسم پہ تھی گردِ تباہی
تھیں بازوؤں میں مچھلیاں یا ریگ میں ماہی
مانند یداللہ لڑائی پہ تُلے تھے
سو عقدۂ مشکل انہیں ہاتھوں سے کھلے تھے

تو قبضے پہ ہے دستِ زبردست شہنشاہ
جن کی رگ و پے میں ہے بھرا زورِ یداللہ
غیر از یدِ قدرت کوئی اس سے نہیں آگاہ
گر کوہِ گراں ہو تو اکھاڑیں صفتِ کاہ
بھاری ہو یہ گر سارا جہاں جنگ پہ تل جائے
زور اس کا ہو گر قلعۂ خیبر پہ تو کھل جائے

اعدا بھی ہیں چپ شمعِ رسالت بھی ہے خاموش
سینے میں تلاطم ہے شجاعت کا ہے یہ جوش
تیزیِ نگۂ شہ سے جوانوں میں نہیں ہوش
چھپ جاتے ہیں ڈھالوں کی سیاہی میں زرہ پوش
جوہر نظر آتے ہیں جو اس تیغِ دودم کے
پانی ہوئے جاتے ہیں جگر اہلِ ستم کے

تولے ہوئے شمشیر کو پڑھتے ہیں یہ اشعار
دنیا بھی ہے بے مہر زمانہ بھی ہے غدار
تف تجھ پہ ہے اے دہرِ ستمگار و جفاکار
بیدل تری اس سفلہ پرستی سے ہیں بیزار
زہرا سے محمد سے علی سے نہ وفا کی
شاکی رہے سب تُو نے کسی سے نہ وفا کی

تو نے غمِ فرزند میں آدم کو رُلایا
عیسیٰ نے جہاں میں کوئی دم چین نہ پایا
خنجر سے لہو حضرتِ یحییٰ کا بہایا
کس چاہ میں یعقوب سے یوسف کو چھڑایا
وہ کون سے دُکھ تھے جو دکھائے نہیں تو نے
کیا کیا کنوئیں پیری میں جھنکائے نہیں تو نے

توڑے دُرِ دندانِ نبی سنگِ جفا سے
مسجد ہوئی تر خونِ سرِ شیرِ خدا سے
فرصت نہ ملی فاطمہ کو رنج و بلا سے
ٹکڑے ہوا شبّر کا جگر زہرِ دغا سے
باقی تھا فقط میں سو عزیزوں سے چھٹا ہوں
پانی کو ترستا ہوں غریبی میں لٹا ہوں

فرما کے یہ اعدا کو پکارے شہِ ذی جاہ
اب جنگ میں کیا دیر ہے اے فرقۂ گمراہ
شاید مری قوت سے ابھی تم نہیں آگاہ
رستم تو یہاں زال ہوا اور شیر ہے روباہ
تلوار کا مالک ہوں ولی ابنِ ولی ہوں
جرأت مرا حصہ ہے کہ فرزندِ علی ہوں

عاقل ہو تو مکار کی باتوں پہ نہ جاؤ … صابر ہوں میں صابر کو نہ تم غیظ میں لاؤ
دم میں غضب آجائے گا دیکھو نہ ستاؤ … جینا ہو تو ہٹ جاؤ جو مرنا ہو تو آؤ
خیر اپنے سروں کی جو ہو منظور تو سر کو … دیکھو ابھی ٹکڑے کیے دیتے ہوں تیغِ دو سر کو

مجھ سا کوئی گر اور ہو تم لوگوں کا رہبر … بہتر ہے پھرا دو مرے اس حلق پہ خنجر
اُمّت کے جو کام آئے تو حاضر ہے مرا سر … پر میرے سوا کوئی نہیں سبطِ پیمبر
کھو کر مجھے ڈھونڈو گے تو فریاد کرو گے … جب میں نہ ملونگا تو بہت یاد کرو گے

جو زندہ ہے قدر اُس کی کسی کو نہیں زنہار … زندوں سے کچھ ان مردہ پسندوں کو نہیں کار
عبرت کی ہے جا فاعتبروا یا اولی الابصار … سوجاتا ہے جب وہ تو یہ سب ہوتے ہیں بیدار
روئے تو اسے کیا جو تمنا کی تو اسے کیا … تعریف اگر بعد فنا کی تو اُسے کیا

گر زیست میں فاقہ ہو تو غم کوئی نہ کھائے … اور وقتِ مصیبت میں کوئی پاس نہ آئے
یوں پیاس میں لا کر کوئی پانی نہ پلائے … اور بعدِ فنا فاتحہ شربت پہ دلائے
پروا نہیں پیوند ہو گر رختِ بدن میں … مرتے ہیں بس اس پر کہ تکلف ہو کفن میں

یوں ہاتھ نہ تھا میں جو گرے بندۂ معبود … تابوت کو دینا ہو جو کاندھا تو ہیں موجود
یوں جانتے ہیں قرضِ حسن دینے کو بے سود … زر صرف ہو میت کے جو ماتم میں تو خوشنود
یوں بھول کے بھی ذکر نہیں کرتے ہیں اس کا … مرجاتا ہے جب کوئی تو دم بھرتے ہیں اس کا

ہشیار ہو اے قوم کہ دُنیا ہے گزرگاہ … رہتا ہے گدا اس میں ہمیشہ نہ شہنشاہ
کیا مرحلۂ صعب ہے العظمۃ للّٰہ … تھرّاتے ہیں سب ہیں بھی وہ پُر خوف ہے یہ راہ
بے خوف ہیں وہ جن کو تولّائے علی ہے … ہاں زادِ سفر دوستیِ آلِ نبی ہے

کچھ دن بشر اس خانۂ دُنیا میں ہے مہماں … دستِ ملک الموت میں ہے سب کا گریباں
زندوں میں ہیں گر آج تو کل ہوویں گے بےجاں … پہلے سے ہے لازم سفرِ مرگ کا ساماں
اعمال و عقائد میں نہ ہر گز خلل آئے … کیا جانیے کس وقت پیامِ اجل آئے

کچھ وقت معین نہیں انساں کی اجل کا
بندہ وہ ہے پابند رہے نیک عمل کا
کیا خاک کا بوجھ اس کے لیے قبر میں کم ہے

لو پند بھی آخر ہے نصیحت بھی ہوئی ختم
الفت بھی مروّت بھی محبت بھی ہوئی ختم
دل رکھتے ہو فولاد یہ جوہر ہیں تمہارے
بے قتل مجھے چین کب آتا ہے خبردار!
فرزند امیر عرب آتا ہے خبردار!
فوجوں کی صفیں دم میں الٹ دیتا ہوں آ کے

خالق نے مرے قوتِ حیدر مجھے دی ہے
مختار نے مختاریِ کوثر مجھے دی ہے
کھل جائے گی دم میں روش اس تیغِ دو سر کی
غصّے میں مرے طور ہیں سب قہرِ خدا کے
بچتا نہیں تلوار ہماری کوئی کھا کے
کس معرکہ میں تیغ کو تولا نہیں ہم نے

تم نار ہو میں نورِ خدائے دو جہاں ہوں
تم جنگ میں روباہ ہو میں شیرِ ژیاں ہوں
لاکھوں ہوں تو ہے فتح بہر کیف ہماری
اس تیغ سے رستم سا دلاور نہیں بچتا
مغفر نہ رہا فرق پہ جب سر نہیں بچتا
بجلی ہے یہ رکنے کبھی دیکھا نہیں اس کو

آج اٹھ گئے وہ کرتے تھے سامان جو کل کا
پلّہ وہی بھاری ہے جو ہو جرم سے ہلکا
ہو اور گناہوں کی گرانی تو ستم ہے

حجت مجھے منظور تھی حجت بھی ہوئی ختم
لو بابِ ترحم کی عبارت بھی ہوئی ختم
اب تیغِ ید اللہ ہے اور سر ہیں تمہارے
سب فوج پہ ادبار اب آتا ہے خبردار!
لشکر پہ خدا کا غضب آتا ہے خبردار!
دیکھوں تو کہاں جاتے ہو پنجے سے قضا کے

فیاض نے توقیرِ پیمبر مجھے دی ہے
کرّار نے شمشیرِ دو پیکر مجھے دی ہے
کنجی تو مرے ہاتھ میں ہے فتح و ظفر کی
غارت ہو نظر جس پہ کروں غیظ میں آ کے
ناخن میں ہمارے ہیں ہنر عقدہ کشا کے
تھا کون سا در بند جو کھولا نہیں ہم نے

تم ننگِ جہاں ہیں شرفِ کون و مکاں ہوں
تم کاہ سے کمزور ہو میں کوہِ گراں ہوں
کرتی ہے صفیں صاف سدا سیف ہماری
سن سے جو یہ چلتی ہے تو مغفر نہیں بچتا
سر کیا ہے کہ اک ضرب میں پیکر نہیں بچتا
گر ہوں پرِ جبریل تو پروا نہیں اس کو

لاسیف اسی حجتِ قاطع کی ثنا ہے
آسیب سے کیا سیب سے پھل اس کا بنا ہے
یہ لشکرِ باغی کے لیے وادیِ فنا ہے
سائے میں ہیں جو اس تیغ کے آباد وہ فنا ہے
جوہر ہیں جو ہی فتح تو قبضے میں ظفر ہے
دشمن کے لیے تیغ ہے مومن کی سپر ہے

فخرِ عرب و روم و عجم کی ہے یہ تلوار
کاٹے ہیں نشاں جس نے علم کی ہے یہ تلوار
کاٹ اس میں غضب کا ہے ستم کی ہے یہ تلوار
مثلِ مہِ نو بدر میں چمکی ہے یہ تلوار
ہلتی تھی زمیں ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا
خندق کو اسی تیغ نے لاشوں سے بھرا تھا

پائی نہ اماں لشکرِ صفین و جمل نے
عنتر کو جلایا ہے اسی تیغِ اجل نے
نہ لات نے مرحب کو بچایا نہ ہبل نے
کاٹا شجرِ کفر کو اس تیغ کے پھل نے
گر پاس نہ ہوتا پرِ جبریلِ امیں کا
ملتا نہ پتا زیرِ زمیں گاوِ زمیں کا

جس وقت سرِ چاہ علی کے قدم آئے
جنات ہزاروں تہِ تیغِ دودم آئے
فریاد کناں ساکنِ بیرالالم آئے
یا شیرِ خدا دینِ محمد میں ہم آئے
دیکھے گا سزا پھر اگر اس راہ سے نکلیں
یوسف کی قسم لو جو کبھی چاہ سے نکلیں

اک ہاتھ میں دو ہونگی سنانوں کو بچاؤ
ڈھونڈو نہ کمیں گاہ کمانوں کو بچاؤ
مٹ جائے گی یہ شان نشانوں کو بچاؤ
جب جانیں کہ اس تیغ سے جانوں کو بچاؤ
رکتی ہے نہ جوشن پہ نہ تھمتی ہے کمر پر
یہ رگِ صفاجات سے جلد آتی ہے سر پر

بے جان لیے خانۂ تن سے نہیں پھرتی
بے صاف کیے فوج کو رن سے نہیں پھرتی
کچھ ہو یہ شجاعت کے چلن سے نہیں پھرتی
بے سیرِ گلِ زخم بدن سے نہیں پھرتی
منہ خود و زرہ سے کبھی موڑا نہیں اس نے
دشمن کو کبھی جنگ میں چھوڑا نہیں اس نے

بیٹھی ہے تو سر تن سے جدا کر کے اٹھی ہے
دشمن کو انشائے میں فنا کر کے اٹھی ہے
کافر کے سراپا کو دو تا کر کے اٹھی ہے
ہر معرکہ میں حشر بپا کر کے اٹھی ہے
چمکی ہے یہ جب دم تو صفیں چاٹ گئی ہے
اک ہاتھ میں سو سو کے گلے کاٹ گئی ہے

پڑھ کر یہ رجز شام کے بادل میں در آئے
بے دینوں کے دل ہل گئے جس دل میں در آئے
تھرّا گیا میداں کہ ہژبرِ احد آیا
اعدا کے سروں پر جو وہ تیغِ دو سر آئی
بجلی سی چمک کر ادھر آئی ادھر آئی
دستانے میں یوں کاٹ گئی دستِ ستم کو
بے دست ہر اک صف تھی تو بے سر تھا ہر اک غول
شمشیرِ دو دستی نے نکالی تھی نئی تول
اس تیغ سے فولاد کا دل نرم ہوا تھا
چار آئنہ والوں کو نہ تھا تیغ سے چارا
کہتے تھے زرہ پوش نہیں جنگ کا یارا
جوشن کو سنا تھا کہ حفاظت کا محل ہے
بدکیش لڑائی کا چلن بھول گئے تھے
سب چلّہ کشی عہد شکن بھول گئے تھے
معلوم نہ تھا جسم میں جاں ہے کہ نہیں ہے
تولے ہوئے بھالوں کو جفا کار تھے ہر چند
کیا روکتے تیروں کو جوانانِ تنومند
بیرق تھے نہ بھالے تھے نہ پرچم نہ علم تھا
دم کی تھی دعا شاہ نے کیا تیغِ دو دم پر
گردن سے جو سینے پہ تو سینے سے شکم پر
جوشن میں فتوحی میں نہ بکتر میں نہ زیں پر

چمکا کے فرس کو صفِ اول میں در آئے
اک شیر سے تلواروں کے جنگل میں در آئے
لشکر میں پڑا شور کہ بھاگو اسد آیا
اک تیز چھری تھی کہ کلیجوں میں در آئی
دو ہو گئی جب تیغ کے نیچے سپر آئی
جس طرح سے کاٹے کوئی جلدی میں قلم کو
خود اُلٹے ہوئے خاک پہ تھے صورتِ کشکول
سر بکتے تھے ارزاں پہ نہ لیتا تھا کوئی مول
تن سرد تھے بازارِ اجل گرم ہوا تھا
چو رنگ تھے سینے تو کلیجے تھے دوپارا
بچ جائیں تو جانیں کہ ملی جان دوبارا
اس کی نہ خبر تھی کہ یہی دامِ اجل ہے
ناوک فگنی تیر فگن بھول گئے تھے
بیہوشی میں ترکش کا دہن بھول گئے تھے
چلّاتے تھے قبضے میں کماں ہے کہ نہیں ہے
کھُلی عقدہ کشا تیغ نہ بندھتا تھا کوئی بند
تھا شیرِ نیستاں اسداللہ کا فرزند
اک ہاتھ میں باگ تھی بھی نیزہ بھی قلم تھا
خود پہ رکتی تھی نہ تھمتی تھی جھلم پر
توسن سے رکابوں پہ رکابوں سے قدم پر
سُم کاٹ کے گھوڑے کے جو دیکھا تو زمیں پر

غل تھا کہ زمانے میں نہیں صف شکن ایسا
تلوار جو ایسی ہو تو ہو تیغ زن ایسا
دنیا میں لڑا ہے کوئی تشنہ دہن ایسا
کچھ حرف شکایت کا نہ آئے چلن ایسا
سکہ نہ ہو کیوں ضربِ شجاعِ ازلی کا
کونین میں ہے نام حسین ابنِ علی کا

نیزوں کو ہلاتے تھے جو رہواروں پہ تن کے
ٹکڑے بھی زمیں پر نہ ملے اُن کے بدن کے
جنگل میں چھپے آ کے وہاں شیر جو بن کے
بھاگے وہ ہرن تیغ کے بہادر تھے جو رن کے
صفدر نے جواں مردوں کے دل توڑ دیئے تھے
نیزوں کے دمِ تیغ نے منھ موڑ دیئے تھے

انبار تن و سر کے سراسر تھے زمیں پر
تن تھے کسی جا اور کہیں سر تھے زمیں پر
کاٹے ہوئے ہتھیار برابر تھے زمیں پر
جوشن کہیں ٹکڑے کہیں مغفر تھے زمیں پر
بیجاں کہیں وہ اہلِ ستم ساتھ بڑھے تھے
ریتی پہ کہیں پاؤں کہیں ہاتھ پڑے تھے

کس سر پہ چڑھی تیغ کہ توسن سے نہ اُتری
وہ کونسا توسن تھا کہ یہ تن سے نہ اُتری
بے جان لئے جسمِ تہمتن سے نہ اُتری
اُتری جو نہ وہ موت بھی گردن سے نہ اُتری
دشمن کو نہ زندہ کسی جا موت نے چھوڑا
تیغ اُتری کمر سے تو گلا موت نے چھوڑا

چلتی تھی چپ و راست جو شمشیر دو دھاری
ریتی پہ تڑپتی تھی دو رستہ صفِ ناری
خنجر تھے گلوں پر تو کلیجوں پہ کٹاری
کٹ کٹ گئیں تیغیں ستم آرا ہوئے عاری
نوکیں جو پڑیں دل پہ کسی بانیٔ شر کے
دو برچھی کے پھل پار ہوئے ایک جگر کے

افعی کی طرح منھ سے نکالے تھی زباں تیغ
ہر دم صفِ کفار پہ تھی شعلہ فشاں تیغ
گرتی تھی چمک کر کبھی یاں اور کبھی واں تیغ
چھپتے تھے جفاجو پہ نہ دیتی تھی اماں تیغ
قبضے میں جو سب فوج تھی اس تیغِ دوسر کے
بچ سکتے تھے دشمن نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے

غل تھا کہ ڈھالوں سے یہ تلوار رُکے گی
روکے سے نہ یہ برقِ شرربار رُکے گی
سو بار گرے گی یہ نہ اک بار رُکے گی
برقِ غضبِ ایزدِ قہار رُکے گی؟
انگشتِ قضا کہتے ہیں اس تیغ کے پھل کو
سر پہ کبھی آتے نہیں دیکھا ہے اجل کو

تاب ایسی کہ لشکر کو پریشاں کیا جس نے
دم ایسا کہ سب فوج کو بیجاں کیا جس نے
سر سیکڑوں کاٹے تھے پہ ناگ سں کا ہر اٹھا
قبضہ وہ جسے رکھتے تھے قبضے میں یداللہ
جوہر وہ کہ ہر فرد بشر جس سے ہوا آگاہ
باڑھ ایسی مقابل کبھی دریا نہیں جس سے

مومن کے لئے نور ہے کافر کے لئے نار
اعجاز تو دیکھو کہیں راحت کہیں آزار
دم بند تھے وہشت سے شجاعانِ جہاں کے
ناری کو سقر تک کبھی پہونچا کے پھر آئی
ناگن کی طرح سن سے کبھی جا کے پھر آئی
غل تھا کبھی یوں تیغ کو چلتے نہیں دیکھا

خوں ناریوں کا چاٹ کے گرمائی ہوئی تھی
دریا کی طرف جانے پہ لہرائی ہوئی تھی
منہ کیا تھا کہ اک قہر تھا خم تھا کہ غضب تھا
دو کر کے سر و صدر و شکم ناف سے نکلی
بجلی سی جو چار آئینہ صاف سے نکلی
چل جاتا تھا جب وار امامِ مدنی کا

جب تن کے چلی حال عدو غیر کر آئی
کشتوں کے تڑپنے کی کبھی سیر کر آئی
سب گھاٹ سے دنبالے تلک خون میں تر تھی
آب ایسی کہ خشکی میں بہ طوفاں کیا جس نے
زہر ایسا کہ جنگل کو گلستاں کیا جس نے
ہر ناب میں ناگن کی طرح زہر بھرا تھا

نابوں سے عیاں تھا کہ عدم کی ہے یہ راہ
قد آفتِ دوراں برش الظلمۃ للّٰہ
گھاٹ ایسا کہ جیتا کوئی اترا نہیں جس سے
یہ رنگ نیا تھا کہیں آتش کہیں گلزار
قدرت کا تماشا ہے کہیں گل تو کہیں خار
مسرور تھے سب سنتے وہاں امن و اماں کے

دیکھا کسی موذی کو تو بل کھا کے پھر آئی
جانا تھا کہ بس فوج پہ لہرا کے پھر آئی
افعی کو بھی یہ زہر اگلتے نہیں دیکھا
مجھتی جو نہ تھی پیاس تو جھنجلائی ہوئی تھی
سب فوج پہ اک برقِ غضب چھائی ہوئی تھی
لشکر کا لہو پی گئی دم تھا کہ غضب تھا

تعریف دلِ صاحبِ انصاف سے نکلی
یا فاتحِ خیبر کی صداقاف سے نکلی
غل ہوتا تھا افلاک پہ اللہ غنی کا
جس صف پہ گری خاتمہ بالخیر کر آئی
دریا کی طرف خوں میں کبھی پیر کر آئی
تلوار نہ تھی ماہیِ دریائے ظفر تھی

وہ سیل جدھر آئی تلاطم نظر آیا
ہلچل میں سواروں کا پرا گم نظر آیا
منھ کھول کے اژدر نے نوالہ کیا سب کو
دو شخصوں نے اک غول سے ہوا نکالے
چار آئینہ بر میں سپریں کاندھوں پہ ڈالے
کس دھوم سے اردو سر میدان ہوئے دونوں
ایک ایک ستم پیشہ و سرہنگ و جفا جو
بدصورت و بدہیئت و بدسیرت و بدخو
پیاسے تھے لعیں خونِ امامِ ازلی کے
برچھوں کو ہلاتے ہوئے آئے جو وہ بدکار
شمشیر کو چمکا کے پکارے شہِ ابرار
حافظ ہے خدا کچھ مجھے پروا نہیں جو ہو
یوں کہنے لگے طعن سے دونوں ستم ایجاد
فرمایا پکاروں کسے ہیں بے کس و ناشاد
سب مر گئے تنہا ہیں لاکھوں میں کھڑے ہیں
گو کوئی نہ بھائی نہ پسر ساتھ ہے میرے
میں سیفِ الٰہی ہوں ظفر ساتھ ہے میرے
تم دونوں ہو کیا فتح کبھی پا نہیں سکتے
ناگاہ بڑھے تول کے نیزوں کو وہ خونریز
ٹاپوں سے ہلا دور تلک دشتِ بلا خیز
آپہ میں یہ دعویٰ تھا ہر اک باغیِ شر کو

آنکھوں سے نہاں مجمعِ مردم نظر آیا
جو تھا بہ سرِ زیں وہ تہِ سم نظر آیا
بجلی کی تڑپ نے تہ و بالا کیا سب کو
اک ہاتھ میں نیزہ لیے اک تیغ سنبھالے
امداد کو پہونچے کئی سو برچھیوں والے
بڑھ بڑھ کے جو جنگ کے خواہاں ہوئے دونوں
مغرور و سیہ کار و سیہ رنگ و سیہ رو
سینے جو کشادہ تو قوی ساعد و بازو
دونوں کو عداوت تھی گھرانے سے علی کے
ہر گشت میں پھرتے تھے فرس صورتِ پرکار
آتی ہے اجل سر پہ خبردار خبردار
یہ بھی ہو شگون نیک کہ پہلے ہی سے وہ ہو
حضرت بھی بلا لیں جسے چاہیں پئے امداد
اب تو نہ بھتیجا ہے نہ بھائی ہے نہ اولاد
بہ خاک پہ لاشے انھیں پیاروں کے پڑے ہیں
ہاں ایک خدا آٹھ پہر ساتھ ہے میرے
ہمدم کی طرح تیغِ دو سر ساتھ ہے میرے
لاکھوں ہوں تو قبضے سے مرے جا نہیں سکتے
مہمیز جو کی برقِ مجسم ہوئے شبدیز
فولاد میں در آئیں سنانیں تھیں وہ سرتیز
نوکوں پہ اٹھا لیتے ہیں زہرا کے پسر کو

مکاروں نے دکھلائی بہت شعبدہ بازی — دیکھا کیے ہنس ہنس کے شہنشاہِ حجازی
تھے عقل کے کوتاہ جو کی دست درازی — ہاتھ آتا ہے کب ابنِ یداللہ سا غازی
جو منہ پہ چڑھا خاک کا پیوند ہوا ہے — نیزوں سے کہیں عقدہ کشا بند ہوا ہے

دار آپ نے جب دو کیے ان کے کئی باری — تھرّانے لگے ہاتھ پہ دہشت ہوئی طاری
تھی تیغِ شہِ دیں غضبِ ایزدِ باری — کانپا جو کلیجا دو دلے ہو گئے ناری
نیزوں کی سناں کو دمِ شمشیر نے کاٹا — غل تھا کہ سرِ شمع کو گلگیر نے کاٹا

اک ضرب میں دونوں کے جو نیزے ہوئے بیکار — تلواریں علم کرکے پھر آئے وہ ستمگار
تیغیں جو چپٹ اس سے چلنے لگیں اک بار — روکے سپرِ حضرتِ حمزہ پہ وہ سب وار
دونوں کو ڈرایا بھی نہ شمشیرِ دوسر سے — پسپا ہوئے وہ خود تو بڑھے آپ اُدھر سے

اک ضرب میں ہاتھ اس کا اُڑا اور سپر اس کی — دوجا جو سر اس کا تو جدا تھی کمر اس کی
اس کو خبر اُس کی تھی نہ اُس کو خبر اس کی — کی موت نے دعوت اِدھر اس کی اُدھر اس کی
گرمی میں لڑے تھے شہِ دلگیر سے دونوں — ٹھنڈے ہوئے آبِ دمِ شمشیر سے دونوں

اک ہاتھ میں بیجاں ہوئے دونوں جو ستمگر — حضرت نے کہا اور بھی ہے کوئی دلاور
دعوے ہو تو دیکھے مری تلوار کے جوہر — پھر تاب کسے تھی کہ مقابل ہو جو آکر
دونوں کو اجل لائی تھی شمشیر کے منہ پر — صید آپ سے جاتا ہے کوئی شیر کے منہ پر

ہاتھ ایسا ہے جیسے دستِ خدا کہیے تو حق ہے — ضرب ایسی کہ جس ضرب سے دل کفر کا شق ہے
جب چاہیں اُلٹ دیں کہ زمیں یک ورق ہے — یہ سب ہے مگر آپ کو اُمّت کا قلق ہے
دیتے تھے دوہائی جو پڑے اہلِ جفا کے — آنسو نکل آتے تھے امامِ دوسرا کے

ہر چند کہ بیٹوں کے تھے قاتل وہ ستمگار — مانگی جو اماں سب نے تو خود روک لی تلوار
بد عہد تھی کیا اُمّتِ غدّار و جفا کار — یاں ہاتھ رُکا واں سے ہوئی نیزوں کی بوچھار
یاں رحم تھا اور اُمّتِ عاصی کی دعا تھی — واں صلح میں تھا مکر لڑائی میں دغا تھی

واں ظلم و ستم تھے ادھر الطاف و مدارا
باطل پہ وہ تھے حق پہ ید اللہ کا پیارا
وہ خاک کے ذرّے تھے یہ تھا عرش کا تارا
واں لاکھ ستمگر ادھر اک پیاس کا مارا
واں قتل کا غل فوج مخالف میں اٹھا تھا
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ ادھر شکر خدا تھا

سب سے پسر سعد یہ کہتا تھا کہ جاؤ
جلدی سر فرزند نبی کاٹ کے لاؤ
لینا ہی زر سرخ تو خوں شہ کا بہاؤ
فرماتے تھے شبیر کہ حاضر ہوں ہیں آؤ
طوفاں سے کہیں کشتیِ تن پار اتر جائے
سر تن سے جدا ہو تو بڑا پار اتر جائے

نقصان ہوا کیا ہی اگر تم نے دغا کی
جاگیر شہادت مجھے خالق نے عطا کی
اللہ سے وعدہ کیا جو اس پہ وفا کی
میرا نہیں سر یہ تو امانت ہے خدا کی
سر دینے میں حجت نہیں تکرار نہیں ہے
ہم لوگوں کے اقرار میں انکار نہیں ہے

فرما کے یہ قبضے سے رکھا تیغ دو سر کو
لٹکا دیا ہرنے پہ دلاور نے سپر کو
پایا تھا جو تنہا شہ مرداں کے پسر کو
بس گھیر لیا شام کے بادل نے قمر کو
لشکر کی سیاہی تھی کہ گھبرا گئے شبیر
سب فوج کی تیغوں کے تلے آ گئے شبیر

اک نور کو گھیرے ہوئے ظلمت نظر آئی
دن کو شب تیرہ کی علامت نظر آئی
خود شافع محشر پہ قیامت نظر آئی
تا ان کے بچنے کی نہ صورت نظر آئی
کٹتی تھیں رگیں ظلم کا دروازہ کھلا تھا
اجزائے تن پاک کا شیرازہ کھلا تھا

بت گرد تھے اور بیچ میں وہ کعبۂ ایماں
تھا نوح پہ خشکی میں عجب طرح کا طوفاں
دو لاکھ دل آزار اور اک عیسیِ دوراں
کیا مورچہ بندی تھی پئے قتل سلیماں
فرعونیوں کا حضرت عیسیٰ پہ ستم تھا
سب فوج کی تیغیں تھیں اور اک شاہ کا دم تھا

بیکس پہ ہزاروں جو چلے تیر سہ پہلو
غربال ہوا سینۂ شاہنشہ خوش خو
نیزے جو برابر سے لگاتے تھے جفا جو
چھد جاتے تھے دونوں کبھی شانے کبھی بازو
بند آنکھیں کیے جھومتے تھے گھوڑے پہ رن میں
تلواروں کے پھل لگتے تھے اس پھول سے تن میں

پھولے ہیں گلِ زخم کوئی جا نہیں خالی
یوں کٹ کے لٹک آئے تھے دستِ شہِ عالی
جل کر جو پھر آئینگے نہیں باغِ جہاں میں
جب مارتا تھا سنگ دہن پر کوئی غدّار
پڑتی تھی قفا سے جو کوئی فرق پہ تلوار
چھدتا تھا جو تیروں سے جگر شاہِ زمن کا
تھا خون کا دریا جو ہر اک زخم سے جاری
پہلو پہ جو لگ جاتا تھا بھالا کوئی بھاری
مجروح سراپا جو امامِ دو جہاں تھے
یاں ایک تنِ زار ادھر سیکڑوں خونخوار
طاقت جو نہیں ہرنے پہ جھک جاتے ہیں ہر بار
سینے سے کوئی تیر نکالا نہیں جاتا
غش سے کبھی چونکے کبھی جھومے کبھی تھرّائے
تلواروں سے جو چور ہو بچکر وہ کدھر جائے
یوں تیروں کی بوچھار کسی تن پہ نہ ہوئے
رہوار سے ناگاہ گرے قبلۂ کونین
ماتم کا ہوا غل فلک و ارض کے مابین
تھرّا گئے چودہ طبقے ارض و سما کے
خنجر کو لئے شمر چلا جب طرفِ شاہ
خاتونِ قیامت ہیں کیا تو نہیں آگاہ
بالائے سرِ شاہ جو وہ بے ادب آیا

شرماتی ہے جن سے گلِ صد برگ کی لالی
جیسے کوئی کرتا ہے قلم پھول کی ڈالی
عالم کو دکھاتے ہیں بہار اپنی خزاں میں
فرماتے تھے فریاد ہے یا احمدِ مختار
سر تھام کے چلاتے تھے یا حیدرِ کرّار
نعرہ لبِ خشکیدہ پہ تھا ہائے حسن کا
منھ زرد تھا اور تن کی قبا سرخ تھی ساری
جھک جھک کے سنبھل جاتا تھا وہ عاشقِ باری
دو خون کے پرنالے کا بوسے رواں تھے
کھایا کبھی نیزہ کبھی برچھی کبھی تلوار
نکلے ہیں رکابوں سے قدم ہاتھ ہیں بیکار
اب تو دلِ مجروح سنبھالا نہیں جاتا
کی آہ کبھی اور کبھی اشک آنکھوں میں بھر آئے
دم ہونٹوں پہ تھا اور کوئی ہمدم بھی نہ تھا ہائے
جو شاہ پہ گزری کسی دشمن پہ نہ ہوئے
تڑپا جو نواسا تو نبی ہو گئے بے چین
اعدا میں ہوا فتح کا غل بی بیوں میں بین
نعروں کی صدا آنے لگی شبیرِ خدا کے
آئی یہ صدا رحم کر اس پیاسے پہ لِلّٰہ
فریادِ جفا جو نے کسی کی نہ سنی آہ
غل تھا کہ الٹتا ہے زمانہ غضب آیا

رکھنے جو لگا سینے پہ زانو ستم آرا — زہرا کی صدا آئی برابر سے دوبارا
پتھر کے تلے دب گیا ہے میرا پیارا — سفاک نے زانو کو نہ سینے سے اتارا
ظالم جگرِ شبیرِ خدا کاٹ کے اٹھا — خنجر سے مسافر کا گلا کاٹ کے اٹھا

چہرے پہ سکینہ کے یتیمی سی جو چھائی — زینب درِ خیمہ سے تڑپ کر نکل آئی
رستے میں خبر آکے یہ فضہ نے سنائی — مارے گئے شبیر دوہائی ہے دوہائی
مادر کو تڑپتا ہوا جنگاہ میں دیکھا — آگے جو بڑھی بھائی کا سر راہ میں دیکھا

ہاں اہلِ عزا مرثیہ اب ہوتا ہے آخر — پرسا دو کہ ہے فاطمہ اس بزم میں حاضر
ہے ہے شہِ آوارہ وطن ہائے مسافر — مذبوحِ قضا تشنہ دہن صابر و شاکر
زلفیں وہ تری خاک میں سب اٹ گئیں آقا — ہے ہے تری خنجر سے رگیں کٹ گئیں آقا

آقا ترے عمامۂ گلگوں کے تصدق — سیدّ ترے پیراہنِ پرخوں کے تصدق
ان زخموں کے صدقے دلِ محزوں کے تصدق — ریتی پہ تڑپتے قدِ موزوں کے تصدق
خنجر کے تلے سجدۂ رب کرنے کے صدقے — سرور ترے پانی کے طلب کرنے کے صدقے

ہاں اہلِ عزا روؤ کہ ماتم ہوا آخر — اے مجلسیو پیٹو کہ یہ غم ہوا آخر
سامانِ عزائے شہِ عالم ہوا آخر — کیا مجمعِ احباب تھا برہم ہوا آخر
یہ مجلس آخر ہے جگر بندِ نبی کی — تم لوگوں سے رخصت ہے حسین ابنِ علی کی

کیا خوب کٹے آٹھ دن اور دو مہینے — نیلے رہے ماتم سے عزاداروں کے سینے
کوتاہ کیا ہاتھ نہ ماتم سے کسی نے — ہر روز دعائیں تمھیں دیں روحِ نبی نے
دل روتا ہے صدمہ ہے عجب طرح کا جاں پہ — دیکھو تو کہ کیا آج اداسی ہے مکاں پہ

آقا ترے قربان خدا حافظ و ناصر — اے شیعوں کے مہمان خدا حافظ و ناصر
اے فاطمہ کی جان خدا حافظ و ناصر — اے دین کے سلطان خدا حافظ و ناصر
مجبور ہیں گر قبر میں ہم ہوئینگے مولا — جیتے ہیں تو پھر اگلے برس روئینگے مولا

خاموش انیسؔ اب کہ ہے سینے میں جگر چاک
حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہے کچھ باک
سب مدح کریں نظم کی یہ نظم و نسق ہے
حق ہے ترا مداح ہی سبطِ شہِ لولاک
نافہم ہے وہ چاند پہ ڈالے جو کوئی خاک
باطل ہے سو باطل ہے جو حق ہے سو وہ حق ہے

سلام

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے
اُڑ گیا جب رنگ رُخ سے استخواں پیدا ہوئے

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

علمِ خالق کا خزانہ ہے میانِ کاف و نون
ایک کن کہنے سے یہ کون و مکاں پیدا ہوئے

ہاتھ خالی آئی لاشوں پر شہیدوں کے نسیم
پھول بھی اس فصل میں ایسے گراں پیدا ہوئے

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

جو عدم سے آ گیا دنیا میں بولی ہنس کے موت
اور لو دو چار دن کے میہماں پیدا ہوئے

ضبط دیکھو سب کی سُن لی پر نہ اپنی کچھ کہی
اس زباں دانی پہ گویا بے زباں پیدا ہوئے

جان دی حُر نے تو حضرت نے دیا باغِ ارم
میہماں ایسے نہ ایسے میزباں پیدا ہوئے

یک بیک ایسا زمانے میں ہوا ہے انقلاب
قدرداں سب اُٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے

بود و نابودِ علی اصغر کا کیا کیجے بیاں
بے زباں دُنیا سے اُٹھے بے زباں پیدا ہوئے

دیکھ کر لاشوں کو حضرت کہتے تھے واغربتا
موت لے آئی کہاں ان کو کہاں پیدا ہوئے

احتیاطِ جسم کیا انجام کو سوچو انیسؔ
خاک ہونے کو یہ پیستِ استخواں پیدا ہوئے

مرثیہ (۲۲)

جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی
بچوں کی مارے خوف کے حالت عجب ہوئی
گھٹ گھٹ کے دخترِ شہِ دیں جاں بلب ہوئی
مضطر کمال بنتِ امیرِ عرب ہوئی
آفت کا سامنا تھا نئی واردات تھی
زہرا کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات تھی

پہلے پہل کی قید وہ اور وارثوں کے داغ
یہ رنگ تھا کہ ہووے خزاں دیدہ جیسے باغ
رونے سے اہلِ بیت کو اک دم نہ تھا فراغ
نے چاندنی نہ شمع نہ مشعل نہ واں چراغ
غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں

یوں وہ شکستہ حال تڑپتے تھے ہر نفس
دشوار جیسے صید پہ ہو تنگیِ قفس
جانوں کو تھی بدن سے نکل جانے کی ہوس
بازو بندھے ہوئے تھے نہ تھا کچھ کسی کا بس
دل چھاتیوں میں صورتِ بسمل پھڑکتے تھے
زنداں کے در سے جا کے سروں کو پٹکتے تھے

اس گھر میں اہلِ بیتِ محمد ہوئے تھے بند
جز کہنگی جسے نہ کسی نے کیا پسند
تنگی سے ایک ایک کو تکلیف تھی دو چند
تھوڑی سی جا مگر کہیں پست اور کہیں بلند
وہ بی بیاں اسیر تھیں اُس قصرِ زشت میں
ہیں جن کی لونڈیوں کے لیے گھر بہشت میں

مطلع دوم

زنداں میں جبکہ آلِ پیمبر ہوئے اسیر
کونین کے امیر کھلے سر ہوئے اسیر
سب رشتہ دارِ حیدرِ صفدر ہوئے اسیر
وحشت سرا میں عرش کے اختر ہوئے اسیر
وہ بی بیاں اسیر تھیں اُس قصرِ زشت میں
ہیں جن کی لونڈیوں کے لیے گھر بہشت میں

بستی وہ فاطمہ کی کہاں اور وہ گھر اجاڑ
جانوں پہ تھی بنی ہوئی قسمت کا تھا بگاڑ
کیا دل کھلیں کہ شام سے جب بند ہوں کواڑ
دیواریں تھیں بلند کہ چھاتی پہ تھے پہاڑ
گھبرا کے چھت کو بی بیاں ہر بار تکتی تھیں
ٹوٹے مکاں کی رات کو کڑیاں کڑکتی تھیں

کیجے شکستگی و خرابی کا کیا بیاں ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت کدائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گزر نہ تھا

مثلِ دلِ یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دودِ آہ حجرے سے چشمِ تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشمِ غزال تھا

شب کو تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر ظاہر تھے جابجا حشراتِ زمیں کے گھر
تھے وقفِ آشیانِ ابابیل سقف و در نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

وہ تیرگی کہ ہو نسبِ ظلمات اس سے دنگ ہر در بسانِ حجرۂ چشمِ بخیل تنگ
تھی واں کی صبح و شام سیہ اور دیار تنگ دیوار و سقف و بام و زمینِ سیاہ رنگ
قید اس میں تھے حرم شہِ گردوں مقام کے
کیا صبح مل گئی تھی خرابے کو شام کے

گرمی کی فصل اور ہوا کا وہ احتباس وہ ضیق اس مکان کی اور قید کا ہراس
اندوہ کا وفور دلوں پر ہجومِ یاس مائیں جو تہلکہ میں تو بچے تھے بے حواس
دیواریں بھی شکستہ تھیں در بھی جھکے ہوئے
جانیں بھی غم سے تنگ تھیں دل بھی رکے ہوئے

ہر دم زمیں سے دل کی نکلتا تھا یوں بخار جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار
گرمی سے یوں زمیں پہ تڑپتے تھے سوگوار جس طرح سے سپند ہو آتش پہ بے قرار
جھک جھک کے آسمان کو حسرت سے تکتے تھے
کیسے ہوائے سرو کو بچے بلکتے تھے

جھڑتی تھی ان کی سقف سے ہر دم سروں پہ خاک تھے گرد سے بھرے ہوئے رانڈوں کے جسم پاک
بھاگی تھی روشنی بھی یہ حجرے تھے ہولناک کہتے تھے اب مکاں یہ گرا اب ہوئے ہلاک
قسمت میں ہے کہ قبر اسی جا نصیب ہو
اچھا تو ہے جو خاک کا پردا نصیب ہو

ایک ایک سے یہ کہتی تھی زینب جگر فگار — لائق نہ اس مکان کے تھے ہم گنہگار
مجبور جو غریب ہوں کیا ان کا اختیار — سایہ تو ہے سروں پہ کرو شکرِ کردگار
ہے جائے گریہ حالِ شہِ مشرقین پر — کیا گزری ہوگی دھوپ میں لاشِ حسین پر
غارت گروں نے لوٹ لیا کہنہ پیرہن — وہ ریگِ گرم اور وہ عریانیٔ بدن
ہے ہے وہ شب پہاڑ سی اور کربلا کا بن — کس طرح جائے بھائی تلک کیا کرے بہن
پیاسا گلا کٹا کے موئے جس کی راہ میں — سونپی ہے میں نے لاش اسی کی پناہ میں

رسّی مرے گلے کی کوئی کھول دے اگر — مقتل کو ڈھونڈھتی ہوئی جاؤں برہنہ سر
نکلی میں جب تو پھر نہیں درکار راہبر — رستے میں پوچھ لونگی کہ ہے کربلا کدھر
ممکن ہے یہ کہ لاش کو زینب نہ پائے گی — بھائی کے خوں کی بو مجھے کوسوں سے آئے گی
کہنے لگی یہ اُٹھ کے سکینہ جگر فگار — لیتی چلو مجھے بھی پھوپھی تم پہ میں نثار
چھپ کر چلی گئیں تو میں روؤنگی زار زار — تم نے بھی کیا بھلا دیا دل سے ہمارا پیار
مر جاؤں گی اگر نہ پدر سے ملاؤ گی — کیا اس اندھیرے گھر میں مجھے چھوڑ جاؤ گی

رو کر تب اس یتیم سے زینب نے یہ کہا — واری کہاں میں اور کہاں دشتِ کربلا
بے کس اسیرِ دامِ بلا غم کی مبتلا — قیدی کو کون جانے کی دیگا بھلا رضا
بھائی کی لاش پاس اگر رہنے پاتی میں — زنداں میں قید ہونے کو کاہے کو آتی میں
ہے دشتِ کربلا تو کئی دن کی یاں سے راہ — ایسے کہاں نصیب کہ حاصل ہو وصلِ شاہ
گھر میں یزید کے ہے سرِ شاہِ دیں پناہ — ہم قید اس مکاں میں ہیں بے جرم و بے گناہ
ہم سا کوئی جہاں میں نہ آفت نصیب ہو — ممکن نہیں کہ سر کی زیارت نصیب ہو

یہ تفرقہ بھی ہوتا ہے کم زیرِ آسماں — ہیں ایک شہر پاسے ہیں لیکن الگ مکاں
ہم ہیں کہیں کہیں ہے سرِ شاہِ انس و جاں — میں کس کے آگے اپنی مصیبت کروں بیاں
بے بس ہیں یہ رشتہ دارِ شہِ ذوالفقار کے — حاکم کے ڈر سے رو نہیں سکتے پکار کے

کہنے لگی یہ سُن کے سکینہ بچشمِ تر
ہے ہے پھوپھی نہ آئیں گے کیا اب مرے پدر
حاکم کے گھر میں قید ہیں سلطانِ بحر و بر
اب مجھ کو نیند کاہے کو آئے گی رات بھر
سچ کہتی ہو نہ شاہِ خوش انجام آئینگے
اماں تو کہتی تھیں کہ سرِ شام آئینگے

جب رو کے پوچھتی ہوں کہ بابا گئے کدھر
بہلاتی ہیں مجھے کہ سدھارے ہیں نہر پر
کہتا ہے کوئی دور نہیں شاہِ بحر و بر
روؤ نہ تم اب آئینگے اب آئینگے پدر
خاطر کی بات کیا کوئی پہچانتا نہیں
سُن لیتی ہوں میں سب کی پہ دل مانتا نہیں

سمجھاتی ہیں چچی کہ اب آنسو نہ تم بہاؤ
آرام سے سُلاؤں میں گودی میں میری آؤ
اب عنقریب ہے کہ چچا اور پدر کو پاؤ
کہتی ہوں ان سے میں کہ بھلا تم قسم تو کھاؤ
سچ ہے اگر تو کس لیئے بے تاب ہوتی ہو
کیوں منہ کو پھیر کر مری جانب سے روتی ہو

ماں سے جو پوچھتی ہوں کہ تم بھی تو کچھ کہو
وہ کہتی ہیں کہ آؤ مری جان سو رہو
اس شب کو اور شہ کی جدائی کا غم سہو
کہیو نہ تب ہی جو شہ سے ملاقات کل نہ ہو
دل صبح سے اچاٹ ہے بستی اُجاڑ ہے
مجھ کو تو کاٹنا اسی شب کا پہاڑ ہے

معلوم ہو گیا مجھے بہلاتے ہیں یہ سب
تا مر نہ جائے قید میں گھٹ کر یہ تشنہ لب
کیا حاصل اس چھپانے سے شاید جیونگی اب
ہے کس بلا میں پھنس گئی یاں آکے ہے غضب
یہ لوگ تو کبھی نہ مفصل بتائیں گے
میں اپنی جان دونگی جو بابا نہ آئیں گے

یہ ذکر تھا ابھی کہ ہوا بند قفلِ در
زنداں میں اور ہو گئی ظلمت زیادہ تر
گھبرا کے دیکھنے لگیں رانڈیں ادھر اُدھر
جُز تیرگی کسی کو نہ آتا تھا کچھ نظر
تڑپے یہ دل کہ سینوں میں سانسیں اُکھڑ گئیں
ماؤں سے بچے بچوں سے مائیں بچھڑ گئیں

نظروں سے صورتیں جو ہوئیں یک بیک نہاں
ہاتھوں سے ڈھونڈنے لگیں بچوں کو بی بیاں
چلائی بے حواسی میں بانوئے خستہ جاں
دیکھو تو بی بیو کہ ہے اصغر مرا کہاں
دل پر سکینہ جان کے صدمے گزر نہ جائیں
بچے مرے دہل کے اندھیرے میں ڈر نہ جائیں

پھرتا تھا گھٹنیوں بھی یاں میرا نونہال
بچے کا میرے صاحبو کیجیو ذرا خیال
کہنے لگی یہ زینبِ بیکس بصد ملال
کس کی تلاش میں ہو کہاں ہے تمھارا لال
ملتا نہیں ہے پھر جسے ہاتھوں سے کھوتے ہیں
تم جن کو ڈھونڈھتی ہو وہ مقتل میں سوتے ہیں

چھاتی کو پیٹ کر یہ پکاری وہ سوگوار
لو جانتی تھی میں کہ یہیں ہے وہ گلعذار
ہے دور مجھ سے ہائے مرا طفلِ شیرخوار
اصغر تمھارے ننھے سے لاشے کے میں نثار
اے لال دامنِ شہِ خوش خو میں سوتے ہو
ماں سے بچھڑ کے باپ کے پہلو میں سوتے ہو

راتوں کو اُٹھ کے دودھ یہ ماں اب کسے پلائے
کس کی بلائیں پیار سے لے کس کے صدقے جائے
آجاؤ یاں کے پاس اگر نیند واں نہ آئے
ان چھوٹے چھوٹے پاؤں کو ہاتھوں سے دبائے
الفت جو ہے پدر کی تو ماں کا بھی درد ہو
گو دان کی گرم ہو مری چھاتی بھی سرد ہو

بانو کے اس بیاں پہ بلکتے تھے سب حرم
باقر پکارتے تھے کہ کیونکر جئیں گے ہم
چلاتی تھی سکینہ کہ گھٹتا ہے میرا دم
زنداں کا در بھی ہوگیا معمور ہے ستم
کھولے گا قفل کون جو عباس آئیں گے
لو اب پدر کدھر سے مرے پاس آئیں گے

ٹکرا کے سر اندھیرے میں چلائیں گے اسیر
اب روشنی کہاں سے بھلا لائیں گے اسیر
گرمی کے مارے اور بھی گھبرائیں گے اسیر
ہے ہے یہ کیا غضب ہوا مر جائیں گے اسیر
دربانوں کو پکارو پیمبر کے واسطے
کھلوا دو قفل فاتحِ خیبر کے واسطے

زنداں کا در کدھر ہے مجھے لے چلو شتاب
دربانوں سے کہہ رہی تھی با دیدۂ پُرآب
دادا مرا ہے شہرِ علومِ نبی کا باب
مجھ پر کرو گے رحم تو ہوگا تمھیں ثواب
پھر کل سے بے کسوں کو نظر بند کیجیو
آ لیویں بابا جان تو در بند کیجیو

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر
دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریبِ در
پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر
دربانو جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر
بیکس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

بولا کوئی کہ کون ہے تو اے نحیف و زار
دل ہو گیا ہے تیری صدا سن کے بے قرار
اک آہ سرد بھر کے یہ بولی وہ دل فگار
آفت زدہ اسیر و پریشان و سوگوار
چھوٹے سے سن میں قیدی زندانِ شام ہوں
میں دخترِ حسین علیہ السلام ہوں

پوتی ہوں اس کی جو کہ ہے کونین کا امیر
شیرِ الٰہ بادشہِ آسمان سریر
ایسا کریم تھا وہ دو عالم کا دستگیر
جس نے ہزاروں قید سے چھڑوا دیئے اسیر
شہرت جہاں میں ہمتِ مشکل کشا کی ہے
ہم آج ہیں اسیر یہ قدرت خدا کی ہے

کہتی نہیں میں یہ کہ کرو قید سے رہا
چھٹ جائیں گے کبھی کہ اسیروں کا ہے خدا
کھانے کی کچھ طلب ہے نہ پانی کی التجا
ہاں قفل کھول دوگے تو دوں گی تمہیں دعا
جائیں گے ہم کہاں کہ تمہارے حوالے ہیں
بابا حسین آج کی شب آنے والے ہیں

اصغر ہے ان کے ساتھ یقیں ہے کہ جلد آئیں
ایسے نہیں ہیں وہ کہ مجھے رات بھر رلائیں
چوکی کے لوگ تو رہیں نہ رہیں مجھے بٹھائیں
دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کہیں آ کے پھر نہ جائیں
نیند آئے گی نہ مجکو بہت بے قرار ہوں
بھاگے کوئی اسیر تو میں ذمہ دار ہوں

منظور ابھی نہ ہو تمہیں در کھولنا اگر
آ کر پکاریں شاہ تو تم کھول دیجو در
دیجاتی ہوں پتا تمہیں ان کا میں نوحہ گر
معلوم ہوگا صاف کہ طالع ہوا قمر
بو زلفِ مشک فام کی مہکے گی دور سے
چمکے گی چاندنی رُخِ روشن کے نور سے

باندھے ہے مصطفےٰ کا عمامہ وہ تاجدار
اور ہے نشانِ سجدہ ستارہ سا آشکار
ہالہ سا گرد ماہ کے ہے خطِ مشکبار
زیبِ کمر ہے شیرِ الٰہی کی ذوالفقار
گہ ذکرِ حق ہے گاہ زبان پر درود ہے
سوکھے لبوں سے پیاس کی شدت نمود ہے

ساتھ ان کے ہوئے گا علی اکبر سا گلعذار
گیسو لٹکتے ہیں رُخِ روشن پہ اس کے چار
تصویر ہے نبی کی سراپا وہ ذی وقار
یوسف ہیں مصرِ حسن کے بھائی کے میں نثار
انجم فلک پسینے کے قطروں سے ماند ہیں
دنیا کی روشنی ہیں اندھیرے کے چاند ہیں

ہوں گے جلو میں حضرتِ عباسِ نوجواں — ہوتا ہے جس سے دبدبۂ شیرِ حق عیاں
اس شیر کا نشان یہ ہے اور شکوہ و شاں — اک دوش پر تو مشک ہے اک دوش پر نشاں
قمری تو قد پہ چال پہ صدقے تدرو ہیں — نامِ خدا علی کے گلستاں کے سرو ہیں
مجھ بن نہ سوئے ہوں گے شہنشاہِ خوش خصال — بے خواب میں ہوں ان کو بھی ہوگا مرا خیال
تم دیکھ لیجو مجھ سے ہے الفت انھیں کمال — آتے ہی تم سے پوچھیں گے پہلے ہی میرا حال
میں خود کہوں گی مجھ پہ جو آفت گزر گئی — مر جائیں گے پدر یہ نہ کہنا کہ مر گئی

ہوتے نہیں عزیز کسے دخترِ پسر — پر مجھ کو چاہتے ہیں وہ سب سے زیادہ تر
سوتی تھی ان کی چھاتی پہ منہ رکھ کے رات بھر — نالاں ہیں اب میں یہ تڑپتی ہوں تا سحر
موقوف ان پہ میری حیات و ممات ہے — آنے کا ہے یہ دن یہی وعدے کی رات ہے

بولے لگا یہاں کہ ترا دھیان ہے کدھر — جا ماں کے پاس بیٹھ کہاں تو کہاں پدر
بے صبح کے ہوئے نہیں کھلنے کا قفلِ در — کیا شمر کے طمانچوں کا تجھ کو نہیں ہے ڈر
دن کو بھی روتی رہتی ہے شب کو بھی روتی ہے — نہ ہم کو سونے دیتی ہے نہ آپ سوتی ہے

ناحق ابھی سے کاہے کو کرتی ہے شور و شین — جا قفل کھول دیں گے بھلا آئیں تو حسین
رونے سے تیرے شب کو بھی ملتا نہیں ہے چین — ہر وقت کے سنے نہیں جاتے ہیں تیرے بین
بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لیے — رونا نہ کم کرے گی تو شبیر کے لیے

ماں بہنیں قید ہو گئیں آتش سے گھر جلا — آیا بچانے کوئی برے وقت میں بھلا
کھائے طمانچے جب تو ترا زور کب چلا — کس دیوے آکے شمر نہ رسی سے پھر گلا
ان سے چھٹے تو اور بھی صدمہ دوچند ہو — ایسا نہ ہو جدا کسی حجرے میں بند ہو

یہ بات سن کے سہم گئی وہ جگر فگار — دروازے سے سرک کے لگی رونے زار زار
دالان سے پکاری یہ بانوئے نامدار — بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار
کھولے گا کون در کسے چلاتی پھرتی ہو — واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو

زنجیرِ ورنہ رات کو کھولیں گے یہ لعیں
پستی میں بلند خانۂ زنداں کی ہے زمیں
دشمن ہر اک ہے لشکرِ اہلِ عناد میں
بولی سکینہ جان ہے تن میں یا کہ جائے
بے جرم کان زخمی ہوئے اور طمانچے کھائے
واں کیا ہے باپ نہ بیٹھ کے آنسو بہاؤں میں
کُبرا کے صدقے جاؤں بھلا وہ ہمارا پیار
مشکل ہے صبر دل پہ مرا کیا ہے اختیار
راحت بہت نصیب میں کم لیکے آئے ہیں
صغرا کو اپنی گود میں لو مجھ سے کیا ہے کام
تم اپنے دل میں سمجھو کہ میں ہو گئی تمام
سبطِ رسول سے مجھے پیارا نہیں کوئی
بیٹی سے رو کے بولی یہ بانوئے تشنہ لب
میں نے ہی شہ سے تم کو چھڑایا ہے بے سبب
جو چاہو کہہ لو ایسی ہی تقصیر وار ہوں
صدقے ہے جان تک مری گھر بار کیا ہے چیز
سب سے سوا ہے یوسفِ زہرا تمھیں عزیز
واری گلہ جو ماں کا کیا سب بجا کیا
بابا کے آگے سچ ہے بھلا ماں کی قدر کیا
بیزار تم ہو مجھ سے میں صغرا سے ہوں خفا
بیٹوں کا کیا گلہ ہے بھلا وہ تو دور ہیں

ماں صدقے جائے گھر کیاں کھانے کو کیوں گئیں
گھبرا کے گر پڑو نہ اندھیرے میں تم کہیں
سونا بھی آج بھول گئیں شہ کی یاد میں
بیٹھی ہوں جب تلک نہ سواری پدر کی آئے
جی چاہے مجھ فلک کی ستائی کو پھر ستائے
اچھا مجھے پدر سے ملا دو تو آؤں میں
سمجھو کہ ایک بیٹی ہوئی باپ پر نثار
اب کوئی دم میں تن سے نکلتی ہے جانِ زار
اتنی ہی عمر خلق میں ہم لیکے آئے ہیں
پیاری تھی سارے گھر کی میں تھے جب تلک امام
اماں بس اب پکارو نہ لے لیکے میرا نام
بابا ہی جب نہیں تو ہمارا نہیں کوئی
ہاں بی بی سچ ہے میری ہی تقصیر ہے یہ سب
لو آؤ بس معاف کرو جرم ماں کا اب
سمجھو نہ ماں یہ جانو کہ خدمت گزار ہوں
میں اک تمھارے باپ کی ادنیٰ سی ہوں کنیز
میں جانتی ہوں کیا مجھے اتنی نہیں تمیز
میں نے تمھارے باپ کو تم سے جدا کیا
کسرائی میں وہ احمدِ مرسل کا دلربا
پوچھی خبر نہ ماں کی دیا ساتھ باپ کا
تقصیروار ہیں ہمیں سب بے قصور ہیں

مشہور ہے کہ چاہتے ہیں باپ کو پسر
بیٹی کو ماں سے ہوتی ہے الفت زیادہ تر
اک بدنصیب ہم ہیں کہ مرجائیں بھی اگر
بیٹوں کو کچھ خیال نہ بیٹی کو کچھ خبر
گو ہم نہ ہوں عزیز وہ ہم کو تو پیارے ہیں
ماں سمجھیں یا نہ سمجھیں سب آنکھوں کے تارے ہیں

روتی ہوئی یہ کہہ کے اُٹھی بانوئے حزیں
بیٹی کو ڈھونڈھتی ہوئی دروازے کے قریں
روتی تھی منہ کو کرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں
پاس آکے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں
سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی
پھر ننگے ہاتھ اُٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

لے آئی ماں گلے سے لگا کر بچشمِ تر
چپ ہو کے لیٹی گود میں ماں کی وہ نوحہ گر
بیٹھیں اسیر بیبیاں سب گرد آن کر
ہاتھوں سے کوئی پاؤں دباتی تھی کوئی سر
ماں لیتی تھی بلائیں پھوپی صدقے جاتی تھی
بابا بغیر نیند اسے لیکن نہ آتی تھی

ماں کہتی تھی تھپک کے مری جان سو رہو
زخمی ہیں پھر نہ دُکھنے لگیں کان سو رہو
فرماتی تھیں پھوپی کہ میں قربان سو رہو
کبرا یہ کہتی تھیں بہن اک آن سو رہو
جی چاہتا ہے چین ملے کوئی دم تمھیں
بابا جب آئیں گے تو جگا دیں گے ہم تمھیں

کہتی تھی ایک ایک سے رو کر وہ ماہرو
تھی شہ کے ساتھ شام سے سونے کی مجھ کو خو
کیا نیند آئے غم سے جگر ہو گیا لہو
سینہ کہاں وہ چاند سا اور اب کہاں وہ بو
تھوڑا ستم سہا ہے بچھڑ کر حسین سے
سوؤں گی اب تو قبر میں جا کر میں چین سے

لوگو بس اب کہو نہ مری زندگی کی آس
بابا تو آچکے ہیں جائیں گے ان کے پاس
ماں نے کہا کرو نہ مری جاں کلامِ یاس
باتیں یہ سُن کے اور میں ہوتی ہوں بے حواس
اصغر تو جا کے بھول گئے ماں کی یاد کو
کیا تم بھی بھول جاؤ گی اس نامراد کو

بی بی تمھیں بتاؤ بھلا ماں کا کیا قصور
بابا اگر ہیں دور تو میں تو نہیں ہوں دور
صادق ہے اپنے قول کا وہ کبریا کا نور
اتنا کہوں گی میں کہ حسین آئیں گے ضرور
کیا دو گی ہم کو آج جو بابا کو پاؤ گی
پہ یاد رکھیو یہ کہ ہمیں بھول جاؤ گی

تم کو سکھائے کہتی ہوں جس دم پدر ملے
صدقے گئی نہ آنے کے کیجو بہت گلے
ماں واری سچ ہے غنچۂ دل کس طرح کھلے
یوں اس کو بھول جاتے ہیں جو باپ سے ملے
دفتر مصیبتوں کا بھی اپنے نہ کھولوں گی
تم جب تلک نہ بولو گی میں بھی نہ بولوں گی

سچ ہے نہ صاحب ان کی نہ بھائی یہ مجکو بات
بچی کو میری غم ہے مجھے تلخ ہے حیات
بوسے جو منہ کے لینے لگیں شاہِ خوش صفات
رکھ لیجو اپنے چہرے پہ تم چھوٹے چھوٹے ہات
آزردگی کی ہے یہ جگہ کیوں چلے گئے
اصغر کو ساتھ لے گئے تم کو نہ لے گئے

اک آہ بھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
اماں میں چپ ہوں گی بھلا آئیں تو پدر
رونے لگیں گے ڈھونڈ کے جب وہ ادھر ادھر
اس وقت گر پڑوں گی میں قدموں پہ دوڑ کر
اتنا تو کہہ دو مجھ سے اگر مر نہ جاؤں گی
صدقے تمھارے منہ کے میں بابا کو پاؤں گی

میرے طمانچے کھانے کا ان سے نہ کہیو حال
اماں بہت کڑھیں گے شہنشاہِ خوش خصال
ہوئے گا غیظ سے علی اکبر کا رنگ لال
عباسِ نامدار کو آ جائے گا جلال
منظور ہے کہ قیدِ ستم سے رہائی ہو
ایسا نہ ہو کہ پھر کہیں ان سے لڑائی ہو

کیوں اماں جان قبلۂ عالم ابھی جو آئیں
رو رو کر اشتیاق سے مجھکو گلے لگائیں
جیتا خدا کرے علی اصغر کو ساتھ لائیں
صدمے جو گزرے ہیں ابھی سب مجھکو بھول جائیں
سو جاں سے میں نثار شہِ خوش خصال کے
کیا سوؤں ہاتھ چاندسی گردن میں ڈال کے

لیکر بلائیں بانوئے بیکس نے یہ کہا
اے عاشقِ پدر تری باتوں کے میں فدا
سمجھو نہیں تم اب تمھیں عرصہ نہیں ذرا
آئے کوئی گھڑی میں شہنشاہِ کربلا
بابا سے ہم بغل تمھیں ہونا نصیب ہو
چھاتی پہ ان کی رات کو سونا نصیب ہو

صدقے گئی جب آئیں شہنشاہِ انس و جاں
میرا گلا نہ کیجو تم ان سے سکینہ جاں
تقصیر جو ہوئی وہ تمھیں بخشو واری ماں
آزردہ مجھ سے ہوں گے بہت سرورِ زماں
لشکر یزید کا دمِ غارت نہ ٹل سکا
سیلی لگائی جب تو مرا بس نہ چل سکا

بیٹی سے ماں نے کیں جو یہ باتیں بچشمِ تر
جاگی بہت تھی سو رہی وہ عاشقِ پدر
سب ہو گئے خموش اسیرانِ نوحہ گر
بدلی نگاہبانوں نے چوکی بجا پہر
فاقوں میں قیدیوں نے اِدھر شکرِ رب کیا
اور اُس طرف یزید نے خاصہ طلب کیا

مطلع سوم

زنداں میں مضطرب تھے اسیرانِ نوحہ گر
وہ ہولناک شب وہ اندھیرا کہ الحذر
بیٹھیں تھیں فرشِ خاک پہ رانڈیں برہنہ سر
بدلی نگاہبانوں نے چوکی بجا پہر
فاقوں میں قیدیوں نے اِدھر شکرِ رب کیا
اور اُس طرف یزید نے خاصہ طلب کیا

جلدی محل سرا میں روانہ ہوا طعام
خاصہ چنا خواصوں نے بازینتِ تمام
ہاں ہند کو بلاؤ یہ بولا امیرِ شام
تب اک کنیزِ خاص نے اس سے کیا کلام
خاصہ نہ دن کو نوش کیا ہے نہ سوئی ہیں
بی بی سحر سے آج کئی بار روئی ہیں

لیٹی رہی ہیں منہ کو لپیٹے بصد ملال
چہرہ ہے زرد رونے سے آنکھیں ہیں دونوں لال
کنگھی نہ سر میں کی ہے نہ سرمے کا ہے خیال
کیوں دل گرفتہ ہیں نہیں کھلتا کسی پہ حال
حمام ترک کیا ہے نہ کپڑے بدلتی ہیں
مہندی کے بدلے وہ کفِ افسوس ملتی ہیں

گہنا اُتار ڈالا ہے یوں جی میں آئی ہے
بے وجہ سوگواروں کی صورت بنائی ہے
تکیہ ہے تر یہ اشکوں کی ندی بہائی ہے
مسند پہ بیٹھنے کی قسم کل سے کھائی ہے
یہ شکل رنج و غم کی ہے اس باتمیز کی
جیسے سنائی آئے کسی کے عزیز کی

بولا خبر یہ سنتے ہی وہ بانیِ ستم
جا کر کہو کہ دیر سے یاں منتظر ہیں ہم
دوڑیں یہ حکم سن کے خواصیں کئی بہم
ناچار ہند آن کے بیٹھی بچشمِ نم
ہر گز یزید کے تو نہ جانب نگاہ کی
دیکھا طعامِ گرم تو اک سرد آہ کی

پوچھا یزید نے کہ ہے کچھ بدمزہ مزاج
بولی یہ ہند ہوتا ہے ہاں درد دل میں آج
ہے ظلم اور ستم کا ترے عہد میں رواج
اپنے جگر کے زخم کا میں کیا کروں علاج
تجھ کو تو عید ہے مجھے صدمے گزرتے ہیں
یہ کون ہیں جو راتوں کو فریاد کرتے ہیں

بتلاؤ یہ سب اسیر مسلماں ہیں یا نہیں
قوم ان کی کیا ہے صاحبِ ایماں ہیں یا نہیں
محبوبِ کبریا کے ثنا خواں ہیں یا نہیں
آیا یہ لوگ قائلِ قرآں ہیں یا نہیں
سنتی ہوں بیکس ان سے نہ ہوں گے زمانے میں
یہ کس خطا پہ قید ہوئے قید خانے میں

ہیں کیا یہ لوگ منکرِ پیغمبرِ الٰہ
شاید نہیں علی کے گھرانے سے ان کو راہ
کیوں ہاتھ سب کے باندھے ہیں کھلتا نہیں یہ آہ
کاٹا ہے کس کا سر کسے لوٹا ہے بے گناہ
کافر ہے وہ عناد جسے پنجتن سے ہے
کیا دشمنی کچھ ان کو حسینؑ و حسن سے ہے

کوئی اگر کہے بھی تو میں مانتی ہوں کب
ابرار و حق پرست ہیں قیدی یہ سب کے سب
میں سن چکی ہوں آپ صدائے نمازِ شب
فاقوں میں بھی وہ کرتے ہیں تا صبح شکرِ رب
گرمی سے گو کہ سینوں میں دم ان کے رکتے ہیں
ماؤں کے ساتھ سجدے میں بچے بھی جھکتے ہیں

قیدی ہیں پر قضا کبھی ہوتی نہیں نماز
رکھتے ہیں پانچ وقت زمیں پر سرِ نیاز
آواز میں سنا نہیں یہ سوز یہ گداز
سجدے میں حق سے کہتے ہیں کچھ اپنے دل کا راز
چھوٹے بڑوں کی عادت طاعت گذاری ہے
آٹھوں پہر درود زبانوں پہ جاری ہے

قیدی ہے ظاہرا کوئی بیمار و ناتواں
معلوم کچھ نہیں کہ وہ لڑکا ہے یا جواں
آواز اک ضعیف سی آتی تھی ہر زماں
کیسا کراہتا ہے سحر تک وہ نیم جاں
یہ درد ہے صدا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے ہیں
رونے پہ اس کے لوگ محلے کے روتے ہیں

کرتا ہے جب تلاوتِ قرآں وہ حق کا نور
ہوتا ہے لحنِ حضرتِ داؤد کا ظہور
رشتہ کچھ اس کو مصحفِ ناطق سے ہے ضرور
قرآں کے حرف حرف کے معنی پہ ہے عبور
تقریر کیا فصیح ہے کیا خوش بیان ہے
گویا زبان اس کی خدا کی زبان ہے

دن بھر تو اس کو رہتا ہے غش اور دردِ سر
کرتا ہے نصف شب سے مناجات تا سحر
واللہ کیا دعاؤں کے فقروں میں ہے اثر
بہ جائے آب ہو کے جو پتھر کا ہو جگر
شاید کوئی عزیزِ شہِ مشرقین ہے
صوتِ حسن میں حسنِ صدائے حسین ہے

کہتے ہیں صبر و شکر سے اللہ رے حوصلہ
شکوہ نہ طوق کا ہے نہ زنجیر کا گلہ
جاری ہے صبح و شام عبادت کا سلسلہ
ہر دم رواں ہے چشم سے اشکوں کا قافلہ
گردن جھکی ہوئی ہے خدا پر نگاہ ہے
لب پر کبھی تو آہ کبھی لا الہ ہے

سنتی ہوں ننھے بچے بھی دو چار ہیں اسیر
لڑکی بھی کوئی قید ہے رشکِ مہِ منیر
رونے سے اس کے لگتے ہیں میرے جگر پہ تیر
کیا قہر ہے یہ ظلم غریبوں پہ اے امیر
دکھ دے کسی کو یہ نہیں عادت کریم کی
قرآں میں حق نے کی ہے سفارش یتیم کی

اے سست رائے قلب کو اتنا بھی کر نہ سخت
عقبیٰ میں رو سفید ہو تا او سیاہ بخت
رہتے ہیں سر جھکائے ہوئے بارور درخت
ڈر ہے مجھے کہیں نہ الٹ جائے تیرا تخت
حاکم کو خوف چاہیئے قہرِ الہ سے
اکثر گری ہے برق یتیموں کی آہ سے

کرتے ہیں لطف و رحم فقیروں پہ اغنیا
عقبیٰ میں کام آتا ہے یاں کا دیا لیا
خالق نے اپنے ملک کا حاکم تجھے کیا
جز نامِ نیک کون جہاں میں سدا جیا
زنداں میں قیدیوں کا بہت حال غیر ہے
کچھ خیر کر کہ خیر سے عقبیٰ بخیر ہے

قاروں کا گنج او ستم ایجاد کیا ہوا
نمرود کس طرف گیا شداد کیا ہوا
تھا پہلے وہ جو بانیِ بیداد کیا ہوا
فرعونِ بد نہاد سا جلاد کیا ہوا
وہ قبر میں ہیں آج جو کل تھے رواق میں
ڈھونڈو تو خاک بھی نہیں کسرا کے طاق میں

گرمی کی فصل اور یہ مکان تنگ ہائے ہائے
اب رحم کر اسے کوئی معصوم مر نہ جائے
فاقے سے ہوں وہ قید میں تو نعمتیں یہ کھائے
پانی تو پیاس میں کوئی جا کر انھیں پلائے
دل سے بھلا نہ وعدۂ روزِ نخست کو
بیمار کو دوا نہ غذا تندرست کو

کھانے کو میں نہ ہاتھ لگاؤں گی کیسی بھوک
اٹھتی ہے بار بار کلیجے میں میرے ہوک
ان کے بغیر مجھ کو یہ کھانا ہے مثلِ خوک
یہ بیکسوں پہ ظلم غریبوں سے یہ سلوک
خوش ہو گا حق دلوں کو یتیموں کے شاد کر
کیا رحم تھا کرم کو محمد کے یاد کر

کافر کے گھر کو بھی کبھی لوٹا نہ بعدِ جنگ
جو ہاتھ آیا دے دیا سائل کو بے درنگ
اس بادشاہِ دیں کو نہ کچھ فکر اور تھی
یکساں تھا خلق آپ کا شاہ و فقیر سے
باتیں تھیں پرورش کی یتیم و اسیر سے
ہر شب کو قیدیوں کی خبر لینے جاتے تھے

ہے آج تک جہاں میں علی کے کرم کا شور
تھا بازوئے رسول میں دستِ خدا کا زور
کی اس نے کچھ زباں سے شکایت تو ڈر گئے
رانڈوں کے وارث اور یتیموں کے تھے پدر
ہر دم حسین پر یہ تقید تھی ای پسر
رکھنی نہ اس کے قتل پہ مشکل کشا ہوئے

خلقِ خدا ہے معترفِ خلقِ مجتبیٰ
یادش بخیر ذکر کروں کیا حسین کا
دونوں جہاں میں کیا برکت ایک دم سے ہے
دنیا ہو اور حسین میں اسلام کے نثار
ہر بات بات میں کرمِ شاہِ ذوالفقار
خو ہے پیمبروں کی شہِ مشرقین میں

تھی میں بھی فیضِ صحبتِ مجلا سے بہرہ ور
نیلے نشاں ہیں چاند سے کاندھوں پہ جلوہ گر
اس پر بھی ہر گھڑی یہ دعا ہے اللہ سے

چادر گلے میں ڈال کے کھینچا ہوئے نہ تنگ
عسرت یہ تھی کہ فاقوں میں باندھا شکم پہ سنگ
رانڈوں کی پرورش تھی یتیموں کی غور تھی
بہلاتے تھے فقیر کو بر تر امیر سے
کرتے تھے سیر انھیں رطب و شہد و شیر سے
دو دن کے بعد نانِ جویں آپ کھاتے تھے

ہر ایک کی زباں پہ ہے نقلِ فقیرِ کور
پرواہ رہے کرم نہ گوارا تھا رنجِ مور
کاندھے پہ رکھ کے مشک ضعیفہ کے گھر گئے
قاتل پہ تے مرتے رکھی رحم کی نظر
قیدی کے بھی طعام کی رکھیو ذرا خبر
مشکیں جو باندھیں تو حسن سے خفا ہوئے

دریائے فیض ابرِ کرم منبعِ سخا
آقا کو دیر گاہ سلامت رکھے خدا
قایم جو ہے زمیں تو انھیں کے قدم سے ہے
فیضِ نبی تو عصمتِ خاتونِ روزگار
اور خلق میں نظیرِ حسن ہے وہ ذی وقار
ہیں جمع کس قدر حسنات ایک حسین میں

پیدا کیا ہے حق نے عجب طرح کا بشر
لیکر اناج جاتے ہیں خود بیکسوں کے گھر
یارب بچائیو مجھے بارِ گناہ سے

اس سالکِ طریقِ ہدایت کے میں فدا
ناقے تو پیچھے ہوتے ہیں آگے وہ مقتدا
اس سال بھی سنا ہے کہ تشریف لائے ہیں
کیا جانے حج کے بعد سدھارے ہیں وہ کدھر
رہتی ہوں اس خیال میں پہروں میں نوحہ گر
ہے دھوم کچھ دنوں سے جدال و قتال کی
اس خاندان میں کون رہا ہے سوائے شاہ
آگاہ ہوں کہ شاہ سے کینہ تجھے تھا آہ
بیتاب ہوں خیالِ شہِ نیک نام میں
وسواس کا مقام تردد کی ہے یہ جا
پھر تھا نہ شک مجھے کوئی ہوتا جو دوسرا
اس نامِ پاک سے برکت ہے جہان میں
کیں ہند نے یہ درد کی باتیں جو ایک بار
اللہ رے جوشِ ماتمِ سلطانِ نامدار
خنجر غمِ حسین کا دشمن پہ چل گیا
رو کر پھر اس سے کہنے لگی ہندِ خوش سیر
گر کہو تو دیکھ آؤں انھیں جا کے اک نظر
ہیں غیر یا عزیز شہِ انس و جاں کے ہیں
ناچار ہو کے ہند سے ظالم نے یہ کہا
واں جا کے اور ہوئے گا تجھ کو قلق سوا
پہلو میں مضطرب تھا دل اس حق پرست کا

یثرب سے حج کو آتے ہیں اکثر پیادہ پا
خالق نے ان پہ ختم کیا زہد و اتقا
کعبے میں اہلِ بیت بھی ہمراہ آئے ہیں
لونڈی نے پھر سنی نہیں آقا کی کچھ خبر
کعبے میں گھر گئے ہوں نہ سلطانِ بحر و بر
یارب تو خیر کیجیو زہرا کے لال کی
قائم رکھے جہان میں شہ کو مرا الٰہ
ہے ہے کیا نہ ہو کہیں زہرا کا گھر تباہ
شہزادیاں اسیر نہ ہوں فوجِ شام میں
روتے ہیں نام لیکے یہ قیدی حسین کا
گر ہے تو اک حسین ہے زہرا کا دلربا
عقدے وہ کھول دیتے ہیں سب ایک آن میں
ہر قلب پر ستم کی چلی تیغِ آبدار
رویا جھکا کے سر کو یزیدِ زبوں شعار
کیا نام میں اثر ہے کہ پتھر پگھل گیا
ہوں بے قرار صورتِ بسمل میں نوحہ گر
شاید انھیں سے شہ کی مفصل سنوں خبر
دریافت تو کروں کہ یہ قیدی کہاں کے ہیں
جا دیکھ آ انھیں مرا نقصان ہے اس میں کیا
سنتے ہی یہ کلام اٹھی ہندِ باوفا
اٹھتے ہی جلد حکم دیا بندوبست کا

سب عورتوں کو لیکے چلی جب وہ حق شناس
کپڑے یہ مل گئے ہیں بدل ڈالیے لباس
اک دم میں سوگواروں کو میں دیکھ آتی ہوں
میلے ہی کپڑے چاہئیں جب دل پہ ہو ملال
کنگھی وہ کیا کرے کہ پریشاں ہے جس کا حال
جی چاہتا ہے یہ کہ گریبان چاک ہو
لازم ہے بزمِ غم میں عزادار بن کے جائے
واں وارثوں کا سوگ ہے کپڑے کسے دکھائے
کپڑے بدل کے اندروں میں جانا روا نہیں
نکلی محل سرا سے یہ کہکر وہ خوش سیر
پہونچی جنابِ حضرتِ زینب کو یہ خبر
اپنا نہیں خیال بزرگوں کا پاس ہے
ہے شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہرِ امام
ہم ہیں فقیر ہم میں امیروں کا کیا ہے کام
پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینب کدھر گئی
رو کر ہر اک سے بانوئے ناشاد نے کہا
لوگو خدا کے واسطے چپکے رہو ذرا
پھر حشر قید خانہ میں ہوگا جو روئے گی
چپ ہو گئے یہ سن کے اسیرانِ نوحہ گر
آئی سواریِ زنِ حاکم قریبِ در
وحشت پہ قید خانہ کی جس دم نگاہ کی

کہنے لگیں یہ سب جو کنیزیں تھیں آس پاس
اس نے کہا کہ ہے مرے دل پر ہجومِ یاس
کیسا لباس کیا کسی شادی میں جاتی ہوں
کچھ سوچ ہے مجھے نہیں کچھ اور ہے خیال
ہے سر کا گوندھنا بھی مجھے اس گھڑی وبال
کپڑے تو سب سیاہ ہوں اور سر پہ خاک ہو
خود روئے پیٹے بین کرے اور انھیں رلائے
روتا ہے دل مقام ہے عبرت کا ہائے ہائے
ان میں چلی ہوں جن کے سروں پر ردا نہیں
تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر
رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگیں سر کو پیٹ کر
ہے ہے کہاں چھپی وہ مری روشناس ہے
غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
لوگو بتا نہ دیجو کہیں اس کو میرا نام
کہہ دیجو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی
کیا حاصل اضطراب سے قسمت کا جو لکھا
رو رو کے سو گئی ہے ابھی میری دلربا
چونکی اگر تو صبح تلک پھر نہ سوئے گی
جا بیٹھی ایک گوشہ میں زینب جھکا کے سر
درباں بھی دور ہٹ گئے دروازہ کھول کر
ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کے خواصوں نے آہ کی

دل ہند کا تو رندہ گیا تھرّا گیا جگر ۔۔۔ بولی ٹھہر کے ڈیوڑھی پہ یہ قہر ہے کہ گھر
دیکھا نہیں مکاں کوئی تاریک اس قدر ۔۔۔ پوچھو کوئی کسی سے کہ ہیں بی بیاں کدھر
ایسا بھی ظلم کرتا ہے کوئی جہان میں ۔۔۔ بندے خدا کے بند ہیں ایسے مکان میں

بڑھ کر کسی کنیز نے تب یہ کیا بیاں ۔۔۔ بی بی کوئی اسیروں میں زندہ نہیں ہے یاں
چلیئے محل میں آپ بھلا جائیں گی کہاں ۔۔۔ قابل نہیں حضور کے جانے کے یہ مکاں
گر غش ہوئے تو آپ میں آیا نہ جائے گا ۔۔۔ ہم سے تو اس خرابے میں جایا نہ جائے گا

آزردہ ہو کے کہنے لگی ہند نوحہ گر ۔۔۔ عبرت کا یہ مقام ہے لونڈی خدا سے ڈر
آخر جو اس میں قید ہیں وہ بھی تو ہیں بشر ۔۔۔ تاراج یوں جہاں میں ہوئے کسی کا گھر
جانے وہی کلیجے پہ جس کے چھری لگے ۔۔۔ ایسی نہ بات کہہ کہ خدا کو بری لگے

یہ بات کہہ کے آگے بڑھی وہ بصد الم ۔۔۔ اک آفتابِ دین نظر آیا اسیرِ غم
حلقہ گلے میں طوق کا زنجیر میں قدم ۔۔۔ بولی ٹھہر کے وہ کہ زہے شوکت و حشم
انساں ہے یہ اندھیرے میں یا شمع طور ہے ۔۔۔ آئی ندائے غیب کہ خالق کا نور ہے

پڑھتی ہوئی درود گئی جب قریب تر ۔۔۔ اللہ رے حسن کرنے لگی خیرگی نظر
غل عورتوں میں تھا یہ فرشتہ ہے یا بشر ۔۔۔ اترا ہے آسماں سے خرابے میں یا قمر
رتبے میں ہے بزرگ نسب میں جلیل ہے ۔۔۔ ثابت ہے ضعف سے کہ نہایت علیل ہے

کوئی بلائیں لے کے یہ کہتی تھی بار بار ۔۔۔ اے بیکس و اسیر و بلاکش ترے نثار
ہے ہے گلا یہ چاند سا اور طوقِ خاروار ۔۔۔ یہ گوری گوری پنڈلیاں زنجیر سے فگار
لوگو بزرگ اس کے مقرر امیر ہیں ۔۔۔ گویا جنابِ یوسفِ کنعاں اسیر ہیں

بولی کوئی کہ عابد و زاہد ہے یہ جواں ۔۔۔ گھٹا جبیں پہ کثرتِ طاعت کا ہے نشاں
ایماں کا نور چہرۂ انور سے ہے عیاں ۔۔۔ دیکھا نہیں حیا سے کہ ہیں کون بی بیاں
برحق شریفِ قوم یہ گردوں اساس ہے ۔۔۔ اشراف کو ہر ایک کی حرمت کا پاس ہے

جو غیر کی طرف نہ حیا سے کرے نظر
یہ خبر ہوئے جس کی طبیعت میں اُس سے شر
تقوے پہ اس کے عفت و عصمت گواہ ہے

افسوس ایسے بندۂ صالح پہ یہ تعب
بستر زمیں کا اور یہ تنِ زار ہے غضب
ہے خامشی دلیل عبادت کے شوق کی

باتیں یہ کرکے بی بیاں روتی تھیں زار زار
کہتی تھی دیکھ کر رُخِ اقدس کو بار بار
آنکھوں میں صاف پھرتی ہے صورت امام کی

آخر دبا کے پاؤں یہ بولی وہ نیک نام
بولے یہ آنکھیں کھول کے مولائے خاص و عام
ہجرِ پدر میں تلخ ہے لذت حیات کی

بولی یہ ہند کب سے علالت ہے میں نثار
اس نے کہا طبیب کو دکھلاؤ حالِ زار
راضی ہیں اس پہ ہم جو رضائے حبیب ہے

رنج و بلا کو لطفِ خدا جانتے ہیں ہم
ہر دردِ جاں ستاں کو دوا جانتے ہیں ہم
کچھ غم نہیں مرض سے اگر حال غیر ہے

ایذا کو چین رنج کو راحت سمجھتے ہیں
صابر ہیں نانِ جو کو بھی نعمت سمجھتے ہیں
عسرت ہو دکھ ہو قید ہو فاقہ کشی رہے

ہاں ہنسیں ایسے شخص کی بلوے ہیں ننگے سر
ٹوٹے غضب خدا کا لعینوں کی جان پر
قرآن ہم اُٹھالیں کہ یہ بے گناہ ہے

زنداں میں کاٹتا ہے تڑپ کر تمام شب
آنکھیں جو بند ہیں یہ نقاہت کا ہے سبب
گردن جھکی ہوئی ہے گرانی سے طوق کی

سینے میں تھا مگر نہ دلِ ہند کو قرار
کس ملک کا رئیس ہے یارب یہ بے قرار
تصویر ہے حسین علیہ السلام کی

اُٹھیے کہ دیر سے میں کھڑی ہوں پئے سلام
اس بیکس و یتیم و بلاکش سے کیا ہے کام
طاقت نہ آنکھیں کھولنے کی ہے نہ بات کی

فرمایا ساتویں سے محرم کی ہے بخار
فرمایا خیر شافیِ مطلق ہے کردگار
دی ہے یہ تپ اسی نے جو سب کا طبیب ہے

دُکھ میں کراہنے کو گلا جانتے ہیں ہم
عارض ہو عارضہ تو شفا جانتے ہیں ہم
صحت ہماری یہ ہے کہ عقبےٰ بخیر ہے

شیریں کو تلخ شور کو لذت سمجھتے ہیں
مرنے کو راہِ حق میں سعادت سمجھتے ہیں
دولت یہی بڑی ہے کہ خالق خوشی رہے

یہ ذکر سن کے رونے لگی ہند باوفا کی عرض کیا ہے اسمِ مبارک حضور کا
گردن جھکائے قبلۂ چارم نے یہ کہا بے کس عزیز مردہ گرفتار بے نوا
کیا پوچھتی ہو نام و نشاں خاکسار کا اک بندۂ حقیر ہوں پروردگار کا

زیبا ہے نامِ پاک پئے خالقِ ودود روزی رسانِ عالمیان واجب الوجود
جو معرضِ فنا میں ہیں کیا ان کی ہست و بود قطروں کی کیا بساط حبابوں کی کیا نمود
درپیش منزلِ لحدِ خوفناک ہے آغاز اپنا خاک ہے انجام خاک ہے

تھے مرتضےٰ علی کے جہاں میں بہت خطاب شیرِ خدا امیرِ عرب مالک الرقاب
کارہ تھا پر ترقیِ ظاہر سے وہ جناب ہوتے تھے شاد کہتا تھا جو یا ابو تراب
جس کو فروتنی ہے وہی سربلند ہے خالق کو خاکساریِ انساں پسند ہے

اس نے کہا بتایئے والد کا اپنے نام فرمایا فاقہ کش وطن آوارہ تشنہ کام
مقتولِ نیزۂ و تبر و خنجر و حسام جس کو ملا نہ پیاس میں پانی کا ایک جام
بے گور و بے کفن جسدِ پاش پاش ہے سر یاں ہے کربلائے معلیٰ میں لاش ہے

پوچھا وطن کو اس نے تو بولے شہِ زمن دارِ فنا مقامِ فنا منزلِ محن
بیٹھے فقیر تھک کے جہاں ہے وہی وطن بے خانماں اسیر و پریشان و خستہ تن
پردیس میں تباہ ہوئے شہر چھٹ گیا جنگل میں ہم بھی لٹ گئے اور گھر بھی لٹ گیا

اس نے کہا کہ طوق سے ہوئے گا دم خفا فرمایا جس میں خالقِ کونین کی رضا
گھٹتا ہے گر گلا تو کچھ اس کا نہیں گلا بندے ہیں امرِ حق میں ہمیں اختیار کیا
صابر ہیں غیرِ شکرِ خدا کیا سخن کریں ہم وہ نہیں کہ شکوۂ طوق و رسن کریں

وہ بولی اور بھائی بھی کیا تھے مہ منیر فرمایا ہاں جوان تھا اک اور اک صغیر
جرأت میں بے عدیل تھے صورت میں بے نظیر دونوں کو تین روز نہ پانی ملا نہ شیر
اعدا کو دشمنی تھی صغیر و کبیر سے برچھی سے ایک قتل ہوا ایک تیر سے

غش ہو گئے یہ کہہ کے امامِ فلک اساس
پہونچی ٹھہر ٹھہر کے جو سیدانیوں کے پاس
تھرا کے واں سے آگے بڑھی ہند بے حواس
رانڈوں کی شان دیکھ کے بولی وہ حق شناس
چہرے سبھوں کے غیرتِ خورشید و ماہ ہیں
گویا کہ اہلِ بیتِ رسالت پناہ ہیں

پیدا ہے ان کی شان سے سیدانیوں کی شاں
یا ہاشمی ہیں یا علوی ہیں خجستہ جاں
ظاہر ہے صبر و شکر سے سادات کا نشاں
کس میں یہ معرفت کے سخن اور یہ بیاں
یہ لاکھ گر چھپائیں تو کب مانتی ہوں میں
خوشبو کو اہلِ بیت کی پہچانتی ہوں میں

مٹی میں گو بھرے ہوئے ہیں ان کے روئے پاک
ہر چند ہیں صعوبتِ زنداں سے سب ہلاک
چھپتا ہے کوئی چاند پہ ڈالے ہزار خاک
روشن ہے قید خانۂ تاریک و ہولناک
میں کس طرح کہوں کہ یہ آلِ عبا نہیں
ہاں فرق اتنا ہے کہ سروں پر ردا نہیں

چہروں کی آب و تاب پہ لوگو کرو تو غور
بازو ہیں ایک رسّی میں ہے یہ ظلم و جور
دیکھا ہے قیدیوں کا کسی نے کبھی یہ طور
بچے بھی ہیں بندھے ہوئے دیکھو ستم یہ اور
مٹی میں مل گیا یہ چمن وا مصیبتا
ان گوری گردنوں میں رسن وا مصیبتا

آکر قریب کہنے لگی ہندِ خوش خصال
مجھ سے تو کچھ بیان کرو اپنے دل کا حال
اے بی بیو ہٹا دو ذرا رخ سے اپنے بال
کھیتی تمھاری ہو گئی کس بن میں پائمال
کیوں لے گئے عدو تمھیں بلوائے عام میں
کس جرم پر اسیر ہوئے ملکِ شام میں

سنتی ہوں میں مدینے میں ہے آپ کا وطن
ہیں خیریت سے حضرتِ شبیر کی بہن
للہ کچھ کہو خبر سرورِ زمن
زندہ رکھے جہاں میں انھیں ربِ ذو المنن
وہ بی بی روحِ بنتِ رسالت پناہ ہے
عصمت پہ جس کی خالقِ اکبر گواہ ہے

کیوں بی بیو بتاؤ خدا کے لئے ذرا
سنتی ہوں اب جواں ہیں ہمشکلِ مصطفےٰ
ہے خیر سے مدینے میں فرزندِ مرتضا
سرسبز رکھے باغِ جہاں میں انھیں خدا
شہرت ہے ابنِ فاطمہ زہرا کے ماہ کی
حسرت تو شہ کو ہوئے گی اکبر کے بیاہ کی

دل سے یہی ہے شام و سحر اب مری دعا

اکبر کا سہرا بانو کو دکھلائے اب خدا

ارمان نکلے بادشہِ مشرقین کا

جب ہند ختم کر چکی رو رو کے یہ کلام

صدقے گئی بتایئے کیا آپ کا ہے نام

زنداں میں سب اسیروں کی سردار آپ ہیں

بانو نے اس سے پھر یہ کہا تھام کر جگہ

زینب کو پھر بتا کے یہ بولی بچشمِ تر

تو دل میں جانتی ہے کہ ان کی عزیز ہوں

وہ بولی کی ہیں آپ کے فرزندِ خوش سیر

تیر و سناں سے قتل ہوئے رن میں دو پسر

ٹکڑے جگر کے صدمۂ فرقت سے ہوتے ہیں

یہ سن کے ہند رونے لگی تب بہ اشک و آہ

رخ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ

ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے

کہنے لگی یہ ہند سے زینب جگر فگار

اے ہند ان کا نام نہ لے بہرِ کردگار

اعدا تو مجھ کو لے گئے بلوائے عام میں

وہ شاد کام اور میں بیکس جگر فگار

بلوے میں لے گئے مجھے اعدا بحالِ زار

وہ بی بی پردہ دار ہے اور خوش خصال ہے

آقا مرے جہاں میں سلامت رہیں سدا

گھر میں بہو کو لائے جگر بندِ مصطفا

آباد گھر ہو فاطمہ کے نورِ عین کا

بانو کے پاس آ کے یہ بولی وہ نیک نام

للہ کچھ کہو میں ہوئی جاتی ہوں تمام

ان قیدیوں کی قافلہ سالار آپ ہیں

ہم قیدیوں کے نام ہیں مظلوم و نوحہ گر

یہ بی بی جو کہ روتی ہیں پھوڑے اپنا سر

مختار یہ مری ہیں میں ان کی کنیز ہوں

فرمایا رو کے لٹ گیا بی بی ہمارا گھر

زنداں میں اک اسیر ہے مظلوم نوحہ گر

جو گود میں پلے تھے وہ جنگل میں سوتے ہیں

پھر مڑ کے روئے حضرتِ زینب پہ کی نگاہ

بے ساختہ کہا کہ زہے قدرتِ الٰہ

زینب تمھیں ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

کیوں فالِ بد نکالتی ہے منہ سے بار بار

نسبت نہ ان سے دے کہ وہ ہیں فاطمہ وقار

دشمن نہ ان کے قید ہوں زندانِ شام میں

آباد وہ ہیں اور میں زنداں میں سوگوار

باہر کنیز ان کی نہیں نکلی زینہار

زینب میں ہی ہوں یہ ترا بیجا خیال ہے

یہ سُن کے بے قرار ہوئی ہندِ خوش خصال
ای میری شاہزادی چھپا وُ نہ مجھسے حال
تم کو قسم ہی فرقِ شہِ مشرقین کی
یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی ہندِ ذی وقار
چلائیں سر کو پیٹ کے باچشمِ اشکبار
پانی دیا نہ سبطِ رسالت پناہ کو
ای ہند کیا کہوں خبرِ شاہِ تشنہ لب
مطلق ڈرا نہ خالقِ اکبر سے بے ادب
رونے نہ پائے ماتمِ شاہِ شہید میں
کیا پوچھتی ہی تو خبرِ شاہِ بحر و بر
باندھا درخت میں کبھی خولی نے بے خطر
یاں تک تھی دُشمنی سپہ بدخصال کو
ای ہند رن میں شاہ کے یاور ہوئے شہید
بن بیاہے دشت میں علی اکبر ہوئے شہید
مرجھا کے فاطمہ کی نہ کھیتی ہری ہوئی
میداں میں بے کفن ہی ابھی لاشِ شاہِ پاک
واحسرتا وہ گرم ہوا اور وہ فرشِ خاک
چہلم تلک ہوا نہ شہِ مشرقین کا
منگوایا ہند نے جو سرِ شاہِ بحر و بر
جب سر پہ شاہِ دیں کے سکینہ نے کی نظر
دُنیا سے تشنہ کام سفر کر گئے حسین

دیکھا بغور رُخ تو یہ بولی بصد ملال
زینب تمھیں ہو خواہرِ شبیرِ باکمال
جلدی کہو خبر مرے آقا حسین کی
فرطِ قلق سے دل ہوا زینب کا بے قرار
ای ہند کٹ گیا سرِ شبیرِ نامدار
حاکم نے بے گناہ کیا قتل شاہ کو
ہنگامِ عصر لٹ گیا زہرا کا باغ سب
چوبِ یزید اور لبِ شبیر ہی غضب
سر ننگے لے گئے ہمیں بزمِ یزید میں
فرقِ حسین تھا کبھی نیزے پہ جلوہ گر
لٹکا درِ یزید پہ سبطِ نبی کا سر
پتھر لگائے راہ میں زہرا کے لال کو
عباس قتل ہو گئے اصغر ہوئے شہید
شبّر کا لال اور مرے دلبر ہوئے شہید
بچوں سے گود ہو گئی خالی بھری ہوئی
ہی ہی وہ دھوپ اور وہ میدانِ ہولناک
کس طرح دل نہ ہو مرا سینے میں چاک چاک
اب تک پڑا ہی دھوپ میں لاشہ حسین کا
مجرے کو اُٹھ کھڑے ہوئے قیدی بچشمِ تر
چلائی رو کے ہائے غضب مر گئے پدر
لو مجھ پہ اب یہ راز کھلا مر گئے حسین

پھر سر کو پیٹتی ہوئی دوڑی وہ سوگوار
دامن میں لے لیا سرِ شبیرِ نامدار
منھ رکھ کے منہ پہ شہ کے جو روئی وہ دلفگار
صدمہ ہوا نکلنے لگی تن سے جانِ زار
دنیا سے سب کی زیست کا نقشہ بدل گیا
جنبش ہوئی لبوں کو بس اور دم نکل گیا

بانو نے سر کو پیٹ کے تب یہ کیا بیاں
بس مل چکیں حسین سے قربان جائے ماں
اے نورِ عین بس نہ کرو نالہ و فغاں
ایسا نہ ہو کہ گھٹ کے نکل جائے تن سے جاں
بچھڑے ہیں کب سے بادشہِ مشرقین سے
ہم بھی تو مل لیں فاطمہ کے نورِ عین سے

اٹھی یہ کہہ کے بانوئے بیکس برہنہ سر
دیکھا پڑی ہے خاک پہ بے جان وہ نوحہ گر
زینب کو پھر دکھا کے یہ بولی بچشم تر
بچی کو میری لے گئے سلطانِ بحر و بر
زنداں کے تھے وہ ظلم کہ عاجز تھی جان سے
افسوس چل بسی مری پیاری جہان سے

بی بی تمھاری ننھی سی میت کے میں نثار
منہ سے اٹھاؤ کرتے کا دامن پھر ایک بار
جی بھر کے تجھ کو دیکھ لے مادر جگر فگار
اماں کو اپنے پاس بلا لو تو ہو قرار
فرصت کبھی نہ ہوگی ہمیں شور و شین سے
تم یاں سے جا کے قبر میں سوؤ گی چین سے

ہے ہے اٹھائے قید میں کیا کیا نہ رنج و غم
باندھا گلے کو شمر نے رسی سے ہے ستم
بابا کو یاد کر کے جو روتی تھیں دم بدم
دیتے تھے گھڑکیاں تمھیں یہ بانیِ ستم
زخمی ہیں کان پھول سے عارض کبود ہیں
اب تک نشان طمانچوں کے رخ پر نمود ہیں

بی بی خدا پہ خوب ہے روشن ہمارا حال
چادر تلک نہیں ہے چھپاؤں جو سر کے بال
کس طرح دوں کفن تجھے اے میری خرد سال
نادار ہوں میں پاس نہ دولت ہے اور نہ مال
سنگِ الم سے شیشۂ دل پاش پاش ہے
دو گز کفن کے واسطے محتاج لاش ہے

ہوتا جو واری پاس مرے کچھ بھی مال و زر
تربت بناؤں ننھی سی میں سوختہ جگر
تابوت پر میں باندھتی سہرا بچشم تر
جو پوچھتا تو بس یہی کہتی میں نوحہ گر
میت یہی ہے بنتِ شہِ مشرقین کی
دنیا سے آج اٹھ گئی عاشق حسین کی

بس ای انیس بزم میں ہی گریہ و بکا
وقتِ دعا ہی خالقِ اکبر سے کر دعا

یارب بحقِ احمد و زہرا و مجتبا
دکھلا دے جلد روضۂ سلطانِ کربلا

دم لب پہ ہی زیارتِ مولا نصیب ہو
بیمارِ غم کو قربِ مسیحا نصیب ہو

رباعی

عزت ہی یار و آشنا کے آگے
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے

یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں
یہ ہاتھ جب اُٹھیں تو خدا کے آگے

رباعی

گو صورتِ دریا ہمہ تن جوش ہوں میں
لب خشک ہیں چشم تر ہی خاموش ہوں میں

کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا
مانندِ حباب خانہ بر دوش ہوں میں

رباعی

آئینۂ خاطر کی جلا ہی رونا
اور دیدۂ مردم کی ضیا ہی رونا

پوچھا جو علاجِ دل مسیحا نے کہا
ہر درد کی دُنیا میں دوا ہی رونا

(مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

۱۹۳۵ء